SALA-I-AM, DELHI REGD No L 1462.

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement and the assimilation of the best features of the new civilization.

[illegible]

Mustansir Press Farashkhana Delhi

فہرستِ مضامین

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

صلائے عام (برعایت سال تمام)

جناب انیس نے ایک جگہ جھرّیوں کے مضمون کو بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے کہ بدن پر یہہ جھرّیاں نہیں ہیں جامۂ ہستی کی آستینیں چنی گئی ہیں۔ ع چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو + اگلی وضع کے خوش پوشاک لوگ اکثر انگرکھے کی آستینیں چنکر پہنتے تھے : یہہ نہایت تکلف میں داخل تھا + زمانہ کی وضع میں بھی یہہ تشبیہ خاصی ہے کہ سال و ماہ کی گردشیں گویا زمانہ کے چہرے کی جھرّیاں ہیں جو بڑھاپے میں نظر آتی ہیں۔ جیوں جیوں زمانہ کی عمر بڑھتی جائے گی جھرّیاں بڑھتی جائیں گی + زمانہ کی عمر بہت بڑی بتاتے ہیں کہ مخلوق میں اس کا کوئی ہمعصر نہیں جس سے پتا لگے ان جھرّیوں سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہے +

جھرّیاں گویا عمر کی جنتریاں ہیں جن سے دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ شباب کا زمانہ ہے یا انحطاط کا۔ جس طرح حسین جوانی سے اُتر کر آئینہ میں ایک ایک جھرّی سے سمجھ لیتی ہیں کہ عمر کتنی ہو چلی۔ شکنیں جو ماتھے اور کن پٹی پر نمایاں ہوتی ہیں ایک ایک سال۔ سال میں ایک ایک ساعت اور ایک ایک لمحے کی غمازی کرتی ہیں + چہرہ اور ماتھے پر جو باریک خط پڑ جاتے ہیں ہمارے

غم و رنج کی گواہی دیتے ہیں جس طرح پت جھڑ میں پتوں کی زردی خزاں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ شکن جو دو برس پہلے اتنی نہ تھی بڑھ چلی ہے اور بہت بڑھ گئی ہے یہ اُس وقت سے بہت بڑھ گئی جب سے کہ ماں کا اکلوتا بچہ جوان ہو کر دُنیا سے سدھارا تب سے مادرِ گیتی کو اولاد کا غم ہی ہوتا رہا ہے ٭

دُنیا عجیب مقامِ عبرت ہے کہ جانے والوں کے حال کی خبر آنے والوں کو نہیں ہوتی نہ آنے والوں کو پچھلوں کی۔ بلکہ جس طرح اسیریٔ بُلبل کا حال صیاد کی زبانی اور پھول کی سرگزشت زبانِ خار سے۔ چاہنے والے کا ذکر رقیب کی زبان سے اور بسمل کا تڑپنا جلاد کی نگاہ سے پوچھا جائے تو کتنا ناموزوں معلوم ہوتا ہے: اسی طرح دسمبر ۳۱ ۱۹۲۷ء کا حال پہلی جنوری ۱۹۲۸ء سے کس طرح معلوم ہو سکتا ہے خاصکر جب کہ ۱۹۲۷ء نے کوئی وصیت نامہ نہیں چھوڑا کہ میرا مال متاع کس طرح تقسیم کیا جائے ٭

اب اس کا تذکرہ غیروں یعنی اخبار نویسوں کی زبانی سُننے چاہیے۔ یعنی میرا حال سنسکرت میں لکھئے یا میر حسن کی مثنوی عبری زبان میں جن زبانوں کے جاننے والے اُن زبانوں کی طرح زمانہ ہوا کہ دُنیا سے رخصت ہو گئے ٭ اب ان قصے کہانیوں کے ترجمہ کرنے والے بھی نہیں رہے۔ دوسرے ایک حالت کا حال دوسری حالت سے ملانا بیگانگی میں داخل ہے کہ وطن سے غُربت میں پہونچنے کے برابر ہے ٭

زمانہ کی طرح ہر انسان کا حال یہی ہے کہ گویا بہار کا حال خزاں سے پوچھا جائے جوانی کا حال بڑھاپے سے۔ وصل میں ہجر کا ذکر اور رنج میں راحت کی باتیں۔ ہماری پچھلی سوانح عمری گویا غیر زبان میں لکھی جاتی ہے جس کی اصطلاحیں اور محاورے مدت ہوئی کہ بالکل بدل بدلا چکے۔ دوپہر دن کے معاملے آدھی رات سے نہیں ملتے نہ شام کے نقشے صبح سے ملتے ہیں۔ نسیم سحر کو تپش آفتاب سے مشابہت نہیں نہ دن کو رات سے ہے۔ صبح کو آفتاب کس دھوم سے شعاعوں کے ساتھ نکلتا اور چڑھتا چلا آتا ہے۔ وہی آفتاب غروب کے وقت تھکے مسافر کی طرح اکیلا بیٹھ دکھا جاتا ہے: دن کام کاج چلنے پھرنے کے لئے ہے اور رات پڑ رہنے کے لئے۔ گرمی میں اور حالت ہوتی ہے اور جاڑے میں اور۔ جوانی میں ہم کچھ اور ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں کچھ اور۔ غرض ہر چیز۔ موسم ہو یا فصل۔ زمانہ ہو یا زمانہ کا نقشہ۔ شعلہ کا سر اوپر کو رہیگا تو پانی کا رخ نشیب کو جائے گا۔ انسان اور انسان کی تصویر بھی بدلتے دیکھی تصویر کا رنگ سایہ میں اور اور دھوپ میں اور۔ خوشی میں آپ کے چہرہ کا رنگ اور ہوتا ہے اور رنج میں اور: غرض کوئی حالت و صورت کیسی ہی کیوں نہ ہو بدلتی رہتی ہے تو جب دنیا میں گردشوں اور تبدیلیوں کا دور دورہ ہے تو محض ایک سال کی تبدیلی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۸ء کے ساتھ کس گنتی و شمار میں ہے ؟

تمدن

تتمۂ مضمون

سال تمام کا مضمون گو مختصر و معمولی ہے مگر طرز بیان نیا ہے۔ یہہ طرز مسز کرا فرڈ کے ناول کا ہے جن کی نثر انگریزی بہت پاکیزہ سمجھی جاتی ہے ٭ اس زمانہ میں انگریزی زبان کی نثر کی سب سے زیادہ تعریف ہے۔ اس لئے انگریزی نثر کی ادائے بیان کے اچھے اچھے نمونوں کی تقلید صلائے عام میں کی جاتی ہے۔ اب کی دفعہ **مضمونِ پریشاں** بھی اسی طرز پر ہے ٭

یہہ مضامین انگریزی کے ترجموں میں داخل نہیں۔ صرف اُن کے ادائے بیان کی تقلید کی گئی ہے ٭ نظم میں تو ہمیں کسی زبان کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ نثر میں البتہ غیر زبانوں کے پاکیزہ طرز کی تقلید کرنی مناسب ہے ٭

ہماری زبان میں اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ دن تو اب رہے نہیں کہ جشن و درباروں کی تقریبوں میں بڑے بڑے زور کے قصیدے پڑھے جاتے تھے جس سے معلوم ہو کہ شاعری میں کون کس سے بازی لے گیا: اب تو صرف اخباروں اور رسالوں میں گنجایش ہے کہ اہلِ کمال پاکیزہ بیانی و نازک خیالی دکھائیں ٭ کونسل اور اسمبلی کے اجلاسوں میں شعر و شاعری کا کام نہیں۔ اب تو فصیح تقریروں اور پاکیزہ اسپیچوں کی ضرورت ہے: یہہ نثر میں ہوتی ہیں ٭

نثر کی ضرورت کے متعلق اس پرچہ میں ایک خاص مضمون پیش ہے جو صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ فرمالیئے ٭

مضمون پریشاں

جناب صفی لکھنوی کا شعر ہے ؎

آلہی زندگی کیا؟ موت کیا؟ بیمارِ ہجراں کی ٭ وہ بدخوابی۔ یہہ اک تعبیر اُس خوابِ پریشاں کی

اِس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی و موت دونوں اُلجھن کا سبب ہیں۔ خواب سے زیادہ تعبیر میں اُلجھن معلوم ہوتی ہے کہ خدا جانے مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

خوش اعتقادی کو چھوڑ کر اگر دیکھئے تو اہل اللہ کے سوا اکثر نامور لوگوں کا اخیر وقت ایسا نہیں گزرا جس پہ رشک کیا جائے۔ سکندر اپنے مصاحب رفیق دوست کو بزمِ مے میں اپنے ہاتھ سے نشہ کی بے ہوشی میں جان سے مار ڈالنے کے غم میں مرا۔ اکبر کو ابوالفضل کے جہانگیر کی بغاوت سے مارے جانے کا ایسا صدمہ ہوا کہ جانبر نہ ہوسکا۔ شاہجہان کی موت اپنے بیٹے عالمگیر کی قید میں آئی کہ مرتے وقت پانی بند تھا۔ خود عالمگیر نے سفر میں وطن سے دور دکن میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ غرض مرنے کے بعد جو کچھ ہو سو ہو اخیر وقت بھی اکثر پریشانی سے خالی دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس کی تمثیل سال تمام کا اخیر ہے کہ قیامت تک یہہ سنہ یعنی ۱۹۲۷ اب آچکا۔ یوں سیکڑوں۔ ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں بے گنتی و بے شمار سنہ و سال

آئیں مگر یہ سنہ کہاں جو ابھی گزر رہا ہے؟

اخبار والوں کا دستور ہے کہ اکثر اخیر سال کا مضمون لکھتے ہیں۔ سال کے آخر میں جانے والے سال کا ذکر کرتے ہیں صلائے عام نے عمداً اس کا ذکر چھوڑ دیا کہ نزع کے وقت جب بیمار دم توڑ رہا ہو بہت باتیں کرنی مناسب نہیں۔ نعش کے سامنے زور سے نہیں بولتے نہ کہ اخباروں میں اس کا شور مچایا جائے + جس بیمار کو صبح پکڑنے کی امید نہ ہو اس کو شور مچا کر بے چین نہ کرنا چاہئے۔ اس کو اور نہیں تو پچھلے پہر آرام سے پڑا رہنے دیجئے +

سنہ ۱۹۲۷ نے پورے بارہ مہینے ۳۶۵ دن، اور اتنی ہی راتوں میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہمارے رنج و راحت میں ہر وقت شریک رہا: ایسے رفیق کا ساتھ چھوٹنا گو اچھا خاصا ہنگامہ ہے مگر لاچاری ہے کہ کیا کیا جائے؟ لاچاری میں خاموشی مناسب ہے

کہتے ہیں کہ خدا نے زبان اس غرض سے دی ہے کہ انسان اپنا خیال جو جی میں آئے زبان سے ظاہر کرے۔ اور بھی دو ایک طریقے اظہار خیال کے ہیں مثلاً تحریر و اشارے اور ٹیلیفون و وآئرلیس وغیرہ: لیکن لاچاری کے لئے خاموشی سے بہتر کوئی تدبیر نہیں اور یہی اکثر کارگر ہو جاتی ہے + یار کے ظلم چپکے برداشت کرنے میں لطف ہے۔ آپ کتنا ہی بکے جائیں وہاں سب کا جواب خاموشی سمجھئے + حسینوں کا اقرار زبان سے نہیں خاموشی سے ہوتا ہے۔ کہ "خاموشی نیم رضا" مشہور ہے + آپ نے خیال کیا ہوگا کہ حسینوں کی اکثر باتیں تحریر و تقریر سے بہت کم واسطہ رکھتی ہیں۔ دہن تو ہوتا ہی

نہیں جو بولیں۔ نگاہ و عشوہ و کرشمے سے کام لیا جاتا ہے۔ ان میں زبان کی ضرورت نہیں ÷ شرم سے گردن جھکا لینا ہی ہزار معنی کے برابر ہے۔ خرامِ ناز کو قیامت کا جواب سمجھا جاتا ہے ÷

سال تمام کے حال میں مصیبت یہہ ہے کہ اس کے مال متاع کا جو وارث ہوگا مرنے والے نے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے ۱۹۲۸ء سے کبھی ملنا نہیں ہوا: اُس کی وضع و اطوار کی خبر نہیں۔ خدا جانے وہ کیسا نکلے کیسا نہ نکلے؟ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ناتجربہ کار ہے ÷ یہہ مرنے والے سے مرتے وقت بھی اگر مل لیتا تو کچھ سمجھایا جاتا ہے

بیا ور ید گر اینجا بود سخندانے ÷ غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد ÷

مگر ۱۹۲۸ء کے آنے سے پہلے ۱۹۲۷ء کی زبان بند ہو چکی تھی اور آنکھیں کھلی رہ گئیں گویا کسی کے انتظار میں ہوں لوگوں نے جو دیکھا ہے تھے بند کر دیں اور چہرہ شستہ پٹی باندھ دی (جسے ڈھاٹا کہتے ہیں) کہ قیامت منہہ نہ کھل سکے ÷

لیکن جسطرح دنیا میں کوئی حالت ایک سی نہیں رہ سکتی تمام یورپ میں سال کا آخر مہینا اور اس مہینہ میں اخیر ہفتہ بڑی خوشی کا زمانہ ہے کہ گو سب سے چھوٹا دن ہو تو ہوا کرے مگر مہینہ اخیر والے ہفتہ میں "بڑا دن" منایا جاتا ہے ÷ تمام دنیا سے صلح و محبت کا یہی دن ہے جس میں سارے رنج و غصے کے خیال مٹائے جاتے ہیں اور آئندہ اتفاق و آرام کی دعائیں دیجاتی ہیں ÷

(اس مضمون کے بعض خیال کا چربہ انگریزی سے لیا گیا ہے۔ فاضلِ Half Hours with the best authors نامی کتاب سے ÷

میں چاہتا ہوں کہ انگریزی لٹریچر کے اچھے اچھے نمونے اپنی زبان میں آجائیں ÷) صلائے عام۔

دور کے ڈھول سہانے

صلائے عام ماہ نومبر میں جناب خاں بہادر صاحب نے ایک روایت ایک معزز ذی ذی رتبہ رئیس دہلی کی سیر و سیاحت کی بیان فرمائی ہے۔ اُن ذی ذی مرتبت نے سیر ولایت کے متعلق جناب خاں بہادر صاحب کو ایک خط ولایت (غالباً انگلینڈ) سے بھیجا اُس میں جناب خاں بہادر صاحب زیر سرخی صلائے عام (صفحہ ۳) میں تحریر فرماتے ہیں کہ " دوسری بات جو انہیں وہاں پسند آئی یہ ہے کہ ولایت میں کسی کو کسی سے سروکار نہیں گویا بہشت ہے جہاں ع کسے را باکسے کارے نباشد۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ایک دوسرے کے جھگڑوں میں لگے رہتے ہیں بیٹھے بٹھائے فضول جھگڑے مول لینے کی عادت ہے" ہم اُن معزز با وقار سیاح کی اس پسند کو کمال افسوس اور استعجاب کے ساتھ ناپسند سمجھ کر یہ عرض کئے بغیر نہ ہوں گی گو اُن بزرگ کی آزردہ خاطری کا باعث ہوں کہ اگر وہ اہل اسلام میں ہیں تو انہوں نے کلام ربانی میں سورہ نسا پر غور نہیں فرمایا۔ میں اس کو شاعرانہ خیال سے تسلیم کرنے میں متامل نہیں کہ ع بہشت آنجاکہ آزارے نباشد لیکن مصرعہ ثانی بہت کچھ عام خیال میں رخنہ پردازی کرتا ہے کیونکہ الفاظ اس کے علاوہ آزار کے جو مصرعہ اولے میں واقع ہوا اور بہت سے ہر خرافات دنیا سے بے سروکاری پر اطلاق کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ یہہ مدعا شاعر کا ہرگز نہیں ہے اُس منشا محض بہشت کے اوصاف تک محدود ہے ورنہ دنیا تو معاملات اور سراسر معاملات سے بھری ہوئی ہے۔ کیا ولایت اس سے کبھی خالی ہو سکتی ہے۔ جہاں حضرت انسان موجود ہیں وہاں بالیقین ایک کا کام ایک سے چلتا ہے ۔

[illegible]

یہہ بحث بہت طول ہو جاوے گی لہذا میں ترک کرکے صرف اسی قدر معاملات کو پیش نظر رکھتی ہوں جن کا ذکر بلحاظ تعلقات ذکور و اناث ہو۔ دلنا رمیں بزبان خالق مطلق اور باحکام قطعی موجود ہے کیا یہ ممکن ہے کہ ولایت میں ایسے سابقے پیش نہ آتے ہوں۔ اخباری دنیا پر بس اگر ایک نظر ڈالی جاوے تو معلوم ہو جاوے گا کہ ہندوستان سے کہیں زیادہ معاملات ولایت میں ہر لحظہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور بغیر انسان کے اور کوئی اُن کا مرتکب نہیں ہوتا۔ خان بہادر صاحب میں تفصیل سے درگزر کرکے محض ایک معاملہ پر توجہ دلاتی ہوں کہ غضب خدا کا عورتیں مردوں سے ترک تعلقات کرتی جاتی ہیں اور اُن کے منہ چڑھتی ہیں معاذ اللہ کیا کلام قرآنی اس پر صاف نہیں ہے کہ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض۔ لئے مجھے اس موقع پر شان نزول درس کا سبب بھی بیان کر لینے دیجئے اور اس کو بجنسہٖ فارسی تفسیر حسینی سے نقل کرتی ہوں۔

"آوردہ اند کہ حبیبہ زوجہ سعد بن ربیع یا جمیلہ زوجہ ثابت بن قیس طریقہ نشوز پیش گرفتہ با شوہر بیراہی بسیار کردہ و شوہر از غایت اضطراب طپانچہ بروے زدہ پدر او شکایت پیش پدر خود برد و باتفاق پدر بملازمت حضرت پیغمبر رفتہ قصہ گذشتہ را بوقت عرض رسانید وآں حضرت بقصاص بر شوہر وے حکم فرمود۔ پدر و دختر متوجہ طلب قصاص شدہ روے بمسجد نہادند جبرئیل آیت آوردہ کہ الرجال قوامون علی النساء مرداں کارگزاراند تسلط یافتہ بر زناں و قائم باسور معیشت ایشاں۔ حضرت رسالت پناہ پدر و دختر را آواز داد گردید کار سے خواستیم و خدائے کار خواست والذی ارادہ اللہ خیرا مفہوم این آیت تفضیل مرداں است بزناں چہ مرداں ادب کنندہ و کارفرمایندہ زناں اند"۔۔ فقط

جناب خان بہادر صاحب جب ولایت میں کسے را باکسے کار سے نباشد کا مضمون ہوگا وہ تو ویرانہ ہوگی اور انسانوں کی بستی اُس میں نہ ہوگی۔

اب میں یہ فرض کرتی ہوں کہ اس ولایت کے بسنے والے کسی مذہب کے پابند نہیں

تو

تو کیا عجب (زن و مرد ناگزیر) کے قانون سے بھی باہر ہو سکتے ہیں۔

اگر وہاں کی عورتیں ایسی آزاد ہیں کہ مردوں کو طاق پر بٹھاتی ہیں اور نسل انسانی کے قائم رکھنے میں متنفر ہیں تو روئے زمین سے انسان ایک دن ناپید ہوں گے۔ لیکن قدرت کا ملہ سے تو کبھی یہ امید ہو ہی نہیں سکتی کہ مستورات کا غلبہ اس حد تک پہونچ سکے اور زیادہ جی کر کیا کریں گی اور کب تک وہ مردوں سے متنفر رہیں گی آخر کار ان مردوں ہی سے سابقہ ہوگا۔ اُن کے مٹانے سے تو قدرت اپنی عادت میں خلل پیدا نہیں کر سکتی۔ خالق مطلق نے انسان کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔

میں خود عورت ہوں مگر امر حق کے کہنے میں مجھے ہرگز دریغ نہیں کہ عورتیں بالعموم ناقص العقل ہوتی ہیں اور ان کے خیال اکثر خام ہی ہوتے ہیں۔ تعلیم کے پا جانے سے خاصیت بشری ہرگز جدا نہیں ہو سکتی۔ میری آزاد قلم کو ناظرین براہ کرم معاف بخشیں گے فقط

(راقم نواب عثمانی بیگم ۔ اعزاز منزل ۔ آگرہ)

تندرستی ہزار نعمت ہے

یہ مثل زبان زد عام ہے کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے" پھر بھی تندرستی کی قدر ہرگز نہیں کی جاتی جس کو دیکھو وہ تندرستی کے مٹانے کی فکر کا مبتلا رہتا ہے۔ ہر چند کہ آفریدگار نے ایک ایسا وقت معین کر دیا ہے کہ تندرست رہتے ہوئے بھی دنیا سے نا دار ہو جاتے ہیں پس اس وقت تندرستی ہی جواب دیتی ہے اور کوئی نعمت کام نہیں آتی تندرستی کے رفع ہوتے ہی ہزاروں نعمتیں بھی رفع ہو جاتی ہیں۔ لیکن تندرستی تو ایک عمر اور ایک

حد معینہ کے واسطے ہے یعنی جب تک انسان زندہ رہے اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ تندرستی بھی قائم رہے ورنہ باوجود زندگی کے اگر تندرستی میں کچھ بھی فرق آ جاتا ہے تو زندگانی تلخ ہو جاتی ہے اور اکثر یہ دیکھنے میں آیا کہ اس نعمت عظمیٰ کو جو پروردگار ہم کو پیدائش کے ساتھ ساتھ بخشتا ہے ہم خود کھو بیٹھا کرتے ہیں۔ ہر چند کہ مذہبی عقائد زندگی کی ایسی حد معین کرتے ہیں جن کو انسان بالیقین جانتا ہے کہ ایک دن اس حد کو چھوڑنا پڑیگا مگر یہ ہرگز نہیں جانتا کہ وہ دن کونسا ہے جس کی آمد کا ہر دل میں یقین پیدا ہے۔

جو انسان اپنی تندرستی کو ہاتھ سے نہیں کھوتے اُن کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ طبیب و ڈاکٹر کہاں رہا کرتے ہیں۔ ان کو کبھی دوا کی کبھی حاجت نہیں ہوتی۔ جہاں جہاں انسان آباد ہیں وہیں کی سرزمین کا پیدا اور ان کی غذا عمدہ تر ہے۔ اور وہ غذا جو بقدر پرورش جسم کھائی جاوے بہترین تدبیر تندرستی قائم رکھنے کی ہے۔ معدہ اور انبوب جو معدہ کے ساتھ وابستہ ہیں اس قسم کی بہ قدرت سے بنے ہیں کہ نہایت ملایم۔ نہایت لزج اور نہایت مضبوط ہیں اگر ان کو بالقصد نہ بگاڑو تو بگڑنا نہیں جانتے اور بگڑ جانے پر پھر اصلی حالت پر آ جانا اگرچہ محال نہیں ہے لیکن عنقریب ناممکن ہے اور ہزارہا مثالیں اُن کے بگڑ جانے کی ہر جگہ موجود ہیں۔ گر اصلی حالت پر بعد بگڑ جانے کے آ جانا شاذ و نادر ہے پس اس کا تحفظ ہر انسان کا بلحاظ زندگی فرض عین ہے اور وہ عمل جس سے یہ اپنی حالت پر برقرار رہیں خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔

یہ امر لحاظ کرنے کے لائق ہے کہ جہاں معدہ اور آنتوں میں بے حد مضبوطی اور لچر لچر ہونے کی قابلیت موجود ہے وہاں ان میں کسی سخت چیز کو جگہ دینے کی بھی قابلیت ہے علاوہ اس کے ڈھیلا پڑ جانا اور اپنے حوصلہ کو بڑھاتے رہنے کی بھی ان میں قدرتی خاصیت ہے اور یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان اس ضرورت سے بھی زیادہ کھا لیتا ہے جو جسم کی پرورش کو درکار ہے مثلاً اگر ایک معدہ میں صرف دو چھٹانک

غذا کی

غذا کی گنجائش ہے تو ایک حریص انسان کا وہی معدہ سولہ چھٹانک بھی رفتہ رفتہ بھر لیگا۔ اس قسم سے معدہ کو بھر لینے سے پیٹ تو بڑھتا چلا جاتا ہے اور گنجائش اس میں ہوتی چلی جاتی ہے مگر وہ بقول بعض ظرفوں کے محض ذائقہ کا کام دیتا ہے نہ کہ جسمی پرورش بلکہ جسمی پرورش کے واسطے تو وہ موجب خرابی ہوجاتا ہے۔ جسمی پرورش کے واسطے منجملہ سولہ چھٹانک کے وہی دو چھٹانک غذا اچھا کام دیتی ہے اور جو زیادہ غذا بھری رہتی ہے وہ پیٹ سے فضلہ بنکر خارج ہو جاتی ہے اور اس کا داخلی رنج طرح طرح کی بیماریاں بوجہہ غیر ضروری ہونے غذا کے پیدا کرتا ہے اور اسی وجہہ سے ایک انسان اپنی تندرستی کو اپنے ہاتھوں خراب کر بیٹھتا ہے۔ اور ہر قسم کی بیماری خواہ وہ تھوڑی ہو یا بہت انسان کے واسطے مصیبت ہوجاتی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے حتیٰ کہ ایک انسان دائم المریض ہوجاتا ہے اور نہ تندرستی قائم رہتی ہے نہ لطف زندگی حاصل ہوتا ہے اور اس وقت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "قدر نعمت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔" فقط

مرزا عرفان علی بیگ ای۔ ایس۔ او۔ ذاکرہ

ہماری زبان میں نثر کی زیادہ ضرورت ہے

گو رات کو آپ کافوری شمعیں جلائیں۔ اپنی وضع کی صحبت میں یاروں کے ساتھ بزم نائے ونوش گرم رہے۔ آوازِ طبل وغنا سے کان پڑی بات نہ سنائی دے۔ سارا مکان خوشبو سے مہک رہا ہو۔ افراطِ سرور میں دماغ فانوسِ خیال بن جائے۔ لیکن جب صبح کو نشۂ خمار اُترے اور آپ باہر میدان میں نکل جائیں تو صبح کی ٹھنڈی ہوا سے دل ودماغ کو ضرور لُطف حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح گو نظم سے انسان کا جی تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو جاتا ہے کہ حُسن وعشق کے ولولے اور وصل وہجر کے قصّے جوانی میں اچھے معلوم ہوتے ہوں پھر بھی روزمرہ کے کھانے پینے کی ضرورتیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ بنارس کی تنگ وتاریک گلیوں کی شہرت سہی جہاں دن کو آفتاب نظر نہیں آتا پھر بھی باہر نکل کر دریا کے کنارے وہاں کے گھاٹ دیکھنے کے لائق ہیں۔ قطب مینار کی بلندی سے جو پہلے پہل تمام سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہونچتے تو بہت دور تک نظر جاتی ہے مگر بار بار چڑھنا اُترنا نہ صرف بے کاری کا مشغلہ ہے بلکہ سانس پھول جاتا ہے اور نیچے اگر آپ دن میں سو بار پھرتے رہیں تو تکان کا نام نہیں۔ بلندی ہے زمین پر قدم رکھنا ایک نعمت معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ریل کی تیزیٔ رفتار سے جی تو خوش

ہوتا ہے مگر ڈرائیور اور گارڈ جو رات دن ریل پر چڑھے رہتے ہیں ذرا گاڑی ٹھمی تو پلیٹ فارم پر پاؤں رکھ لینا غنیمت سمجھتے ہیں +

اس تمثیل سے میری غرض یہہ ہے کہ شعر و شاعری کتنی ہی خوش کُن ہو مگر نثر زیادہ بکار آمد ہے۔ اول تو نظم میں ردیف و قافیہ کی پابندی سے قوت بیانیہ کی وسعت میں خلل پڑ جاتا ہے۔ عروض و قافیہ سے ایک ہی طرز کے مضمون ادا کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے؛ نئی بات پُرانی وضع پر بیان کرنی پڑتی ہے۔ ردیف و قافیہ کی دُھن میں کوئی بات تازہ بہت کم سوجھتی ہے۔ خیال و بیان اُسی ایک پگ ڈنڈی کی دُھن میں اس طرح مصروف ہوتا ہے کہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا + آئینہ کا خیال ہوگا تو "حیران" کے سوا اور لفظ ذہن میں نہیں آتا۔ آسمان ظلم و جور کے سوا کسی کام کا نہیں نہ زمانہ سے غرض نہ سال ہے نہ ماہ۔ نہ سنہ ہجری ہے نہ عیسوی مگر کسی کے موافق نہیں دیکھا۔ یار ہمیشہ اقرار کا جھوٹا اور رقیب رُوسیہ رہا +

ہماری زبان کی لٹریچر شروع سے نظم کی اس قدر گرویدہ رہی کہ نثر کو بھی نظم ہی سے ملانے کی کوشش ہوتی رہی۔ یعنی جہاں تک ہو سکا مُقفّٰی عبارت کی پابندی لازمی سمجھی گئی + نثر کو نظم سے ملایا۔ یہہ نہ ہوا کہ نظم اس قدر سلیس کرتے کہ نثر معلوم ہوتی: میرے عقیدہ میں نظم کی بڑی خوبی یہہ ہے کہ اگر ردیف قافیہ سے علیحدہ کی جائے تو نثر معلوم ہو + برخلاف اس کے فسانہ عجائب میں جو

نثر کی مستند تصنیف ہے قافیہ کے جھگڑے میں نثر کو بھی نظم کا لباس پہنا دیا ہے
ہماری زبان میں نظم کی پابندی اور نظم کو ترجیح دینے سے یہہ بڑا نقصان ہوا کہ ہر طرح کی تحقیق و معلومات کی ترقی رک گئی + یہی حال فارسی لٹریچر کا ہوا کہ آغاز سے نظم کیطرف توجہ زیادہ رہی۔ نثر کا خیال بہت کم ہوا: یہاں تک کہ سنہ ۱۲۰۰ء تک ایران میں نثر فارسی کا کوئی جیّد لکھنے والا پیدا نہ ہوا۔ آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے نثر کیطرف توجہ کی۔ اس شخص نے تحقیق علوم وفنون میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ محقق طوسیؒ کے لقب سے مشہور ہے + علم ہیئت و نجوم میں اس شخص کا بڑا مرتبہ ہے کہ ہلاکو خاں نے سلطانی رصد کی تعمیر اور رصد کا انتظام نصیر الدین کے سپرد کر دیا + نصیر الدین کو یونانی زبان و علوم وفنون میں بہت دخل تھا۔ اقلیدس کا ترجمہ عربی میں مجسطی کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ ان کی تصانیف میں اخلاق ناصری لاجواب ہے + نجوم و ہیئت و ریاضی میں آپ کی کتابیں بڑے مرتبہ کی ہیں +

نثر میں رشید الدین کی کتابیں بھی بہت مشہور رہیں۔ جامع التواریخ۔ کتاب التوضیحات۔ مفتاح التفاسیر۔ رسالت السلطانیہ وغیرہ کی قدر اہل علم سے پوچھئے +

فارسی میں ذی کمال نثر لکھنے والوں کی فہرست اور ان کی تصانیف کی تفصیل اس مضمون میں آنی مشکل ہے۔ جلدی میں بعض کے نام اور تصانیف سن لیجئے +

محمدالله

حمد اللہ مستوفی کی تاریخ جس میں ایران کی چار پشتوں کے بادشاہوں کا حال ہے یعنی کیانی۔ ساسانی پیشدادونیانی۔ اسکا نیانی قدیم سلطنتوں کی تاریخ۔ یہہ گویا نثر میں شاہ نامہ ہے + اہل تحقیق میں ان کی نزہت القلوب کی بہت تعریف ہے +

یحییٰ بن احمد کی جامع الشرائع۔ اصول فقہ۔ بڑے مرتبہ کی تصنیف ہیں + استقا اور مصابیح الانوار۔ مرجان تلخیص المرام۔ غایت الاحکام۔ اور ارشاد۔ از تصانیف شیخ علامہ۔ قابل قدر کتابیں ہیں + عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی نے تاریخ جہان کُشا کے سلسلہ میں تاریخ وصاف لکھی + عربی کی کنز الدقایق کا ترجمہ۔ نصیرالدین کرمانی نے فارسی میں کیا + ظہیرالدین نے عوارف المعارف مُصنفہ سہروردی کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا + محمد بن علی کی مجمع الانساب میں گویا تاریخ عالم قدیم سے چودھویں صدی عیسوی تک کا حال فارسی میں ہے +

یہاں میں طب کے مُصنفوں کا ذکر عمداً چھوڑتا ہوں کہ بہت طویل ہے۔ ان میں علی ابن حسین انصاری کی اختیارات بدیعی فی الطبابت جو چودھویں صدی کے اخیر میں لکھی گئی معتبر کتاب ہے +

یہہ مختصر ذکر فارسی نثر کا زیادہ تر فارسی زبان کی تاریخ سے لیا گیا جو پروفیسر براؤن صاحب انجہانی لکھی اور پادری واعظ لال صاحب نے اپنی تصنیف دیباچہ تاریخ فارسی لٹریچر میں لکھا[۵۱]

[۵۱] *An Introductory History of Persian Literature.*

بمندوالسلام

ہندوستان کی نثر فارسی میں بڑا زور محض انشا پر دیا گیا۔ کہ بڑے چھوٹے برابر والوں کو خط کس طرح لکھا جائے۔ اور بادشاہوں کی طرف سے جو خط کتابت ہوئی وہ جمع کی گئی۔ کچھ افسانہ بھی لکھے گئے: مثلاً بہار دانش۔ انوار سہیلی۔ وغیرہ + ہمارے ہاں کی نثر زیادہ تر تحقیق علوم و فنون و معلومات سے خالی رہ گئی: اور اردو میں تو اس کا پتہ ہی نہیں + جب تک نثر کو ترقی نہ ہو ہماری زبان کی قدر مشکل ہے +

نظم کے دلکش ہونے میں شک نہیں مگر نظم کا طرز محدود ہے اس میں وسعت خیال کی بہت گنجائش نہیں + اس سے میری یہ غرض نہیں کہ میں شعر و سخن کا معتقد نہیں۔ میری غرض یہ ہے کہ جب تک نثر کی ترقی نہ ہو ہماری زبان کی لٹریچر اور زبانوں سے برابری نہیں کر سکتی + میں چاہتا ہوں کہ جس قدر نظم کی طرف توجہ ہوئی اب نثر کی طرف متوجہ ہونا مناسب ہے +

مجھے یہاں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ نظم کا سکہ اس قدر دلوں پر بیٹھا ہوا ہے کہ کم و بیش نثر اردو کے اچھے لکھنے والے بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب نے اچھی نثر لکھنے میں بہت شہرت حاصل کی اور واقعی نثر خوب لکھی مگر نظم میں شعر گوئی کی طرف بھی متوجہ ہو گئے۔ اُن کے صاحبزادے بھی نثر اچھی لکھتے تھے جن کے مضامین صلائے عام میں اکثر شائع ہوتے رہے پھر شعر کہنے لگے اور صاحب دیوان ہو گئے + اس ذکر سے میری غرض یہ ہے کہ ہر شخص کے لئے نظم و نثر دونوں میں کمال پیدا کرنا مشکل ہے۔ جن کو نثر میں کمال ہو جائے نظم کی ضرورت نہیں +

جذب منظر

جناب منظر لکھنوی

(از جناب عشرت لکھنوی)

سید جعفر حسین صاحب تخلص منظر عمر تخمیناً ۲۵ سال خلف سید مرتضیٰ حسین مرحوم ساکن محلہ نواز گنج لکھنؤ۔ شاگرد رشید جناب حکیم سید مہدی حسن صاحب احسن ڈراماٹسٹ مصنف واقعات انیس + آپ کی طبیعت میں شوخی اور جدت ہے: لکھنؤ میں ایک زمانہ ہوا کہ شعرا نے اپنی ایک انجمن قائم کی تھی اور اس کا نام انجمن معیار رکھا۔ اسی نام سے ایک رسالہ معیار نکالا تھا + اس میں اکثر شعرا شریک ہوئے اور غیروں کے کلام کے طرز کو ناپسند کیا۔ شہر کے دوسرے شعرا نے اس کے مشاعروں میں جانا ترک دیا +

کچھ زمانہ کے بعد شعر و شاعری کو وسعت دینے کی غرض سے انجمن معین الادب قائم کی۔ انجمن معیار کے پرانے شرکا اس میں شریک ہوے اور لکھنؤ کے نومشق شعرا کو اپنا شریک کیا: کئی برس تک انجمن کا ماہوار مشاعرہ نہایت اہتمام سے ہوتا رہا۔

اس کے بعد نومشق شعرا اور کہنہ مشق شعرا میں مخالفت پیدا ہوئی نومشق شعرا نے اپنی ایک جدید انجمن موسوم انجمن معراج الادب قائم کی اس میں تمام نومشق خوش گو جو کبھی انجمن معین الادب کی زینت کا باعث تھے شریک ہوئے۔ اس جماعت کا نام ینگ پارٹی رکھا گیا + ینگ پارٹی کے ممتاز شعرا میں جناب منظر شمار کئے جاتے ہیں آپکا کلام اچھا ہوتا ہی صرف چند مطالع انتخاب کر کے بھیجے جاتے ہیں +

(خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی)

انتخاب:

انتخاب از کلام جناب منظر لکھنوی

م جہاں میں ابھی گذر ہوئی ہے تبھی خوشی سے بسر ہوئی ہے ⁂ تمہاری جس پر نظر ہوئی ہے اُسی کی شام و سحر ہوئی ہے
م حیات کو مختصر ہوئی ہے مگر بدقت بسر ہوئی ہے ⁂ کہ رات زنداں میں گر ہوئی ہے تو جنگلوں میں سحر ہوئی ہے

اسیر ناتواں ہیں ضبطِ غم سے کام لیتے ہیں ⁂ بہارِ لالہ و گُل دیکھ کر دل تھام لیتے ہیں
نزع کا حالِ دگرگوں چارہ گر دیکھا کئے ⁂ اور ہم حسرت سے ایک ایک کی نظر دیکھا کئے
م رخصتِ جاناں قیامت تھی مگر دیکھا کئے ⁂ اپنی آنکھوں سے اُجڑتے اپنا گھر دیکھا کئے *
م یوں نہیں دے دیا اُن کو دلِ بسمل میں نے ⁂ کہہ لیا خوب ہی جی کھول کے قاتل میں نے
اتنی کمالِ عشق میں تاثیر ہوگئی ⁂ جس شے پہ کی نظر تری تصویر ہوگئی
اعجاز اُن کی شوخیٔ تقریر ہوگئی ⁂ جو بات کی ملا کے نظر تیر ہوگئی
م کیا کہوں کیا ہوا غربت میں قضا آنے سے ⁂ بے خبر رہ گئی دُنیا مرے افسانے سے
م مدت کے بعد ایسی سنائی خبر مجھے ⁂ میں نامہ بر کو دیکھتا ہوں نامہ بر مجھے
م قبرِ عاشق سنائی جاتی ہے ⁂ نوجوانی دکھائی جاتی ہے [1]
یہہ کیوں کہو دوائے دردِ جگر نہیں ہے ⁂ کہدو کہ چارہ سازی مدِ نظر نہیں ہے
رفتہ رفتہ قیدیں یہہ ناتوانی ہوگئی ⁂ خود حوالے میرے میری پاسبانی ہوگئی [2]

* یہہ سین قیامت کا ہے۔ اس مصیبت سے بہت ملتا ہے جب کہ مسلمان تین سو برس رہ کر اسپین سے نکلے: اسپین چھوڑ کر نکلتے وقت خلافتِ قرطبہ کے والی کے آنسو نکل آئے۔ اُس پر اس کی ماں نے طعنہ دیا کہ کمبخت جس چیز کو تو مردوں کی طرح (مردانہ وار) نہ رکھ سکا اب عورتوں کی طرح روتا ہے! اپنا گھر اپنی آنکھوں کے آگے اُجڑنا قیامت کا سامنا ہے ⁂ [1] کسی کو مٹانا طاقت میں داخل ہے۔ اور طاقت نوجوانی کا نتیجہ ہے: بُرائی بھلائی پیدا کرنا اسی کو کہتے ہیں ⁂ [2] یہ مضمون غالب (مرزا نوشہ) نے بھی باندھا ہے ع
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے ⁂

بس نگاہ

بس نگاہِ ناز تیری مہربانی ہو گئی ؛ دل جگر دونوں میں اب ایک اِک نشانی ہو گئی

گرمیِ عالم ۔ ہائے پھر بیٹے دل دار کا ؛ اب نہیں تو کل نکل جائے گا دم بیمار کا

م اُن سے جب پوچھا گیا بسمل تمہارے کیا کریں ؛ ہنس کے بولے زخمِ دل دیکھا کریں رویا کریں ٭

کب کوئی پرساں کسی کا حشر کا ہنگام ہے ؛ اپنی اپنی فکر سب کو اپنا اپنا کام ہے

شبِ غم میں جب نہ پایا کوئی غمگسار اپنا ؛ ہمیں ہو گیا غنیمت دلِ بے قرار اپنا

وفا دارانِ اُلفت شکوۂ بیداد کیا کرتے ؛ دعا کرتے کو یا ہی تھی زباں فریاد کیا کرتے

دل گنوا کر کہہ رہا ہوں کوچۂ قاتل کے پاس ؛ لٹ گیا سرمایۂ تاب و تواں منزل کے پاس

کوئی خوشبو کو ترسا کوئی یوں نکلا گلستاں سے ؛ بھرے تھے پھول اتنے جو گرے پڑتے تھے داماں سے

اجل کے ساز و ساماں کر کے اُس محفل میں جاتے ہیں ؛ اُٹھانے والے دیکھیں اب ہمیں کیونکر اُٹھاتے ہیں

نہ اُٹھا ہوں زندگی میں نہ اُٹھوں گا آستاں سے ؛ وہ ہے دم کے ساتھ منظر جو نکل گیا زباں سے

ص میں یہ کہہ رہا ہوں رو کر کسی در کے پاسباں سے ؛ کہیں قبر کھود لی ہے جو اُٹھا تا ہے یہاں سے م

م بپا ہو حشر قیامت کرے دعا میری ؛ یہ مصلحت ہے کہ سنتا نہیں خدا میری صم

وہ کہانی سن کے کہتے ہیں دلِ ناشاد کی ؛ آج میری نیند اس کمبخت نے برباد کی

وہ ہوئے محجوب لذت مٹ گئی بیداد کی ؛ ہائے میں نے کیوں کلیجہ تھام کے فریاد کی

بتوں کے سامنے اظہارِ مدعا نہ کرے ؛ خدا سے مانگ لے موت ان سے التجا نہ کرے

م بے خود ایسا کیا خوفِ شبِ تنہائی نے ؛ صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے ٭

دلِ صبر آزما پلٹے گی قسمت جب کبھی میری ؛ اثر فریاد کا پیدا کرے گی خامشی میری

دل دیا کیوں وفا شعاری کی ؛ ہاں ہمیں نے گناہ گاری کی

حق یہ ناصح ہے کہ دل مدت سے ہے اُلجھن مجھے ؛ دیکھئے کب ہو تمیزِ دوست اور دشمن مجھے

پیدا جو ہوا خوفِ رسوائیِ جانانہ ؛ دُنیا کے دکھانے کو میں بن گیا دیوانہ

دو لفظوں میں ہمارے الفت کا ہے افسانہ ؛ آباد ہوئی تربت گھر ہو گیا ویرانہ

+ کس زباں سے شکوۂ جورِ ستم آرا کریں ٭ جس کو اچھا کہہ چکے اُس کی برائی کیا کریں ؛

٭ (بالکل سچا مضمون ہے)

٭ (اچھا مضمون ہے) ص (بہتر مضمون ہے) م (بالکل نیا مضمون ہے)

بزم الفت

بزمِ اُلفت میں قدم رکھکے یہ حیراں ہوں میں ؛ میزباں ہوں نہیں معلوم کہ مہماں ہوں میں

م بے مایہ ہوکے پہنچا قاتل کی سرزمیں پر ؛ طاقت جھٹی کہیں پر دل چھٹ گیا کہیں پر

چمکے گا نور بن کر منظر تری جبیں پر ؛ اک داغِ نشانِ سجدہ کام آئے گا کہیں پر

م واکشودِ باب جام سے لب سے جدائی ہو چکی ؛ میکدہ میں رو کے مجھسے پارسائی ہو چکی

ہوں اک تودۂ عصیاں پڑا رہنے دو تربت میں ؛ فرشتو کونسا منہہ لے کے میں جاؤں قیامت میں

بڑھا لیتا کفن کا بار بھی سامانِ راحت میں ؛ اگر میں جانتا مرنا پڑے گا راہِ اُلفت میں ؎۱

ناوک جو مرے دل پہ لگائے ہیں ادا کے ؛ یوں شاد ہیں جیسے کوئی مُردے جلا کے

دوست دشمن کوئی سُنتا نہیں افسانے کو ؛ اک یہی بات ہے کیا کم مرے مرجانے کو

اخفائے رازِ عشق کی اب انتہا نہیں ؛ ہے دل میں درد اور جگر آشنا نہیں

م مرنے پہ بھی کام آئی شمعِ شبِ تنہائی ؛ اُٹھکر مری بالیں سے تربت پہ چلی آئی

بہلاتا ہے زنداں میں یوں دل ترا سودائی ؛ دیوار و در پہ لکھتا ہے افسانہ تنہائی ؎۲

چھٹنا تھا نہ زنداں سے چھوٹا ترا سودائی ؛ سو بار خزاں آئی سو بار بہار آئی

کسی کے واسطے پھول آئے اور ہار آئے ؛ اسیرِ اُمید ہی میں رہ گئے بہار آئے

کیا کہوں ربطِ محبت کا اثر اک راز ہے ؛ حُسن میں شہرت کسی کی اور مجھکو ناز ہے

شہیدِ ناز نے شکوے کئے نہ قاتل کے ؛ خدا پہ چھوڑ دئے سب معاملے دل کے

ادا و ناز کے جور و جفائے قاتل کے ؛ بڑے بڑوں سے ہوئے ہیں مقابلے دل کے

رہے تو کس طرح قابو رہے کسی دل پر ؛ شباب ہے کہ پھٹا پڑ رہا ہے قاتل پر

م نزع تک کوئی نہ سمجھا کہ ستم ہوتا ہے ؛ اب زمانے کو مری موت کا غم ہوتا ہے

غصہ قاتل کا نہ بڑھتا ہے نہ کم ہوتا ہے ؛ ایک سر ہے کہ وہ ہر روز قلم ہوتا ہے

؎۱ یہہ مضمون میر تقی نے اپنی لڑکی کے نوحہ میں خوب باندھا ہے ع کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسبابِ شادی میں ؛

؎۲ انگریزی میں تنہائی نامی Pilgrim's Progress دیوار زنداں پہ لکھی گئی تھی ؛

خون ناحق

خونِ ناحق سے مکرنے کا کہاں ہنگام تھا ÷ تیر جتنے دل سے نکلے سب پر اُنکا نام تھا

ع مرگِ عاشق پر نہ شرمندہ تھا موت کا بدنام تھا ÷ وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جسکا کام تھا

کیا ہے ضعف نے عاجز جنونِ فتنہ ساماں کو ÷ میں اب روتا ہوں رکھ کر سامنے اپنے گریباں کو

مبارک ہو یہ دن یارب جنونِ فتنہ ساماں کو ÷ کہ بسم اللہ کہہ کر چاک کرتا ہوں گریباں کو

ع کیا کہیں کس طرح اُس شوخ کی صورت دیکھی ÷ ہمنے تو لے کے حساب آج قیامت دیکھی

ع ایسا نہو کہ کل سے تقاضا ہوا کرے ÷ ناوک لگا کے بھول گئے ہوں خدا کرے

کوئے جاناں میں قضا آنے سے آرام آگیا ÷ دل جہاں کام آیا تھا میں بھی وہیں کام آگیا

ع گر جذبۂ وحشت کا ایدل یہی عنوان ہے ÷ دو روز کا دامن ہے دو دن کا گریبان ہے

ع جس دن سے بہار آئی روز اک نیا ساماں ہے ÷ کل مشق میں دامن تھا اور آج گریباں ہے

شوق میں دردِ دل سنانے کے ÷ قصے دُہرا گیا زمانے کے
فائدہ طول سے فسانے کے ÷ فقرے دو ہوں مگر ٹھکانے کے

(یہ دونوں شعر طوالت و اختصار کے سونے ہیں)

تعجب اب تو مری موت کا نہ آنا تھا ÷ تمہاری رائے بھی اور متفق زمانا تھا

ع مٹانے والے ہمارا ہی گھر مٹانا تھا ÷ چمن میں ایک سے ایک اچھا آشیانا تھا

ہوئی دیوان گی اسدرجہ مشہور جہاں میری ÷ جہاں دو آدمی بھی ہیں چھڑی ہے داستاں میری

مل گئی جب حشر میں دادِ جبیں سائی مجھے ÷ جس قدر رویا تھا اُتنی ہی ہنسی آئی مجھے

ع او ناصحِ عشق میں کیا خوفِ رسوائی مجھے ÷ بس زیادہ سے زیادہ کہہ لے سودائی مجھے

دُنیا کی کسی بات پہ مقدور نہیں ہے ÷ زندوں میں شمار دلِ رنجور نہیں ہے

جز عمل منظور نہیں شاہ و گدا میں امتیاز ÷ محفلوں میں محفلِ محشر پسند آئی مجھے

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

صلائے عام - یہہ مضمون جناب عشرت لکھنوی کا ہے اور شعر بھی

آپ ہی

آپ ہی کے انتخاب کئے ہوئے ہیں: جناب عشرت کو تذکرہ نویسی میں ید طولے ہے اور انتخاب اشعار میں بڑا ملکہ ہے ؛ میں نے بھی فٹ نوٹ کے طور پر دو چار جگہ مختصر ریمارک لکھ دئے اور جو شعر دل میں چبھے اُن پر صاد لگا دیا ؎

چنے اپنے آشیاں کے واسطے ؛ جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

خواجہ صاحب نے جو مضمون میں ینگ پارٹی کا ذکر کیا یعنی "نومشق شعرا" اس کی نسبت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری میں کمال خداداد بات ہے۔ چھوٹے بڑے نئے پُرانے کا جھگڑا نہیں۔ خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آجائے ؎

کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہو نہ تو فرہاد ؛ لیلیٰ ہی نہ چھوٹی ہے نہ شیریں ہی بڑی ہو

ابتدا میں گو اُردو کی بنیاد دِلّی میں پڑی۔ شاعری اور اچھی شاعری کا آغاز ولّی سے ہے: مگر اب بمصداق اس کے کہ ع آدمی را بچشم حال نگر۔ شعر و شاعری میں لکھنؤ کے سر سہرا دکھائی دیتا ہے ؛ آپ اسے لکھنؤ کی طرفداری میں نہ سمجھیں ✦

دوایک تحقیق

دو ایک تحقیق طلب باتیں

اس پیشانی کے نیچے میں دو ایک تحقیق طلب باتوں کا ذکر کیا چاہتا ہوں جن کا حال صلائے عام کے پچھلے پرچوں میں باقی رہ گیا تھا +

اُن باتوں میں ایک امر تحقیق طلب یہہ تھا کہ ملک عرب اور اہل عرب ہمیشہ از روے تہذیب و تعلیم جاہل و وحشی سمجھے جاتے رہے۔ بلکہ اسلام سے پہلے کا زمانہ "ایام جہالت" کے نام سے مشہور ہے: پھر جو اسلام کے بعد اک بارگی ان کے کمالات علمی اور تہذیب و تعلیم کی شہرت ہوئی تو اس کے اسباب کیا تھے؟

اس کا جواب بڑا دفتر چاہتا ہے۔ اور جواب میں شرط ہے کہ عقاید والہام وحی سے تعلق نہ رکھا جائے: مؤرخانہ و محققانہ جواب ہو۔ صرف یہہ نہ کہہ دیا جائے کہ فضل الٰہی شامل حال ہو گیا +

اس کی تحقیق کے لئے قدیم تاریخ میں بہت دُور جانا ضرور ہے۔ اوّل تو جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر طور سینا کے پہاڑوں اور وادیوں میں آوارہ و سرگرداں پھرا کئے تو ظاہر ہے کہ مصر کی تہذیب کا ساتھ لائے تھے اور قدیم مصر کی تہذیب قدیم زمانہ میں تمام دُنیا کے رشک کا باعث تھی: پھر جب بیت المقدس کی بربادی کے بعد بنی اسرائیل اپنے ملک سے برباد اور آوارہ ہو کر نکلے تو عرب کا ملک پاس تھا

بلکہ از روئے

بلکہ از روے قومیت بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل برابر کے بھائی تھے: دونوں کی زبان یعنی عبری و عربی ملتی جلتی ہے۔ تمام بنی اسرائیل ملکِ عرب میں آ بسے ٭ بنی اسرائیل کی اُس زمانہ کے علوم و فنون میں بہت شُہرت تھی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پس ماندگانِ اقوامِ برباد شدہ اپنے ملک سے نکل کر بہت ذہین و شائستہ نکلے۔ بنی اسرائیل پر کیا مدار ہے؛ پارسیوں کو دیکھئے کہ ایران سے نکل کر گجرات و ہندوستان میں کیسے اولوالعزم مُہذّب و شائستہ نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے پنڈت کشمیر سے نکل کر ہندوستان میں سلاطینِ مُغلیہ کے زمانہ میں اور اب تک کیسے کیسے مرتبہ کو پہونچے: اور بنی اسرائیل تو جس ملک میں پہونچے وہاں کی تہذیب و ترقّی کا خاص باعث ہوئے ٭ جس گھر میں آگ لگ جائے گو سارا اسباب جل کر خاک ہو جائے سونا چاندی کا زیور گل کر راکھ میں دب جاتا ہے نیاریئے راکھ سے نکال کر پھر کام میں لے آتے ہیں: یہودی جہاں پہونچے اُس ملک میں پہونچ کر وہاں کے کارکن۔ محاسب اور اکثر اہل کار ہوئے۔ بچّوں کی تعلیم انہیں کے سپرد ہوتی تھی۔ تجارت اور لین دین اُن کے ہاتھ میں تھا۔ لکھنے پڑھنے کا مدار انہیں پر تھا۔ گھروں میں علاج معالجہ یہی کرتے تھے کیونکہ مصیبت میں پڑ کر انسان کو ہر طرح کا تجربہ ہو جاتا ہے ان میں اکثر اچھے طبیب و حکیم ہوئے ٭ عرب کو بنی اسرائیل کی صحبت سے جنہیں عوام میں یہودی کہتے ہیں قدیم زمانہ کی تہذیب تعلیم کا چسکا پڑ گیا ٭ اس کے بعد قدیم کلیساؤں کے قدیم عیسائی جو یہودیوں کے ستائے

ہوئے تھے عرب میں پہونچے۔ پہلے مصریوں سے پھر ان دو قوموں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی صحبت کے اثر سے عرب کے لوگوں میں تہذیب و تعلیم کا چرچا خاصہ ہوگیا۔ اور آخر میں خود عرب نے باہر نکل کر ہر طرح کی تہذیب و تربیت کی تحصیل میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ۔

مجھے تعجب ہے کہ عیسائی مذہب نے اکثر ملکوں میں بہت زور پکڑا لیکن ایران اب تک عیسائیت کی طرف بہت متوجہ نہیں ہوا۔ حالاں کہ اسلام نے وہاں تھوڑے ہی دنوں میں ایسی جڑ پکڑ لی کہ پھر کوئی ہلا نہ سکا ۔ یہہ خیال محض سرسری ہیں جو تاریخ و تحقیق سے معلوم ہوسکتے ہیں ۔

یہہ بات بھی تعجب کی ہے کہ تاتار کے قدیم بادشاہ جو ظالم و سفاک مشہور تھے لٹریچر کی ترقی میں دریغ نہیں کرتے تھے ۔ مثلاً ہلاکو۔ چنگیز خاں۔ التقا خاں وغیرہ یہہ اہل علم کے بڑے قدردان تھے: اپنے دربار میں عُلما و فضلا اور اکثر شعرا کا مجمع رکھتے تھے ۔ سلاطین غزنوی ۔ سلجوقی ۔ قدیم مغل سلاطین ۔ تیموریہ خاندان تک سب کے سب علم و فضل کے بڑے قدردان گزرے ۔ جب بادشاہوں کا یہہ حال ہو تو اُن کے اُمرا و روسا ، اور اصحاب دولت و جاہ علم و فضل کی قدردانی میں دریغ نہیں کرتے تھے ۔ اُس وقت کے سلاطین چاہے کتنے ہی ظالم و جابر ہوں مگر علوم و فنون کی قدردانی میں کسر نہیں کرتے تھے ۔ ہندوستان کے اُمرا اور روسا کے درباروں میں (چند رئیسوں کو چھوڑ کر) بہت کم اہلِ علم اور اہلِ کمال کی قدر دیکھنے میں آئی ۔ یہاں کے خداوندانِ دولت

جاہ کا مقابلہ یورپ کے خاصکر انگلستان سے فرداً فرداً کیجئے تو انگلستان کے اُمرا اور اغنیا دولت و اقبال خود عالم نکلیں گے اور علم دوست ❊

تذکرہ نویسی اس میں شک نہیں کہ شاعروں کے تذکرے لکھنے سے اہل سخن پر بڑا احسان ہوتا ہے۔ مگر تذکرہ لکھنے والوں کو پہلے یہہ دیکھ لینا چاہئے کہ از روئے تحقیق بری بھلی معمولی تک بندی اور کمال کی شاعری میں کیا فرق ہے؟ شاعر کے مفصل حالات سُننے سے کہ لمبا قد تھا یا چھوٹا قد تھا ٹوپی چہ گوشیہ اوڑھتے تھے یا ترکی ٹوپی۔ کَے بچے تھے اور شادی کہاں ہوئی؟ اور اسی طرح کی تفصیل و تشریح سے زیادہ ضرورت کلام کی خوبیوں کی داد دینے کی ہے اور پھر کلام کے انتخاب کرنے میں رطب و یابس ہر طرح کا کلام نہ لکھ دیا جائے۔ اساتذہ اور نومشق شاعروں میں امتیاز رکھا جائے۔ انتخاب میں ہر کس و ناکس کی رائے کو دخل نہ ہونا چاہئے۔ خود اچھا شعر سمجھتا ہو اور جس میں جو خوبی ہو وہ ثابت کر کے دکھا دے ❊ اس طرح کا تذکرہ لکھنا نواب مصطفےٰ خانِ شیفتہ کا حصّہ ہو گیا ❊

بادشاہوں کی تاریخ لکھنے سے تذکرۂ شعرا لکھنا زیادہ مشکل ہے کہ بادشاہوں کی لڑائیوں اِن کی فتح و شکست کا ذکر۔ بلکہ زیادہ تر فتحوں کی تعریف لکھدی اور بس اس میں گھر کی لیاقت درکار نہیں ❊ برخلاف اس کے جس کو تذکرہ نویسی کا دعوے ہو معمولی شاعروں سے اس فن میں زیادہ لیاقت رکھتا ہو اور یہہ لیاقت مارے باندھے کی بات نہیں خدا داد بات ہے ❊ میری نگاہ میں از روئے لیاقت و محنت و رنج سے تذکرہ نویس کا مرتبہ بڑا ہے ❊ تذکرہ نویس کی نگاہ بہت اونچی چاہئے اور لیاقت ذاتی ہو ❊

یہہ ذکر اس لئے کیا گیا کہ اُردو میں اب تذکرہ نویسی کا چرچہ زیادہ ہو گیا ہے ❊

(اداریہ)

ادائی بیان

شعر و سخن میں جہاں اور سیکڑوں پابندیاں ہیں "رنگِ شاعری" کی بھی پابندی دیکھنے میں آتی ہے کہ یہہ شعر آتش کے رنگ میں ہے یہہ ناسخ کے - یہہ میر کا رنگ ہے یہہ مرزا کا - یہہ داغ کا یہہ امیر مینائی کا - یہاں تک کہ مرثیہ میں بھی دبیر اور انیس کا رنگ جُدا جُدا ہے + کسی ذی کمال شاعر سے شعر سنانے کے لئے کہئے تو اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ آپ کو کس رنگ کا کلام پسند ہے ؟ اُسی رنگ کے شعر سنائے جائیں +

" رنگ " کا لفظ روز مرّہ میں داخل ہے - اس سے مراد یہہ ہے کہ عاشقانہ - رندانہ یا مولویانہ - معاملہ کے شعر یا پند و نصیحت کا کلام : بلکہ اساتذہ میں علیحدہ علیحدہ رنگ کے استاد علیحدہ علیحدہ ہیں + لکھنؤ کی شاعری کا طرز جُدا اور دلّی کا جدا - ان میں متقدّمیں اور متاخّرین کا جُدا + متاخّریں میں لسان الملک جناب ریاض کا خاص رنگ اور بڑے مرتبہ کا ہے - جناب صفی لکھنوی بہت خوب فرماتے ہیں - دلّی میں جناب سائل و جناب بیخود کی شہرت ہے + جناب بیخود کو غزل میں کمال ہے - اور جناب ناصر دہلوی کے کلام کا کیا کہنا ! یہہ رائے تمام شعراء پر حاوی نہیں - اس کے لئے بہت تحقیق و تفصیل کی ضرورت ہے - یہہ میرے بس کی نہیں +

مگر مجھے اس وقت شعر و شاعری سے بحث نہیں - صلائے عام کو نثر کی دُھن ہے

کہ ہر زبان کی لٹریچر کا مدار نثر پر ہے۔ اس اظہارِ عقیدہ کے بعد مجھے یہہ عرض کرنا ہے کہ جس طرح شعر میں علیحدہ علیحدہ رنگ ہیں نثر میں بھی یہہ بات پیدا ہونی چاہئے ؛

نثر میں اب تک دو تین طرز دیکھنے میں آئے۔ قدیم طرز مقفہ عبارت کا ہے جس کا سب سے اچھا نمونہ فسانۂ عجائب ہے۔ مقفّہ عبارت کے مقابلہ میں جناب غالب نے صاف و سیدھی سادی نثر میں خطوں کی طرز ایجاد کی + مولانا شبلی کی اُردو بُری نہیں مگر بہت بڑے مرتبہ کو نہیں پہونچی۔ مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی اُردو کی بہت شہرت ہوئی۔ اور بہت پھولی پھلی کہ اُن کی تصانیف سے آمدنی اچھی ہوئی + جناب سر سید احمد خاں کی اُردو بھی خاصکر تہذیب الاخلاق کے مضامین کی زبان بے مثل ہے۔ مولوی مہدی علی اور مولوی چراغ علی جو تہذیب الاخلاق کے اچھے مضمون نگاروں میں تھے بہت اچھی اُردو لکھتے تھے + مولوی محمد حسین آزاد کی اُردو اہلِ پنجاب اور نئی تعلیم کے انگریزی خوانوں میں بہت مقبول ہوئی + پنڈت رتن ناتھ سرشار نے افسانہ نویسی میں بہت بڑا کمال پیدا کیا۔ اُس وقت اس فن میں اُنکا کوئی مدِمقابل نہ تھا اور سچ پوچھئے تو اب بھی مجھے شبہہ ہے۔ یوں کہنے کو اُردو میں ناولوں اور ناول نویسوں کی گنتی مشکل ہے +

نامور اور اچھے اُردو کے لکھنے والوں میں کوئی نہ کوئی پیچ کی خاص غرض تھی۔ سر سید احمد خاں اور اُن کی پارٹی کی بڑی غرض یہہ تھی کہ مسلمانوں کے عقائد مذہبی میں تاویل و ترمیم مناسب ہے۔ مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے شروع

میں سرکاری انعام اور ترقی مناصب کے خیال سے لکھا۔ کسی نے عقاید کی پچ میں کسی نے نمود کی دُھن میں اُردو لکھنا پسند کیا: محض اس غرض سے کہ اپنی زبان میں نئے نئے خیال اور نئے طرزِ بیان پیدا ہوں بہت کم لکھا گیا +

ولایت کے اچھے لکھنے والوں میں سے کسی کا قول ہے کہ روپیہ کے لالچ سے لکھنا لٹریچر کو ذلیل کرنا ہے۔ خوشامد سے لکھنا حماقت اور جو پہلے لکھتے آئے ہیں وہی بار بار لکھے جانا بے کار ہے + شعر کے بارہ میں بھی یہی مناسب ہے کہ جب تک کوئی نیا مضمون ذہن میں نہ ہو محض ردیف و قافیہ کے لئے سمع خراشی تضیع اوقات ہے + جو آپ سے پہلے اور لوگ باندھ چکے ہیں وہی بار بار کہے جانا بے کار ہے۔ جس طرح کوئی مشعل جلا کر طلوع آفتاب کو روز دیکھا کرکے

آج کل کے اُردو لکھنے والوں میں زبان کی وہ خوبی نہیں جسے ادائے بیان کہتے ہیں کہ اپنا رنگ کسی سے نہ ملے نہ دوسرا اُس طرز پر لکھ سکے + شاعری میں تو اکثر اساتذہ کے کلام میں یہہ بات نظر آتی ہے نثر میں سوائے دو ایک لکھنے والوں کے کسی نے خاص ادائے بیان کی طرف توجہ نہیں کی + کسی اچھے نثر لکھنے والے کا طرز دوسرے سے نہ ملنا چاہئے۔ جس طرح مخلوق میں ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ یہہ صنعتِ ایزدی ہے: جس طرح نظم میں بیت الگ۔ رباعی الگ قطعہ الگ۔ غزل الگ قصیدہ الگ ہے +

قصیدوں میں تشبیب کے بعد "گریز" کا طرز مجھے پسند آتا ہے کہ بہار و باغ

کی تعریف

کی تعریف کرتے کرتے یا آسمان کا رونا روتے روتے اپنی کہانی شروع کر دی۔ ایسی "گریز" صاحبِ زہرِ عشق نے اپنی مثنوی میں غضب کی لکھی ہے کہ کوئی آشفتہ مزاج کسی پر مبتلا ہوا۔ جیسا کہ اس شغلہ میں دستور ہے کہ جس سے محبت کی جائے اُسے بے پروائی ہوتی ہے۔ اس پریوش کی بے پروائی میں ان کا بُرا حال ہوا۔ ان کے دوست آشنا اُس ماہ وش کو سمجھانے گئے۔ بیگم صاحب نے چھوٹتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ لیکن جی میں جو طبیعت گدگدائی تو گالیاں دیتے دیتے کیا سوجھی

گالیاں مُنہہ پہ دیجیئے چل کر + جھوٹ سچ دیکھ لیجیئے چل کر

یہہ کہہ کر چلنے کا بہانہ نکال لیا۔ کسی قصیدہ کی "گریز" سے یہہ چلنے کا بہانہ بُرا نہیں اس مضمون سے مجھے بھی صلائے عام کی نسبت کچھ عرض کرنے کا بہانہ نکالنا ہے +

صلائے عام کی نسبت شکایت ہے کہ اس کا طرزِ بیان خاص ہے خاص نہیں تو عام پسند نہیں۔ عام سے غرض اگر عوام ہے تو واقعی عامیانہ طرز خوبی میں داخل نہیں ÷ مجھے پسند نہیں کہ لکھنے والے پڑھنے والے سے کسی بات میں کم ہوں۔ پڑھنے والے تعداد میں کم ہوں تو مضائقہ نہیں لیاقت میں ہرگز کم نہ ہوں + میں خوش ہوں کہ صلائے عام کا اندازِ بیاں خاص سمجھکر مشکل بتایا جاتا ہے کہ عوام کی سمجھ سے باہر ہے +

قاعدہ بغدادی پڑھنے والوں کو مقاماتِ حریری ضرور مشکل ہے۔

مگر حریری حریری ہی ہے۔ حریری کے کمال میں کیا فرق آسکتا ہے اسکول کے پہلی جماعت کے لڑکے اگر بارہ ماسہ اور دیوان غالب برابر جانیں تو غالب کا کیا بگڑ جائے گا؟ ریل کے ٹکٹ بابو سے ٹکٹ کے مانگنے میں لیاقت کی کیا ضرورت ہے؟ سقّہ سے پانی منگانے میں نازک خیالی کیا درکار ہے؟

مجھے خاص ادائے بیان میں اتنی وقت نہیں ہوتی جتنی کہ عامیانہ وضع کی تقلید میں مُشکل کا اندیشہ ہے۔ آتش و ناسخ۔ میر و مرزا لاجواب غزل۔ مثنوی۔ قصیدے جب آپ کہئے بے تکلف کہہ دیتے۔ ٹھُمری ایک بھی مُشکل سے کہی جاتی۔ صلائے عام کے ادائے بیان کی قدر اگر عوام کو نہ ہو نہ سہی جن کو اس کی قدر ہے اُن کی داد میرے لئے بس ہے۔

اللہ بس باقی ہوس!

ایک سخن گسترانہ خط کا اقتباس

× × × × × × × × × × × × ×

میرے اشعار کی داد میں جو چند فقرے صلائے عام میں درج فرمائے اُن کی نسبت میری زبان نہیں کہ کچھ لکھ سکوں مگر استادوں سے سُنا ہے کہ سخن شناس اور سخن سنج اسی کو کہتے ہیں کہ جو شعر میں بات ہو اس کو سمجھ کر داد دے۔ پھر کس طرح میں یہہ کہوں کہ یہہ مصرعہ میرا "ہے ابھی دنیا میں اک صورت جہاں آباد کی"۔ اپنے محل پر نہیں ہے۔

آپ کے مضمونِ پریشاں اور اور نثریں صبا صاحب نے پڑھیں اور اُن پر غور و فکر کے مزے لیکر یہہ ہی کہا کہ سید صاحب کی نثر میں علاوہ اور باتوں کے ایک بات ایسی ہے کہ وہ مولانا آزاد مرحوم کے بیان میں کچھ کچھ تھی مگر تام و کمال آپ کے ہاں پائی جاتی ہے وہ یہہ کہ ورق پر ورق پڑھتے چلے جائے شوق بڑھتا جاتا ہے طبیعت کو تکان نہیں معلوم ہوتی۔

× × × × × × × × × × ×

ہاں خوب یاد آیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ بیرون جات کے لوگ جو دہلی میں آ بسے ہیں وہ سیپارہ کو پارہ کہتے ہیں اور اُن سے سُن سُنا کر دلّی کے جُہلا عوام نوجوان بھی یہہ ہی کہنے لگے اور لفظ سیپارہ مخصوص کلام مجید کے لئے ہے کہ جس وقت لفظ سیپارہ کہا جاے گا فوراً کلام مجید کی طرف خیال جائے گا۔ جیسے تلاوت اس کے معنی پڑھنے کے ہیں مگر جب تلاوت کا لفظ کہا جائے گا یہہ ہی سمجھا جائے گا کہ کلام مجید پڑھ رہے ہیں اور کسی کتاب کی نسبت تلاوت نہیں کہا جائے گا۔ جیسے نعت اس کے معنی تعریف کرنے کے ہیں مگر اب مخصوص اک ذات پاک کے

سالم ہو گئی

ساتھ ہوگئی ہے۔ ایک مضمون "پارہ" کے بے جا ہونے میں بھی تحریر فرماویں تو بہتر ہے ورنہ زبان کا ایمان ہاتھ سے چلا فقط مائل

(مرزا محمد تقی بیگ۔ مائل دہلوی)

صلائے عام۔ لفظ "پارہ" اور "سی پارہ" کے متعلق میں نے دو ایک دلّی والوں سے گفتگو کی۔ مگر دلّی والوں کو اب زبان کی خوبیوں اور صحتِ الفاظ سے واسطہ نہیں رہا ❊ آپ کو تو ایک لفظ پر خیال ہوا میں رات دن یہی دیکھ رہا ہوں کہ دلّی کی زبان اب قابلِ اعتبار نہیں ❊ غیر مُلکوں اور معمولی قصبوں میں دلّی سے زیادہ صحیح اُردو کا پتہ ملجاتا ہے۔ دلّی میں اُردو مسخ ہو رہی ہے ❊ آپ کی رائے سے مجھے بالکل اتفاق ہے کہ مقتضائے ادب یہی ہے کہ صرف قرآن شریف کے ساتھ "سی پارہ" کہا جائے اور نرا "پارہ" کہدینا ترکِ ادب ہے۔ اسی طرح الفاظ نعت اور منقبت میں ❊

دلّی میں صحتِ الفاظ کا رونا مجھے مُدّت سے ہے۔ اس بات میں لکھنؤ کی زبان زیادہ معتبر ہے ❊ سبب یہہ کہ دلّی میں زیادہ دُکانداری اور ہاتھ کی محنت مزدوری پر معاش کا مدار ہے ❊ دُکان داری و دستکاری میں پاکیزہ بیانی مشکل ہے ❊

غزل جناب مائل دہلوی

محتسب تجھکو کیا تو کیا کیا مستانہ سا ❊ آسماں کو کر دکھائیں بادہ کش پیمانہ سا
کیوں نہ ہو مائل کا دیواں کوچۂ جانانہ سا ❊ ہر غزل میں اس کی ہے انداز معشوقانہ سا
جام اُٹھاتے ہی مرے مقبول عالم ہوگیا ❊ اے جنابِ شیخ صاحب مشربِ رندانہ سا
ہمسری کیا کر سکو گے رندِ دریا نوش کی ❊ شیخ صاحب ظرف پایا آپ نے پیمانہ سا
کیا نہیں ہم جلوہ زارِ کفر و ایماں کیا نہیں ❊ کیا نہیں ہے دل ہمارا کعبہ و بتخانہ سا

کیا اسی میں تھے فروکش حضرت پیر مغاں ٭ متصل کعبہ کے تھا جو اک مکاں بتخانہ سا
آگ لگجاتی کبھی کی مجلسِ عشاق میں ٭ شمع تجھ میں سوز دل ہوتا اگر پروانہ سا
کعبہ ہو میری نظر میں کیوں نہ عبرت کا مقام ٭ یاد پڑتا ہے کہ یہہ گھر تھا کبھی بتخانہ سا
مژدہ باد اہل بصیرت کعبۂ دل میں مرے ٭ کوئی بیٹھا تو نظر آتا ہے صاحب خانہ سا
اب گلہ یہہ ہے کہ تونے مجھکو رسوا کردیا ٭ میں گلی کوچوں میں جب پھرنے لگا دیوانہ سا
ایسے بھی دو چار ہو گزرے ہیں دنیا میں نفوس ٭ ننگ تھا جن کی نظر میں رتبۂ شاہانہ سا
کام میرا تھا بہار روئے جاناں دیکھکر ٭ اپنے قابو میں رکھا برسوں دل دیوانہ سا
یہہ نصیبہ دیکھکر تقدیر کعبہ رو پڑی ٭ جب دل عاشق بنا یا کوچۂ جانانہ سا
وحشت دل نے نہ چھوڑا ساتھ اجڑ کر بھی کبھی ٭ میری آنکھوں میں رہا باغ جہاں ویرانہ سا
توبہ توڑی یا نہ توڑی یہہ تو دیکھا دور سے ٭ شیخ نے جو ظرف توڑا تھا مگر پیمانہ سا
خاک میں ملتے ہی اس کے یہہ تو عقدہ کھل گیا ٭ گھر خدا کا بھی نہیں ہے کوچۂ جانانہ سا
جی میں آتا ہے کہ مائل زہد و تقوےٰ بیچ کر ٭ اک در توبہ بنا ڈالیں در میخانہ سا

صلائے عام - یہہ غزل خوبی مضمون کے سوا بالکل نئی طرز کی ہے - میں یہہ بات داد کے خیال سے نہیں کہتا بلکہ امر واقعی ہے کہ اس طرز کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا ٭ ؎

کیا اسی میں تھے فروکش حضرت پیر مغاں ٭ متصل کعبہ کے تھا جو اک مکاں بت خانہ سا

واہ کیا کہنا! بہت ہی پاکیزہ مضمون نئی طرز پر ادا کیا ٭ اسی طرح یہہ شعر ؎

آگ لگ جاتی کبھی کی مجلس عشاق میں ٭ شمع تجھ میں سوز دل ہوتا اگر پروانہ سا

اور اس شعر کا کیا کہنا ؎

توبہ توڑی یا نہ توڑی یہہ تو دیکھا دور سے ٭ شیخ نے جو ظرف توڑا تھا مگر پیمانہ سا
جی میں آتا ہے کہ مائل زہد و تقوے بیچ کر ٭ اک در توبہ بنا ڈالیں در میخانہ سا

جناب مائل کی شاعری پر اہل سخن جتنا ناز کریں تھوڑا ہے - دلی کے اساتذہ کے مضمون زبان کی یادگار آپکی شاعری ہے ٭

مآلِ فلاسفی

فلاسفی کا مآل یعنی علم و عقل کا نتیجہ صرف نیک اعمالی ہے۔ قدیم یونانیوں نے فلاسفی کے دو اسکول بنائے: ایک کا نام اسٹوائک ازم دوسرے کا نام ایپی کیوریَن ازم تھا۔ پچھلے نام کے اسکول کا عقیدہ تھا کہ خوشی بڑی چیز ہے۔ خوشی کی تلاش میں زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اسٹوائک فلاسفی نے زندگی کا مدار محض نیکی پر رکھا؛ کیونکہ نیکی ہی سے آخر کو خوشی ممکن ہے۔ اور ایپی کیورین عقیدہ تھا کہ نیکی سے جو خوشی ہوتی ہے۔ صرف اس خوشی کے خیال سے نیکی کی جاتی ہے۔

اسٹوئیکل فلاسفی کی تعلیم نفس کشی پر مبنی تھی کہ ہر طرح کی تکلیف خوشی سے برداشت کرنی چاہئے: نیکی کو مقدم سمجھا اور زندگی کا مآل ازروئے اعمال نیکی پر منحصر سمجھنا غایت فلاسفی ہے۔ نیکی کی تعریف اس طرح کی گئی جو فعل عقل کے موافق ہو اچھا سمجھا جائے۔ اس کے خلاف سے احتراز مناسب ہے۔ نیکی اسے نہیں کہتے جس میں اپنا مطلب نکلے۔ نیکی میں تکلیف شرط ہے اگر تکلیف نہیں تو نیکی نہیں: یعنی جس قدر زیادہ تکلیف ہو اُسی قدر نیکی کا مرتبہ ہے۔

خوشی کی تلاش عیب میں داخل نہیں۔ لیکن بہت خوشیاں ایسی ہیں جن کا انجام رنج ہوتا ہے۔ ایسی خوشیاں یک لخت ترک کی جائیں: بلکہ بہت سی تکلیفیں اور رنج ایسے ہیں جن کا انجام راحت و اطمینان ہوتا ہے۔ وہ سب برداشت کرنی ضرور ہیں کہ آخر میں ان کے برداشت کرنے سے زیادہ خوشی ممکن ہے۔

رنج سے بچنا خود ایک بڑی خوشی ہے۔ یہاں تک کہ زندگی میں اگر رنج ہی رنج ہے تو

مرتاض ــ Stoicism. ــ Epicurianism.

مرنا بُری چیز نہیں: فلاسفر کے نزدیک موت سے ڈرنا مردانگی کے خلاف ہے بلکہ بے وقوفی میں داخل ہے۔ کیونکہ اگر ہم موجود ہیں تو موت موجود نہیں۔ اور جب موت ہے تو ہم نہیں +

پرانی روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں مچھروں نے شکایت کی کہ پروردگار نے ہوا محض بے کار پیدا کی۔ ہوا ہماری بربادی کا باعث ہے۔ ہوا کو ہم سے جانی دشمنی ہے ہمارا انصاف کیا جائے + حضرت سلیمانؑ نے ارشاد فرمایا کہ ٹھہرو۔ ہم تمہارے دشمن کو بلواتے ہیں دونوں کے سامنے انصاف کیا جائے گا: ہوا کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ ہوا جو آنے کو ہوئی تو مچھر چل دیئے + حضرت نے فرمایا کہ جب مستغیث ہی چلے گئے تو دادرسی کس طرح ہو سکتی ہے؟

اسی طرح موت و زندگی کا معاملہ ہے کہ جب تک زندگی ہے موت کہاں؟ جب مر گئے تو زندگی کہاں؟

فلاسفی کی تعلیم انسان کو تارک الدنیا نہیں بناتی بلکہ بعض دنیوی حالتوں کی ضرورت سمجھتی ہے مثلاً تندرستی۔ فارغ البالی۔ خوشحالی وغیرہ انسان کے لئے بُری نہیں بشرطیکہ یہہ نیکی کے لئے مانع نہ ہوں + فلاسفر کی نگاہ میں تندرستی بیماری سے بہتر ہے۔ فارغ البالی محتاجی سے اچھی ہے کہ تندرستی میں زیادہ نیکی ہو سکتی ہے اور فارغ البالی میں زیادہ بھلا ہو سکتا ہے +

فلاسفر اُسے کہنا چاہیے جو مخلوق اور خالق دونوں کا خیال رکھے۔ لفظ فلسفی جو عوام میں مشہور ہے کہ فلسفی دہریئے ہوتے ہیں۔ دہریت اگر خالق سے انکار کا نام ہے تو یہہ خیال فلاسفی کو بدنام کرنا ہے فلاسفی کا مدار زیادہ تر خداشناسی پر ہے +

فلاسفر ہر چیز کو رنج ہو یا راحت انتظام عالم میں ضروری سمجھتا ہے۔ نہ کسی بات پر تعجب کرتا ہے نہ گھبراتا ہے۔ نہ کسی سے عداوت رکھتا ہے نہ کسی پر جان دیتا ہے: عداوت سے تو قطعی پرہیز۔ اخلاق و مروت

کا البتہ

کا البتہ قائل ہے ؎

فلاسفی میں دُنیا کا وجود خالق کے بغیر ممکن نہیں۔ خالق کے بغیر دنیا محض تن بیجان ہے: جس طرح جسم جان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا خالق کے بغیر دنیا ایک دن بھی ٹھہر نہیں سکتی ؎

مسلمانوں کے خلاف الزام ہے کہ اسلام میں فلاسفی نہیں۔ یہہ نہایت عامیانہ و جاہلانہ خیال ہے مسلمانوں نے اگر شروع میں نہیں تو عرب سے نکل کر قدیم فلاسفی پر بہت محنت کی اور جیسا کہ قاعدہ ہے پہلوانوں سے جو اکھاڑے میں کُشتی لڑ رہے ہوں کُشتی دیکھنے والے زیادہ پہلوانوں کے داؤ پیچ پر نگاہ رکھتے ہیں کہ اس میں چوک ہوئی وہ پیچ چل گیا۔ مُسلمانوں نے قدیم فلاسفی کی عیب و ہنر خوب دیکھے اور ایک خاص فلاسفی متکلمین کی نکالی۔ جو عقائد مذہبی کی پشت پناہ سمجھی گئی ؎ ہاں۔ اس میں شک نہیں کہ مُدت سے ہندوستان میں فلاسفی کی تحقیق سے غفلت ہو رہی ہے۔ اس فن شریف کے جاننے والے بہت کم ہیں اس کا مشغلہ ہندوستان سے گویا جاتا رہا: حالانکہ یونان کی فلاسفی کا ماخذ ہندوستان ہی سمجھا جاتا تھا ؎

یہہ فلاسفی کا اثر تھا کہ ہندوستان میں ہر قوم و فرقہ و ہر پیشہ کا آدمی اپنے اپنے کام میں خوش تھا۔ برہمن کو اگر اپنے جنیئو پر ناز تھا۔ تو راجپوت کو اپنی تلوار پر فخر تھا۔ مہاجنوں کو روپیہ پیسہ سے واسطہ تھا تو لوہار بڑھئی اور ہر پیشہ والا اپنے اپنے پیشہ میں خوش تھا ؎

سر لیپل گریفن صاحب بہادر کا قول تھا کہ ذات پات کا سہارا ہندوستان میں بڑے آرام کا باعث ہے ؎ فلاسفی کا مآل یہی ہے کہ ہر انسان اپنے حال میں خوش رہے ؎ فلاسفی سے دنیا میں امن و اطمینان سمجھنا چاہئے۔ جس قدر فلاسفی کی ترقی ہو سکے ہندوستان کے لئے بہت مفید ہے ؎

نظرِ بازگشت

اس کے معنی ریویو کے سمجھئے اور ریویو کے معنی نظرِ ثانی یا پھر کر دیکھنے کے ہیں۔ لیکن سب سے اچھی اُردو **مُڑ کر دیکھنا** ہے۔ پہلی نظر تو فہرست مضامین سمجھئے **نظرِ بازگشت** مضامین کا مختصر ریویو ہے گویا مضامین اب مُڑ کر دیکھے جا رہے ہیں۔ اچھی شکل پر پہلی نظر تو سرسری سمجھی جاتی ہے۔ مُڑ کر پھر وہی شکل دیکھنے میں زیادہ لُطف آتا ہے۔

اس پرچہ کے مضامین میں پہلا مضمون اور **مضمونِ پریشاں** دونوں سال تمام کے لحاظ سے لکھے گئے۔ "ہماری زبان میں تعزّل کی زیادہ ضرورت ہے"۔ یہہ صلائے عام کا عقیدہ ہے: "**ادائے بیان**" بھی اسی سے ملتا ہوا مضمون ہے۔ "دو ایک تحقیق طلب باتیں" اس سے معلومات کا بڑھانا منظور ہے۔

"دُور کے ڈھول سہاونے"۔ یہہ ایک تعلیم یافتہ پاکیزہ مزاج بیگم صاحب نے لکھا۔ "**منظر**" تذکرہ نویسی کا اچھا نمونہ ہے: خاصکر انتخاب اشعار لاجواب ہے۔ جناب مائل دہلوی کی غزل تازہ اور بہت پاکیزہ ہے۔ آپ کا خط جس کا اقتباس درج ہے سخن گسترانہ ہے۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ یہہ جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او کا مضمون ہے۔

غرض نظم و نثر معمولی در تازہ مضامین کی طرف سے اس پرچہ میں کسر نہیں: صلائے عام کو شکایت ہے تو دیر باری کی ہے۔ یہہ تپ لرزن کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی بلکہ سپرے بڑھاپے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

مآلِ فلاسفی وہ مضمون جو آخر میں ہے گو سرسری ہے مگر اس سے یہہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان کی ہندو فلاسفی انسان کے اطمینان اور مُلک میں امن آمان کے لئے کارآمد تھی۔ اس کے ساتھ فارسی زبان کا ادب آداب حفظِ مراتب کے لئے بہت ضروری نکلا۔ ہماری تعلیم و تربیت میں ان دونوں باتوں کی ضرورت ہے۔

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپئے سالانہ ہے قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے جو مضمون شایع نہ ہو سکیں ان کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس کرانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا۔ سو قت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی بیاض عروس جمیل و لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر صاحب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسری صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایکروپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اجرت کی شرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبان اردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے [illegible]
" " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" " نصف صفحہ یکسال کیواسطے [illegible]
" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیلیے [illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے ۵۰
" نصف صفحہ " " ۱۰، ۲، ۴
" چوتھائی صفحہ " " [illegible]

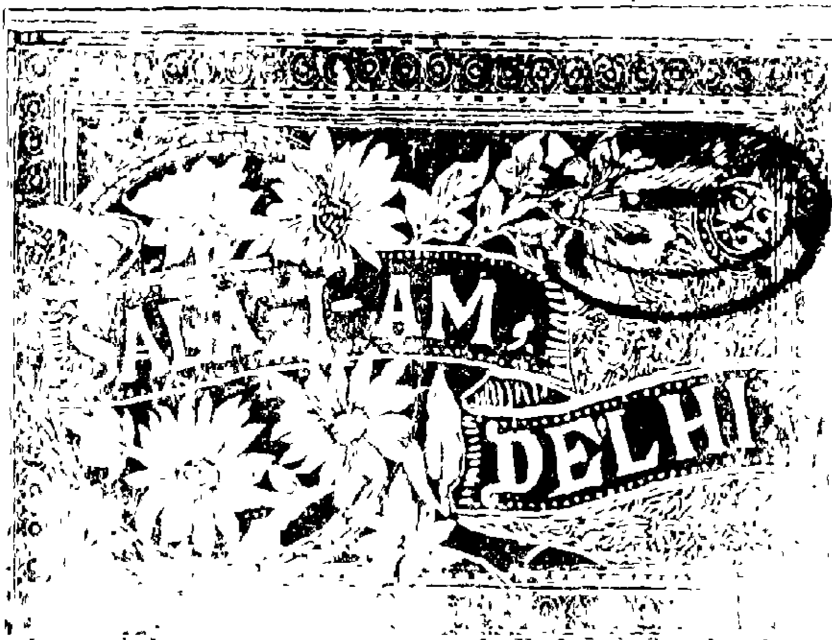
ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دگنی اجرت ہوگی اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

مینیجر صلائے عام

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:-
دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خان بہادر -

[illegible] میر ناصر علی [illegible] مطبع ناصری [illegible] فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر محمد [illegible] چھپا اور شایع ہوا
Printed and Rublished by Mir Nasir Ali khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrkhana Delhi

SALA-AM DELHI ... No. 1452



Mustansir Press Farashkhana Delhi

فہرست مضامین

بابت ماہ جنوری فروری ۱۹۲۸ء

گزشتہ سال و حال

سال گزشتہ

گزشتہ سال کا کچھ حال غیر حال رہا ❊ ولے جو حکم تھا قدرت کا وہ بحال رہا
کہیں تو زلزلے آئے کہیں کہیں طوفان ❊ فلک سے فرش زمیں سارا پائمال رہا
کہیں فلک نے جو آنکھیں دکھائیں بارش سے ❊ کرہ زمیں کا تھمنا ذرا محال رہا
مٹا کے بستیاں لاکھوں کو کر دیا ویراں ❊ ستم سے چرخ کے کوئی نہ بے زوال رہا
کہیں تو آگ لگی اور کہیں وبا پھیلی ❊ بہت قریوں میں آفت پڑی وبال رہا
جو پانی برسا تو ایسا کہ کر دیا فانی ❊ بجا جنوب نہ محفوظ کچھ شمال رہا
جہاز بھی کہیں ٹکرائے اور کہیں ڈوبے ❊ بہت سی کشتیاں ڈوبیں جنھوں پہ مال رہا
تلاطم ایسا سمندر میں تھا خدا کی پناہ ❊ کہ اف بھی کرنے کا منہ سے نہیں مجال رہا
خدا بچائے اُن آفات و قہر سے سب کو ❊ کنارہ بحر کے اب کوئی خال خال رہا
زمانہ کی جو نحوست تھی سب جگہ پہونچی ❊ نہ جان کسی سے بچائے بچی نہ مال رہا
گزشتہ سال کو میرا سلام ہر صاحب ❊ قیامت آئیگی جلدی جو ایسا حال رہا

نہ پوچھو ہم سے نحوست گزشتہ سال کی اب
تمام سال کا عارفؔ عجیب حال رہا ❊

(ناظم مرزا عزیز خاں علی ملکت، از آگرہ)

سال حال

صلائے عام کی سب کے لئے ہے دل سے دعا ÷ یہ سال نو ہے مبارک کرے سبھوں کو خدا
یہ سال نو ہمیں اللہ تو مبارک کر ÷ گزشتہ سال بلا شبہ پر ستم ہی رہا
سبھوں کو اپنی اماں میں خدا رکھے دائم ÷ خدا کرے یہ مبارک ہے ہو سبکا بھلا
نہ جان کا کوئی نقصان ہو نہ مال کا ہو ÷ ہر اک زمانہ کی آفت سے اے خدا تو بچا
یہ سارا سال الٰہی ہمیں مبارک ہو ÷ گزشتہ سال کے مانند یہ کرے نہ دغا
ملا نہ چین کسی کو کسی جگہ دم بھر ÷ اثر دلوں پہ نحوست کا ہر بشر کے پڑا
کمی و بیشی پہ موقوف کچھ نہ تھا نقصان ÷ ہر ایک گوشۂ دنیا میں جا بجا تو ہوا
وہ سال دور ہوا۔ تھا جو سال ستائیس ÷ یہ بیس اور آٹھ کا سال اب کے سال چلا
گزشتہ سال تھے اکتیس دن دسمبر میں ÷ یہ جنوری بھی اکتیس دن کا اب کے ہوا
ہزاروں جانوں کا اور مال کا ہوا نقصان ÷ بہت سی کشتیاں غرقاب کہیں پتہ نہ ملا
گرائے کوہ کے ٹکڑے سڑک کو بھی توڑا ÷ کہ جس سے ریل کا سب راستہ رواں نہ رہا
صلائے عام زباں دانی میں ہوا یکتا ÷ فصیح تر کوئی اردو زباں لکھے تو بھلا
جچے نظر میں نہ ہرگز رسالوں کے مضموں ÷ کوئی فصیح تر اس سے کبھی نہ ہم نے سنا
بہت سے اچھے رسالے نکل کے بند ہوئے ÷ صلائے عام مگر وضع خاص سے نہ ہٹا
ہے خاص ہمت عالی بہادر ذی جاہ ÷ کہ خرچ اپنا کیا اس کو بند پر نہ کیا
صلائے عام کے چندہ میں ہو رہی ہے کمی ÷ مگر یہ حوصلہ ان کا جو سارا خرچ دیا

کمی تو چندہ میں عرصہ سے ہو رہی ہے ضرور ٭ کمی میں اب کے مگر اور کچھ کمی ہے بڑھا
امید یہ ہے کہ احباب باقی وار ضرور ٭ کریں گے سارا ادا اتنیہ آجتک جو رہا
ہمیں کسی سے نہ مطلب نہ کچھ غرض عارف ٭ اجی یہ دل ہی تو ٹھیرا ملا ملا نہ ملا

(راقم مرزا عرفان علی بیگ عارف۔ از آگرہ)

تنقید صلائے عام ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء

صلائے عام ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء اپنی خوبیوں سے ابھرا نکلا ہے۔ خان بہادر صاحب نے گزشتہ سال کے عیوب سے چشم پوشی فرمائی اور اپنے اخلاق کریمانہ سے گئے ہوئے سال پر بار احسان رکھا۔ مجھے تو اس تشبیہ نے جنتری میں کھینچ لیا کیونکہ میں بھی بوڑھا ہوں کہ جھریاں گویا عمر کی جنتریاں ہیں۔ تشبیہ کی تشبیہ اور دراصل عمر کی جنتری یہی ہے جس سے فوراً تمیز ہو جاتی ہے کہ اب تار ڈھیلے پڑ گئے بوڑھاپا آگیا۔ میں تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ خان بہادر صاحب کو خوب سوجھی جو ایسی جنتری نکالی اور یہ جنتری تو سال حال میں کام نہیں دیتی یہ تبدیلی ۱۹۲۷ء کی ۱۹۲۸ء سے اچھی ہوئی مفرد ہندسہ سات کا آٹھ سے بدلا جو ہر طرح سے تقسیم میں آسانی بخشتا ہے اور کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

مضمون پریشان اپنے رنگ میں ہفت رنگ ہے۔ خان بہادر صاحب اس میں ۲۷ء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں...... "بے گنتی و بے شمار سنہ و سال آئیں مگر یہ سنہ کہاں"...... میں اس قدر اس میں ہاں میں ہاں اور ملاتا ہوں کہ یہ سال تو بیشک اب نہ آوے گا مگر خدا ایسا سال بھی نہ لاوے۔ یہ تو پُر از آفات ارضی و سماوی رہا ہے جس نے دنیا کو الٹ پلٹ کر دینے میں کیا کسر رکھی ہے۔

دور کے ڈھول سہاونے۔ یہ مضمون بیگم صاحبہ کا بہت ہی قابل قدر ہے۔

مستورات میں ایسے پاکیزہ خیال کی اور اس لیاقت کی اہلِ زبان اور اہلِ قلم شاذو نادر ہوں گی بڑی خوبی کے ساتھ مصرعۂ "بہشت آنجا کہ آزارے نباشد" پر بحث فرمائی ہے۔ اور یہہ صاف پایا جاتا ہے کہ بیگم صاحبہ نے علمِ دین کو اچھی طرح سے حاصل کیا ہے۔ اس زمانہ میں ایسی باعلم و فہم مستورات کا ہونا تعجب خیز ہے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس مضمون کے متعلق اگر کچھ کہوں تو ناظرین مجھے میاں مٹھو کا خطاب دیں گے کیونکہ مضمون میری ٹوٹی پھوٹی قلم لکھا ہوا ہے۔

ہماری زبان میں نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ خان بہادر صاحب نے بہت ہی وسعت خیال کو دخل دیا ہے اور اعلےٰ ترین مضمون لکھا ہے اور سچ کہا ہے کہ "اگر ردیف قافیہ سے علیحدہ کیجائے تو نثر معلوم ہو" نظم کی بڑی خوبی یہ ہے۔ میں تو اس پر اصرار کرتا ہوں زبان والی اسی کا نام ہے۔ کار آمد تو نثر ہی ہے اور اسی سے سارے جگت میں پالا پڑتا ہے۔ نظم میں سچ فرمایا ہے کہ "ردیف و قافیہ کی دھن میں کوئی بات تازہ کم سوجھتی ہے" (میں معاف کیا جاؤں کہ "کم" کے لفظ کی جگہ "کیا" لفظ زیادہ زوردار ہوتا۔

جناب منظر لکھنوی۔ حضرت خواجہ محمد عبد الروف صاحب عشرت لکھنوی نے جو انتخاب کلام ینگ پارٹی کے باکمال و ممتاز شاعر جناب سید جعفر حسین صاحب متخلص منظر کا بغرض اشاعت صلائے عام میں بھیجا ہے وہ بالیقین زینت صفحات ہے اور بے نظیر انتخاب ہے ماشاءاللہ اہل کلام بھی اور منتخب کنندہ کلام بھی اعلےٰ درجہ کی طبایع موزوں رکھتے ہیں جب تو یہہ خوبی سے بھرے کلام ان کی زبان سے اور قلم سے نکلتے ہیں۔ غضب کا چوچلے کا مطلع ہے کہ "قبرِ عاشق سنائی جاتی ہے ✤ نوجوانی دکھائی جاتی ہے"۔ یہہ فصیح کلام ہے اور کیا وجہ معقول دعا کے نامقبولی کی اس مطلع میں بیان فرمائی ہے کہ سبحان اللہ فرماتے ہیں ؎

بپا ہو حشر قیامت کرے دعا میری ✤ یہ مصلحت ہے کہ سنتا نہیں خدا میری

مجھے تو یہ مصرعہ لاثانی نظر آیا ہے کہ "میکدہ میں رہ کے مجھسے پارسائی ہو چکی"۔ سبحان اللہ یہ تو

ضرب المثل ہے ۔ با محاورہ جملہ تام ہے ۔

دو ایک تحقیق طلب باتیں ۔ یہہ مؤرخانہ مضمون ہے اس کا کیا کہنا ہے ۔ اور پھر خان بہادر صاحب کا قلم ؁

مآل فلاسفی ۔ اس مضمون میں نیکی کی تعریف میں لکھا ہے کہ ”جو فعل عقل کے موافق ہو اچھا سمجھا جائے ۔ اس خلاف احتراز مناسب ہے“ ۔ بہت اچھا مضمون قابل قدر ہے کیا میں اس قدر کہہ سکوں گا کہ فلاسفی مجموعہ علم و عقل ہے ۔ اگر صرف علم ہے تو بے کار ہے ۔ اور اگر صرف عقل ہے تو بے کار ہے ۔ جب علم و عقل کا ساتھ نہیں ہوتا کوئی کام نہیں چلتا ۔ اور جو کام اپنی حد تمام کو پہونچے تو وہ حکمت سے بھرا بالیقین ہے فقط

(راقم مرزا عرفان علی بیگ ۔ آئی ۔ ایس ۔ او ۔ از آگرہ)

”کلیات خسروؒ“ کے دفتر سے یہہ ایک اپیل شایع ہوئی ہے (صلائے عام)

اپیل

(جملہ علم دوست و معارف پرور اصحاب کی خدمت میں)

یہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے کہ بے شمار اسلامی مصنفوں میں ایسے بھی ہیں جن کی کل یا بعض تصانیف دست برد زمانہ سے آج تک بے نشان ہیں ؁ لہذا از بس ضروری ہے کہ قومی شعرا و مصنفین کے قابل حفاظت کلام کو حتی الامکان محفوظ کیا جائے ۔

اسی بنا پر علی گڈھ میں ۱۹۱۸ء سے یہ کام بفضل خدا کامیابی کے ساتھ جاری ہے ۔

ابتدا ہندوستان کے مشہور اور بے نظیر شاعر و مصنف حضرت امیر خسروؒ سے کی گئی ہے ۔ چنانچہ ”سلسلہ کلیات خسروؒ“ کے نام سے آٹھ کتابیں چھپ چکی ہیں ۔ اور جن میں بعض ایسی ہیں جو ادب و تاریخ دونوں اعتبار سے بے مثل ہیں اور اب تک کہیں نہیں چھپی تھیں اور ان کے نایاب ہیں (مکمل یا ناقص) قلمی نسخے بھی معدودے چند ہی تھے ؁ یہی نہیں کہ کتابوں کے محض متون چھاپ ڈالنے پر اکتفا کیا گیا ہو ۔ بلکہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کی تصحیح و تنقید کی گئی ہے ؁ ”خمسہ خسروی“ بھی پورا چھپ گیا ہے جس مطالعہ سے فارسی لٹریچر کی نوعیت پر فی الجملہ عبور حاصل ہو سکتا ہے

اگرچہ ابھی اس سلسلہ کی بہت سی کتابیں چھپنی باقی ہیں جن میں سے بعض نہایت نادر ہیں لیکن فی الحال سلسلہ دواوین کو مکمل کرنے کی کوشش ہے منجملہ پانچ دواوین کے دو تصحیح و تنقید کے بعد ہمہ جہت مکمل اور چھپنے کے لئے تیار ہیں ایک زیر تنقید ہے ۔ اگر یہ پانچوں دواوین چھپ کر شایع ہو گئے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت بڑی علمی اور ادبی خدمت انجام پائے گی ؁ اس لئے ارباب ذوق و ہمت کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ کا خریدار بننے یا نقد اعانت فرمانے نیز دوست احباب کو اس پر آمادہ کرنے کی غرض سے جس طرح ممکن ہو اس مقصد عظیم کی تکمیل میں سعی فرمائیں ۔ نوٹ ہر قسم کی خط و کتابت [illegible]

صلائے عام

سال حال کا پہلا پرچہ نکالتے مجھے شرم آتی ہے کہ جہاں آغازِ سالِ حال کے خیال سے بڑے تکلّف کے جنوری نمبر نکلیں وہاں صلائے عام کا یہہ معمولی پرچہ گویا شیخ سعدیؒ کی گلستاں کے سامنے سادی کتاب ہے ٭

میں نے دیکھا کہ جنوری کے اکثر رسالے اس دھوم سے نکلے ہیں جن سے بازی لینی درکنار اُن کی برابری بھی مشکل ہے کہ حضرت شیخ سعدیؒ کے قطرۂ باراںؔ کی طرح میری ہمت نہ ہوئی جو وسعت بحر کو دیکھکر گھبرایا کہ سمندر کے آگے میری ہستی کیا ہے ع خجل شد چو پہنائے دریا بدید ٭

اس میں شک نہیں کہ آغاز سال کے عموماً سارے رسالے معمول سے بہت زیادہ تکلّف کے نکلے جن میں رسالے والوں نے دل کھول کر خرچ کیا۔ رنگین و سادہ تصویریں اور فوٹو و نقشے اچھے اچھے نکالے: صلائے عام نے یہہ رسم عمداً چھوڑ دی کہ شاید ہی کسی کو اس غیر معمولی زیر باری کی داد ملی ہوگی۔ بقول جناب صفدر مرزاپوری ؎

وہ لیسے ہی تو ہیں رکھ دیں گے دامن میری آنکھوں پر ٭ سرِ بزم آپ دیکھو تا ہے کیوں اشکِ رواں میری

مجھے قلق ہے کہ صلائے عام میں کسی طرح کی تصویروں کا بندوبست نہ ہو سکا۔ سچ پوچھئے تو سیدھے سادے پرچہ کا بھی اہتمام مشکل ہو رہا ہے: دوسرے انگریزی اخباروں و رسالوں میں اس کثرت سے ہر طرح کی تصویریں سادی و رنگین اور لاجواب فوٹو اور نقشے دیکھنے میں آتے ہیں جن کے سامنے پتھر کی چھپائی کی تصویریں نرا گویا منہہ چڑانا ہے علاوہ اس کے سنجیدہ و علمی مضامین کے ساتھ رنگ برنگ کی تصویروں کا جوڑ نہیں ملتا۔ صلائے عام سے بڑی غرض انشا و ادب یعنی محض لٹریچر کی ترقی منظور ہے۔ یورپ کی زبانوں میں جو اعلےٰ مرتبہ کے لٹریری رسالے نکلتے ہیں اُن میں تصویروں کی شرط نہیں ہوتی: بہرحال صلائے عام میں تصویروں کے نہ ہونے کا یہہ عذر خاص ہے۔ اس کے کفارہ میں مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بقول صائب ؎

کفارۂ شراب خوری ہائے بے حساب

ہشیار در میانۂ مستاں نشستن است

مضمون پریشان

پریشانی گو ہر جگہہ پسند نہ ہو مگر حسینوں کے بالوں کے لئے اس سے زیادہ دلکش صفت نہ شعرا کو سوجھی نہ میرے ذہن میں ہے۔ شاعری میں جس طرح آئینہ کے لئے حیرانی کے سوا اور کوئی صفت کسی کے ذہن میں نہیں آئی اسی طرح زلف یار کے لئے پریشانی ہنر میں سمجھی گئی۔ کیونکہ چاہنے والوں کا مسلمہ ہے کہ محبت میں یار کی ہر بات ہنر میں داخل ہے۔ جس طرح بقول شیخ سعدی رح "ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است"۔ اسی طرح محبت والوں کو پری وشوں کا عیب بھی ہنر دکھائی دیتا ہے۔ ہوا میں بال بکھر گئے تو گویا پریوں کو پھانسنے کے لئے جال پھیلانے کی تشبیہہ ہوگئی ؎

گر اڑتی ہوئی پریاں پھسانے کا ارادہ ہے ٭ ہوا پر جال پھیلایا ہے کیوں زلفِ پریشاں کا

باغ میں جو بال کھل گئے تو اوراقِ گل کی پریشانی کا باعث سمجھے گئے ؎

پریشاں خاطری صیاد کی لائے جو رنگ اپنا ٭ چمن میں دفتر اوراقِ گل یک لخت ابتر ہو

بالوں کے کھل جانے کی تشبیہہ یہہ سب سے زیادہ پاکیزہ ہے کہ ؎

لیلےٰ کو کھولتے دو ذرا گیسوئے دراز ✤ مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

"کچھ کھلے کچھ گندھے" بالوں کی تمثیل بالکل نئی یہہ ہے کہ جو بال سر کے بکھر گئے گویا بغاوت میں داخل ہو گئے اُن کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری میں کچھ بندھے کچھ کھلے رہ گئے ✤ آوارہ مزاجی کا علاج یہی ہے کہ بگڑوں کو بنایا جائے۔ گو سب نہ بنیں جس قدر قید میں آسکیں ان کو چھوڑنا مناسب نہیں ؎

پھری قسمت ہوا کی آپ کی زلفوں کے صدقے میں ✤ پریشاں ہوکے اُٹھی تھی چلی عنبر فشاں ہوکر

حسینوں کے چہرہ پہ بالوں کا بکھر جانا شاعری میں بڑے لطف کا سامان ہے مگر کسی کی لاش پر بال کھول دینا غایتِ ماتم ہے ؎

بال کھولے تم سوئے گورِ غریباں کیوں گئے ✤ اور بھی لاشیں اندھیرے میں پریشاں ہوگئیں

اور اندھیر کیا قبر پہ تم نے آکر ✤
بال کیوں کھول دیئے تیرہ عزاداروں میں

کھل گئی آنکھ ہوئی صبح اب آتی نہیں نیند ✤ زندگی دیکھ لیا خواب پریشاں تیرا

دستور ہے کہ صبح کو اکثر آنکھ کھل جاتی ہے مگر جن کو رات بھر نیند نہ آئے ان کی آنکھ صبح ہی کو لگ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جس قیدی کو صبح پھانسی لگنے کا حکم سنایا

بجائے

جاتا ہے اُس کو صبح کو جگانا پڑتا ہے۔ اس لئے مثل مشہور ہے کہ سُولی کے تلے بھی نیند آجاتی ہے۔

آہ پیری میں جوانی سے سوا ہوں غافل ✦ نیند کیسی مجھے ہنگام سحر آئی ہے

جس کو زندگی اجیرن معلوم ہو وہ اُس شخص کے مانند ہے جو شطرنج کھیلنے کا دعوے کرے اور مہروں کی چال سے واقف نہ ہو کہ اسپ و فیل کی چال میں کیا فرق ہے؟ رُخ سیدھا چلتا ہے یا ٹیڑھا؟ پیادہ بھی وزیر کے مرتبہ کو پہونچ سکتا ہے کہ نہیں؟

ذرّہ کا بھی چمکے کا ستارہ ✦ قایم جو زمین و آسماں ہے

شہ دینے کے معنی مات دینے کے نہیں۔ ہزار دفعہ شہ لگے مگر مات نہ کھانا چاہئے۔ زندگی کتنی ہی بے لطف نظر آئے آنے دیجئے۔ مُہرے ٹھیک ہیں تو کچھ فکر نہیں: حریف کے مُہروں پر نگاہ رکھئے کہ اُس کی چال سے اپنے مُہرے نہ دبیں ؎

مزاج اک دن اے خورشید محشر تیرا پوچھیں گے ✦ ذرا پھاہا سرک جائے ہمارے داغ ہجراں کا

گھٹائیں کیسی ہی جھوم جھوم کر آئیں مگر ساری عمر گھری نہیں رہ سکتیں۔ برس چکیں گی تو مطلع ضرور صاف ہو جائے گا: مطلع صاف ہو جائے تو آپ کو باہر نکلنے سے کون روکتا ہے؟ آپ اپنے جھگڑوں کو چھوڑ کر ذرا باہر نکل کر دیکھئے کہ خلق خدا کا کیا حال ہے؟ اگر آپ کی حالت سے اچھی ہے تو اُن کے شریک حال ہونے میں اچھا خاصہ غم غلط کرنے کا مشغلہ ہے۔ اور اگر آپ کے ذہن کے موافق بُری ہے تو اس سے زیادہ شکر کا کونسا موقع ملے گا؟ آپ خوش ہیں تو اوروں کو بھی خوش کیجئے۔ اگر خوش نہیں ہیں تو اوروں کو خوش

دیکھ کر

دیکھکر یا غم غلط کیجئے۔

دُنیا میں سب سے بڑی مُصیبت محتاجی ہے۔ اس کی نسبت کسی فرنچ خوش بیان نے خوب لکھا ہے کہ محتاجی مرد کے لئے پارسائی کی جڑ ہے کہ نہ مقدور ہوگا نہ عیاشی ہو سکے گی۔ محتاجی گویا پارسائی کی سپر ہے کہ عیاشی سے بچائے رکھے گی۔

بچپن میں ہم کہتے رہتے کہ ہمیں جوان ہونے دیجئے تو دیکھئے کیا کچھ کر دکھائیں گے جوان ہوئے تو وہ بے فکری بھی گئی جو بچپن میں تھی: بڑھاپے نے دونوں حالتیں کھو دیں

تاب و طاقت کو کبھی کی کوچ یا نسی کر گئی　　　اب وداع ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

اسکا علاج صرف حضرت شیخ سعدی رح کو سوجھا کہ:۔

"مگر ایں پنج روز دریابی"

بچپن اور جوانی بے کار جانے کا مجھے اتنا افسوس نہیں جتنا کہ اب باقی کے چند روز جو رہ گئے ہیں ان کے رائیگاں جانے کا اندیشہ ہے پہلے تو جتنی زندگی بے کار گئی اُس میں یہہ بڑا سہارا تھا کہ دس برس کی تھی تو سمجھتے تھے کہ بیس برس میں اس کی کسر نکل جائے گی۔ بیس کی تیس میں اور تیس کی چالیس میں: چالیس سے وہ پچھلی صورت بھی بگڑنے لگی کہ "چوبے جی چھبے ہونے کو چلے راہ میں کوئی ملا تو کہا کہ دُوبے جی کیسے ہو؟ چوبے سے دوبے رہ گئے"۔

بچپن اور جوانی دو نوں عجیب نعمتیں ہیں سہ

ماہِ کامل مہِ نو دونوں حسیں ہیں لیکن + اِک ذرا پن ہے جو کم اس سے ہلال اچھا ہے

اِن دونوں کی قدر کا باعث اندھیری راتیں ہیں جسے بڑھاپا کہنا چاہئے + ہم کو جوانی اور بچپن کی قدر اُسی قدر ہوتی جاتی ہے جس قدر کہ عمر بڑھتی جاتی ہے + جوانی میں جوانی کی قدر اس لیئے نہیں ہوتی کہ جوانی دیوانی مشہور ہے۔ دیوانہ کی نگاہ میں سچے اور جھوٹے موتی برابر ہیں +

انسان اگر عظامِ رمیم یعنی اپنے نسب نامہ کے کارناموں پر دُولن کی لے تو بہت کچھ ناز کے اسباب میں داخل نہیں۔ بزرگوں کا نامور ہونا گو بُرا نہیں مگر "ترا چہ" ؟ کو کیا کیجیے ؟ کسی کے دس پُشت کے پہلے کے بزرگ چنگز خاں کی لڑائی میں کام آئے مگر آپ تو گھر سے باہر نکلتے ڈرتے ہیں۔ سگردادانے سبعۂ معلقہ کی شرح لکھی تھی صاحبزادی ستہ کے معنی نہیں جانتے کہ سبعہ وستہ میں دس کا فرق ہے یا پندرہ کا۔ محتاجی میں باپ کو کفن نصیب نہیں ہوا مگر سُنا ہے کہ دادا کے جنازے پر پچاس سیاہ دوشالے سوزن کاڑے تھے + بچے کی بسم اللہ میں شہر کے سارے مولوی بُلائے گئے اور اقرا و باسمِ ربّک مولانا فلاں نے جن کا جواب ہندوستان میں نہ تھا پڑھایا تھا مگر بچہ جوان ہو کر الف کے نام بے نہیں جانتا + آدمی اپنا حال دیکھے۔ ع آدمی را بچشمِ حال نگر۔ گڑے مُردے اکھاڑنے سے اپنے کفن کاٹھی کی فکر زیادہ مناسب حال ہے +

دُنیا کو بقا نہ ہو نہ سہی۔ مجھے فکر ہے کہ بُڑھاپے میں جو زندگی کے دن باقی ہیں یہ

کہیں سیہ کار نہ جائیں : اس کے بعد قیامت ہی کیوں نہ آجائے ۔ قیامت کا دن حساب کتاب کا بتلاتے ہیں۔ حساب کتاب میں شاید ہمارا ہی کچھ نکل آئے : کیونکہ زندگی میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سپردم بتو مایۂ خویش را ۔ تو دانی حساب کم و بیش را ۔ اگر اس سے بھی کچھ نہ نکلا تو رحمتِ الٰہی پھر کس دن کام آئے گی ؟ غرض جیتے و مرتے کسی حالت میں ناامیدی قفل ہے ؎

کہدو دنیا سے کہ رندوں سے الگ ہوکے مرے ۔ کسی زاہد سے یہ اٹھوائے جنازہ اپنا ؎

نہا دھو کر کفن پہنے لحد میں چین سے سوئے ۔ ترے بیمارِ الفت کو کہیں جلدی سے صحت ہو

دنیا میں یونہی کیا کم مصیبتیں ہیں کہ آپ نے عاقبت کے خوف سے دن کی تو کیا رات کی بھی نیند حرام کر رکھی ہے۔ مطلب یہ کہ قبر میں بھی آرام سے نہ سونے پائیں ؎

اندھیری رات میں بجلی کو بھی ترس آیا ۔ غریب لے کے چراغ آئی آشیاں کے لئے

باغباں ہم کو ہے اب طاقتِ پرواز کہاں
اونچی کیوں کرتا ہے تو باغ کی دیواروں کو

عالمِ اسباب کا رنگ گو مزاجِ یار کی طرح ہر وقت بدلتا رہتا ہے مگر اس میں ایک رنگ فنا کا سب سے زیادہ پکا ہے۔ یہ رنگ قیامت تک کیا بلکہ اس کے بعد بھی شاید ہی جائے : زمانہ ہزار گردشیں بدلے یعنی جس طرح دھوبی پکے رنگ کے کپڑے کو ہزار بار پتھر پہ مارے۔ ہزاروں ضوب پڑیں پکا رنگ نہیں اترتا۔ اسی طرح گردشِ روزگار سنگِ حوادث پہ انسان کو ہزار بار دے دے مارے عالمِ اسباب سے رنگِ فنا نہیں مٹ سکتا ؎

رنگ اُترتا ہی نہیں عشق کا جب چڑھ جائے ÷ ہم نے دُنیا میں اسی رنگ کو پکا دیکھا

پکے رنگ کی تصویر دیکھئے

تصور لیلےٰ محمل نشین کا یہہ بندھا اُس کو ÷ کہ مجنوں کھنچتا پھرتا ہے میں لیلےٰ کا محمل ہوں

نکل جائے تڑپ کر اسکا قیدی غیر ممکن ہے

کہ دیواریں بہت اونچی ہیں زندانِ محبت کی

حضرت شیخ سعدی رح کا یہہ شعر لاجواب ہے ؎

برگ درختانِ سبز درنظرِ ہوشیار ÷ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

پڑھ سکیں ہم تو ہر ایک برگ ہے تاریخ چمن

لکھنے والے نے کوئی بات اُٹھا رکھی ہے؟

یہہ شعر حضرت کا جواب تو نہیں ہے مگر یہہ بات بہت پاکیزہ زبان سے نکل گئی کہ ع
"لکھنے والے نے کوئی بات اُٹھا رکھی ہے"؟ لکھنے والے کے کمال میں شک نہیں۔ کوئی پڑھنے والا نہ ہو تو کیا کیجیے؟

لیلےٰ وہ ہی رہی نہیں اربابِ عشق میں ÷ مجنوں نہیں تو ہم ترے محمل کے ساتھ ہیں

ساربان روک ناقۂ لیلےٰ

قیس سے اب چلا نہیں جاتا

پاکیزہ بیانی کا نمونہ

اے حیا تجھکو انہیں آنکھوں میں کیا آنا تھا ✤ چشمِ نرگس نہ ملی دیدۂ آہو نہ ملا

اندھیر ہے کہ آنکھ میں سُرمے کی جا نہیں
اتنے حسیں سمائے ہیں اپنی نگاہ میں

میں خوش ہوں کہ صلائے عام کی داد میں جو تحریریں آتی ہیں اکثر پاکیزہ بیانی کے نمونے ہوتے ہیں۔ ابھی ایک تحریر ایسی آئی جو صلائے عام میں فخریہ شایع کرنے کے قابل ہے: یہہ نہایت بے ساختہ ہے۔ مگر صاحبِ تحریر نے اُس کے چھاپنے کی ممانعت کر دی ✤ بڑی منت سماجت سے دو چار فقروں کے چھاپنے کی اجازت ملی۔ یہہ بھی اس شرط پر کہ حضرت کا نام نہ لکھا جائے ؎

مُنہہ پہ ڈالے ہوئے آتا ہے نقاب آج وہ شوخ ✤ ہائے یوں وعدۂ دیدار وفا ہوتا ہے ✤

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

"ہم دونوں ...... صلائے عام کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ بعض بعض فقرے تو آپ کے اس قدر بجلی میں سموئے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم لوگ دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ اور بے اختیار میر کا یہہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

آگرہ بازار

آہ! نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو ÷ اے ستم کش! میر! ظالم! ہے جگر بھی دل کی پاس

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

(میں نے لکھا تھا کہ اُردو کے رسالے زیر باری کے باعث سے بہت کم چلتے ہیں۔ جواب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ کے قول کے مطابق۔ اُردو زبان کے رسائل کو کسی پہونچے ہوئے فقیر کی بددعا لگ گئی ہے"

× × × × × × × × × × × × × × ×

(اپنے بُڑھاپے سے تنگ آکر میں نے حضرت کو لکھا کہ بازگشتِ شباب کا کوئی نسخہ تلاش کر دیجئے۔ جواب میں لکھتے ہیں:۔)

× × × × × "کیا پیری میں آپ بازگشت شباب کے نسخہ کے متلاشی ہیں؟ ہم لوگ تو جوانی کی چیرہ دستیوں سے پریشان ہیں۔ ایک بار صلائے عام میں آپ نے لکھا تھا کہ بُڑھاپے میں یہہ اچھی بات ہے۔ کہ حسینوں سے ملنے جلنے میں بوڑھوں پر کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا۔ گویا آپ ایسی چیز سے تھک گئے ہیں جو کہ آپ کی بے گناہی کی سپر ہو سکتی ہے" ؎

باندھ کر سبز عمامہ جو بھرا روپ ریاضؔ ÷ حضرتِ خضر سے اچھی رہی صورت میری

× × × × × × × × × × × × × × ×

(یہہ سارا خط ازروئے لٹریچر شایع کرنے کے لایق تھا۔ میں نے بہت خوشامد کی

کہ اس کا اقتباس ہی چھاپنے کی اجازت دیجئے۔ جواب آیا کہ :-)

"گرامی نامہ صادر ہوا۔ آپ کا یہ خط لٹریچر کی جان ہے۔ میں نے نہایت احتیاط سے حرزِ جان بنا کر رکھا ہے۔ خدا آپ کے لٹریچر کے شباب کو عمر جاودان عطا فرمائے۔"

× × × × × ہندوستان میں ایسا لکھنے والے اس وقت عنقا ہیں۔ آپکا یہ طرزِ تحریر یادگارِ زمانہ ہے" × × × × × × × × × × × ×

"میری خواہش تو یہ ہے کہ میرے ہذیانات منظرِ عام پر نہ لائے ہیں اور وہ خط شایع نہ کیا جائے۔ اور اگر شایع کیا جائے تو میرا نام حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے: اور اگر آپ کسی طرح راضی نہیں ہوتے ہیں تو پھر آپ کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں "دامنِ فرہاد" کی نمائش کریں ؎

آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا + بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا -

جنوں را کار رہا باقی ست با مشتِ غبارِ من
کہ بازی گاہِ طفلاں می شود خاکِ مزارِ ما

صلائے عام۔ اس تحریر کا اقتباس چھاپنے کی اجازت گویا لٹریچر پر احسان ہے۔ اس کا میں بہت شکرگزار ہوں: یوں تو صلائے عام کی قدرشناسی میں اکثر تحریریں آتی رہتی ہیں مگر یہ نہایت بے ساختہ اور بہت پاکیزہ ہے ؎

دلِ مجنوں سے نکلی آہ یا بجلی کوئی چمکی + کہ محمل سے تڑپ کر لیلئِ محمل نشیں نکلی

ای ڈی کے

اسی ڈاک کے ساتھ ایک صاحب کا خط آیا جس کے اخیر میں لکھا تھا :-

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × "اُردو کی خدمت ہی کے صلہ میں اللہ جلّ شانہ آپ کی عمر میں برکت دے - آمین! رسالے بہت نکلتے ہیں مگر وہ بات کہاں خاں بہادر صاحب کی سعی!

× × × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام - ایسی قدر شناسیوں کے جواب میں مجھے یہہ عرض کرنا ہے کہ انہیں قدر دانیوں پہ صلائے عام کی زندگی کا مدار ہو رہا ہے - ورنہ میں اسے کبھی کا بند کر دیتا؛ بقول میر تقی ؎

موسم گیا وہ ترک محبت کا ناصحا ✤ میں اب تو خاص و عام میں بدنام ہو چکا

میر سوز فرماتے ہیں ؎

سوز کے منہہ سے شعرِ درد سنو ✤ کیونکہ اس کا بیان ہے کچھ اور

قیس و فرہاد کا نہیں قصہ

ہاں جی یہہ داستاں ہے کچھ اور

شعر و سخن

گو صلائے عام کو زیادہ تر نثر سے تعلق ہے مگر اُردو کو شروع سے شعر و شاعری سے زیادہ واسطہ رہا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اُردو لٹریچر سے غرض ہی یہی رہی کہ شعر میں کمال پیدا کیا جائے + ہر قوم کے "ایام جہالت" کے یادگاروں میں شاعری ہے۔ "ایّام جہالت" کی اصطلاح اسلامی لٹریچر کی ایجاد ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے کا زمانہ "ایام جہالت" کے نام سے مشہور ہے +

قرآن شریف کو مسلمان جو معجزہ کہتے ہیں۔ اس کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ نظم ہوتی تو اکثر شعرا ایک دوسرے سے بازی لے گئے۔ مگر نثر میں یہ بات انسان کے اختیار سے باہر ہو گئی

میں نثر کو زیادہ ضروری اس لئے سمجھتا ہوں کہ شاعری تو ایک خاص کمال کا نام ہے جو ہر ایک کو میسر نہیں۔ مگر نثر بغیر دُنیا کا کوئی کام چل نہیں سکتا: نثر سے ہر شخص کو ہر وقت واسطہ رہتا ہے اور نظم کی ضرورت کبھی کبھی۔ بلکہ فلاطوں نے انتظامِ عالم میں اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی + بہر حال۔ میرے عقیدہ میں شعر و سخن اگر ستۂ ضرورۃ میں داخل نہیں تو بھی زندگی کی رونق کا باعث ضرور ہے + مجھے شعر و شاعری میں

مطلق دخل نہیں مگر کسی کے اچھے کلام سے اس قدر جی خوش ہوجاتا ہے جو کسی اور سے نہیں ہوتا ابھی میر کا یہہ شعر دیکھکر اس قدر جی خوش ہوا کہ جس قدر میں نے تمام عمر لکھا پڑھا ہی سب نذر کرنے کو حاضر ہوں سہ

آہ! نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو ✤ اے ستم کش! میر! ظالم! ہے جگر بھی دلکے پاس

"ہے جگر بھی دل کے پاس"۔ اس سے زیادہ نازک خیال اور کیا ہوگا؟

میرے دماغ میں خبط سمایا ہوا ہے کہ شاعری میں ترقی کی ضرورت نہیں۔ اساتذہ جو مضمون باندھ گئے اُسی کو اُلٹ پھیر کر آپ کہے جائیے: کوئی نیا مضمون نکالنا مشکل ہے نیچرال شاعری اور "قومی راگ" کے نام سے جو آج کل نظم لکھی جاتی ہے اس سے شاعری کا مرتبہ بڑھتا نظر نہیں آتا۔ گو عوام میں اس کا رواج ہو تو اور بات ہے: شعر و سخن دوسری چیز ہے ✤

لیکن اس وقت مجھے اس بحث سے غرض نہیں۔ گفتگو یہہ ہے کہ گو صلائے عام کو زیادہ تر نثر کی ترقی کا خیال ہے مگر اچھے کلام کی داد نہ دینی اس کی وضع کے خلاف ہے ✤

یہہ میں ابھی عرض کر چکا کہ آج کل کی شعر گوئی شعر و سخن کے مرتبہ کو نہیں پہونچتی مگر متاخریں میں حضرت **محسن** کاکوروی کا کلام جو اُنہوں نے نعت میں لکھا واقعی لاجواب ہے: کمال یہہ کیا کہ نعت کا مضمون اور متھرا گوکل اور گنگا جل سے اجتماعِ ضدین کے مرتبہ کو پہونچا دیا۔ اُردو میں یہہ بات کسی سے بن نہ پڑی ✤ مرزا اسداللہ خاں غالب نے

منقبت

میں ایک قصیدہ فارسی میں لکھا تھا جس کا مطلع یہہ ہے کہ ؎

صبح کہ درہوائے پرستاریٔ وشن ✤ جانبِ کلیسا بت کدہ در دستِ برہمن

فارسی میں اِس طرز کا کلام بہت کم دیکھنے میں آیا۔ اِس لئے یہہ طرز جناب غالبؔ کا حصہ سمجھا گیا تھا: لیکن اُردو میں جناب محسنؔ نے یہہ طرز جس خوبی سے نباہا اُس خوبی سے کسی سے ہو نہیں سکتا ✤

حضرت محسنؔ نے بڑا کمال یہہ کیا کہ تمام قصیدے میں سارے استعارے اور تشبیہیں ہندوستان کی سینری اور مذہب ہنود کے عقاید سے کام میں لے آئے۔ قصیدہ کیا ہے گویا ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا نسخہ ہے ✤ کاشی و متھرا۔ گنگا و جمنا استنان و تیرتھ: گوکل و جمنا جل۔ مہاراج سری کرشن جی و مہاتن۔ بندرابن کا تذکرہ ہوا گل ؎

قمریاں کہتی ہیں طوبےٰ سے مزاجِ عالی ✤ لاؤ یا تحفے ہندو سے فلک گھیم گسل

طوبےٰ کے لئے مزاج عالی اور قمریوں کی زبانی۔ اس کے ساتھ ہندو سے نگار سے "گھیم گسل"۔ "گھیم گسل بھی" لالہ باغ کی طرف سے: غضب کیا!

سنسکرت میں میگھ اُودت کا ڈراما لاجواب ہے کہ بادل سے کام نہایت نزاکت سے لیا گیا۔ جناب محسنؔ کے قصیدے میں بادل پانی کی طرح بہادیئے گئے ؎

ہم سمجھے ہم نے مدح کے دریا بہا دئے ✤ کیا ہوگیا جو بحر میں قطرے ملا دیئے

آپ کے قصیدے میں سے بادل کے دوچار مضمون عرض کرنے کے لایق ہیں:۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل ✤ برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی ٭ کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پہ بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی ٭ ہند کی ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

(کالی گھٹاؤں کے لئے کالے کوس ۔ بے مثل بات ہے)

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی ٭ پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

(آٹھ پہر ۔ دو چار گھڑی : چار دونی آٹھ ۔ اور منگل منگل جسطرح جمعہ جمعہ آٹھ دن اور دو منگل دو ہفتہ کے برابر یعنی پندرہ دن جسے انگریزی میں فارٹ نائٹ[1] کہتے ہیں ۔ یہہ پوری لیلاوتی ہوگئی)

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے ٭ برق سے رعد یہہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

جس طرف سے گئی بجلی پھر اُدھر آنہ سکی ٭ قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

(یہہ شاعرانہ مبالغہ کی غایت ہے)

بادل کی یہہ پوری غزل بھی سُننے کے لایق ہے :۔

سمت کاشی سے گیا جانب متھرا بادل ٭ تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل

سمت کاشی سے گیا جانب متھرا بادل ٭ برج میں آج سری کشن ہے کالا بادل

خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل ٭ رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

شاہد گُل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل ٭ برق کہتی ہے مبارک تجھے سہرا بادل

سطح افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی ٭ روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل

چرخ پہ بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہے ٭ سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل

جب تلک برج میں جمنا ہے یہ کھلنے کا نہیں ٭ ہے قسم کھائے اُٹھائے ہوئے گنگا بادل

[1] Fort night.

بجلی دو چار قدم چلکے پلٹ جائے نہ کیوں ✦ وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
چشمۂ نہر ہے عکسِ زرِ گل سے دریا ✦ پرتوِ برق سے ہے سونے کا بجرا بادل
میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش و خروش ✦ کسی بھیدو کو دکھلائے کرشما بادل
دلِ بیتاب کی ادنےٰ سی چمک ہے بجلی ✦ چشمِ پرآب کا ہے ایک کرشما بادل
تپشِ دل کا اُڑا یا ہوا نقشہ بجلی ✦ چشمِ پرآب کا دھویا ہوا خاکا بادل
اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے ✦ میری آنکھوں کا ہے اُترا ہوا صدقہ بادل
کچھ ہنسی کھیل نہیں جوششِ گریہ کا ضبط ✦ یہ مرا دل ہے یہ میرا ہے کلیجا بادل
جامِ عمرِ فلکِ پیر ہوا ہے لبریز ✦ لئے جاتا ہے جنازہ دیئے کاندھا بادل
راجہ اندر ہے پریخانے کا بانی ✦ نغمہ ہے کا سیہ کشن کنہیا بادل
جوش پر رحمتِ باری ہے چڑھاؤ نہ ہو ✦ چشمکِ برق سے کرتا ہے اشارا بادل

دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری
نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

کثرتِ بارش و بادل کے ساتھ بہار کا لطف بھی چاہئے اس لئے بہاریہ شعر بھی سن لیجئے:۔

آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ چمکا ✦ شاخ میں کاہکشاں کے نکل آئی کونپل
دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گلشن کی بہار ✦ دیدۂ نرگسِ شہلا کو نہ سمجھو احول

خضر فرماتے ہیں سنبل سے تری عمر دراز ✦ پھول سے کہتے ہیں پھلتا ہے گلزار امل
عطرافشاں ہے شبیہ گل نسرین سمن ✦ نخل داؤدی مومی سے ٹپکتا ہے عسل
لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ ✦ چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل
جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر ✦ مصحف گل کے حواشی پہ طلائی جدول
ہمزباں وصف چمن میں ہوئے سب اہل چمن ✦ طوطیوں کی ہے جو تضمین تو بلبل کی غزل
تخت طاؤسی گلشن پہ ہے سایہ کئے ابر ✦ چتر کھولے ہوئے فرق شہ گل پر سنبل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں ✦ لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل
آہ قمری میں مزہ اور مزے میں تاثیر ✦ سرو میں دیکھئے پھول آنے لگے پھول میں پھل
شاخ پر پھول ہیں نباتات میں زمیں پہ سنبل ✦ سب ہوا کھاتے ہیں گلشن میں سوار و پیدل
پھول لوٹے ہوئے پھرتے ہیں روشن پہ نسیم ✦ یا سرک پر ہیں ٹہلتے ہوئے گلگوں کوتل
شجرے میں پیر مغاں کے نکل آئیں شاخیں ✦ حرمت دختر رز میں نظر آتا ہے خلل
ساتھ ساتھ آتے ہیں نالوں کے جگر کے ٹکڑے ✦ غنچۂ آہ رسا میں نکل آئی کونپل
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخی لب ✦ چمن حسن سے لال اُڑ گئے بنکر ہریل
صاف آمادۂ پرواز ہے شایاں کی طرح ✦ پر لگائے ہوئے مژگان صنم سے کاجل
خندہ ہائے گل قالیں سے ہوا شور نشور ✦ کیا عجب ہے جو پریشان ہے خواب مخمل

اس مضمون میں حضرت محسن کے قصیدے کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ۔

کراچی کی

آج کل کی نظم میں اگر بیگانہ اور غیر مانوس الفاظ لانے ہوں تو اسطرح لائے جائیں کہ مضمون میں کھپ جائیں۔ حضرت بیاں نے ناسخ کی مشہور غزل جو کہ بالکل عاشقانہ تھی معرکہ کربلا کے ذکر میں کس خوبصورتی سے کھپادی کہ از روئے شاعری بیگانگی کا نام نہیں رہا :-

گرہ بے بدل و سرکہ شراب غزل در ماتم نور دیدہ رسول عز و جل

ہوا جب کوچ سوئے کربلا شاہ شہیداں کا — مدینہ تیرہ و تاریک تھا محبوب یزداں کا
کہا صغریٰ نے شعلہ جیکہ ہجر کا سوز پنہاں کا — مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

تصور زلف اکبر کا دل بیکس میں رکھتے ہیں — خیالات پریشانی عجب مجلس میں رکھتے ہیں
وہ گھونگر والے گیسو انکو اپنے بس میں رکھتے ہیں — ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دل پر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلف پیچاں کا

زمین نینوا میں قافلہ یثرب کا اترا ہے — زمیں سے وادی ایمن فلک تک نور پھیلا ہے
رخ شہ کی تجلی سے زمینداروں میں چرچا ہے — کسی خورشید رو کو جذب دل نے آج کھینچا ہے
کہ نور صبح صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

محب ماہ عزائے شاہ دیں میں جان کھوتے ہیں — بہار آتی ہے ماتم کی لہو آنکھوں سے روتے ہیں
پہنتے ہیں ہرے ملبوس منہ اشکوں سے دھوتے ہیں — شگفتہ مثل گل ہر فصل گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہی کیا ہمارا کالبد خاک گلستاں کا

شفق کا ہیکو تھی قبل از شہادت باکبھی زردی
یہ سرخی آسمانپر ماتم شہ نے عیاں کردی
غبار کربلا اور غازۂ گردوں زہے مردی
شفق سمجھا ہے اسکو ایک عالم وائے بیدردی
فلک کو گر گلولہ جا لگا خاکِ شہیداں کا

نبی کی آل کو کیا کام تھا غربت میں جینے سے
اگر یہ دیوار زنداں کی کھلے در ان کے رونیسے
جلائی شمع ہند نہ تب کہا زینب نے کونے سے
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یہاں عالم چراغاں کا

بتا ای چرخ کیا مذہب ترا کیا رسم ملت ہے
محمد کے حرم میں گوشۂ زندان امت ہے
کہا عابد نے ہے ای بیکسوں پر کیسی عبرت ہے
مرا ویرانہ مثل آئینہ معمور حیرت ہے
یقیں ہر روزنِ دیوار یہ ہے چشم حیراں کا

شہِ مظلوم کو صغریٰ نے لکھا حال سب اپنا
کہ بابا جی بہت گھٹتا ہے تنہائی میں اب اپنا
کہا تمسے نہیں روح الامیں نے کیا تعب اپنا
جنوں نے ہجر کی شب ہاتھ دوڑا ہے جب اپنا
کیا ہے چاک تا جیب سحر اپنے گریباں کا

جو چاہو روشنی بزم عزائے اہلِ ایماں میں
نہ بھولے یاد اکبر مومنو گریہ کے طوفاں میں
ملایک رو کے کہتے ہیں زبانِ شمع سوزاں میں
چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابر باراں میں
تصور چاہیئے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کہا شہ نے حسن کے بعد زینت اٹھ گئی یکسر
نہو گا غیر خون گلگونہ روئے ضیا پرور
زمانہ دشمن جاں ہے نہیں تم دیکھتیں خواہر
جو سرخی آتی ہے عکسِ شفق سے بھی مرے منہ پر

مسدس

حسد سے رنگ ہوتا ہے مبدل مرغ گردوں کا

زباں مفتاح دل گنجینہ معنا سمجھتے ہیں
قلم کو اژدہا پنجہ ید بیضا سمجھتے ہیں
زبس سینہ کو بیشہ شیر یزداں کا سمجھتے ہیں
صریر کلک کو اب شیر کا نعرا سمجھتے ہیں

یقیں اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستاں کا

بیاں کہتا ہے سچ آساں نہیں عشق خدا ناسخ
یہ رتبہ تھا برائے بادشاہ کربلا ناسخ
شہادت کی خوشی تھی عاشق صادق کو یا ناسخ
تہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ

کہ عالم ہر دہان زخم پر ہے روئے خنداں کا

غزل۔ لسان الملک جناب ریاض

پس کے محشر تری رفتار ستم سے اٹھا ؛ ایک غبار آج بیابان عدم سے اٹھا
مجکو ہنسنے کے لئے غیر بھی آ بیٹھا تھا ؛ وہ بھی گھبرا کے مری محفل غم سے اٹھا
سر فرشتوں کے پڑا دفتر عصیاں کیسا ؛ ہم نے یہ بار اٹھایا تو نہ ہم سے اٹھا
کیا کہا عہد وفا ہوگا ترے سر کی قسم ؛ اعتبار آج ترا تیری قسم سے اٹھا
تیری رفتار نے پامال یہ محشر کو کیا ؛ گرد کی طرح بیابان عدم سے اٹھا
ہاتھ سے بوجھ گناہوں کا اٹھے گا کیونکر ؛ رعشہ ایسا ہے کہ ساغر بھی نہ ہم سے اٹھا
تیری رفتار کی شوخی نے قیامت ڈھائی ؛ فتنۂ حشر ترے نقش قدم سے اٹھا
ہو رہیں گے کسی میخانے کے ہم بھی جا کر ؛ آب و دانہ جو کبھی دیر و حرم سے اٹھا

میری محفل میں ریاضؔ آکے وہ بیگانہ رہا
لطفِ صحبت کا نہ کچھ شرکتِ جم سے اُٹھا

صلائے عام۔ لسان الملک حضرت ریاضؔ نے یہہ غزل صلائے عام کے لئے بھیجی ہے۔ یہہ امتیاز صلائے عام کو حاصل ہے کہ حضرت ساذی کمال اپنا کلام اس کے لئے بھیجتا ہے: مدیر صلائے عام کو اس بات پر ناز ہے۔ آپکا کلام یوں بھی لاجواب ہوتا ہے۔ اس غزل میں یہہ شعر بے مثل ہیں:-

سر فرشتوں کے پڑا دفترِ عصیاں کیسا + ہم نے یہ بار اُٹھایا تو نہ ہم سے اُٹھا
کیا کہا۔ عہد۔ وفا ہوگا ترے سر کی قسم + اعتبار آج ترا تیری قسم سے اُٹھا

ہو رہیں گے کسی میخانہ کے ہم بھی جاکر
اب وہ دانہ جو کبھی دیر و حرم سے اُٹھا

آخر کے شعر کی تعریف جس قدر کی جائے تھوڑی ہے۔ دیر و حرم اور میخانہ سب نے باندھے مگر اس خوبصورتی سے ان کا ایک جگہہ باندھنا مشکل ہے۔ مضمون کس قدر صاف ہے کہ نثر میں بھی یہہ خوبی پیدا ہو نہیں سکتی +

مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں کی وفات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اہل سخن میں حضرتِ ریاضؔ نے نہایت سچے دل سے مجھے لکھا کہ: × × × × × ×
"میں حکیم اجمل خاں صاحب کے علاج سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ وہ میرے لئے مبارک۔ میں اُن کے لئے نحس ثابت ہوا" × × × × × × × × × × ×

لسان الملک جناب ریاضؔ کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "مجھسے تو اب شعر بھی نہیں کہا جاتا۔ اب کی نذر ئے کہن سال ہے" ؛ خدا کے لئے کہیں شعر کہنا نہ چھوڑنا!

انتخاب از کلام جناب اشک

جناب ابو الکمال لطفؔ لکھنوی نے حضرت اشکؔ کے کلام سے یہہ شعر انتخاب کرکے صلائے عام کے لئے بھیجے ہیں۔

[illegible]

اے قیس ہے وہ آہ جو الفت میں کام آئے
کب تک رہیگا پردۂ محمل پہ اختیار

بجلیوں پہ بجلیاں گرنے لگیں
آشیاں جب تک رہا گلزار میں

اٹھی ہے میری طرح آمادۂ راہِ عدم
ہے پیری یا کفن پہنا ہے شمع زار نے

کبھی فخر ان سے ڈرنا اور کبھی قبروں کو ٹھکرانا
جوانی زیب ہے بچپن اور بچپن میں جوانی ہے

ابھی سمجھا ہے چاک پردۂ چشم
مروت آنکھوں سے ناز کون کرے

کیوں تھکا جاتا ہے او لاش اٹھانے والے
اور بس چار قدم ہیں کہ لحد دور نہیں

اے خوشا قسمت خزاں ہو کر کسی کے گل کھلا
قبر پر وہ ہار لائے ہیں جو کل گردن میں تھا

کیا کشش تھی کھنچ گیا خود قاب پیکاں دیکھکر
بلکہ یوں کھنچے ادائے ناز جاناں دیکھکر

اب خدا جانے کہ تو ہے کہ ترے عکس کا نور
آئینہ دیکھ لیا تیرے تماشائی نے

یہ تصور نہ گیا خواب پریشاں کی طرح
مجھکو سونے نہ دیا آپ کی انگڑائی نے

ہے مرے پیشِ نظر وسعتِ دنیائے خیال
تشنہ کو کھینچ لیا عالمِ تنہائی نے

بلا تشبیہ حلق پہ کیواں کا خنجر چل گیا
نزع کی ہچکی صدائے نازِ بسمل نہ تھی

حال پھیلائے ہیں حسن والے یوں پڑھو
سورۂ یوسف یہاں ہم ماہ کنعاں دیکھکر

انتخاب کلام ذرا بڑا ہے۔ اتفاق سے اس پرچہ میں پوری داد کی گنجائش نہیں: علاوہ اس کے اتنی برس کے بوڑھے سے اس قدر شعر (یعنی سو سوا سو) دیکھنے اور سمجھنے کی امید رکھنی میری ضعیفی پر ظلم ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ کلام بہت پاکیزہ ہے + دو چار شعر پھر سن لیجئے کہ اس زیادہ پاکیزہ کلام

اور کیا

اور کیا ہوگا؟ دوبارہ پڑھنے کی تکلیف اس لئے دیتا ہوں کہ رسم مشاعرہ کی موافق جو شعر زیادہ پسند ہوتا ہے پھر پڑھوایا جاتا ہے۔

اے خوش قسمت خزاں پہ سبقت لے گئی گل سے سنبھلے
نمبر ۲ وہ بہار لائے ہیں جو جیب سے گردن میں تھا
(بہت خوب کہا - دوسرا مصرع لاجواب ہے)
نمبر ۲ وہ بہار لائے ہیں جو جیب سے گردن میں تھا
ع نمبر ۲ وہ بہار لائے فصل خزاں کا مال
سنتے ہیں فصل خزاں میں ہم بہار میں
ہاں نمبر ۲ ہوئے ہیں اسے خیال
سب یاد ہم صحبت دنیا سے
ہے مرے پیش نظر عالم نہ بانی نے
حسن سمیٹ لیا

اے صورت شرر دیکھو زیادہ نہ شور کر
ہونا ہے ایک عمر کا جا بجا شرار میں
سنا ہے ایک ساعت کی اس جبر کو ترک
سفر کے بند ہوئے پھر ہو گئی آس
سرا وقادہ گیا آسے کرد وادہ بنا داد الا
یہ بھی ہے میری طرح آمادۂ راہِ عدم
جو سپیدی کا کفن پہنا ہے شمع مزار نے
سمجھا قبروں سے دنیا اور سمجھا قبروں کو ٹھکانا
جوانی ہے بچپن اور بچپن میں جوانی ہے

تبدیلِ عقائد

تھوڑے عرصہ سے شُدّھی اور تبلیغ کا جو ہندوستان میں چرچا ہو رہا ہے اور حال میں مس بلر صاحبہ کا باضابطہ عیسائیت سے ہندو مذہب میں آنے کا شور ہے۔ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی تحقیق بلا رو و رعایت از روئے سائنس و فلاسفی ہو سکے تو معلومات کے لحاظ سے مناسب حال ہے ٭

ہندوستان میں پہلے تو جب مسز بسنٹ صاحبہ نے عقائدِ مذہبی میں انقلاب پسند کیا تو کچھ دنوں اس کا ذکر اخباروں میں بہت رہا۔ اب مس بلر صاحبہ کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں آنے والی ہیں ٭ ایسے وقوعے شخصی اور ذاتی سمجھنے چاہئے۔ شُدّھی اور تبلیغ عام تحریکیں ہیں ٭

دُنیا میں صرف دو مذہب یعنی اہل ہنود اور یہودی ابتک غیر قوم اور غیر مذاہب سے علیحدہ رہے۔ کہ برہمن وہی سمجھا جاتا ہے جس کے ماں باپ از روئے حسب و نسب برہمن ہوں اور یہودی اُسی کو سمجھتے تھے جس کے آباؤ اجداد یہودی ہوں ٭ عیسائی مذہب نے یہودیوں سے علیحدگی اختیار کی کہ ہر قوم اور مذہب کا آدمی عیسائی ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضرت عیسٰی کا آخری اور ضروری پیغام اپنے حواریون کو یہی تھا کہ اپنے عقاید کی منادی کرو جسے تبلیغ کہنا چاہئے ٭ اس میں پہلے یہہ گفتگو رہی کہ اولاً خویش بعدہٗ درویش

سکے اُو

کے موافق یہود یوں کا حق مقدم ہے۔ مگر اس سے کام جب نہ چلا تو ہر قوم کے لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہوئی + اسلام نے شروع سے اپنے مذہب کا بڑا جزو یہی قرار دیا کہ تمام مخلوقِ خدا کو مذہب اسلام کی خوشخبری پہونچانی چاہیئے + عیسائیوں کی تبلیغ گویا اُنیس سو اٹھائیس برس کی پُرانی ہے اور مسلمانوں کی ۱۳۴۷ سال کی ہے۔ شُدھی سے غرض اگر غیر مذہب کے لوگوں کو اہلِ ہنود میں ملانا ہے تو یہہ بھی ایک طرح کی تبلیغ ہے مگر بہت ہی نئی۔ اور نئے ہونے کی وجہہ سے پُرانے خیال کے لوگوں کے دلوں میں کم و بیش کھٹکتی ہے +

تبدیل عقاید کا خیال انسان کے دل میں ہر وقت اور ہر زمانہ میں نہیں ہوتا فرداً فرداً تو اس کا خیال سن بلوغ سے شروع ہوتا ہے: اس لئے نابالغ کے ذمہ فرائض مذہبی کی ذمہ داری عاید نہیں کی جاتی۔ ہاں ان مذاہب میں سوائے دو ایک بزرگوں کے سب نے بالغ ہونے کے بعد اپنے اپنے عقاید کی تعلیم شروع کی۔ مذہبی تعلیم کا اثر سُننے والوں میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے دلوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ ہر مذہب کی عورتیں مردوں سے زیادہ اپنے عقاید میں مضبوط پائی جاتی ہیں +

کسی نئے مذہب و عقیدہ کا اثر اُس وقت لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے جب کہ اُس وقت کے موجودہ عقائد کے لوگوں میں از روے اعمال اور اطوار ضعف نظر آتا ہے۔ عیسائی مذہب کی ترقی اُس وقت زیادہ ہوئی جب کہ اُس زمانہ کے غیر مذاہب کے لوگوں میں از روئے اطوار و اعمال شکایت پیدا ہوئی + انسان کو اپنے اعمال

کی سزا کا خوف زیادہ ہوتا ہے اور جزا کی اُمید بہت کم۔ کم اس لئے کہ ہر شخص کی گھٹی میں یہہ بات پڑی ہوئی ہے کہ ہم گنہگار ہیں اور گنہگار کے لئے خوف ہی زیب دیتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اُمید کے مقابلہ میں خوف کا اثر پندرہ گُنہ بڑھکر ہے۔ اور خدا سے ملنے کی خوشی (جو عقاید صوفیہ میں داخل ہے) مشکل سے ۵ فیصدی۔ اس سے آپ دیکھ لیں کہ بہشت سے زیادہ دوزخ کا خوف انسان کے لئے کارگر ہے۔ رہا یہہ خیال کہ خُدا سے ملیں گے خدا کرے سب کو ہو۔

جو لوگ کسی نئے مذہب میں آتے ہیں اُن کو گو آپ کسی نگاہ سے دیکھیں مگر اِن کی اولاد نئے عقیدے کی بڑی پکّی نکلتی ہے۔ اس لئے کسی عقیدے کی تبلیغ سے گو سر دست بہت فائدہ نہ ہو مگر آگے کو یہہ ڈھنگ بہت کام آتا ہے۔

کسی نئے عقیدہ کے اختیار کرنے میں بہ نحوائے کُلّ جدیدٌ لذیذٌ نئی حالت پیدا ہونے سے نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نیا مرید پرانے سے زیادہ سرگرم ہوتا ہے جس طرح جو لوگ جمنا کے کنارے پر رہتے ہیں اُن کو جمنا کے دیکھنے کا اس قدر شوق نہیں ہوتا ہے جس قدر دور سے آنے والوں کو ہوتا ہے۔

کسی مذہبی عقیدہ میں انقلاب سوائے دل و دماغ کے اثر کے کوئی اور تعلق بہت فائدہ مند نہ سمجھنا چاہئے۔ یعنی پہلے خوب تسلّی کر لی جائے کہ ہرگز کسی ظاہری و دنیوی ہوس سے تو واسطہ نہیں۔ اور ایسی صورت شاذ و نادر ہوتی ہے کہ بالکل خالص نیّت سے عقاید میں انقلاب پیدا ہو۔ نئے عقاید والے بھی پُرانے رسم و رواج سے

فوراً

فوراً قطع تعلق نہیں کرتے۔ بلکہ بقول جناب نصیر دہلوی اکثر" اگلے برس کی تیاریوں" سے کام چل جاتا ہے ❖

آپ غور سے دیکھیں تو ہر مذہب میں خدا، رسول اور عاقبت کا عقیدہ ضرور ہے (رسول سے مراد پیغمبر و ہادی اور عاقبت سے مرنے کے بعد جزا و سزا) اس عقیدہ کے بغیر کوئی سوسائیٹی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں کم و بیش افراط تفریط بھلے ہی کر لی جائے ورنہ کسی طرح کی سوسائیٹی کیسی ہی کیوں نہ ہو کسی کو اس سے مفر نہیں ❖

انسان کے لئے عقائد کے ساتھ نیک اعمال کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہر عقیدہ کی رونق اعمالِ نیک سے ہے اور خدا کا خوف نیک اعمال کی جڑ ہے ❖

غزل (از سید معین الدین قیس رضوی عظیم آبادی مؤلف گلشن حیات

پی مگر چھپ کے کسی اور ہی میخانے کی　آگے زاہد کے جگہ رکھ لی قسم کھانے کی　دیدہ روشن نہ ہوئی شمع کے جل جانے کی
ہونہ ہو آتشِ باطن تھی وہ پروانے کی　دلِ صد پاش ہے مینائے خراباتِ بہشت　قدر اللہ رے ٹوٹے ہوئے پیمانے کی
پھر تو خود میری زبانی وہ سنیں آخر تک　ابتدا تو کوئی کر دے مرے افسانے کی　سخت جانی سے خجل ہوں ترے خنجر قاتل
کہیں تکلیف نہ رہ جائے ترے شانے کی　جس نے تیری گلِ رخسار کی ہوس کی ہے　وہ کلی تا بہ قیامت نہیں مرجھانے کی
جب کہیں حسنِ مجرد متجلی ہو کا ز ہو　کوئی پرچھائیں بھی دل میں ہو بیگانے کی　پی تھی جس جام میں تو نے کہ مرے ساقی نے
میں نے بھی پی ہے وہی مئے اسی پیمانے کی　تو نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا کہ کدھر مرتا ہے　ایک یہی بات کیا کم مرے مرجانے کی
اب تو کرنے لگے بہکی ہوئی باتیں ناصح　لاؤ اتری ہوئی بیڑی کسی دیوانے کی

قیس انہیں رستوں سے کیوں جاتے ہو کعبہ کی طرف
دل ہی بھولیں نہیں راہیں تمہیں بت خانے کی؟

جامۂ عاریت

یہہ سُرخی مجھے حضرت شیخ سعدیؒ کے اُس شعر سے سوجھی جو گلستاں کے خاتمہ میں ہے کہ ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن ٭ بہ از جامۂ عاریت خواستن

حضرت کو تو نظم و نثر دونوں میں کمال تھا۔ نثر میں جہاں شعر کی ضرورت ہوئی اُن کے اپنے ہی شعر لاجواب موجود تھے: لیکن جس کے پاس گھر کے کپڑے کسی تقریب میں جانے کے لایق نہ ہوں تو عُریانی سے لباسِ عاریت بُرا نہیں: ذلت اُس کی ہے جسکو مانگے کے کپڑے بھی میسّر نہ ہوں ؛

اِس وقت مجھے میری طبیعت جواب دے رہی ہے اور صلائے عام کے مہتمم میری جان کو آرہے ہیں کہ ایک مضمون اور لکھ دیجئے تاکہ رسالہ کا پیٹ بھر جائے۔ جس طرح عدالت کے منشیوں کی اصطلاح میں اکثر غیر ضروری کاغذات اس غرض سے شامل کئے جاتے ہیں کہ مِسل کا پیٹ بھرنا منظور ہوتا ہے: یا "برائے بیت" سمجھئے ؛

اس مضمون میں پرائے خیال اور غیر زبان کے دو ایک اقتباس لکھے جاتے ہیں تاکہ مہتمم صاحب کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے ؛

قدیم یونان کی لٹریچر میں حضرت عیسٰیؑ سے سوا دو سو برس پہلے کِلِن تھیز[۱] نامے ایک

[۱] کِلن تھیز اُس فلاسفی کا مُستند فلاسفر تھا جو اسطوئیک فلاسفی کے نام سے مشہور ہے ؛

ایک فلاسفر گزرا ہے جس کے آخری خیالوں کا اقتباس یہہ ہے کہ :۔

× × × × × × × × × × × × × ×

اے خدا! تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے مجھے پیدا کیا۔ مجھے زندگی جیسی نعمت عطا فرمائی۔ تندرستی اور درازیٔ عمر بخشی؛ اس کے ساتھ دل ایسا دیا جو مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تمام دنیا کی مردانگی کا خلاصہ اور ثمرہ یہی ہے ÷ یہہ تیری رحمت ہے کہ مرنے کے بعد میری ہستی کے اجزا جنہیں عناصر کہتے ہیں برباد نہ جانے دیگا جب تک کہ میرے لئے پھر کوئی صورت نہ پیدا ہو ÷ (یہہ صورت تیرے اختیار میں ہے۔ چاہے تناسخ ہو چاہے حشر)

خدایا! مجھے کبھی کبھی شبہہ ہوا کہ مرنے کے بعد خدا جانے کیا ہوگا ÷ گو ہستی جیسی نعمت جو میرے وہم و گمان میں نہ تھی تو نے بے طلب مجھے عطا کی۔ مگر مجھے اندیشہ ہوا کہ مرنے سے شاید تمام انعامِ الٰہی کا خاتمہ ہو گا کہ مرنا گویا "تممت علیکم نعمتی" کی شرح ہے ÷

مگر اے خالق میرے! میرا کوئی حق نہیں کہ مرنے کے بعد میں اپنے تئیں تجھسے کسی خاص رعایت کا مستحق سمجھوں۔ جو زندگی کہ تو نے عطا کی اسیکا احسان کیا تھوڑا ہے کہ مرنے کے بعد زیادہ پاؤں پھیلاؤں۔ لیکن تو رحیم و کریم! یہہ سمندر کی لہریں جو ایک کے بعد ایک پے در پے بنتی اور بگڑتی چلی جاتی ہیں اسی پانی سے پیدا ہوئیں۔ اسی میں پیدا ہوئیں اسی میں مٹ گئیں : اور اسی میں پھر پیدا ہوں گی۔ اسی طرح بنتی اور بگڑتی چلی جایں گی : بگڑیں گی اور پھر بنیں گی۔ ان کا بنانا اور بگاڑنا سب تیرے اختیار میں ہے[1] ÷

[1] کلن تھیمز نے یہہ باتیں مرتے وقت سمندر کے کنارے دریا کی لہروں سے مخاطب ہو کر کہیں ÷

صلائے عام۔ یہہ طرزِ بیان میرا نہیں۔ یونانی لٹریچر کا فلسفیانہ طرز ہے۔ جو از روئے خدا ترسی خدا پاک سے عاجزی کی دعا کا اچھا نمونہ ہے؛ صلائے عام کے لئے "جامہ عاریت"

اس کے بعد دوسرا مضمون جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے یہہ لانگ مین کے میگزین سے بطور اقتباس اخذ کیا گیا۔ اس کا مسالہ کم و بیش انگریزی کی اُس نظم سے لیا گیا جس کی سُرخی ہے The ThingCalled Love.

ع عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہئے؟

سین یہہ ہے کہ جنگل میں ایک اچھی صورت کی کم سن عورت بے یار و مددگار اکیلی دم توڑ رہی ہے۔ "بے یار" میں نے اس لئے کہا کہ کمبخت اس کا آشنا اسے جنگل میں اکیلا چھوڑ گیا: ایک معصوم بچّی اس کی گود میں ہے + ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں یہہ اس لئے نہیں رو رہی ہے کہ اسے اپنی تنہائی اور بے کسی میں مرنے کا افسوس ہے بلکہ اُس معصوم کا خیال ہے کہ خدا جانے میرے بعد اس پہ کیا گزرے گی؟

شام کا وقت ہے جسے جُھٹ پٹا کہتے ہیں۔ سُنا ہے کہ دونوں وقت ملتے جنگل میں پریوں کے نکلنے کا وقت ہوتا ہے + اس وقت پریوں میں سے کسی کا گُزر اس طرف کو ہوا۔ مرنے والی کی حالتِ زار دیکھ کر اُس فرشتہ خصلت پری کو ترس آیا + کہتے ہیں کہ ہر بچّے کی پیدائش کے وقت سے ایک فرشتہ بطور محافظ بچّے کے ساتھ رہتا ہے وہ پری اس بچّی کی محافظ فرشتہ نکلی + دیکھنے میں آیا ہے کہ ننھے دُودھ پیتے بچے جو خودبخود مسکرایا کرتے ہیں فرشتوں سے باتیں ہوا کرتی ہیں: فرشتے کہو یا پریاں کہو +

بچی نہایت

بچی نہایت حسین تھی۔ فرشتہ کو جو پری کی صورت میں تھا بچی پہ بہت ترس آیا: ماں سے کہا کہ اس بچی کو میں لئے جاتا ہوں۔ اس کی حفاظت و پرورش میرے ذمہ ہے تو اس کا غم نکر۔ میں اس کو ہر آفت سے بچاؤں گا ✦ تجھے اپنی بچی کے حق میں جو کچھ مجھ سے کہنا ہو کہہ۔ سبب یہہ کہ اس نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے اور تو دیکھ چکی ہے کہ دُنیا میں زندگی کیا چیز ہے؟ تجھے اپنی بچی کے لئے جو کچھ مجھ سے مانگنا ہو مانگ ✦

مرنے والی نے کہا کہ بچی آپ کے حوالہ ہے۔ آپکی عنایت کی میں بہت ممنون ہوں: میں اس کے لئے کیا مانگوں؟ مانگنا تو درکنار۔ بلکہ میں اس کو ایک چیز سے بچانا چاہتی ہوں۔ وہ یہہ ہے کہ اس کو چاہنے سے محروم رکھنا کہ چاہنا تمام مصیبتوں کی جڑ ہے: تمام دنیا کی آفتوں کی جڑ محبت ہے۔ اس کو محبت سے بچانا کہ محبت کی طاقت ہی اسے نصیب نہو۔

فرشتہ نے جواب دیا کہ یہہ آرزو تیری ضرور پوری ہوتی مگر چاہنا تو جان کے ساتھ ہے اور جان کے ساتھ دل ہے۔ دل پہ قابو رکھنا مشکل ہے ✦ مگر اتنا کروں گا کہ اس کے دل کو روکے رکھوں گا جب تک کہ یہہ اپنے نفع نقصان سے واقف نہ ہو اور خود مجھ سے رونے کی طاقت چاہے اور محبت کے ساتھ کسی کے غم میں رونے کی: محبت کے لئے رونے کا شیوہ ضرور ہے ✧

ماں تو بچی کو چھوڑ کر دُنیا سے رخصت ہوگئی: بچی بڑی ہوئی۔ بچپن سے شباب کی طرف چلی۔ مگر نہ کسی کو چاہا نہ کسی کی جدائی کا غم کیا: اس کے حسن و جوانی پہ سب نے اس سے محبت کی مگر اس کو کسی سے محبت نہ ہوئی ✧ گلے کے ہار مرجھا گئے تو اتار کر پھینک دیے

پھر اٹھا کر نہ دیکھے : باتیں کرتی ہوئی مینا مرگئی تو پنجرے سے نکال کر باہر ڈال دی۔ ہرن کا بچہ جس سے کھیلا کرتی تھی چلا گیا تو دوسرا پال لیا۔ نانی کا انتقال ہوگیا تو اتنا پوچھکر رہ گئی "کہاں چلی گئیں"۔ کسی نے پیار کیا تو منہہ بڑھا دیا مگر دوسرے کو پیار نہ کیا ♦ غرض ہر طرح غضب کی بے لگاؤ زندگی بسر کی ♦

ابھی کچھ لڑکپن اور آغاز جوانی تھی کہ ایک نوجوان اس کی نظر سے گزرا۔ جس کے خط و خال حسینوں کی بلائے جان تھے : سب نے اس نوجوان کی تعریف کی۔ اس نے بھی دیکھکر تعریف کی اور خوش ہوئی ♦ جب وہ ملتا اُسے دیکھ کر خوش ہوتی : لیکن اس سے زیادہ نہیں ♦

ایک دن جوان کو شاہی خدمت کی وجہہ سے (کیونکہ جوانمردی و بہادری میں بہت مشہور تھا) کسی مُہم پر جانے کا حکم ہوا۔ مُہم سخت تھی جس سے زندہ لوٹنے کی اُمید نہ تھی : جوان نے اس ماہ وش سے مُہم کا حال بیان کیا اور کہا کہ اگر میں مارا گیا تو تم میرے لئے آنسو بہاؤ گی ؟ جواب دیا کہ رونا مجھے نہیں آتا ♦

اتفاق سے اُس مُہم میں وہ مارا گیا اور اُس کی لاش پر اس کی نظر پڑی تو بے اختیار آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس قدر روئی کہ ہچکی بندھ گئی اور ہچکیاں آتے آتے دم نکل گیا ♦

اُس وقت ہاتف نے آواز دی کہ چاہنے کے ساتھ رونا لازمی ہے سو یہہ تو ممکن ہی نہیں دل لگے اور جان بچے ♦ صاحب خانہ یہ ہو آفت وہماں بچے ♦

ہمارے ہاں کی مثنویوں میں عشق و محبّت کے ایسے افسانے بہت ہیں۔ اس میں یہہ بات خاص ہے کہ خدا کسی کو کسی کی محبّت نہ دے: نہ محبّت ہوگی نہ غم ہوگا ؛ دلوں کی موت چاہنے والوں کی مرضی سے وابستہ ہے ؛

میں نے یہہ قصّہ اس لیئے چھیڑا کہ صلائے عام کے آغاز میں صلائے عام سے یہہ غرض رکھی گئی ہے کہ یورپ کے اچھّے اچھّے خط و خال ہماری زبان میں جس قدر ہو سکے دکھائے جائیں: یعنی

The Assimilation of the best features of the new civilization and English Literature.

یہہ مختصر نظم انگریزی کے ایک پُرانے رسالہ میں شایع ہوئی تھی جسکا نام LONGMAN'S MAGAZINE ہے ؛ مطبوعہ ۱۸۸۲ء

میں نے ایک فرنچ مُصنّف کی رائے پر تعجّب کیا جس نے لکھا ہے کہ انسان اگر اپنی زبان میں زیادہ باتیں کرنی پسند نہ کرے تو غیر زبان جب نئی نئی سیکھتا ہے تو اپنی زبان سے غیر زبان میں زیادہ لمبی چوڑی تقریریں کرنے پر جان دیتا ہے۔ یہہ تعجّب میرا جاتا رہا جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے جلسوں لقریبوں اور کونسلوں کی بحثوں میں اکثر ہندوستانی انگریزی میں فخریہ بڑے زور کی تقریریں کرتے ہیں اور اپنی زبان میں معمولی دو چار فقرے بھی زبان سے نہیں نکال سکتے ؛

اس پر مجھے خیال ہوا کہ ہمیشہ نہیں تو اکثر "جامۂ عاریت" حضرت شیخ سعدیؒ کے "کُہن خرقۂ خویش" سے زیادہ اثر کر جاتا ہے۔ اس سے مجھے اُمید ہے کہ اس پرچہ کے پڑھنے والے میرے مضمونوں سے پرائے مانگے کے مضمون زیادہ پسند کریں گے ؛

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چہ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے:

مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں: اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے:

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی لباس عروس جمیل و لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے:

اکثر صاحب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسری صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایکروپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی:

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبان اردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے	[illegible]
,, ,, چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
,, ,, ,, تین ماہ کیواسطے	[illegible]
,, ,, نصف صفحہ ایکسال کیواسطے	[illegible]
,, ,, چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیلیے	[illegible]
,, ,, ,, چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
,, ,, تین ماہ کیواسطے	[illegible]
,, ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے	[illegible]
,, نصف صفحہ ,, ,,	[illegible]
,, چوتھائی صفحہ ,, ,,	[illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دگنی اُجرت ہے: اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں آجانا چاہئے:

مینیجر صلائے عام

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:-
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خان بہادر -

میر ناصر علی خان بہادر ایڈیٹر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد علی چھپا اور شایع ہوا
Printed and Published by Mir Nasir Ali khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrkhana Delhi

صلائے عام

SALA-I-AM, DELHI.

[illegible]

[illegible]

فہرستِ مضامین

بابت ماہ اگست ۱۹۲۸ء

صلائے عام

THE HONOURABLE SIR JOHN THOMPSON

SAHIB BAHADUR, K.C.S.I., K.C.I.E., &C &C,

CHIEF COMMISSIONER, DELHI.

جمال کا لیداس جی نے لکھا ہے کہ دنیا میں بہت کم کمال اور اقبال کا ساتھ دیکھنے میں آتا ہے لیکن جہاں یہ دونو نعمتیں ایک جگہہ جمع ہو جائیں اس سے بڑھ کر کوئی موقع مبارکباد کا شاذ ہی ہو سکتا ہے +

حضور کے (جن کا نام نامی زیب عنوان ہے) کمالات علمی کے ساتھ یہ بڑی خوبی ہے ابتدائے عالی کو شروع سے **دہلی** سے بہت محبت ہے اس شہر کے متعلق حضور کی معلومات تاریخ عالی کا مرتبہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ شاید ہی کسی اور کو حاصل ہو۔ دہلی کی تاریخ و تحقیق میں حضور کو دہلی والے حاصل ہے: اس شہر کی خوش نصیبی ہے کہ دلی کا ایسا قدر شناس و قدر دان اسے نصیب ہوا +

سرکاری اعلیٰ اعلیٰ خدمتوں کے سوا سنہ ۱۹۱۱ء کے **دہلی** دربار کے جشن تاجپوشی میں آپ نے اعلیٰ حضرت **ملک معظم شہنشاہ ہند** خلد اللہ ملکہم کے ملاحظۂ اقدس کے لئے جو قلعۂ معلیٰ میں عجائب خانہ و نمائش گاہ کا انتظام و اہتمام کیا وہ دلی کی تاریخ میں ایسا کارنامہ تھا جو بطور یادگار قایم رہے گا +

ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ کے مطابق اس مختصر گزارش سے حضور کی ثناگستری کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس قدر عرض کرنی ضرور ہے کہ بندگان عالی کو صوبہ **دہلی کا چیف کمشنر** دیکھ کر دلّی اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کرے تھوڑا ہے +

معروضہ
(سید ناصر علی)

دہلی

۲۳۔ اگست سنہ رواں کو میڈن ہوٹل میں جناب صاحب چیف کمشنر بہادر صوبۂ دہلی کی تشریف آوری کی تقریب میں جو دعوت ہوئی اُس میں صاحب ممدوح نے دِلّی سے اپنی محبّت کا ذکر اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا اس سے پہلے صلائے عام (دہلی) میں مختصراً یہی گزارش کیا گیا تھا: یہہ حُسنِ اتفاق ہے کہ حضور کی زبان سے وہی آویزۂ گوشِ سامعین ہوا اور بہت مفصّل +

دلّی (بموجب ارشادِ بندگانِ عالی) قدیم سے تہذیب وشائستگی کا مرکز رہی ہے۔ جس طرح بغداد خلفاء عبّاسیّہ کے زمانہ میں۔ قرطبہ اسپین میں اتھنس یونان میں اور روم اِٹلی میں + یوں تو ہندوستان میں اور بھی اچھے اچھّے زمانے گزرے ہیں مگر آخر میں سلاطینِ مُغلیہ کا زمانہ بھی یادگار رہا ہے۔ جن کے زمانہ میں تہذیب وشائستگی کی خاصی ترقّی ہوئی: "خاصیٔ میں نے مصلحتاً عرض کیا کہ زیادہ طرفداری مبالغہ نہ سمجھی جائے + بغداد میں ہارون رشید کا۔ اسپین میں سلطان عبدالرحمٰن کا۔ اور سلاطینِ مُغلیہ میں اکبر کا زمانہ بہت اچھا گزرا: مسلمانوں میں یہہ تین سلطنتیں ازروے علم وفضل نامور گزری ہیں +

ہندوستانی

ہندوستان کے شہروں میں دلّی کے برابر کوئی مقام اتنا قدیم نہیں جس کو اس قدر عروج و شہرت نصیب ہوئی ہو۔ اُجین۔ چتّور۔ قنّوج۔ مانڈو۔ دھار وغیرہ اور چند مقامات قدیم ضرور ہیں لیکن اب اُن کا ذکر صرف آثارِ قدیمہ کی کتابوں میں رہ گیا ہے دلّی سو بار بگڑی اور بگڑ بگڑ کر بنی۔ اس کا نام تاریخ میں سیاہی سے نہیں بلکہ آبِ حیات سے لکھا ہوا ہے مسلمانوں سے پہلے بھی دلّی کا اہلِ ہنود کے راج میں بہت عروج رہا ہے اُس زمانہ میں بھی دلّی ہندوستان کی ناک تھی۔ بڑے بڑے معرکے اِسی سرزمین پر ہوئے

ہندوستان میں جس قدر تہذیب و شائستگی ہے اُس کی جڑ دلّی میں سمجھنی چاہئے۔ یہ شہر علم و فضل کی ٹکسال رہا ہے۔ اور جیسا حضور نے فرمایا امید ہے کہ سلطنت انگریزی کے سایہ عاطفت میں پھر بھی مقام مرجع تہذیب و شائستگی ہوگا۔ اہلِ دہلی حضور کی اس قدر قدردانی کے جس قدر شکرگزار ہوں حق بجانب ہے۔

دلّی کے متعلّق چند تاریخی معلومات

(۱) **قلعہ مُعلّٰے** ۔ کہ پنجم ذیحجہ سنہ ہزار و چہل و ہشت ہجری حسب الحکم جہاں مطاع بجہر بنیاد قلعہ پرداختند و بعد از پنج ساعت و دوازدہ دقیقہ نجومے از شب جمعہ نہم محرم اساس آں نہادہ اند و دراں ہزار گز بادشاہی پہنا سیصد گز و ارتفاع جدارش ما سوا فات ہشت و پنج گز بنیاد آں پانزدہ عرض آں بالایاں پانزدہ بالا دہ و درمیان حصارش لک دراع است

مضاعف زمین قلعه اکبرآباد. وخرچ عمارت قلعه ودیگر عمارات که درون قلعه است شصت لک روپیه. نشیمنهائے خاصه بست وہشت لک روپیه بدیں تفصیل شاه نشین دتوابع ده لک روپیه آمتیاز محل با آرامگاه مضافاتش پنج لک وپنجهزار روپیه. دولتخانه عام وخاص دو لک روپیه. باغ حیات بخش باحمام شش لک روپیه. منازل بیگم صاحب ودیگر بیگماں واہل محل ہفت لک روپیه ودیگر عمارات از بازارہا وچوک ہاکه درون قلعه بجهة کارخانجات بادشاہی ساخته چہار لک روپیه. قلعه باخندق بست ویک لک روپیه. و ہشت وچہارم ربیع الاول سنه ہزار پنجاه وہشت ہجری از دروازه کنار دریا که بشاه محل راه دارد درآمده. دولتخانه را بنور درود برافروختند. بعد ازاں در ایوان دولتخانه خاص وعام تخت مرصع را بجلوس شرف مانوس مبیں نمودند وپیش کشہائے پسند دیده بنظر درآمد ازاں میاں جنس مبلغ دوازده لک روپیه شرف پذیرائے یافت بیگم صاحب را چہار لک روپیه انعام فرمودند. شاہزاده محمد دارا شکوه را باضافه دوہزاری از اصل واضافه سی ہزاری برقرار گردانیدند. ومیر یحیی کاشی که تاریخ تمامیت دارالخلافت شاہجہاں آباد یافته بود. شد شاه جہاں اباد از شاه جہاں اباد. فروغی کشمیری مثنوی از توصیف شاہجہاں آباد وباغ حیات بخش بعرض رسانیده واورا به بندگی آستان افضل والعام ہزار روپیه غیر افتخار بخشیدند. ایں دو بیت ازاں مثنوی است تعالی الله چه شہر است ایں که از شاں ؛ گزشته ہر بنائے از کیواں ؛ جہاں را گر بناز خود یاد باشد ؛ ہمیں شاہجہاں آباد باشد. ودر تعریف باغ حیات بخش گفته. اے چشم بہار از تو روشن ؛ خاطر بتصور تو گلشن + کس مثل تو در جہاں ندیده ؛ مثل تو خدا نیافریده +

شنوید بن

شوید دہن از گلاب ایام ❊ آنکہ بزبان برد ترا نام

(۲) جامع مسجد (دہلی)

مسجد جامع شاہجہاں آباد کہ در سنہ بست و چہارم جلوس اعلیٰ حضرت اساس یافتہ بود در سال سی ام جلوس صورت اتمام پذیرفت و اہتمام ایں عمارت قریب پنج ماہ بجعفر خاں مفوض بود و قریب دو سال خلیل اللہ خاں باہتمام پرداخت و مدت سہ سال پنج ماہ سعد اللہ خاں بذل سعی نمود و پس از انتقال او ازیں عالم بروح اللہ داروغہ عمارت حکم شد کہ بہ ترمیم آں پردازد۔ و بالجملہ در عرض شش سال صورت اتمام یافت تاریخ اتمامش چنیں یافتہ اند ❊ مسجد شاہجہاں قبلہ حاجات آمد۔ اگرچہ عدد این ہزار و شصت و ہفت است و انجا تمش در ہزار و شصت و شش بوقوع آمد لیکن چوں قلیلے از کار حکاکی و جلا ماندہ بود نظر بجودت تاریخ بحکم مقدس دریں سال داخل نمودہ شد۔ ایں کارنامہ او بصرف مبلغ دہ لک روپیہ تمام شد۔ طول المسجد نود ذراع و عرض سی و دو مشتمل بر سہ گنبد افراز ہر گنبدے گنبدے افزودہ شکل است و بالائے آں کلسے مطلا صحن مسجد کہ از سنگ سرخ است یکصد و بست و شش ذراع است در یکصد و بست و شش ذراع و در وسط آں حوضے است پانزدہ ذراع۔ در دروازہ اطراف آں صحن ابواب ہائے دلکشا و روح افزا است ❊

(۳) عہدنامہ درمیان نادرشاہ و محمدشاہ بادشاہ دہلی

وثیقہ کہ محمدشاہ بادشاہ بمہر مبارک بہ مسودہ مرزا مہدی منشی باشی بہ نادرشاہ نوشتہ دادہ اینست۔ قبل از اینکہ بندگان اعلیٰ حضرت کیوان منزلت بہرام صولت مریخ سطوت شاہنشاہِ جہاں سلطانِ سلاطین، و راں پادشاہ ظل اللہ اسلام پناہ خاقان سکندر شان آسمان بارگاہ السلطان الاکرم والقاآن الاعظم نادرشاہ خلد اللہ ملکہ۔ ایلچیاں بجہت بعضے امور روانہ حضور ایں نیازمند درگاہ الٰہ فرمودہ بودند ایں نیازمند نیز متعہد انجام آن مطالب گشتہ بعد ازانکہ محمد خان ترکمان از قندہار وارد گردید و کارگزاران ایں دولت درصدد توقیف ایلچی و تعطیلِ جواب نامۂ آں اعلیٰ حضرت برآمدہ محرک مادۂ مخالفت گردیدند تا اینکہ ورود موکب ہمایوں اعلیٰ حضرت بحدودِ ہندوستان اتفاق افتادہ در قصبۂ کرنال بمقتضائے قضا ملاقی فریقین و جنگ سلطانی واقع و نیر جلے الظہور فتح و ظفر مشرق آں دولت بیزوال طالع گردید چوں اعلیٰ حضرت بادشاہ جمشید جاہ بزرگ ایل ترکمانیہ و سرچشمۂ مردمی و احسان بودند بفتوت ایشاں مستظہر و از فیض ملاقات و مجالست بزم ارم نظم ہمایوں ایشاں بہرہ ور گشتہ باتفاق دارد دارالخلافہ شاہجہاں آباد تمامی خزائن و جواہر و نفائس و کنوز مالیعرف سلطنت ہندوستان را برسم نیاز بموجب تفصیل علیحدہ منتقل بآں سرکار عزّ و شاں ساختہ۔ آنحضرت نیز حسب الالتماسِ ایں نیازمند بعضے را بحیطۂ قبول موصول و در عالم اہلیّت و اتحاد جنسیت و مراعات سلسلۂ علیۂ گورگانیہ و مراتبت مابین نیازمند درگاہ الٰہ مفوض و موکول فرمودند چوں ایں نوع عطیّہ و عنایت

کارپرداز

کہ از پدر در بارۂ فرزند و از برادر نسبت بہ برادر بعمل نمی آید از آں شاہنشاہ بلند جاہ نسبت بایں
نیازمند درگاہ الٰہ بوقوع پیوست لہذا در ازائے ایں معنی تمامی غربی ممالک سمت رود اٹک و دریائے
سندھ و نالہ سنکرہ منشعب از دریائے سندھ را کہ عبارت از تہتہ و روہنکات و دار الملک
کابل و غزنین و کوہستانات مساکن افغان و ہزارہ جات و قلعہ مکر و سکر و خدا آباد و باقی الکائی
سندھ و دیرہ جات و مساکن جوکیہ و بلوچیہ وغیرہ ہم و صوبہ ٹھٹھا و قلعہ را ہمہ و قصبہ مدین و پرگنہ و
چوں پرگنہ سماوانی و کھیڑا و سائر پرگنات متعلقات بہ ٹھٹھا با جمیع قلاع و مواضع و قری و مزارع و پرگنات
و بنادر از ابتدائے منابع رود خانۂ اٹک با کل دریاہا و اماکن کہ از آب مزبور منشعب شدہ آنہا را فرا گرفتہ
باشد تا حدے کہ دریائے سندھ و نالہ سنکرہ بدریائے محیط اتصال می یابد آنچہ بہر جہتے از جہات
باراً و دایراً در سمت غربی دریائے اٹک و شعبہائے آں در سمت غربی دریائے سندھ و نالہ سنکرہ واقع
شدہ باشد محصول آں بدولت نادرہ و ضمیمۂ ممالک محروسۂ سلطنت قاہرہ نمودیم کہ من بعد گماشتگان
آں دولت خداداد و بندگان آں آستان سپہر بنیاد و مباشر ضبط و ربط ولایات و پرگنات مزبورہ و متوجہ
حل و عقد مہمات جزئیہ و کلیۂ اہالی و سکنہ و رعایا و ایلات آنہا بودہ امنائے ایں دولت ابد قرین ممالک منصوصہ
را از ولایات متعلقہ بایں نیازمند درگاہ الٰہ موضوع و قلم امر و نہی را بالکلیہ از آنہا مرفوع دانستہ بہیچ
وجہ دخل در امور ولایت و پرگنات مزبورہ و سکنہ و رعایائے آنہا نہ نمانند و اصل قلعۂ اٹک و شہر لوہری
سند و اوچ و سائر ولایاتے کہ جنب شرقی رود اٹک و دریائے سند و نالہ سنکرہ واقع شدہ
بمن متعلق بمملکت ہندوستان خواہد بود در چہارم محرم الحرام سال یکہزار و یکصد و پنجاہ و دوم ہجری
و سال بست و یکم از جلوس والا نوشتہ شد

تحفہ فہرست

مختصر فہرست تواریخ ہندوستان

یہہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں میں تاریخ سے واقف کاری کا خیال زیادہ پیدا ہورہا ہے - اس معاملہ میں سب سے بڑا مرتبہ فارسی تاریخوں کا ہے کہ سب سے زیادہ تاریخیں فارسی میں ہیں: اس فن کی معلومات کے لئے پہلے زبان فارسی کی تحصیل ضرور ہے پھر قدیم تاریخوں کا جمع کرنا + دلی میں عرصہ ہوا کہ تاریخ کے متعلق دو ایک سوسائیٹیاں تھیں - اب وہ مشغلہ نہیں رہا : جناب صاحب چیف کمشنر بہادر دہلی کے زمانہ میں جو ابھی تشریف لائے ہیں اُمید ہے کہ اس طرف توجہ ہوگی + پہلے ضرور ہے کہ فارسی تاریخوں کا ایک خاص کُتب خانہ جمع کیا جائے - پھر حسب فرصت تاریخی مسائل پر بحث ہوا کرے اور مضامین لکھے جائیں +

میں یہاں چند تاریخوں کے نام لکھتا ہوں جو تلاش کر کے تاریخی کُتب خانہ میں جمع کی جائیں +

(۱) تاریخ سلطان محمود غزنوی جس میں سلطان ناصرالدین سبکتگین کا بھی حال ہے یہہ مولانا عنصری کی تصنیف ہے + (۲) تاریخ شہاب الدین غوری - (۳) تاریخ سلطان علاءالدین خلجی (۴) تاریخ فیروزشاہی - (۵) تاریخ افاغنہ محتوی بر احوال سلطان بہلول لودی او اُن کی نسل - اور حقیقت حال شیرشاہ سور اور شیر شاہ کی اولاد مُصنّفہ حسین خاں افغان - (۶) ظفر نامہ - از تصانیف مولانا شرف الدین ہروی - (۷) تیمورنامہ

انشائے ہاتفی۔ (۸) تاریخ بابری جس کا ترجمہ مرزا خان خاناں عبدالرحیم نے فارسی میں کیا۔ بابرنامہ خود بابر بادشاہ کی تصنیف ہے (۹) اکبرنامہ ابوالفضل۔ (۱۰) تاریخ اکبرشاہی تصنیف عطا بیگ قزوینی (۱۱) اکبرنامہ مرتضیٰ خاں (۱۲) طبقات اکبری از تصانیف خواجہ نظام الدین جنہوں نے اور بھی ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں (۱۳) اقبال نامہ جہانگیری جو معتمد خاں عرف شریف الکل نے جہانگیر بادشاہ کی طرف سے لکھا (۱۴) تاریخ شاہجہانی جو داراشکوہ نے لکھی اور علامی سعداللہ خاں نے درست کردی۔ (۱۵) تاریخ عالمگیری نوشتہ میر محمد کاظم۔ (۱۶) بہادرشاہی مشتمل بر احوال سلاطین ولایت گجرات۔ احمدآباد۔ ولایت سندھ معروف بہ ٹھٹھہ۔ (۱۷) تاریخ سلاطین ولایت ملتان و مالوہ و دولت آباد (دکن) و جونپور و بنگالہ و اڈیسہ کہ ان صوبوں نے علیحدہ علیحدہ شاہان دہلی سے آزاد ہوکر اپنی اپنی حکومت قایم کرلی تھی ÷ (۱۸) خلاصۃ التواریخ۔ (۱۹) زبدۃ التواریخ۔ (۲۰) منتخب التواریخ۔ (۲۱) روضۃ الصفا (۲۲) فرشتہ (۲۳) نادرشاہ کے حالات کے وقایع وغیرہ وغیرہ ÷

ان کے سوا اور تاریخیں رہ گئیں جنکے نام تک معلوم نہیں۔ کہیں کسی قدیم کتب خانہ میں کوئی جلد ناقص یا کامل شاید مل جائے ÷ بہرحال فارسی کی تاریخیں جسقدر مل سکیں غنیمت ہیں ÷

انگریزی میں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر فارسی تاریخوں کے اُلٹے سیدھے ترجمے ہیں جو صاحب لوگوں کے منشیوں نے اپنی لیاقت کے موافق صاحب کو لکھوا دئے ÷ بعض انگریزی مورخوں نے جس دُھن میں لکھنے بیٹھے اُسی خیال کے موافق اپنی رایوں کو بھی دخل دیدیا۔ مثلاً پادری صاحبوں نے غیر مذہب کے خلاف جسقدر مسالہ مل گیا کم بیش اسی پر زور دیا۔ بلکہ خرابی یہ ہے کہ ہندوستان کے رسم و رواج اور یہاں کی زبان سے بھی پورے آگاہ نہ تھے ÷

پھر بھی فارسی کے بعد انگریزی کی تاریخیں پڑھنے کے لایق ہیں۔ اُردو اور ہندی میں تاریخی مسالہ نہ ہونے کے برابر ہے ÷ اُردو زبان تو شروع سے اس لایق نہیں سمجھی گئی کہ سلطنتوں اور بادشاہوں کے حال لکھے جاتے۔ اہلِ ہنود

ع مجھکو نہ دیکھئے مرے مضموں کو دیکھئے

یہہ مصرع حضرتِ امیر مینائی کے شعر کا ہے۔ دوسرا مصرع ہے ع دستِ گدا میں گوہر شہوار ہے تو ہو۔ اس عنوان سے میری غرض یہہ ہے کہ مباحثۂ گلزارِ نسیمؔ میں جو معرکہ مولانا شررؔ اور جناب چکبستؔ کے درمیان عرصہ تک رہا بہت ضروری نہ تھا۔ مثنوی کی تعریف میں جس قدر لکھا جاتا تھوڑا تھا نہ کہ مصنّف کی تلاش میں مثنوی کو کھو دیا: دوسرے مقابلہ کی دُھن میں میر حسنؔ کی مثنوی لتاڑ میں آگئی۔

مثنویوں میں دو ہی مثنویاں لاجواب سمجھی جاتی ہیں۔ مثنوی گلزارِ نسیمؔ اور میر حسنؔ کی مثنوی۔ دونوں کا جواب ابتک نہ ہوا اور شاید نہ ہوگا: جواب سے میری غرض جس طرز پہ دونوں نے اپنے اپنے کلام کی خوبیاں دکھائی ہیں یہہ انہیں دو کا حق ہے۔ ایک کی ضد میں دوسرے کو ترجیح دینی انصاف نہیں۔

عرصہ ہوا کہ مولوی اشرف حسین صاحب دہلوی نے میر حسنؔ کی مثنوی کی داد میں جو بولیہ رسالۂ مخزن میں لکھا تھا داد کا حق ادا کر دیا تھا۔ مناسب تو یہہ تھا کہ گلزارِ نسیمؔ کی خوبیوں کی داد میں اُسی طرز پہ لکھا جاتا نہ کہ مصنّف کی جستجو میں مثنوی کو اس قدر بحث مباحثہ میں ڈالا۔

شعرا قدیم و جدید یا حمد و نعت میں اکثر ساقی و میکدہ سے بہت طول طویل ذکر چھیڑتے میں جو شایانِ احتیاط نہیں کہ حمد و نعت میں مے و میکدہ یعنی چہ؟ برخلاف اس کے نسیمؔ نے ایک ہی شعر میں قلم سے یہہ کام لے لیا: اور کس قدر بدیہی کہ قلم قط لگانے سے دو زبانیں

بہ وقت موجود + ایک ہی شعر میں دونوں کام کس خوبی سے نکل گئے ؎

کرتا ہے یہہ دو زباں سے یکسر + حمد حق و مدحت پیمبر

لکھنؤ کی رعایت سے جہاں عقاید اثنا عشری کا عروج تھا قلم کی زباں سے
نہایت پاکیزہ بات بڑی خوبی سے نکلوادی ؎

پانچ انگلیوں میں یہہ حرف زن[1] ہے + یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

خالق نے دیئے تھے چار فرزند + دانا ۔ عاقل ۔ ذکی ۔ خردمند

چونکہ ایک باپ کے بیٹے تھے چاروں برابر کے ۔ دانا ۔ عاقل ۔ ذکی ۔ خردمند ۔
چاروں لفظ برابر کے جن کے معنی بھی برادرانہ یعنی یکساں +

تھا ایک کحال پیر دیرینہ + عیسیٰ کی تھیں جسنے آنکھیں دیکھیں

کحال کے "پیر دیرین" ہونے کی تعریف میں اس سے بہتر کوئی کہہ نہیں سکتا کہ حضرت
عیسیٰ کی آنکھیں دیکھنے والا تھا ۔ یہہ غایت قدامت کا ثبوت ہے کہ حضرت عیسیٰ کی آنکھیں
دیکھنے والا ضرور بہت بڑی عمر کا ہوگا اور کحال کے لئے آنکھیں دیکھنا کتنا پاکیزہ محاورہ ہے +

دانا تو کرے کب اس طرف میل + ہارا ہے جوئے کے نام سے بیل

"جوئے" سے بیل کا ہارنا ۔ بہت خوب کہا !

---

[1] جناب چکبست کی گلزار نسیم میں "حرف زن" ہے ۔ یعنی "حرف" کے ساتھ زیر کی اضافت لگی ہوئی ہے +

ویرانیٔ دشت کا نقشہ ہے :-

سایہ کو پتہ نہ تھا شجر کا + عنقا تھا نام جانور کا

"عنقا تھا نام جانور کا" کتنی بے تکلف تشبیہ ہے کہ عنقا جانور ہی ہے +

دیو کے تھک کر گرنے کی تصویر یہ ہے کہ :-

تیورا کے وہیں وہ بار بر دوش + بیٹھا تو گرا - گرا تو بیہوش

ایک چھوٹے سے مصرع میں - تھک کر بیٹھ جانا[1] - پھر گر پڑنا[2] اور آخر کو گر کر بیہوش ہو جانا کتنی جلد ختم کر دیا +

یہہ کہہ کے اُٹھا کہا کہ لو میاں + جاتے ہیں کہا خدا نگہبان

یہہ رخصت کتنی جلد ہی ختم ہو گئی - تاج الملوک نے کہا کہ "جاتے ہیں" جواب ملا "خدا نگہبان"!

حضرتِ شوق (جنہوں نے گلزارِ نسیم کی وضع پر بہ مثل مثنوی لکھی) از رو ئے انصاف فرماتے ہیں کہ "ترانۂ شوق میں نسیم کے اس شعر کے خیال میں سو چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں + کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں - میں نے (جناب شوق نے) اس رنگ میں بہت شعر نکالے مگر نسیم کے شعر کی فصاحت اور تناسبِ الفاظ کو میرا (شوق کا) کوئی شعر نہیں پہونچ سکا" الخ -

واقعی نسیم کے اس شعر کے بعد اس رنگ میں کہنا مشکل تھا - پھر بھی حضرتِ شوق نے اس وضع کے مقام پر غضب ڈھایا ہے ؎

گالوں کو لگا یا ہو اگر ہاتھ + ہو حشر آتش پرست کے ساتھ

نسیم نے تاج الملوک کے سودائے فراق میں بکاولی کے پابہ زنجیر ہونے کا جو سماں باندھا ہے نہایت پاکیزہ ہے :-

آخر تو یہہ جی سے اپنے تھی تنگ ✤ ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ
یاد آئیں جو ابروانِ خمدار ✤ پھیرے نہ کہیں گلے پہ تلوار
وہ سبزۂ خط جو یاد آئے ✤ گھبرا کے کہیں نہ زہر کھائے
کر یاد کہیں چہ ذقن کو ✤ کود ے نہ کوئیں میں باولی ہو
دیوانے کی مطلق العنانی ✤ ہے باعثِ مرگِ ناگہانی
تدبیر کا حوصلہ نکالا ✤ زنجیر کا سلسلہ نکالا
جب وحشتِ عشق ہو زیادہ ✤ زنجیر سے پیش پا فتادہ

خوش بیانی کے نمونوں میں طرزِ تحریرِ نامہ و پیغام بھی داخل ہے۔ غصہ میں لکھتے ہیں کہ اب خط کتابت موقوف سمجھنی چاہئے ؎

پھر خط کی نہ ہو امیدواری ✤ القط ہے قلم کی دوست داری

راجہ اندر پریوں سے پوچھتے ہیں کہ بکاولی کہاں ہے ؟ پریوں نے جسطرح جواب دیا اُس کی تصویر نسیم نے اس طرح کھینچی ہے :-

مُنہہ پھیر کے ایک مُسکرائی ✤ آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتوں کو ملا کے رہ گئی ایک
ہونٹھوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

راجہ اندر کی محفل میں بکاؤلی سے چھپ کر تاج الملوک بھی پہونچا:-

رقص اُسکا (بکاؤلی کا) اگرچہ خوشنما تھا ٭ سنگت کا پکھاوجی تھکا تھا

شہزادے (تاج الملوک) نے دیکھا یہ ماجرا ٭ لیں طبلہ نواز کی بلائیں

آہستہ کہا کہو تو آؤں ٭ فرمایئے تو بندگی بجاؤں

اُس نے جو پکھاوج اس کو دیدی ٭ کیفیت اتفاق نے دی

(طبلہ نواز کی رعایت سے "دائیں بائیں" خوب کہا۔ اسیطرح "فرماؤ تو بندگی بجاؤں")

یورپ کی قدیم و جدید لٹریچر میں ڈایالاگ[1] یعنی گفتگو میں فصاحت و خوش بیانی کا زور زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ تاج الملوک کے فراق میں جب بکاؤلی کا بُرا حال ہوا تو اُس کی ہمجولیوں نے سمجھایا:-

سمجھانے لگیں کہ مرتی ہے کیوں ٭ ترکِ خور و خواب کرتی ہے کیوں

ثابت کچھ اثر ستارے کا ہے ٭ کس چاند کو کیا گہن لگا ہے

رحم اپنی جوانی پہ ذرا کر ٭ منہہ دیکھ تو آئینہ منگا کر

صورت تری زار ہو گئی ہے ٭ گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے

ہے ہے تری عقل کس نے کھوی ٭ ناجنس کو چاہتا ہے کوئی

سمجھتی نہیں آگ ماہیِ تر ٭ رہتا نہیں پانی میں سمندر

روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر ٭ پھیر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر

[1] Dialogue.

مجبور ہیں کیا بتیں تجھکو بہرچت + توبہ کا تو در نہیں کیا بند
سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار + اب مان نہ مان تو ہے مختار
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

جھنجھلائی بکاولی کہ بس بس + اب ایک کہو گی تم تو میں دس
مجبور جو ہوں تو میں تمہیں کیا + مجبور جو ہوں تو میں تمہیں کیا
ماما مری حالت اب ردی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

مباحثۂ گلزار نسیم گو چکبست و شرر جیسے دو ذی کمال اُستادوں میں تکرار کا باعث ہوا مگر اس تکرار میں اکثر اہل سخن کی معلومات کا اچھا ذخیرہ دیکھنے میں آگیا۔ اس معرکہ کی بدولت گلزار نسیم کے مصنف کی تحقیق خاصی ہو گئی اور اودھ پنچ کو خوش بیانی کا موقع ہاتھ آیا +

مگر سچ پوچھیے تو جناب چکبست نے جو کچھ کیا حق بجانب تھا کہ پنڈت ہو کر پنڈت کی اتنی پیچ بھی نہ کرتے۔ مولانا شرر۔ مولانا حالی شاعری کے معاملہ میں جب لکھنؤ کی زبان کی اس قدر چھٹی سنتے تو مثنوی گلزار نسیم پر دو چار اعتراض بھی نہ کر بیٹھتے تو کیا کرتے ہ مگر معترض ہونے میں سابقہ نہ رہا تھا کہ کلام کی خوبیوں پہ خاک ڈالی جاتی + تمام اہلِ سخن

اس بات پر متفق ہیں کہ نہ میر حسن سی مثنوی دوسری لکھی گئی نہ گلزار نسیم کی سی۔ جناب شوق نے جو مثنوی ترانہ شوق لکھی وہ خود فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم کا جواب نہیں لکھا۔ اس کے یہ معنی کہ گلزار نسیم کا کم و بیش تتبع ہے نہ جواب۔ مثنوی کے لاجواب ہونے میں شک نہیں۔ اسس مثنوی میں جو لوگ لغزشیں نکالتے ہیں پنڈت دیا شنکر (نسیم) کی سمجھ لیں۔ قادر الکلامی جن کی نظر میں ہے خواجہ حیدر علی (آتش) کو دُعا خیر سے یاد کریں۔ کہ اس کی خوبیاں آتش جیسے اُستاد کے سوا کسی کے بس کی نہیں۔

مثنوی کو صرف از روئے خوبیٔ کلام دیکھئے۔ مثنوی دونوں میں سے کسی کی ہو دونوں کا احسان ہے کہ ہماری زبان میں اسس مرتبہ کا کلام دیکھنے میں آیا۔

غزل حضرتِ مائلِ دہلوی

فلک کا دل ہلا دیتی ہیں آہیں دلفگاروں کی ۔ زمیں کا دم نکلتا ہے تڑپ سے بے قراروں کی
کہیں ہیں چارہ سازوں کی کہیں ہیں رازداروں کی ۔ جو اُلجھو پہنچا وہاں قبریں ملیں دو چار یاروں کی
نہیں ہے اُسکی عادت آپ سے غفلت شعاروں کی ۔ خدا سنتا ہے اور سنتا ہے ہم سے خاکساروں کی
اسی میدانِ محشر میں مٹی گی عید یاروں کی ۔ خدا نے بات رکھلی آج اپنے بادہ خواروں کی
زمیں کی کوئی کہتا ہے فلک کی کوئی کہتا ہے ۔ خدا باتیں سنا کرتا ہے اپنے بادہ خواروں کی
ذرا سی لغزشِ مستانہ جھکنا چور کرتی ہے ۔ مری توبہ بھی ہے گویا صراحی بادہ خواروں کی

جہاں وحشت میں جاتا تھا مرے ہمراہ جاتے تھو ٭ مجھے اب یاد آتی ہے وہ ہمدردی غباروں کی
جہاں کوئی نظر آیا بنا دیتی ہے دیوانہ ٭ نگاہ مست ساقی کی ہے دشمن ہوشیاروں کی
زبانِ خار پہ جو ہیں زبانِ تیشہ پہ جو ہیں ٭ وہ ساری سرگذشتیں ہیں ہمیں آفت کے ماروں کی
طبیعت آگئی کس پر کسے تسخیر کرنا ہے ٭ منگاتے ہیں وہ کیوں مٹی شہیدوں کے مزاروں کی
وہی انسان ہوتا ہے اُسے انسان کہتے ہیں ٭ میسر جس کو ہو جاتی ہے صحبت بادہ خواروں کی
ترا احسان مانوں گا بلا دے جام میں ساقی ٭ ذرا سی حضرتِ پیرِ مغاں کے خاص یاروں کی
شبِ غم میں زمین و آسماں کا ہوش کس کو تھا ٭ بہت سے داغ دل بھی آگئے گنتی میں تاروں کی
تری ابرو پہ سر کٹتے ہوئے دیکھے ہیں لاکھوں کے ٭ تری آنکھوں پہ کافر جان جاتی ہے ہزاروں کی
پیاپے جام پینے سے نہ کر تکرار اے واعظ تو ٭ دلیلِ رحمتِ حق ہے یہ حجت بادہ خواروں کی
رسا ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں نالے خستہ جانوں کے ٭ اثر کرتی ہیں اور کرتی ہیں آہیں دل فگاروں کی
تڑپ پاتی نہ کوئے یار میں بجلی یہاں آ کر ٭ بگڑ جاتی ہیں دم بھر میں ہوائیں بیقراروں کی
اگر دل ہے زمانہ میں تو اُن کے بیقراروں کا ٭ اگر آنکھیں ہیں دُنیا میں تو اُن اشکباروں کی

جنابِ شیخ کے تقوے کو مائل اُس سے کیا نسبت
مری توبہ نے برسوں کی ہے خدمت بادہ خواروں کی

صلائے عام۔ حضرتِ مائل نے ہجوم غم و افکار میں یہہ غزل مجھے بھیجی۔ آپ کی قادر الکلامی کا میں قائل ہوں کہ پے درپے غم و الم کے صدموں میں بھی اس قدر پاکیزہ غزل کہی۔ "بادہ خواروں" کے مضمون سب اچھے نکالے اور ذیل کے اشعار میں بلا کی خوبیاں

پیدا کر

پیدا کر دکھائیں :۔

(۱) شبِ غم میں زمین و آسمان کا ہوش کس کو تھا ٭ بہت سے داغِ دل بھی آ گئے گنتی میں تاروں کی

(بے ہوشی میں "داغِ دل" کا مرتبہ کتنا بڑھا دیا کہ آسمان کے تارے بن گئے۔ تاروں کی گنتی نہیں نہ داغوں کی)

(۲) طبیعت آگئی کس پر کسے تسخیر کرنا ہے ٭ منگاتے ہیں وہ کیوں مٹی شہیدِ عشق کے مزاروں کی

(نسخۂ تسخیر میں قبروں کی مٹی جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے۔ اب وہ کسی اور کے دل کو تسخیر کیا چاہتے ہیں)

(۳) کہیں ہیں چارہ سازوں کی کہیں ہیں رازداروں کی ٭ جہاں پہونچا وہاں قبریں ملیں دو چار یاروں کی ٭

(یاروں کی موت کا سبب ہی یہہ ہوا کہ شومیٔ بخت سے وہ ہمارے چارہ ساز و رازدار تھے۔ ہماری سیہ بختی نے اُن کو بھی نہ چھوڑا) ٭

(۴) اسی میدانِ محشر میں منے گی عید یاروں کی ٭ خدا نے بات رکھ لی آج اپنے بادہ خواروں کی ۔

(بادہ خوار جب بخشے گئے تو عید کیوں نہ ہو۔ اور رحمتِ ایزدی کا تقاضہ ہی یہہ ہے کہ بادہ خوار بخشے جائیں ٭ عید اکیلے نہیں منائی جاتی۔ میدانِ محشر سے زیادہ بڑا مجمع دُنیا میں نصیب نہ ہوا ٭ عید منانے کی جگہہ اور موقع اس سے بہتر نہیں ٭ "اسی میدانِ محشر میں" خوب کہا ! کہ میدانِ حشر جس کا خوف تھا یہیں لُطف آیا) ٭ "بادہ خواروں" کے چھہ شعر اس غزل میں ہیں اور سب اچھے ٭

(۵) "غباروں" کا مضمون بھی نیا باندھا ہے

جلد حسرت میں

جہاں وحشت میں جاتا تھا مرے ہمراہ جاتے تھے ✦ مجھے اب یاد آتی ہے وہ ہمدردی غباروں کی ✦

(۶) حضرت نے یہ شعر اپنے حسب حال فرمایا ؎

زبانِ خار پر جو ہیں زبانِ تیشہ پر جو ہیں ✦ وہ ساری سرگزشتیں ہیں ہماری فتنہ کاروں کی

(۷) گردشِ روزگار کی تشبیہ بہت اچھی ہے کہ ؎

تڑپ اتنی نہ کوئے یار میں بجلی یہاں آکر

بگڑ جاتی ہیں دم بھر میں ہوائیں بیقراروں کی

(۸) زمیں کی کوئی کہتا ہے فلک کی کوئی کہتا ہے ✦ خدا باتیں سُنا کرتا ہے اپنے بادہ خواروں کی ✦

(رندان بادہ خوار جو آسمان و زمین کے قلابے ملایا کرتے ہیں اس سے یہ غرض نہیں کہ آپ سُنیں۔ آپ سُنیں یا نہ سُنیں: وہ جانتے ہیں کہ اللہ میاں سُنتے ہیں اور غرض یہ ہے کہ وہ سُن لیں ✦

حضرت سر اقبال کی ایک فارسی نظم

رسالہ حرم گو ڈاکٹری کا رسالہ ہے اور عورتوں کے لئے ہے مگر اس میں اکثر اچھے لٹریری مضامین بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ پچھلے پرچہ میں محترمہ زاہدہ بیگم نے ڈاکٹر حضرت اقبال بالقابہ کی ایک فارسی نظم نہایت پاکیزہ شائع کی: نظم مختصر ہے۔ مگر مختصر ہو یا مطول ایسی فارسی نعمتِ غیر مترقبہ سے بڑھ کر ہے: اس کے ساتھ محترمہ صاحبہ کی

سخن فہمی بھی تعریف کی مستحق ہے کہ ترجمہ بہت خوب کیا + اس نظم کے دیکھنے سے سخن سنجی اور سخن فہمی دونوں کا ثبوت ملتا ہے +

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابی + ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لولوے لالاست در گریبانت ؛ درون سینہ چو من گوہرے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

ترجمہ میں دریا کے پاس گیا۔ اور موج کی بیتابی دیکھ کر اس سے دریافت کیا۔ کہ تو کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ کہ ہمیشہ کسی تجسس میں رہتی ہے۔ تجھ میں تو ہزاروں موتی موجود ہیں۔ لیکن کیا تیرے سینہ میں میرے دل کی طرح کوئی موتی بھی ہے؟

وہ موج تڑپی اور لبِ ساحل سے ٹکرائی اور کچھ نہ کہا۔

بہ کوہ رفتم و پرسیدم ایں چہ بیدردی ست ؛ رسد بگوش تو آہ و فغان غم زدۂ؟
اگر بہ سنگ تو لعلے ز قطرۂ خونست ؛ یکے در آ بہ سخن با منِ ستم زدۂ
بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

ترجمہ - پھر میں پہاڑ کی طرف گیا۔ اور اُس سے کہا کہ یہ کیا ظلم ہے کہ تو انتہائی بلندی کی وجہ سے کسی غم زدہ کی آہ و فغاں نہیں سُن سکتا۔ اگر تیرے پاس کوئی ایسا لعل ہو۔ جو قطرۂ خون سے بنا ہو۔ (یعنی دل کی طرح ہو) تو آ اور مجھ ستم زدہ سے ہم کلام ہو۔

اس نے بھی ٹھنڈی[1] سانس بھری اور کچھ نہ کہا۔

---

[1] نسیم سحر چلی ہو گی۔

رہِ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم ٭ سفر نصیب! نصیبے تو منزلیست کہ نیست
جہاں ز پرتوِ سیمائے تو سمن زاری ٭ فروغ داغ تو یک جلوۂ دلے ست کہ نیست
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

ترجمہ۔ طویل راستہ طے کرکے میں چاند تک پہونچا۔ اور اُس سے دریافت کیا کہ سفر نصیب تیری کوئی منزل بھی ہے۔ یا تو تمام عمر گردش میں رہے گا۔ سارا جہان تو تیرے نور سے روشن ہے۔ لیکن کیا کسی دل کا جلوہ تیرے داغ کو بھی روشن کرتا ہے یا نہیں۔
اس نے ستاروں کی طرف رشک سے دیکھا اور کچھ نہ کہا

شدم بہ حضرت یزداں رسیدم از مہ و مہر ٭ کہ در جہاں تو یک ذرّہ آشنائم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل ٭ چمن خوش ست ولے درخورِ نوائم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

ترجمہ۔ اب میں چاند سورج سے بھی زیادہ بلند ہوکر خداوند تعالےٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ اے خدا مجھ سے اس تیری دنیا میں کوئی بھی واقف نہیں یہ دنیا دل سے خالی ہے۔ اور میری مٹھی بھر خاک کا ذرہ ذرّہ دل ہے۔ یہ دنیا کا باغ ہے تو اچھا۔ لیکن میرے لائق نہیں
خدا نے مسکرا دیا اور کچھ نہ فرمایا۔

صلائے عام۔ دل جیسی چیز واقعی دنیا میں کہیں نہیں۔ پہلے موج دریا سے

پوچھا

پُوچھنا مناسب تھا کہ دلِ بیتاب کی ہمدرد موج ہی ہو سکتی ہے جو بیقراری میں اپنا جواب نہیں رکھتی : جواب کے لئے اپنے لب کھولتا تو در کنار لبِ ساحل سے بھی چلدی[1]

ہوئی ایذا میں راحت ہے یہ احسانِ دشمنِ جاں کا ۔ لبِ زخمِ جگر پر لی جو چٹکی لگ گیا ٹانکا +

پہاڑ تو سکوتِ مجسم ہیں ۔ وہ کیوں بولنے لگے ۔ قیامت تک چپ سادھنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں : آسمان کی طرح اونچا سُنتے ہیں[2] + ان سے اس بات کی اُمید رکھنی کہ ع "رسد بگوش تو آہ و فغانِ غم زدہ"؟ غلطی ہے + ہر کوہ پر کیا منحصر ہے کوہِ طور بھی چپکا کھڑا ہے +

چاند سے جواب کی کیا امید ؟ جس کے داغ آجتک نہ مٹے ۔ یہہ ستاروں کو رقیبانہ نہ دیکھے تو اور کیا کرے ؟ ے زلیخا نے تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رکھا تھا ؛ خدا پردہ نہ رکھ لیتا اگر یوسف کے داماں کا

آخر کو خدائے لایزال جل جلالہٗ وحدہٗ لاشریک لہٗ سے عرض کی : وہاں بس تو بھلے ہی لیں مگر کسی کو آجتک جواب نہ ملا : حضرت موسےٰ نے کوہِ طور سے ہزار سر مارا مگر لن ترانی کے سوا کچھ جواب نہ ملا + مسکرائے ضرور ہونگے[3] ۔ کیونکہ وہاں بھی اسی کی تلاش ہے : انسان ہاتھ پاؤں سے ہزار سر مارے مگر جب تک دل نہ ہو ساری دوا دوش بیکار ہے ؛ عبادت میں صرف اسی کی ضرورت ہے ۔ باقی خیریت +

اس نظم میں "پیچ نہ گفت" کی رعایت واقعی لاجواب ہے +

کیا چیز ہے کیا سینۂ بسمل میں نہیں ہے
دل تیر میں یا تیر ترا دل میں نہیں ہے

---

[1] بقول استاد ذوق سے کیا ایں جورے کیوں مرادُ بانی دیتا ؛ اے فلک گر مجھے ادنچا نہ سنائی دیتا +
[2] یہہ کیا جب آؤ تو چھپتے ہوؤں کو کم رلا جاؤ ۔ مگر وہ بات دل نے ایک عالم کے دکھا دیکھے +

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون بھیجنے کی کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصول ڈاک آنا چاہیے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو۔ یعنی لبنائے عروس جمیل و لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی یا عربی میں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبان اُردو میں	ایک صفحہ ایک سال کے واسطے	عـــہ
”	” چھ ماہ کے واسطے	عـــہ
”	” تین ماہ کے واسطے	عـــہ
”	نصف صفحہ ایک سال کے واسطے	عـــہ
	چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایک سال کے واسطے	عـــہ
”	” ” چھ ماہ کے واسطے	عـــہ
”	” ” تین ماہ کے واسطے	للعہ
”	ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے	ـــہ
”	نصف صفحہ ” ”	ـــہ
”	چوتھائی صفحہ ” ”	عـــہ

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہیے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آنا چاہیے۔

منیجر۔ صلائے عام

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:-

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر۔

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر۔ مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شایع ہوا۔
Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press Farrash Khana Delhi

16(9)

SALA-I-AM DELHI.

دہلی

Mustansir Press Farashkhana Delhi

فہرست مضامین

بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۸ء

صلائے عام

ہندوستان میں شروع سے نثر کا چرچا بہت کم رہا ہے - یہاں کے قدیم علماء و فضلاء دو ہزار برس سے نظم ہی پر زور دیتے چلے آئے : اسی ملک پر کیا مدار ہے اکثر قدیم قوموں اور ملکوں کی پرانی نامور کتابیں نظم میں ہیں + حضرت داؤدؑ کی شاعری کا ثبوت زبور میں دیکھ لیجئے کہ "لحنِ داؤدی" آج تک مشہور ہے: سنسکرت میں عموماً ساری مذہبی کتابیں نظم میں ہیں - یونانی لٹریچر میں ہومر کی شاعری لاجواب سمجھی جاتی ہے - اسلام میں "ایام جہالت" کی نظم کی شہرت ہے - اور جب تک قرآن مجید نازل نہ ہوا کسی کو یقین نہ ہوا کہ نثر بھی کچھ چیز ہے + اس وقت اگر اور ملکوں کا ذکر چھوڑا جائے تو ہندوستان کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں نثر کی طرف بہت کم توجہ ہوئی +

سنسکرت میں وید کی تصنیف کے بعد ایک سادی نثر کا پتہ چلتا ہے - مگر وہ نثر برائے نام تھی - جس کا شمار اعلٰے لٹریچر میں نہیں آ سکتا : عبادت میں اشلوک (شعر) ہی لابد تھے کہ شلوگ اول تو جلدی یاد ہو جاتے تھے دوسرے فطرتاً کانوں کو اچھے لگتے تھے + ہومر اپنی نظم سے گا بجا کر روٹی کماتا تھا - سبب یہ کہ نظم سے انسان

زیادہ خوش

زیادہ خوش ہوتا ہے ✦ قدیم زبانوں کی نازک خیالیوں اور پاکیزہ بیانیوں کا مدار نظم پر تھا۔ قدیم زبانوں کی لٹریچر میں نثر کا مرتبہ ہمیشہ گرا رہا ✦

جہاں قدیم زبانوں کی نثر کا یہہ حال ہو وہاں اُردو بیچاری کس شمار میں ہے؟ اس بیچاری بازاری منگتا کے پاس اس قدر بضاعت کہاں کہ قدیم زبانوں سے برابری کر سکے؟ بقول صاحب گلزار نسیم ؎

آگے اُن کے فروغ پانا ✦ سورج کو چراغ ہے دکھانا

اُردو میں تو شروع ہی سے شعر و شاعری کے سوا کسی کو اور کچھ سوجھا ہی نہیں۔ اساتذہ نے فارسی لٹریچر کی تقلید میں کچھ صنایع بدایع شعری اُردو میں پیدا کئے۔ مگر نثر کو کورا رکھا۔ بلکہ ادھورا: نتیجہ یہہ کہ شاعری میں تو کچھ کچھ خوبیاں پیدا ہوگئیں مگر نثر کا طرز بہت پھیکا رہ گیا۔ بقول جناب تمنّا ؎

کیا لُطف اگر ہو طرز پھیکا ✦ جس طرح یہہ قول ہے کسی کا

زندانِ تو جامہ وردہا نند ✦ چشمانِ تو زیر ابروانند

خدا اُردو کے رسالے والوں اور اخبار نویسوں کا بھلا کرے کہ اکثر رسالوں میں اُردو کے اب ایسے ایسے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں جن پر ناز کرنا بیجا نہیں۔ اس معاملہ میں لاہور والے سب سے بازی لے رہے ہیں: یہہ مبالغہ نہیں بلکہ ناز کرنے کا مقام ہے کہ پنجاب کی اصلی زبان گو اُردو نہیں مگر اُردو کی قدر جس قدر پنجاب کے رسالے والے کر رہے ہیں دوسری جگہہ کہیں نہیں ✦

صلائے عام کو شروع سے اسبات کا خیال ہے کہ قوم اور ملک کی ترقی و بہبودی کے لئے اپنی زبان کی قدرشناسی مقدم ہے۔ اور زبان کی ترقی کے لئے نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں یہہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ زبان کے لئے اردو کی شرط کیا ضرور ہے؟ اس کا مدار آپ کے انصاف پر موقوف ہے کہ ہندوستان کی مختلف متفرق زبانوں میں آپ اُردو سے زیادہ کس کو زیادہ موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں +

اُردو وہ زبان ہے جسنے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت جیسی زبردست زبانوں کے قدم جمنے نہیں دیئے۔ چھوٹی موٹی بولیاں جو جابجا پراگندہ ہیں یہہ اُردو سے کیا بازی لیں گی؟ یہہ آپ ہی کی زبان کے حوصلے ہیں کہ غیر زبانوں کو بھی اپنے دامن میں لے سکتی ہے۔ اور لے لے گی ؎

لپٹا لے تو بڑھ کر اُنہیں اے جوشِ تمنّا + تنتے ہیں بہت کچھ وہ برابر سے نکل کر

ہماری زبان میں بڑا ہنر یہہ ہے کہ مطلب کیسا ہی بیگانہ ہو اُسے ہم اپنا کر لیتے ہیں۔ کوئی مضمون کتنا ہی اجنبی ہو ہمارا یار ہو جاتا ہے: جن کو اپنی زبان کی قدر نہیں وہ یاد رکھیں کہ پھر ایسی زبان پیدا ہونی مشکل ہے ؎

قتل کر ڈالنا غصّہ کو فرو ہونے دو + کہیں ایسا نہ ہو پھر آپ مجھے یاد کریں

شکوۂ جور پہ کہتے ہیں کہ فریاد کرو!
ہم نے فریاد کبھی کی ہو تو فریاد کریں

ہماری فریاد صرف یہی ہے کہ اس وقت آپ کی زبان کی قدر اُردو رسالوں

کے ہاتھوں میں ہے اور سب سے زیادہ زیرباری انہیں کو ہے ۔ کہ فائدہ درکنار خرچ اخراجات کا بھی رونا رہتا ہے : میری دانست میں کوئی رسالہ نہیں جو اس کا شاکی نہ ہو ؂

کیا پوچھتے ہو قیمتِ دل کا معاملہ ٭ تم سے بھلا کبھی کوئی سودا بنا بھی ہے

خوں بہا فرہاد کا خسرو کی گردن پر رہا
جانِ شیریں تو فقط اُجرت تھی جوئے شیر کی

قدرشناسی کے معاملہ میں آپ ہی دیکھیں کہ آپ کی زبان کو آپ ہی سے اُمید نہ ہو تو پھر کس سے ہو؟ حسنِ یوسف کی قدر گو حضرتِ یوسفؑ برگزیدہ خاندانی پیغمبروں میں تھے مگر فرشتوں سے قدر کی امید نہ ہوئی ۔ قدر کی تو زلیخا نے ؂

جس جگہہ عشق نہ ہو حسن کی قیمت کیا ہو ٭ کوئی یوسف کا فرشتوں میں خریدار نہ تھا

پلاتا ہے تو ساغر بھی لگا دے آپ ہی منہ سے
پڑے رہنے دے میرے ہاتھ ساقی اپنی گردن میں

مضمون پریشان

لوگ مجھسے پوچھتے ہیں کہ ذرا ک پرچوں سے "مضمون پریشان" دیکھنے میں نہیں آیا

کیوں اب گلی میں خاک اُڑتا نہیں کوئی ❊ وہ تیرے گیسوؤں کے پریشان کیا ہوئے

سب سے پہلے تو حضرت شیخ سعدی رح نے میرے حق میں ارشاد فرمایا کہ

مزن بے تامل بگفتار دم ❊ نکو گوے گر دیر گوئی چہ غم
بیندیش وآنگہ برآور نفس
وزاں پیش بس کن کہ گویند بس

دوسرے صلائے عام سے میری یہہ غرض شروع سے نہیں ہے کہ میں خود ہی لکھے جاؤں حتے الامکان میں اپنے تئیں[1] بچایا چاہتا ہوں : حسن اتفاق سے اِن دنوں صلائے عام کے مضمون نگاروں میں سے میرے ایک کرم فرمانے "مضمون پریشان" کے رنگ پر ایک مضمون لکھا ہے جو نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے

سیکھ لی نرگس نے حیرانی مری ❊ لے گئی سنبل پریشانی مری

---

[1] یہاں "تئیں" بغیر لاچاری تھی۔ غالب نے لفظ "تئیں" جائز رکھا ہے ❊

عالمِ اسباب کی خوبیاں

(بہ آہنگ "مضمونِ پریشاں")

اُس کا یہی ہے رحم کہ ہم کو ستائیگا + اُس کی یہی ہے صُلح کہ آنکھیں لڑائیگا

عالمِ اسباب کی کیا ہی خوبی ہے کہ اس کو سب روتے چلے آئے اور روتے چلے جائیں گے۔ دُعائیں تو کیا قبول ہوں گی؟ کسی پر مرنے والوں کی مُنہہ مانگی قضا بھی آتے نہیں دیکھی ؎

گر یہہ ہوس ہے وعدہ کو ایفا کرے کوئی + عمرِ خضر کی پہلے تمنا کرے کوئی

باوجودِ کثرتِ اسباب عالمِ اسباب کس قدر تنگ ہے کہ دُنیا میں کسی فردِ بشر کے سارے حوصلے پورے نہیں ہوتے۔ بخیل کی دولت کی طرح عالمِ اسباب سے کسی کو سیری نہیں ہوتی۔ جہاں دیکھو ھل من مزید کا شور ہے + کہیں پیاس کے مارے پانی کا قطرہ میسّر نہیں۔ افریقہ کے کفِ دست بیان دیکھ لیجئے: اور سمندر میں ساحل کا پتہ مشکل ہے + بعض آبادیوں میں تل دھرنے کی جگہہ نہیں اور اکثر جنگل بیابان و ویراں پڑے ہیں + ایک معمولی درخت کس قدر محنت سے سرسبز ہوتا ہے اور امریکہ کے بڑے بڑے نامی جنگلوں میں جب ایک شاخ کے دوسری شاخ سے رگڑ جانے میں چقماق کی طرح چنگاری سے خود بخود آگ لگ جاتی ہے تو کوسوں بلکہ منزلوں

جنگل کے جنگل جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں ۔ ایک ایک درخت توکس محنت و جانفشانی سے سرسبز ہوا اور دم بھر میں سارے جنگل یوں خاک سیاہ ہو جائیں ؎

تیز ناقہ کو لئے جاتا ہے کیوں اے سارباں ۔ خاکِ مجنوں کو ذرا آ لینے دے محمل کے پاس ۔

عالم اسباب کی قلت و کثرت سے مجھے غرض نہیں۔ مخلوق میں جو کچھ پیدا ہو وہ کمال کو پہونچے بغیر فنا ہو جائے تو اُس کی مصلحت کس سے پوچھنے جائے ؟ یہاں عالم اسباب کی بیداد کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس چیز کو جس کام کے لئے پیدا کیا وہ اکثر اپنی منشا پورا ہونے سے محروم رہ جاتی ہیں ؎

بلبے دعوے لیکے دل اُٹھتا ہے جب اُس بزم سے ۔ چتونیں کہتی ہیں پھر آؤ گے پچتائے ہوئے ۔

دنیا میں کبھی ہزار تدبیروں سے بھی کام نہیں بنتا اور کبھی آپ سے آپ سارے کام بن جاتے ہیں: بقول جناب مائل دہلوی ؎

نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر ۔ اور ہوتا ہے تو باتوں میں اثر ہوتا ہے ۔

زمانہ کی بیداد کا یہ حال ہے کہ ہزار احتیاط کیجئے۔ تمام عمر پھونک پھونک کر پاؤں رکھیئے۔ مگر عالم اسباب نے کسی کے ساتھ وفا نہ کی: یہاں کے جھگڑے باوجود پوری کامیابی کے یہیں چھوڑنے پڑے ؎

دل پہ رہیں گی نقش یہ بے مہریاں تری ۔ جانا اور اس طرح سے کہ مُڑ کر نہ دیکھنا ۔

مخلوق میں بچوں کو دیکھئے جو ابھی نیکی و بدی سے واقف نہیں۔ ماں کی کیسی کیسی جاں کنی کے بعد پیدا ہوئے اور دُنیا کو دیکھے بغیر چل بسے ۔ ہم بے دیکھے دوزخ

بہشت پر ایمان لے آئے اور آجتک کسی نے یہہ نہ بتایا کہ مرکر کیا ہوا؟ ہم بے دلیل اُنکے
کو موجود اور وہاں ہزار دلیلیں بھی بیکار ÷ ہمارا ایمان ہر بات پر آمنا صدقنا۔ رہا
ہر کہ شک آرد کافر شد ؎

پینے گئے تھے یا اُسے سمجھانے شیخ جی + دیکھا تھا مے فروش کی میں نے دکان پر ÷

غایت درجہ کے قیاس کے بعد بھی یہہ نہ معلوم ہوا کہ عالم اسباب میں انقلاب
سے انسان کو کیا فائدہ ہے؟ انقلاب سے مراد اگر موت ہے کہ ہم مریں اور پھر پیدا
ہوں تو مرنے کا رنج پھر پیدا ہونے کی امید کا معاوضہ نہیں کر سکتا: رنج تو واقعی اور وقوعی انسان
کی فطرت میں موجود ہے۔ محض امید کے سہارے سے وہ رنج مٹنا آسان نہیں ؎

آڑے نہ آتی اُن کی نزاکت تو ہاں مجھے + دل سے اُتارتے وہ گراتے نگاہ سے ÷

لیکن اگر موت کو عالم اسباب سے نکال دیجئے تو اس سے بہتر دوسرا علاج قیام عالم
کا ذہن میں نہیں آتا کہ ایک کا مٹنا دوسرے کے بننے کا سامان ہے ؎

کہتے ہو کیا ہماری گلی میں ہے کون دفن + ٹھوکر لگا کے پوچھ لو کس کا مزار ہے؟

پھر اس میں یہہ قباحت ہے کہ جو مٹ گیا اُسے کیا ملا؟ اسکا جواب یہی ہے کہ جو میاں کی مرضی! وہ جانیں
اور اُنکی مشیت اب ؎ بتوں کا عشق ہوا جب نصیب اے واعظ ÷ کہ مدتوں کیا پہلے خدا خدا ہم نے +

صلائے عام۔ اس مضمون میں عقائد سے غرض بالکل نہیں ہے۔ صاحب مضمون کو صرف ایک طرز
کی خوش بیانی کا رنگ دکھانا ہے۔ وسعتِ بیان کے لئے ہماری زبان میں ہر طرز پر لکھنے کی ضرورت ہے ؎

حضرت شیخ نہ پینا مگر آؤ تو سہی ÷ میکدہ میں قدم پاک سے برکت ہوگی
جی لگا کر پھر سنوں گا حرمتِ مے کا بیاں
شیخ جی دو گھونٹ پی لوں میں تو پھر ارشاد ہو

وحشت نیاز

وسعتِ زبانِ اُردو

عرصہ سے اہلِ سخن اس فکر میں ہیں کہ ہماری زبان کی ایک مبسوط فرہنگ تیار ہوجائے مگر ابتک تیار نہ ہوئی۔ صاحبانِ انگریز نے اُردو سیکھنے کے لئے انگریزی میں اُردو کی لغت کی دو چار کتابیں لکھیں: ڈاکٹر فالن صاحب نے سب سے زیادہ محنت کی یہہ صاحب لوگوں کے لئے خاصی ہے۔ مگر اس سے اہلِ زبان کا کام نہیں نکلتا۔ جناب امیر مینائی نے بھی یہہ کام شروع کیا مگر شاید ختم نہیں ہوا +

میری دانست میں سب زبانوں سے اُردو کی فرہنگ لکھنی بہت مُشکل ہے۔ وجہ یہہ کہ اُردو میں بے گنتی زبانیں شامل ہوگئی ہیں اور ہزاروں پیشے اور مشغلے ہیں اور اور ہر مُلک و قوم کے علیحدہ علیحدہ۔ اور ہر لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے: مثلاً لفظ "اُستاد" اور "استادجی" ہیں موقع و محل کے موافق اور معنی ہوجاتے ہیں + زبانی و تحریری معنی علیحدہ۔ لغوی علیحدہ اور روزمرہ میں علیحدہ۔ ان کا جمع کرنا ایک دو آدمیوں کا کام نہیں۔ پُشتوں نسلوں اور خاندانوں کے بس کا بھی نہیں: زیادہ تر تمام مُلک و قوم اور سلطنت کا بلکہ ہے +

میں جی بہلانے کو کبھی کبھی افسانے و ناول لے بیٹھتا ہوں تو آنکھیں کھُل جاتی ہیں کہ زبان کی پوری واقفیت کاری مُشکل ہے +

کسی کوشش داں بازاری کی شعبدہ بازیوں کی تحقیق میں ریسرچ کے طور پر لکھنا تھا تو اتنے نام گانے بجانے والوں کے متعلق دیکھنے میں آئے :۔

× × × × × × بالاجمال ڈھیالچی۔ گوتیا۔ بانڑی۔ کارک۔ اکیل۔ مدہم۔ ادہم۔ سچھیا کار۔ الکات رنگیک۔ ایکل۔ جمل۔ بند۔ نکرشت۔ مرشت۔ مُدھر۔ جھپال۔ ترستھان۔ سکھابہ۔ کارن۔ کرن گرت کومل۔ سرادک۔ گمن۔ سنگڈہ۔ گاڈہ۔ سُلپھن۔ پرچرہ۔ رکت جگت۔ کنٹھ رس۔ ڈہاڑی۔ میراثی۔ ڈوم۔ سروالی۔ قوال۔ ڈیڑھ یوا۔ کلاونت۔ مجاور۔ نقارچی۔ غرض کہ جملہ اقسام و اقوام کے گانے والے اور بجانے والے آدمی آئے واہ واہ اے سبحان اللہ اے خدا تم کو سلامت رکھے کہتے ہوئے تحسین و آفریں کو آئے دنیز اشخاص برادری و مختلف الاقوام کے آدمی اور رنڈیاں جیسے کھیت۔ پران۔ بدھیا۔ بھانتو۔ سونت۔ کنجن۔ سانتھ۔ باترہ۔ رونان۔ بھارتی۔ ذرک۔ میگھی۔ ڈھاڑہی۔ گوچے۔ کٹو۔ کالیٹ۔ بہتی۔ موسنی۔ حرکنی۔ بگلوئے۔ میو۔ جھمیلے۔ گکھاروی ڈھبریا۔ بردا۔ بھرڑالی۔ نٹ۔ للّیا۔ موچھار۔ دھرم سکہ۔ گھوگھسی۔ کرؔ۔ پائیں بال۔ چھیکری۔ سورادل۔ ہرجا۔ بگھو۔ رسک۔ ستان۔ کیسریا۔ جیروا۔ لالابن۔ جوگیلے۔ عمرکٹے۔ بوبلے۔ بیڑسن۔ چھاڑئے۔ ٹھک ٹھک بدھیا۔ کال بھور۔ بیسیہ۔ دویا۔ برجیا سیا۔ نٹ بیڑیے۔ گوایہ مہرسوار۔ بنباسی۔ پترے۔ پترکھے۔ رام جنی × × × × × × × × × × ×

بعض محاورے "کرپ ساتک پسوائیگا"۔ "جو زیور قابل ٹھنڈا کر رکھنے کے ہے"۔ "چوڑیاں ٹھنڈی ہوگئیں" (چوڑیاں ٹوٹ گئیں) "ہمک نہ جانا" (تامل نہ کرنا)۔ "اگر ایسا کروں تو خدا میرا تختہ تباہ کرے"۔ "آنا نبڑا ہو جائیگا"۔ "آپ سے ہم غیریت کا برتاوا نہیں رکھتے"۔ (غیر نہیں سمجھتے) "ڈوکاری دیتے ہو"۔

خاندان کی of Research.

خاندان کو داغ لگیگا۔ دھوتے دھوتے مرجاؤگے۔" "تاخت راج ہوجائے" +

اِن کی نذر نیاز یں مانے تو منّت پوری ہو :-

شاہ مدار صاحب کا جھنڈا چڑھائے ستیہ اور بالے میاں کی بجھ نگی شیرینی بٹائے زین خاں پیر کی مانترا مانے پیرونکا طاق بھرے نیاز ٹھانے الوکھی بی بی کی کلیاں بھرے بالے میاں کی کڑاہی رکھ کر رتجگا کرے +

"اُبسا سالن" "نخالص گھی"۔ "دعوت کے سامان کی کثرت سے حویلی ہاترس کی منڈی ہوگئی۔" "وقت پہ کام نہ کرو تو پھر بوند کی جگہہ گھڑے ڈھلکا کرو تو کیا ہوتا ہے؟" "لاکھوں تین کے شٹا کے اڑاتے ہیں"۔ "کھالو حرفوں کی بنی ہوئی ہے"۔ "مجھسے چُپ چھپ کر کہا" (چوری سے چھپ کر کہا) "شیخی خورے مونچھ مروڑے بھرتے"۔ "وہی مثل ہے کہ دیکھی تیری کالپی باون پردی اُجاڑ"۔ "کٹ تان کبٹ تان" (مجیروں کا شور)۔ "بجھیائے باوا" (بیل)۔ "بےدال کے بودم" (الو)۔ د۔ ف۔ ع ہو (دفع ہو) +

غرض ایسے ہزاروں لفظ اور محاورے اُردو میں مستعمل ہیں کہ غیر تو غیر یہاں کے رہنے والے بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہیں[1]۔ یہاں نمونے کے طور پہ لکھے گئے +

اُردو زبان کی فرہنگ (ڈکشنری) بنے تو ایک نہیں پندرہ بیس جلدوں میں آئے اور پھر بھی شاید ہی پوری ہو۔ پہلے فصحا کی زبان - پھر بازاری - پھر متروک اور مستعمل - ہر پیشہ کی علیحدہ علیحدہ: یہہ بے گنتی ہیں۔ غرض ڈکشنیر نکلیا وبالِ جاں ہوجائے +

---

[1] یہ محاورے اور الفاظ زیادہ تر ایک ناول (افسانۂ نوبہار) سے جابجا سے ماخوذ کئے گئے ہیں - اور افسانوں میں بے گنتی نکلیں گے +

زنانہ مصطلحات

اب اب کرکے ۔ چند دنوں سے ۔ شعر

اب اب کرکے انہیں ہوئی صحت + آج یہہ دن خدا نے دکھلایا ۔

اب تب ہورہی ہے عالم نزع میں اکثر عورتیں مریض کے واسطے بولتی ہیں ۔ شعر

بڑی بیگم ہے اب تب ہورہی ہے + دلہن بی چپکے چپکے رورہی ہے ۔

اب سے دُور ۔ تندرستی میں جب کسی کی علالت کا ذکر ہوتا ہے ۔ تو اب سے دور کہا کرتی ہیں شعر

خیر ہی گرہتے تھے اب سے دُور حالت دیکھکر + چار دن کی تپ نے ایسا زار ان کو کردیا ۔

آبرو کا لاگو ۔ کسی کی عزت یا ناموری کو برباد کرنے کے درپے ہونا ۔ شعر

آبرو کا ہو کے لاگو کیا کوئی پھل پاے گا + آپ کیا پھل پائے گا جو اور کو کلپائے گا ۔

آب نمک ۔ نمک مرچ کا درست ہونا ۔ شعر

پرائے گھر تجھے جانا ہے بچی + سلیقہ سیکھ لے آب نمک کا

آب وہوا کا راس آنا ۔ آب وہوا کا مزاج کے موافق ہونا ۔ شعر

راس آئی ہو کسی کو آب وہوا چمن کی + اپنی تو عمر ساری دام قفس میں گزری

آب ودانہ کا اٹھنا ۔ موجودہ جگہہ سے یک بیک منتقل ہونا ۔ شعر

کردیا آزاد مجھکو دیکھکر مانوس غم + ایکدم کیسا قفس سے آب ودانا اٹھ گیا

آپا بسرا ۔ خود فراموش ہونا ۔ آپ کو بھلا ڈالنا ۔ شعر

دولہا بھائی سدھارے کیا جم جم + آپا بسرا دیا ہے آپا نے

آپا دھاپی پڑنا ۔ اپنی اپنی فکر پڑنا ۔ شعر

آنکھ مچتے ہی اپنی دیکھنا تم + آپا دھاپی پڑے گی گھر بھر کو

آپا بہتال

سنبھالنا۔ اپنے تن بدن کی خبر رکھنا۔ شعر

دل کی ہمراس ہوش میں ہو کر نہ لئے + اپنے پرائے بیٹھے ہیں آپا سنبھالیے

لا سنبالا۔ بغیر گھبرا کھانا۔ شعر

اُبلا ست پلا بھی نعمت ہے سالک + جو کچھ بھوک میں پیٹ بھرنے کو پائیں

نا ملنا۔ ابنا کھیلنا۔ بیاہ شادی میں دلہن کے ملا جاتا ہے

آج بی ہمسائی کی بچی کا اُبٹن ہے بُوا + کیا بہار آئیگی اُبٹن کھیلنے آنا ضرور

سے چڑھنا۔ بھاپ کا دماغ کی طرف چڑھنا۔ شعر

ابخرے چڑھ گئے دماغ کو کیا + بے سروپا جو بک رہے ہو تم

نا۔ آپے سے گزر جانا۔ شعر

میری صورت کو دیکھتے ہی بُوا + وہ بھری سے اُبل پڑیں مجھ پر

آل و اولاد مال و دولت پر + کیوں اُبل جائے آپ سے کوئی

یہ بھی حکمت بات تھی کوئی + خالی چاول اُبال لیتے ہیں

سنھی سرپوش کھول دے جلدی + دیکھ تو دیگچی اُبلتی ہے

ر الینا۔ مرض کم تخفیف ہو کر دوبارہ شدت پکڑنا۔ شعر

کل افاقہ ہوا تھا ننھے کو + پھر اُبھار لیا بخار نے آج

ب خرادی آپ مُرادی۔ خود پرست خود غرض۔ شعر

بن کے بیٹھی سب کی دادی + آپ خرادی۔ آپ مرادی

انوار حسین سالک دہلوی (از میرٹھ)
(منقول از رسالہ سہیلی)

اکثر اصطلاحیں اس مضمون میں ایسی ہیں جو ساٹھ برس سے یہاں دہلی کی کسی عورت کی زبان سے کبھی نہیں سُنی
ہوئے دہلی اور لکھنؤ کے اور جگہ کی اصطلاح ٹکسالی نہیں مانی جاتی خواہ زنانی ہو یا مردانی + اور اشعار جو سند میں پیش کئے ہیں وہ بھی
(کاتب) دہلوی

دلی: (از روے قدیم علم و فضل)

چونکہ صلائے عام دلی سے نکلتا ہے اس میں اور مضامین کے مقابلہ میں دلی کے متعلق جو مضمون ہوں زیادہ مناسب و موزوں ہیں * تمام دنیا کے شہروں میں یہہ شہر جس قدر انقلاب دیکھ چکا ہے اور کسی شہر نے شاید ہی اس قدر دیکھے ہوں گے۔ اگر دیکھے ہوں گے تو ساتھ ہی مٹ گیا ہوگا * دلی نے انقلابوں کے معاملہ میں آب حیات پی رکھا ہے۔ یہاں کا پانی (آب جمن) آب خضر کی تاثیر رکھتا ہے *

اس وقت مجھے اس کے انقلابوں کی تفصیل لکھنی منظور نہیں۔ ان کی تفصیل کے لئے عمر خضر چاہیئے * مگر باوجود انقلابوں کے یہاں کی آب و ہوا میں ایک خاص اثر ہے کہ تہذیب و شائستگی میں دلی کی ہمیشہ شہرت رہی۔ اس شہرت میں دلی والے ہمیشہ نیک نام رہے * اس شہرت میں دلی والے اگر تمام دنیا سے نہیں تو اکثر ملکوں سے بازی لے گئے * یہاں کے علما، و فضلا، اور ملکوں و سلطنتوں میں از روے امتیاز بلائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سکندر ذوالقرنین کے دربار میں جس کی پیدایش کا ملک یونان تھا (اور یونان علم و فضل کا گھر سمجھا جاتا تھا) سُنا ہے کہ سکندر کے دربار میں ہندوستان کے فلاسفر موجود رہتے تھے۔ تیمور یہاں کے اہل علم و فن اپنے ساتھ لے گیا اور فیروز شاہ کے کوٹلہ کی جامع مسجد کا نقشہ اُتروایا کہ اس وضع کی مسجد سمرقند میں بنائی جاے *

نادر شاہ

نادر شاہ کے ساتھ صاحب تحفۃ المومنین (حکیم) ایران گئے اور یہاں کی ایک نامور رقاصہ کو جس کا گانا نادر جیسے خشک سپاہی منش کو پسند آیا تھا نادر اپنے ساتھ لے گیا +

یہہ بات مسلّمہ ہے کہ تہذیب و شائستگی کا مدار زبان پر ہے - اور یہہ کون نہیں جانتا کہ زبان میں دلّی کی زبان (اُردو) کا سکّہ تمام ملک میں بیٹھا ہوا ہے - اُردو کا مرکز یہی شہر سمجھا جاتا ہے : جہاں دلّی و دلّی والوں کا نام آیا گویا پاکیزہ بیانی کا بیمہ ہوگیا - شائستگی و خوش کلامی کا نقشہ کھنچ گیا + اخلاق و شائستگی میں دلّی کی سند لیجاتی تھی - دستار و رفتار و گفتار میں دلّی پر خاتمہ تھا : زبان کے معاملہ میں دلّی کا نام آیا نہیں پھر کیا مجال جو کوئی دم مارے - جو بات دلّی والوں کی زبان سے نکل گئی پھر کوئی لاکھ بکا کرے نقش کالحجر ہوگئی + جسطرح بازیگر تماشے سے پہلے اُستاد کا نام لیکر کان پکڑتے اور زمیں چومتے ہیں - دلّی کے سامنے تمام ملک کان پکڑتا تھا + دلّی کا عطّار باہر چلا جائے تو حکیم سمجھا جاتا ہے اور مکتب کا مُلّا عالم متبحّر - جیسے قرآن شریف کی دو ایک سورتیں نماز کے لایق یاد ہوں تو حافظ جی صاحب +

گو اب یہہ شہر مدّت کے بعد ہندوستان کا دارالسلطنت قرار پایا ہے اور نئی دہلی نہایت شاندار شاہانہ عظمت و اہتمام سے تعمیر ہوئی ہے اور پرانا شہر (شاہجہاں آباد) بھی تجارت اور جدید عمارتوں اور بازاروں سے بہت ترقی پر ہے کہ تجارت کی ترقی اور نئے بازاروں اور دکانوں سے غدر سے پہلے کی دلّی سے شہر پہچانا نہیں جاتا - مگر باوجود سب طرح کی ترقی کے یہہ شکایت ہے کہ علم و فضل اور خوبیٔ گفتار و رفتار و دستار میں اب اس کی وہ شہرت نہیں جو قدیم زمانہ میں تھی + زبان میں بیگانگی آگئی - لباس میں ہندوستانیت نہیں رہی -

بزرگانی وضع

پُرانی وضع کے لوگ نہیں رہے: اور گو مدرسوں سے انگریزی خواں زیادہ نکلتے ہیں۔ اور کھیل تماشوں کی کثرت ہے مگر پہلی سی وہ صحبتیں نہیں۔ اجنبیت بہت بڑھ گئی +

میرے ملنے والوں میں جو بعض اصحاب باہر سے دلی کی شہرت سُنکر دلی میں تشریف لاتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ وہ پُرانی صحبتیں نظر نہیں آتیں۔ علمی مشاغل کی تلاش میں کہاں جائیں؟ دلی اب تجارت کی منڈی ہے کہ سودا لیا اور چل دیئے۔ ہر شخص سوداگری اور دُکانداری میں مشغول ہے۔ پہلی کی سی علم و فضل کی باتیں سُننے میں نہیں آتیں +

یہاں کی زبان علم و فضل سے خالی ہوکر عامیانہ ہوگئی۔ عامیانہ میں نے بہت ڈر کر عرض کیا کہ اکثر عوام کبوتر کو بخرہ "تبوتر" بولتے ہیں اور کسی کی سادگیئے مزاج کو جس میں تکلف نہو سادہ لوح فرماتے ہیں۔ گویا سادہ لوحی تعریف ہوئی +

دلی سے زیادہ لکھنؤ میں شعر و سخن کا چرچہ ہے + اُردو رسالوں اور اخباروں میں لاہور دلی سے بازی لے گیا۔ لاہور کے اخبار و رسالے روزمرّہ دلی میں آکر ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں +

ہندو مسلمانوں میں جو علمی مشاغل خاصکر فارسی اُردو کی وجہہ سے شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہتی تھیں اب نہیں رہیں۔ علمی مشغلوں کا چرچہ جو یگانگت و اتفاق کا باعث تھا کم ہوگیا۔ اسی شہر میں ادھر تو نادر کے حکم سے قتل عام ہو رہا تھا اُدھر لالہ ٹیک چند بہار (صاحب بہار عجم) ایک ایک مُغل سے فارسی الفاظ کی صحت پوچھتے پھرتے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مرزا نوشہ جناب ہرگوپال تفتہ کو فرزند عزیز سے بڑھ کر سمجھتے تھے + ...

غدر سے پہلے کے معرکے

غدر سے پہلے کے معرکوں میں ایک مولوی اسماعیل صاحب کا دوسرا مولوی امیر علی صاحب کا معرکہ از روئے تاریخ بھولی ہوئی باتوں میں ہیں۔ مولوی امیر علی صاحب کے معرکہ کی حقیقت لکھنؤ سے علاقہ رکھتی ہے جو واجد علی شاہ بادشاہ کے زمانہ میں غدر سے پہلے اور واجد علی شاہ بادشاہ کے اودھ کی سلطنت سے جُدا ہونے سے تھوڑے ہی عرصہ پیشتر واقع ہوا ✣ مولوی اسماعیل صاحب کے معرکہ کا تعلق کم وبیش دہلی اور پنجاب سے ہے۔ اوّل الذکر کا شہرہ لکھنؤ میں بہت دنوں رہا۔ جسکے متعلق دو ایک کتابیں اُس زمانہ میں لکھی گئیں: مگر آخر الذکر کا حال مفصل دیکھنے میں نہیں آیا ✣ دونوں واقعوں کا تعلق سرکار انگریزی سے نہیں۔ نہ اس مضمون میں پالیٹکس سے واسطہ ہے ✣

پہلے میں مولوی اسماعیل والے واقعہ کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا تعلق کم وبیش غدر سے پہلے کی دلّی (شاہجہاں آباد) سے ہے ✣ اس معرکہ کے بانی ایک بزرگ مولوی سیّد احمد نامے رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ اور مولوی اسماعیل صاحب دلّی کے مولویوں کے نامور خاندان سے تھے ✣

مورخانہ تحریر میں کسی کی تعریف یا غیر تعریف سے واسطہ نہیں ہوتا۔ محض واقعات سے غرض رہتی ہے۔ نہ مورخ کو چاہئے کہ اپنی رائے کو دخل دے ✣ یہہ میں پہلے سے اس لئے عرض کئے دیتا ہوں کہ یہہ مضمون بالکل بے لگاؤ ہے جس سے مضمون نگار کو کوئی خاص تعلق نہیں۔ اور عقائد

مذہبی سے تو قطعی واسطہ نہیں + ناموں میں کہیں کہیں ادب اُردو کے موافق ذعابلی الفاظ میں باضابطہ احتیاط نہیں ہو سکی۔ کہیں زیادہ ہوگئی کہیں رہ گئی +

شروع سے اخیر تک اس معرکہ کے بانی مبانی دراصل مولوی سید احمد تھے جو عوام میں یہہ اور ان کے ہمراہی وہابیوں میں سمجھے جاتے ہیں+ میں یہاں "وہابی" کے لقب اور عقاید کا ذکر نہیں کرنا چاہتا کہ یہہ بحث علیحدہ ہے اور صلائے عام کے اصول کے خلاف ہے +

سید احمد رائے بریلی میں ۱۲۰۱ ہجری میں مُحرّم کے مہینہ میں پیدا ہوئے۔ آغاز عمر کا حال معلوم نہیں کہ طفولیت کس طرح گزری۔ ملازمت میں یہہ پہلے پہل نواب امیر خان کے لشکر میں سواروں میں نوکر ہوئے : یہہ نوکری ترک کر کے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں دلّی آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ یا ۳۰ برس کی ہوگی +

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے علم و فضل کی شُہرت تمام مُلک میں تھی۔ سید احمد نے حضرت کی خدمت میں ۳ برس حاضر رہ کر علم دین بہت محنت سے حاصل کیا۔ اور وعظ و موعظت میں مشہور ہوئے + یہاں سے آپ رامپور چلے گئے۔ رامپور میں رجوع خلایق زیادہ ہوا + دینیات میں چونکہ بہت دخل تھا۔ اب علماء سے بحث و مباحثہ میں بہت شُہرت ہوگئی +

یہاں سے میں آپ یعنی سید صاحب کو مولوی ہی کے رُخ سے مخاطب کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید اور حدیث کی رو سے دینی بحث و مباحثہ میں آپ بہت مشہور ہوئے اور عوام میں اسلام کے نام سے جو بدعتیں آپ کی دانست میں رائج ہو چلی تھیں اُنکی بیخ کنی کی طرف متوجہ ہوئے + آپ کے وعظ و نصائح سے اکثر لوگ آپ کے معتقد ہوگئے +

رام پور سے آپ ۱۸۱۹ء میں پھر دلّی واپس گئے۔ دلّی میں ایک بات نعمت غیر مترقبہ کی طرح ایسی نصیب ہوئی جسکا اثر اس معرکہ میں بڑے

کام آیا

کام آیا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب سے جو رشتہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے بھانجے تھے ملنا ہوگیا۔ مولوی اسمٰعیل صاحب کے علم و فضل کا کیا کہنا معقول و منقول اور فقہ و حدیث میں آپکا جواب نہ تھا۔ معقول میں منطق و ریاضی و فلسفہ میں ید طولےٰ تھا۔

مولوی اسمٰعیل صاحب کی فضیلت اور دینیات میں کمال کا ایک زمانہ قائل تھا۔ اس پر خاندان کیسا بزرگ جسکا سلسلہ حضرت عمر خطاب تک پہونچتا ہے۔ مولوی صاحب کو بھی عوام میں جو بدعتیں داخل ہوگئی تھیں اُسکا رنج تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو خلاف شرع اور اسلام رسمیں رائج ہورہی تھیں ان کا انسداد ضرور ہے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نے جامع مسجد دہلی میں خلاف شرع بدعتوں کے خلاف بہت زور سے وعظ شروع کئے۔ اور کتاب تقویت الایمان بڑے زور کی لکھی۔

یہہ اتفاق کی بات ہے یا مشیت ایزدی کہ مولانا اسمٰعیل صاحب اور ان کے رشتہ کے بھائی مولوی عبدالحی صاحب پر سید صاحب کے عقائد کا بڑا اثر پڑا۔ اور یہہ دونوں بزرگ آغاز سے انجام تک سید صاحب کے دل سے معتقد اور اس معرکہ میں سید صاحب کے دست و بازو رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس شخص پر سید احمد صاحب کی نگاہ پڑ جاتی بھی بلا تامل معتقد و مرید ہوجاتا تھا۔ چنانچہ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سید احمد صاحب کی نگاہ مولوی اسمٰعیل صاحب پر جامع مسجد میں نماز کے وقت جو پڑی تو اُسی وقت سے ان کی حالت عجیب ہوگئی کہ دنیا و مافیہا سے واسطہ نہ رہا۔

اب یہہ تینوں صاحب یعنی سید احمد صاحب مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحی صاحب اس بات پر آمادہ ہوئے کہ تمام ملک میں دورہ کرکے توحید کا وعظ کرنا چاہئے پھر خانۂ کعبہ کو حج کو چلے چلیں۔

اس غرض سے دلی سے اور راہ میں بڑی

جمعیت اکھٹا ہوگئی۔ دلی سے اکثر اہل علم ساتھ ہو لیئے: مولوی عبداللہ صاحب ایک جو بڑے پایہ کے عالم و فاضل تھے لشکر کے موذن اور میر منشی مقرر ہوئے ÷ اس لشکر کا (جس کی تعداد ہزار ہا تک پہونچ گئی) سفرنامہ میں نے دیکھا جس میں عجیب عجیب خرق عادات اور کرامات کا ذکر ہے کہ اتنے بڑے لشکر کے خرچ اخراجات اور بغیر انتظام کمسریٹ کے کس طرح کام چلا ÷

یہہ لشکر ۱۸۲۰ء میں یہاں سے چلا اور راہ میں لوگوں کو اپنی وضع پر تلقین کرتے ہوئے پٹنہ پہونچا اور پٹنہ سے کلکتہ۔ معتقدین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مرشد کے ہاتھ پر بیعت کا طریقہ مشکل ہوگیا: ہاتھ پر بیعت کرنے کی جگہہ صرف سید صاحب کے عمامہ کا سرا بڑھا دیا جاتا تھا جس کے چھونے سے بیعت کی رسم ادا ہو جاتی تھی ÷

۱۸۲۲ء میں مولوی سید احمد اور ہمراہیان معتبر کلکتہ سے حج کو روانہ ہوئے اور حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ کی زیارت سے شرفیاب ہوے ÷

یہاں اُس زمانہ کے عرب کے حالات میں یہہ بات ذکر کرنے کے قابل ہے کہ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۸ء تک "وہابی" عقائد کا بڑا شور مچ رہا تھا اور مصر کے محمد علی پاشا سے اور وہابیوں سے معرکہ آرائیاں درپیش رہیں جن میں وہابیوں کے لیڈر عبدالوہاب کو بعد صلح باہمی قسطنطنیہ بھیج دیا گیا ÷

اس میں شک نہیں کہ وہابی عقائد کا چرچہ دلی میں مولوی سید احمد کے دلی آنے سے بہت پیشتر زبان زد خلایق تھا ÷

حاجیوں کی یہہ پارٹی مدینہ منورہ سے قسطنطنیہ پہونچی۔ قسطنطنیہ میں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور وہاں سے خوش خوش یہ لوگ پھر دلی آئے ÷ دلی میں مولوی سید احمد

سے اکبرآبادی

نے اکبر آبادی مسجد میں قیام کیا اور مولوی اسماعیل صاحب نے کمال فصاحت اور بلاغت سے عقائد وہابیہ کی تائید میں جابجا وعظ کہنے شروع کئے۔ ان وعظوں کا اثر گو بہت لوگوں پر ہوا اور وہابیت کے معتقدوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا: مگر اگلے عقائد کے لوگ جو "بدعتی" کے نام سے مشہور تھے وہابیوں کے خلاف رہے۔ خاص کر اولیا اللہ کی درگاہوں کے معتقدوں کو وہابیوں سے بہت بیزاری پیدا ہوگئی + بزرگوں کی درگاہوں سے جن کو عقیدہ تھا اُن کو وہابیت سے اُنس نہ ہوا + اب دلّی میں دو گروہ ہوگئے۔ وہابی اور بدعتی: ان کے اختلاف کی تائید اور تردید میں دونوں طرف سے کتابیں لکھی گئیں اور مسجدوں اور محلوں میں برابر وعظ ہونے لگے +

اس بحث کو میں یہیں چھوڑ کر مولوی اسماعیل کی مہم کا پھر ذکر کرتا ہوں + "مولوی اسماعیل کی مہم" میں اس لئے قرار دیتا ہوں کہ وہابی اور غیر وہابی خیالات کو چھوڑ کر مولوی اسماعیل سا عالم فاضل دوسرا نہ تھا۔ اِنہیں کی قابلیت اور جان فشانی سے یہ نئے عقاید وہابیوں کے اُسوقت سرسبز ہوگئے +

نئے عقاید میں یہہ بات عجیب ہے کہ ان کا آغاز پہلے عالموں اور فاضلوں سے ہوتا ہے۔ جس طرح قادیانی عقاید میں ان کے لیڈر علمی لیاقت میں بہت مشہور مشہور اشخاص ہیں وہابیوں میں بھی بہت بڑے بڑے عالم و فاضل شامل ہوئے ان کی تائید و تردید سے مورّخ کو واسطہ نہیں +

۱۲۴۶ھ میں یعنی آج سے سو برس کا ذکر ہے کہ یہہ پارٹی جو وہابیوں کے نام سے

مشہور ہوئی پشاور پہونچی۔ پشاور کیا تمام پنجاب اُن دنوں مہاراج رنجیت سنگھ جیسے زبردست و بیدار مغز حکمراں کے قبضہ میں تھا؛ وہابی پارٹی جیسلمیر۔ سندھ اور کابل کی راہ سے پشاور پہونچی اور پشاور نے یوسف زئی۔ جہاں وہابیوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر قرار دیا؛ اس وقت اس پارٹی کے پاس بڑا لشکر تھا جس کے مقابلہ میں راجہ رنجیت سنگھ نے بہت بڑی فوج پہلے سے اٹک میں جمع کر رکھی تھی؛ وہابیوں نے اٹک پر حملہ کیا۔ اور گو اس مہم میں ظاہرا تھوڑی بہت کامیابی ہوئی مگر آخر کو رنجیت سنگھ کی جنگ آزمودہ فوج کا مقابلہ مشکل ہوگیا۔ اور وہابی لشکر معہ اپنے افسروں کے سوات کی طرف پس پا ہوکر آخر کو تباہ ہوگیا؛

اس مہم سے دو نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں کہ گو اس پارٹی کے مذہبی جوش میں کمی نہ تھی مگر انتظام اور تجربہ نہ تھا عقائد مذہبی کی اصلاح میں جس قدر سختی کی گئی اُسی قدر آخر کو ناکامی رہی؛ دُرّانی افغان اور پٹھان زمانہ ساز نکلے اور وہابیوں کو ان کی سختی سے چھوڑ بیٹھے؛

اس مضمون کا مسالہ زیادہ تر
Journal of the Central Asian Society, 1921
سے ماخوذ ہے؛

صلائے عام

گمنام شاعر

نواب کاظم علی خاں کاظم لکھنوی خدا بخشے عجیب زندہ دل اور بابا باشش آدمی تھے کم سخن اور ضابطہ شریف خاندان نواب شجاع الدولہ بہادر کی اولاد میں تھے تیس روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے۔ اس پر بسر اوقات نہوتی تھی پہلے تو محلہ میر بخارا میں رہتے تھے مگر آخر عمر میں معالی خاں کی سرائے میں سکونت اختیار کی تھی دبلے پتلے چھچھا رو نحیف الجثہ آدمی تھے گل مچھے رکھتے تھے نکہ دار ٹوپی دو پلّی پہنتے تھے سلیم شاہی جوتا۔ غدر کے دو برس بعد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۲۵ء میں انتقال کیا۔

کمسنی میں مصوری کا شوق تھا جوانی میں وہی ذریعہ معاش بن گیا تصویر بہت اچھی بناتے تھے خصوصاً اصلی مُرغ کا جوڑا ان کے قلم کا بےمثل ہوتا تھا اور اس کی قیمت بھی زیادہ لیتے تھے۔ روز نخاس میں آتے تھے اور کچھ سودا دکانداروں سے ہوجاتا۔ اتوار کو بڑا بازار ہوتا تھا اس دن کوئی شوقین مل گیا تو بہت سی رقم مل جاتی تھی نہیں تو معمولی تصویریں بادشاہوں کی چار چار آنہ بیچ ڈالتے تھے۔ اچھی تصویریں دو روپیہ کو فروخت ہوتی تھیں۔ قدردان کا ملنا شرط تھا ضرورت کے وقت ایک روپیہ کا مال چار آنے کو دیدیتے تھے ان کا قول تھا کہ ضرورت انسان کو مجبور کر دیتی ہے باوجود ان سب باتوں کے تشویش اور فکر معاش میں مبتلا رہتے تھے۔ ان سب اُلجھنوں کے ساتھ شاعری کا شوق بحدّ کمال تھا کسی ضروری کام سے جاتے ہوں کسی نے اصرار کیا نواب صاحب دو چار شعر تو سُنانے جائیے عذر نہیں کرتے تھے دو چار گھڑی بیٹھ کر دل بہلاتے تھے اس وقت نہ گھر کی فکر ہوتی تھی نہ مال کے بکنے کا غم۔ نواب ہادی علی خاں یکتا کے شاگرد رشید تھے نواب صاحب ان کو بہت مانتے تھے لیکن غزل عمر بھر مشکل زمینوں میں کہی اور دو چار مرتبہ سنا کر غزل کا کاغذ ردی کی طرح ڈال دیا۔ لکھنے

توکئی دیوان جمع ہو جاتے مگر اس بات کی کبھی فکر نہ کی اور سچ تو یہ ہے فکرِ معاش نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ فطرت کی صناعیوں کی بہار لوٹنے کا مزہ تمیز میں تھا۔ ایک دن ابرتھا نواب ہادی علی خاں یکتا بھی ساتھ تھے کہنے لگے استاد آج تو کمپنی باغ چلو دو گھڑی بیٹھ کر ہوا کھائیں۔ کمپنی باغ میں جا کر گھاس پر آرام سے بیٹھ گئے ٹوپی اتار کر رکھدی ہاتھ میں چھڑی تھی اُسے بھی زمین پر رکھ دیا۔ تصویر وں گوزانوں کے نیچے دبا لیا۔ چار بجے سے چراغ جلے تک کلام سُنتے رہے اور سناتے رہے۔ اس کے بعد جو گھر کا خیال آیا کہنے لگے بڑی دیر ہو گئی اچھا خدا حافظ یہہ کہہ کر سیدھے گھر کا راستہ لیا۔

لوگ آزمایش کے لحاظ سے مشکل سے مشکل زمین میں غزل کہنے کی فرمائش کرتے تھے اور نواب صاحب کبھی عذر نہیں کرتے تھے۔

اب یہ امید تو رہی نہیں کہ کوئی ان کا کلام جمع کر کے چھپوائے گا مگر افسوس ہوتا ہے کہ ایسا پُرگو۔ ایسا مشکل گو شاعر اب گمنام رہے کہ سوا دو چار دوستوں کے اور کوئی اس کے کلام سے محظوظ نہ ہو۔ ہمکو جس قدر غزلیں دستیاب ہوئیں اور ان میں جو دو چار شعر ممتاز نکلے انہیں کو جمع کر دیا تاکہ نواب کاظم علی خاں کا نام زندہ رہے

حُسن غنچے میں کہاں یہ اور یہ جوبن پھول میں
یہ دہن اے رشکِ گُل اور ایسی چتون پھول میں

وہ سُبک رَو بادپا ہے شوخ کا وقتِ خرام
پڑ نہیں سکتے نشانِ نعلِ توسن پھول میں

کیا خبر میت کو گمگیرہ ہو یا ہو دشمنی
چادرِ مدفن بنے یا سیکڑوں من پھول میں

قطرۂ شبنم سمجھتے ہیں جسے سب نے غلط
دانہائے اشکِ بلبل کا ہے خرمن پھول میں

کوئی پرچہ نہ لکھو جب تو ہمارے دل کے
کیوں نہ غربت میں ملیں ابتر وطن دیکھ کے

کشتِ دل پر نہ مرے سنگِ حوادث برسا
نہیں لایق ہے یہ اے چرخِ کہن پتھر کے

نہ پوچھو اپنے نشیب فراز کا عالم
بشکلِ اشک گرے اور درد دمکے اُٹھے

تھے بلبلوں کے جو کہ نشیمن چمن چمن
زاغ و زغن کے ہیں وہی مسکن چمن چمن

دامانِ چاکِ گُل کوئی کرتی نہیں رفو
موجود گو ہے خار کی سوزن چمن چمن

گلچیں سے طالب زرِ گُل ہیں یہ باغ میں
پھیلائے ہیں جو پھولوں نے دامن چمن چمن

بزم میں اس شعلہ رو کی سرد مہری دیکھ کر
سرد ہیں صدمہ سے اہلِ انجمن کے ہاتھ پاؤں

نزاکت دیکھئے ہو لاکھ گہنا ہلکے پھولوں کا
مگر اُن کے تنِ نازک پہ ہے بارِ گراں پھر بھی

۴ کیا گو قتل بھی قاتل نے ہم کو لاکھ منت سے
مگر اللہ رے شوخی کہ چھوڑا نیم جاں پھر بھی

گُل سے افزوں ہیں مری آنکھوں میں دل جو کانٹے
پھول رکھتا ہے تری بو تو تری خو کانٹے

۵ باغ عالم میں جو راحت ہے تو کچھ رنج بھی ہے
تا کمر گُل ہیں تو پائیں سرِ زانو کانٹے

یوں آبِ تیغ کی ہے روانی گلے گلے
ہو جس طرح کہ سیل کا پانی گلے گلے

یہ خاکِ قبر پہ کیوں صورتِ نیا قیصر و دارا ہے
جتاتے اب نہیں کچھ شوکتِ شاہانہ تربت میں

جنباں نہیں نسیم سے یہ بار بار پھول
گلبازیِ نگار کو ہیں بیقرار پھول

ناداں خزاں مآل ہے اس باغ کی بہار
گلشن کی اس فضا پہ نہ تو اے بہار پھول

اوجِ شاہی کا ملا ہے گر چہ ہوں ادنےٰ فقیر
سر پہ بشکلِ چترِ شاہی آسماں گردش میں ہے

سُرخ ہیں مہندی سے اس شاخِ چمن کی انگلیاں
یا کہ ہیں ترشی ہوئی لعلِ یمن کی انگلیاں

جائے گر یہ اُس گہر کی ہے شکستہ خاطری
جو نہ اس کے کان کا گوہر بنے اور ٹوٹ جائے

چھوٹ پڑتی گر نہ حسنِ یار کی ہنگام دید
اس قدر ہوتا نہ ہرگز حسن افگن آئینہ

بات اس غنچہ دہن کی ہے جو آدلۂ گُل — عرقِ تن بھی ہے مثلِ عرقِ تازہ گُل

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

صلائے عام۔ صادشدہ شعر لاجواب ہیں ۱۲

مختلف فیہ الفاظ

جو چیز اپنے مرکز سے مٹ جاتی ہے اس کا اعتبار صحیح نہیں رہتا۔ زبان اُردو کے دو مرکز اول دہلی ہے اور اس کا انکار کرنا چاند پر خاک ڈالنا ہے اگر دہلی کی سلطنت میں انقلاب پیدا نہ ہوتا تو یہی شہر اکیلا مرکز رہتا۔ شاہ عالم بادشاہ کے وقت سے دہلی کی تباہی شروع ہوئی اہلِ کمال مُصیبت میں مبتلا ہوئے علم و ہنر کی قدردانی مٹ گئی۔ ایسی مُصیبت کی حالت میں دہلی کے شہزادے جن بیچاروں نے قلعہ معلّٰی سے قدم باہر نہ نکالا تھا عہدِ نواب آصف الدولہ بہادر میں دہلی سے لکھنؤ چلے آئے یہاں ان کے قدردان موجود تھے نواب بہو بیگم کے قرۃ العین نواب آصف الدولہ نے اپنی آنکھیں بچھا دیں نواب سالار جنگ نواب مرزا علیخاں نواب بہو بیگم کے بھائی نے ان کا خیر مقدم اچھی طرح کیا۔ شہزادہ سلیمان شکوہ شہزادہ جہاندار وغیرہ جو جو شہزادے دہلی سے لکھنؤ میں آئے نواب آصف الدولہ کے مہمان ہوئے انکی تنخواہیں مقرر ہوئیں ان کے عملے میں دہلی کے مشہور شاعر بھی داخل ہوئے ٭

خاص شاہ عالم کے درباری شعراء میر تقی میر۔ مرزا رفیع السودا۔ حسرت۔ جرأت سوز وغیرہ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے بہت انعام پائے۔ بیش بہا تنخواہ ہوئی۔ اب لکھنؤ کی زبان نے وقار حاصل کیا اور عہد ناسخ میں لکھنؤ زبان اُردو کا مرکز قرار پایا تذکیر و تانیث نے اصول و قواعد کا جامہ زیب بر کیا زبان کے ایک ایک لفظ ایک ایک محاورے کی جانچ پرتال ہونے لگی شعراء کی زبان صحیح اور مستند مانی گئی اور ان کی اتباع میں زبان پرورش پانے لگی۔ اُس وقت میں لکھنؤ کی شاعری صرف اس لحاظ سے ہوتی تھی کہ لوگوں کو لفظ کا محلِ استعمال صحیح صحیح معلوم ہو جائے یہی سبب ہے کہ جتنے الفاظ قدما کے دواوین میں پائے جاتے

ہیں حال کے شعرا کے دواوین میں اس کے اکثر الفاظ بھی نہیں ملتے اُس وقت کے شعرا کا دیوان نہ تھا ایک لغت تھا اس ترتیب میں بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں فرق آ ہی گیا۔ لکھنؤ والے اس بدل میں مجبور تھے کیونکہ لکھنؤ کے عام استعمال کی ان کو اتباع کرنا پڑتی تھی بلکہ جو شعرا دہلی کے لکھنؤ میں موجود تھے اُنہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور دہلی کے بعض مذکر الفاظ لکھنؤ میں مؤنث اور بعض مؤنث الفاظ مذکر مستعمل ہونے لگے۔

شعرا نے دانشمندی سے اس کی اسطرح اصلاح کی کہ اس اختلاف کو اختلاف علما سمجھ کر دونوں طرح جائز رکھا کہ متبعین کو اختیار ہے دونوں مرکزوں میں سے جس کی چاہیں اتباع کریں دونوں جائز اور صحیح ہیں خود لکھنؤ میں ایسا اختلاف بعض موقع پر رونما ہوا اس میں بھی یہی قاعدہ جاری ہوا کہ دونو طرح صحیح مانے گئے۔

ان مختلف فیہ الفاظ کی کوئی فہرست مکمل نہیں ہے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ بعض الفاظ جو میں نے سُنے ہیں ان کو ایک جگہ جمع کر دوں تاکہ اُردو زبان بولنے والوں کو دقت پیش نہ آئے۔

اَبرو۔ بھوں کے معنی پر عموماً دہلی کے لوگ مؤنث بولتے ہیں۔

ظفر۔ دیکھنا بھونچال سے ہل جائیگا سارا جہاں
یک ذرا ابرو اگر اس فتنہ گر کی ہل گئی

اہل لکھنؤ کی زبان پر مذکر ہے۔

دیکھ تو کتنے گلے کٹتے ہیں تلواروں سے
تو ملا بیٹھ کسی روز تو ابرو اپنا تو

آغوش۔ گود کے معنی پر دہلی میں اس لفظ کو مؤنث بولتے ہیں۔

ظفر۔ شاہد مقصود ہے کس کی بغل میں ہی ظفر
دیکھ ہے آغوشِ چرخ پیر بھی خالی پڑی

لکھنؤ والے مذکر بولتے ہیں۔

رند۔ میں وہ محروم محبت ہوں لڑکپن میں بھی
وا کسی نے نہ مرے واسطے آغوش کیا

اُف۔ ایک کلمہ ہے جو تکلیف یا درد کی حالت میں بولا جاتا ہے۔ دہلی میں مؤنث بولا جاتا ہے

مومن۔ بے گنہ مجکو ستایا اُس نے
اُف نہ کی تو بھی جلایا اُس نے

لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے۔

آتش۔ سوزشِ دل سے زباں کو نہ ہوئی آگاہی
اُف کیا منہ سے نہ جھلا راز اپنا

التماس۔ بمعنی عرض و گزارش دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مختلف فیہ ہے یعنی اہل دہلی مذکر اور مؤنث دونوں طرح بولتے ہیں۔ اور اہل لکھنؤ بھی مذکر و مؤنث دونوں طرح بولتے ہیں

مذکر کی مثال۔

مومن۔ فلک رس ہو خو تمامناجات کا
کروں التماس اپنی حاجات کا

مؤنث کی مثال

شائق دہلوی۔ آئے چند اشخاص اک دن اسکے پاس
بعد تسلیمات کے کی التماس

لکھنؤ میں اکثر لوگ مؤنث بولتے ہیں کم تر مذکر۔

مؤنث کی مثال۔

نسیم لکھنوی۔ ادا ہر طرح رسم آبرو کی
ادب سے التماس گفتگو کی

عموماً اہل لکھنؤ مؤنث بولتے ہیں۔

بلبل مشہور پرند ہے۔ شعرا کے کلام میں افراط سے نظم ہے۔ بعض نے اسے مذکر باندھا ہے بعض نے مؤنث۔ اہل دہلی نے مؤنث نظم کیا کہا ہے لکھنؤ میں آج کل عام زبانوں پر مؤنث ہے۔

ناسخ۔ بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

آتش۔ بلبل گلو سے دیکھ کے مجھکو بگڑ گیا
قمری کا طوق سرو کی گردن میں پڑ گیا

غالب۔ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ناسخ۔ گل تر دام محبت میں ہیں لو تازہ اسیر
جس طرح دام میں بلبل ہو گرفتار نئی

خدنگ۔ چھوٹا تیر یہہ لفظ عموماً مذکر بولا جاتا ہے۔

وزیر۔ غضب سے دیکھا جو پھیلائے میں نے پیار ہاتھ
خدنگ جانب آغوش آرزو آیا

لیکن اسیر نے ایک جگہ مونث نظم کیا ہے۔ مگر آج کل مذکر مستعمل ہے اس لئے یہہ لفظ مختلف فیہ نہیں رہا۔

اسیر۔ میں نہ سمجھا تھا کہ دل توڑے گی یوں اسکی نظر
پار سینے کے خدنگ بے کماں ہو جائیگی

زنار جنیو۔ آج کل زبانوں پر مذکر مستعمل ہے

ناسخ۔ رہتی ہے حسن پرستوں کے گلے میں زنجیر
کفران کا ہے نیا اور ہے زنار نئی

وزیر۔ کافر ہوا ہوں پیکے مے عشق بت وزیر
زنار مجکو چاہئے موج شراب کا

سبحہ۔ تسبیح۔ لکھنؤ میں مختلف فیہ
بولا جاتا ہے۔
امیر۔ ذکر کرتا ہوں کسی کی نرگس مخمور کا
سبحہ میرے ہاتھ میں ہو دانۂ انگور کا
ناسخ۔ فصل گل میں اسقدر ہے میکشوں کا دور دور
سبحہ زاہد نے بنائی دانۂ انگور کی
فکر۔ اندیشہ۔ دہلی میں مذکر مستعمل
ہے لکھنؤ میں مؤنث۔
مومن۔ کیا اچھے ہو گئے کہ بھلوں سے برے ہوئے
یاروں کو فکر چارۂ و درماں نہیں رہا
ناسخ۔ خواب اس غفلت کدے میں اب جو آتے ہیں نظر
فکر کرنی ہے لحد میں ایک دن تعبیر کی
قلم۔ پہلے دہلی میں مؤنث مستعمل تھا
مگر اب لکھنؤ و دہلی میں مذکر مستعمل ہے۔
ظفر دہلوی۔ رہی قلم دم تحریر غم بھری کی بھری
بہانہ اشک رہی چشم نم بھری کی بھری
ذوق۔ ہوا حمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا
الف الحمد کا ابن گیا گویا قلم میرا
داغ۔ عدوے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے موسوی ہے حمد خالق میں قلم میرا
لفظ۔ کو اہل لکھنؤ اکثر مذکر بولتے ہیں
اور کمتر مؤنث۔ میر انیس کے خاندان کے لوگ
مؤنث بولتے ہیں۔
ناسخ۔ ہے طلب سے اس قدر نفرت کہ آتا ہے خیال
آنہ جائے لفظ لب پر باب استفعال کا
رشک۔ وصل کی رات بنا نامہ بھی شوق گیسو
شام لفظیں ہیں سفیدی ہے سحر کاغذ کی
مالا۔ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے دہلی میں مؤنث
نسیم لکھنوی۔ انداز سے اپنے لیکے مالا
کاندھے پہ رکھا وجیں کے ڈالا
موتیا۔ لکھنؤ میں مذکر ہے۔ دہلی میں مؤنث ہے
داغ۔ بیلا کھلا گلاب کھلا موتیا کھلی
دل کی کلی نہ تجھ سے مگر اے صبا کھلی
سحر لکھنوی۔ جہاں بہار میں آنسو گرے تھے بلبل کے
اسی زمین پہ سنتے ہیں موتیا پھولا
نقاب۔ مذکر اور مؤنث لکھنؤ میں
دونوں طرح بولا جاتا ہے۔
آتش۔ ٹھہر حضور ماہ نہ ماہ چہار دہ
دن ہو گیا نقاب جو منہ سے اٹھا دیا
سحر۔ نہ دیکھے غیر تمہیں اور ہم تمہیں دیکھیں
ہماری آنکھ کا پردہ کرو نقاب اپنی
ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اہل

لکھنؤ

لکھنؤ جس لفظ کو مونث بولتے اور اہل دہلی اسی لفظ کو مذکر کہتے ہیں تو اُن کے نزدیک ایک جائز ہے ایک ناجائز ہے۔ بلکہ دونوں طرح اس کے جواز کا مسئلہ جاری ہے اور دونوں کو صحیح مانتے ہیں یہہ تحقیق بہ اعتبار استعمال عام کے ہے۔ اسی طرح لخت کا لفظ ہے کہ اہل دہلی کی زبان پر مونث ہے اور لکھنو والے مذکر بولتے ہیں لیکن اگر کوئی لکھنؤ کا شاعر اسے مونث نظم کرے تو ہم اسے غلط نہیں کہہ سکتے اور اکثر ایسا ہوا کرتا ہے÷

سانس کا لفظ دہلی میں مذکر ہے اور لکھنو میں سب لوگ مونث بولتے ہیں لیکن مذکر کو غلط نہیں کہتے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہندوستان کے دیگر اضلاع کے رہنے والوں نے آج کل تقلید زبان سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ اور جو دل میں آتا ہے نظم کر جاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی درخت پر بیٹھے اور اسی کی جڑ کاٹنا شروع کرے اس لئے لازم ہے کہ جب کوئی اُردو زبان کا استعمال کرے تو اس کے مرکز کی تقلید کرے ورنہ زبان خراب ہو جائے گی اور سب کو نقصان پہنچے گا ہم اگر پنجابی زبان بولیں تو ہم کو اہل پنجاب کی تقلید ضرور ہے ورنہ اسے کوئی پنجابی زبان نہ کہے گا۔

اسی طرح اگر بنگالہ زبان بولیں تو اہل بنگالہ کی تقلید واجب و لازم ہوگی ورنہ ہماری زبان صحیح نہیں کہی جائے گی۔ انگریزی زبان میں ہم حرف بحرف انگریزوں کی تقلید کرتے ہیں اور جہاں کوئی لفظ اپنی طرف سے بے محل بول جاتے ہیں وہ قابل قبول نہیں ہوتا۔

اُردو زبان جو ہندوستان کی زبان مانی جاتی ہے وہ اُنہیں لوگوں کی برکت ہے جن لوگوں نے لکھنؤ و دہلی کی تقلید میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور ایک حرف خلافِ محل مُنہ سے نہیں نکالا۔

ایک مرتبہ میں گیا میں تھا وہاں میں نے دریافت کیا کہ یہاں اُردو زبان کس ذریعہ سے پہنچی اور لوگوں کو صحت زبان کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ کیونکہ گیا کی عام زبان ایک دوسری ہے وہ بھاشا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

معلوم ہوا میر کاہش جلن پوری جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے اور بڑے پایہ کے شاعر تھے مصحفی کی خدمت میں دن

بارہ برس لکھنؤ میں رہے۔ اُستاد سے زبان کی سند لیکر اور لکھنؤ میں علم طب حاصل کرکے گیا میں تشریف لائے۔ ان کے سبب سے یہاں کی شاعری نے فروغ پایا اور زبان اُردو کا رواج پھیلا۔ تمام شائقین شعر ان کے شاگرد ہوئے۔ کاش مرحوم تمام عمر گیا میں رہے ایک وہ زمانہ تھا اور ایک یہہ زمانہ ہے کہ ہزاروں دیوان مطبوعہ لکھنؤ کے موجود ہیں۔ چند لغات بھی کم و بیش موجود ہیں۔ صرف نحو اُردو کی کتابیں بھی بقدر ضرورت مل جاتی ہیں۔ ریل کے سبب سے آدمیوں کی آمد و رفت بھی جاری ہے۔ اکثر لکھنؤ اور دہلی کے لوگ ہندوستان کے ہر حصہ میں بائے جاتے ہیں تو بھی لوگ زبان کے معاملہ میں بہت بے پروائی کرتے ہیں اور انگریزی حاصل کرنے کے بعد اُردو کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہہ لوگ سخت غلطی میں پڑے ہوئے ہیں یہہ سمجھتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے جس طرح چاہیں ہم بولیں اس غلط فہمی سے اُردو کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور ہر ضلع کی زبان اور لہجے میں تفاوت پیدا ہوتا جاتا ہے۔ نتیجہ یہہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ضلع کی زبان دوسرے ضلع کے واسطے ایک غیر زبان بن جائے گی کہ لوگ اس کے سمجھنے میں قاصر رہیں گے ہم کو اس غلط فہمی کو دور کرکے یہہ کوشش کرنا چاہئے کہ ہم اپنے مرکز کے موافق لفظوں کا استعمال کریں۔

اور اس بات کی کوشش سب ملکر کریں کہ ہماری زبان میں ہم کو تعلیم دی جائے یہہ بھی خیال غلط ہے کہ اُردو ہندی دو زبانیں ہیں۔ ایک زبان ہے جس کے لوگوں نے دو نام رکھ لئے ہیں۔ کیونکہ دہلی اور لکھنؤ میں جو ہندو مسلمان بات چیت کرتے ہیں اس کو دونوں سمجھ لیتے ہیں اور بالکل فرق ایک دوسرے کی زبان میں نہیں ہے۔ اسی زبان کو مسلمان اُردو۔ ہندو ہندی کہتے ہیں۔ اگر اسی زبان کو جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں باتفاق آپنے مدارس کی زبان قرار دیں اور اسی زبان میں تعلیم حاصل کریں تو ہندوستان کے دن پھر جائیں خدا ہم کو ہماری زندگی میں ایسا دن دکھادے۔

(خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

خوذ ساختہ

خود ساختہ پیمبروں کے افسانے

عباسیہ کے دور میں جب ایک طرف فلسفۂ یونان کا مذاق مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ دوسری طرف مختلف مذاہب کی تاریخ سے اہلِ عرب آشنا ہونے لگے تھے۔ صدہا لوگوں نے نبوت کا دعوے کیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُن دنوں نبوت کے مدعی بننے کا ایک فیشن سا ہوگیا تھا۔ اُن میں سے دو چار کو تو اتنا موقع بھی ملا کہ کوئی بڑا گروہ اُن کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ بغاوت و سرکشی کرنے کے بعد پکڑے اور قتل کئے گئے۔ مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ نظر آتے ہیں جو دعوے نبوت کرتے ہی پکڑے جاتے اور خلیفہ وقت کے سامنے پیش ہونے کے بعد بھی جب اپنے دعوے پر قایم رہتے تو اُن کی گردن ماری جاتی۔

اس قسم کے لوگوں کی اُن دنوں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ سُن کے تعجب ہوتا ہے۔ چنانچہ ماموں رشید کے سامنے ایک بار دس مدعیان نبوت ایک ساتھ پکڑ کے لائے گئے۔ دار خلافت میں آتے وقت جب وہ راستہ میں وقار و تمکنت کی شان سے گزر رہے تھے کیونکہ سب تعلیم یافتہ اور شائستہ صورت کے لوگ تھے تو ایک طفیلی کو جو دعوتوں میں بے بلائے جا کے پیٹ بھرنے کا عادی ہو رہا تھا دھوکا ہوا کہ یہ لوگ کہیں دعوت میں جا رہے ہیں اور اُن کے غول میں مل گیا۔ ماموں کے سامنے جب یہ لوگ پہنچے تو سب لوگ متحیر تھے کہ یہ دس گیارہ کیونکر ہو گئے۔ جب تصدیق کے بعد اُن کے قتل کا حکم ہوا تو وہ طفیلی گھبرایا۔ اور بولا "میں تو یہ سمجھ کے ان کے ساتھ ہو لیا تھا کہ یہ کسی امیر کے ہاں دعوت میں جا رہے ہیں۔ ورنہ مجھے دعوے نبوت سے کیا علاقہ؟" یہ سن کے تمام حاضرین ہنس پڑے۔ اور ماموں بھی مارے ہنسی کے لوٹ گیا اور کہا۔ اسے بھی لے جا کے قتل کر دیجئے اس نے ان لوگوں کا ساتھ دیا ہے تو آخر تک نباہنا چاہئے۔ لیکن یقین ہے کہ اس دھمکی کے بعد وہ چھوڑ دیا گیا ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے مدعیان نبوت میں سے اکثر مذاقاً دعوے کر دیا کرتے اور خلیفہ کے سامنے کوئی لطیفہ یا مذاق کا فقرہ کہہ کے چھوٹ جاتے

جیسا کہ واقعات ذیل سے ظاہر ہوگا۔

خلیفہ مہدی عباسی کے عہد میں ایک شخص نے دعوٰئے نبوت کیا۔ جب اُسے پکڑ کے دربار خلافت میں لائے تو مہدی نے پوچھا "تم نبی ہو؟" بولا "جی ہاں" پوچھا "اور کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو؟" بولا "تم نے کسی کے پاس ایک گھڑی بھر کے لئے بھی تو جانے نہیں دیا۔ میں نام لوں تو کس کا لوں؟ اِدھر میں نے دعوٰے کیا اور اُدھر تم نے مجھے پکڑ کے قید خانہ میں بند کر دیا۔" یہ جواب سُن کے مہدی ہنسا اور اُسے چھوڑ دیا۔

ایک شخص نے ایک بار بصرے میں پیغمبری کا دعوٰے کیا۔ لوگ اُسے پکڑ کے حاکم بصرہ سلیمان بن علی کے پاس لائے۔ سلیمان نے صورت دیکھتے ہی کہا۔ "تم خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو؟" بولا "جی اس وقت تو قیدی ہوں"۔ پوچھا "کمبخت تجھے کس نے نبی بنایا ہے؟" بولا بھلا پیغمبروں کے ساتھ ایسی ہی تہذیب سے گفتگو کی جاتی ہے؟ اے بے عقیدہ شخص اگر میں گرفتار نہ ہوتا تو جبریل کو حکم دیتا کہ تم سب کو ہلاک کر ڈالیں۔ مگر کیا کروں قید میں ہوں۔ سلیمان نے پوچھا "تو کیا قیدی کی دعا نہیں قبول ہوتی؟" بولا "جی اور کیا۔ خصوصاً انبیا کا تو معمول ہے کہ جب تک قید رہتے ہیں اُن کی دعا آسمان پر نہیں جاتی" سلیمان کو اس پہ ہنسی آگئی۔ اور کہا "اچھا میں تمہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ آزادی پانے کے بعد تم جبریل کو حکم دو اور اگر انہوں نے تمہارے کہنے پر عمل کیا تو ہم سب تم پر ایمان لائیں گے۔" یہ سُن کے بولا "خدا سچ فرماتا ہے فَلَا یُؤمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَاب (لوگ جب تک عذاب کو دیکھ نہ لیں گے ایمان نہ لائینگے) یہ جواب سن کے سلیمان بہت ہنسا۔ پھر اس سے کہا جاؤ اپنا کام کرو" اور اُسے چھوڑ دیا۔

مامون کے عہد میں ایک اور شخص نے دعوٰی نبوت کیا۔ اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ میں ہی ابراہیم خلیل اللہ ہوں۔ جب وہ مامون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت ثمامہ بن اشرس مامون کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مامون نے اُس مدعی نبوت کی کیفیت سُن کے کہا میں نے ایسا جری شخص نہیں دیکھا کہ خدا پر بھی بہت لگائے۔ ثمامہ نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں اس سے گفتگو کروں" اس نے اجازت دی۔ اور ثمامہ نے کہا "اے شخص حضرت ابراہیم کے پاس تو نبوت کی دلیلیں بھی تھیں تمہارے پاس کونسی دلیل ہے؟" پوچھا "ابراہیم کے پاس کونسی دلیلیں تھیں؟" ثمامہ نے کہا "آگ

جلائی گئی اور وہ اس میں ڈال دئے گئے۔ مگر آگ اُن کے لئے ٹھنڈی اور آرام دہ ہوگئی۔ تو ہم تمہارے لئے آگ جلواتے ہیں اور تمہیں اُس میں ڈال دیں گے اگر تمہارے لئے بھی آگ ویسی ہو گئی تو ہم پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ سُن کے وہ بولا "یہ زیادہ مشکل ہے۔ اس سے کوئی آسان صورت بتاؤ۔ ثمامہ نے کہا تو حضرت موسیٰ کے سے دلائلِ نبوت پیش کرو۔ اُس نے پوچھا "ان کے دلائل کیا تھے؟ کہا اُن کے پاس عصا تھا جب اُسے زمین پر ڈال دیتے اژدہا بن جاتا اور اُسی عصا سے مار کے انہوں نے سمندر کو ٹھہرا دیا تھا۔ بولا "اس سے بھی آسان صورت نکالئے۔ کہا "تو حضرت عیسےٰ کے دلائل سہی" پوچھا "وہ کیا تھے؟ کہا "مردوں کو زندہ اور اندھوں کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ بولا "یہ تو سب پر تیار سے۔" ثمامہ نے کہا "پھر کوئی دلیلِ نبوت تو ضرور ہی چاہیئے"۔ اُس نے جواب دیا "کہ میرے پاس اِس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے جبرئیل سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے شیطانوں کے پاس بھیجتے ہو تو کوئی دلیل دو تاکہ اُسے پیش کردوں۔ اِس پر جبرئیل بگڑے۔ خفا ہوئے اور کہا۔ تم نے خود ہی برائی سے اپنے کام کی ابتدا کی۔ جا کے دیکھو تو کہ لوگ کیا کہتے ہیں"۔ یہ باتیں سُن کے ثمامہ نے مامون سے کہا "امیر المومنین اِس کا دماغ بگڑا ہوا ہے اور میرے خیال میں تو مجنون ہے"۔ مامون نے کہا "ہاں میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں" اور یہ کہہ کے اُسے نکلوا دیا۔

یونہیں ایک شخص ادعائے نبوت کا مجرم بن کے خلیفہ مہدی کے سامنے پکڑا آیا۔ مہدی نے اُس کی صورت دیکھکر پوچھا "تم کب مبعوث ہوئے؟ بولا "آپ کو تاریخ سے کیا تعلق؟" مہدی نے پوچھا "تمہیں کہاں نبوت ملی؟ بولا خدا کی قسم یہاں تو ایسی باتیں پوچھی جا رہی ہیں جن کو نبوت سے کوئی علاقہ نہیں اگر آپ میری نبوت مانتے ہوں تو میں جو کچھ کہوں اسے مانئے اور میری پیروی کیجئے۔ اور اگر مجھے جھوٹا سمجھتے ہوں تو اپنے گھر خوش رہئے۔ اور مجھے چھوڑ دیجئے کہ میں اپنا راستہ لوں"۔ مہدی "چھوڑ کیونکر دوں؟ اس لئے کہ تمہاری وجہ سے دین میں فساد پڑیگا۔ یہ سُن کے بولا بڑے تعجب کی بات ہے جب اپنے دین میں خرابی پڑنے کے اندیشے سے آپ برہم ہوئے جاتے ہیں تو پھر مجھے کیوں نہ غصہ آئے؟ کیونکہ میری تو نبوت بگڑی جاتی ہے۔ آپ کی ساری شان و شوکت اور یہ سارا جبروت معین بن زائدہ اور حرب

بن تحطب جیسے سپہ سالاروں کے برتتے رہتے۔" اتفاقاً اُس وقت قاضی شریک سامنے کھڑے ہوئے تھے مہدی نے کہا قاضی صاحب آپ اس پیغمبر کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟" قبل اس کے کہ قاضی شریک لب ہلائیں اس شخص نے کہا "آپ نے میرے معاملہ میں ان سے تو مشورہ لیا۔ بھلا مجھی سے کیوں نہ مشورہ لیا؟" مہدی نے کہا "اچھا تمہیں بتاؤ کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" بولا "میں اپنا فیصلہ اُن انبیاء پر چھوڑتا ہوں جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ بس جو اُن کا فیصلہ ہو اُسی پر عمل کیجیے۔" مہدی نے کہا مجھے یہ منظور ہے۔ اب اس نے پوچھا۔ اچھا بتائیے میں آپ کے نزدیک کافر ہوں یا مومن؟ مہدی نے کہا تم کافر ہو؟ بولا تو بس قرآن میں موجود ہے کہ ولا تطع الکافرین والمنافقین ودع اذاھم۔ (تو تو کافروں اور منافقوں کی پیروی نہ کر اور ان کے تکلیف دینے کو چھوڑ دے) اس لئے آپ نہ میری پیروی کیجیے اور نہ مجھے ستائیے بلکہ مجھے چھوڑ دیجیے کہ غریبوں اور مسکینوں کے پاس جاؤں جو کہ پیغمبروں کے پیرو ہوتے آئے ہیں۔ اور بادشاہوں اور جباروں کو میں بھی چھوڑ دوں جو کہ جہنم کے کندے ہیں۔ یہ سن کے مہدی ہنسا اور اسے ازادی دی۔

ایک دن عبداللہ بن حازم دجلہ کے پُل کے پاس اپنی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں لوگ ایک شخص کو پکڑے ہوئے لائے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا انہوں نے اس سے کہا "تم ہو؟" بولا "جی ہاں" پوچھا "کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو؟" بولا۔ "کسی پر ہوا ہوں تمہیں کیا؟ میں شیطان پر مبعوث ہوا ہوں۔" یہ جواب سُن کے عبداللہ ہنسے اور کہا۔ "اُسے چھوڑ دو کہ شیطان ملعون کے پاس جائے"

ثمامہ بن اشرس کہتے ہیں میں قید تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک مہذب اور شائستہ اور باوقار شخص قیدخانہ میں آیا۔ اُس وقت میرے ہاتھ میں شربت کا جام تھا۔ اُسے دیکھ کے میں اس قدر متحیر ہوا کہ جام کو منہ سے لگانا بھول گیا اور اُس سے کہا "آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں لوگوں نے کس گناہ پر آپ کو قید کیا ہے؟ بولا۔ یہ بدمعاش مجھے پکڑ لائے ہیں اور محض اس بنا پر کہ میں نے امر حق کو ظاہر کیا۔ میں نبی مرسل ہوں۔ یہ سُن کے میں متعجب ہوا اور اس سے کہا کوئی معجزہ بھی آپکے پاس ہے؟ بولا جی ہاں۔ میرے پاس تو سب سے بڑا معجزہ موجود ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ کہا کسی حسین عورت کو لاؤ۔ دیکھو ابھی حاملہ کرا دوں گا۔ پھر اُس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو میری نبوت کی تصدیق کریگا۔ ثمامہ نے یہ سُن کے مشکل ہی ہنسی روکی اور کہا صلی اللہ علیک پھر جام پیش کر کے کہا۔ لیجیے اسے نوش فرمائیے۔

(از رسالۂ دین دنیا)

جناب قلق

جناب قلق کی برسات

میرے دماغ میں یہہ خبط سمایا ہوا ہے کہ شاعروں سے نثر نہیں بن پڑتی۔ دو چار نامور شاعروں کی نثر کے نمونے جمع کئے۔ معلوم ہوا کہ اگلے شعراء ذی کمال نثر میں بھی قافیہ ہی پہ زور دیتے تھے۔ کوئی نئی بات یا نیا مضمون دیکھنے میں نہیں آیا +

جناب قلق لکھنوی کی یہہ نثر بہت مشہور ہے۔ اس میں قافیہ کے سوا اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی: حالانکہ حضرت کی شاعری واقعی لاجواب سمجھی جاتی ہے ؛ پھر بھی اساتذہ کی نثر کو جدتِ مضامین سے خالی تھی مگر صحتِ زبان میں نہایت مستند سمجھئے کہ غیر مانوس الفاظ اور بیگانہ لب و لہجے پاس نہیں پھٹکنے پاتے تھے۔ ٹکسالی اُردو ہوتی تھی + یہہ نمونہ حضرت قلق لکھنوی کی نثر کا ہے +

ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہے کیا ہوا برسات کی ؛ جھومتی آتی ہے مستانہ گھٹا برسات کی

اب کے سال عجیب لُطف کی برسات ہے۔ ہاتھ میں ساغر دلبر ساتھ ہے۔ بزم یاران قدح نوش ہے۔ ہر ایک نشۂ عیش و سرور سے مدہوش۔ مست گنبدِ مینائی ہے۔ کالی گھٹا چھائی ہے سہ

تند و پُر شور سیہ مست زکہسار آمد ؛ میکشاں مُژدہ کہ ابر آمد و لب یار آمد

لبِ جُو سبزہ لہلہاتا ہے۔ خضر کا جی لہریں دیکھکر لہراتا ہے۔ ترشح ہو رہا ہے۔ ابر کرم کدورتِ دل دھو رہا ہے۔ ہوا کیا کیا اٹکھیلیوں سے چلتی ہے۔ بدلی کیا کیا رنگ بدلتی ہے۔ ایک سُوپڑتی

پھوار ہے

[illegible]

پھوار ہے۔ اک سمت بگلوں کی قطار ہے۔ گھنگھور گھٹ چھائی ہے۔ مستوں کی بن آئی ہے۔ مور
بولتے ہیں عقدے دل کے کھولتے ہیں۔ شورِ رعد نالۂ عاشقانہ ہے۔ بجلی میں طرزِ آہ بتیابانہ ہے۔
مینھہ برستا ہے ہر کوچہ بہشت کا رستہ ہے۔ اس عالم میں جو چمن کو جاتا ہوں عجب لطف اٹھا
تا ہوں۔ دل شگفتہ ہے۔ فتنہ خفتہ۔ باغباں شاد ہے۔ قمری غم سے آزاد ہے۔ ایسی تاثیر بہار ہے
کہ خاکِ چمن غازۂ روئے نگار ہے۔ ہر روش پہ سُرخی اس رنگ سے کُٹی ہوئی ہے۔ گویا صفحۂ گلستاں پہ
جدولِ شنجرف کھچی ہوئی ہے۔ فرشِ سبزۂ نودمیدہ رشکِ سبزمخمل ہے۔ سطحِ آبجو عکسِ گُل سے لال
بادل ہے۔ بہار جیست خزاں سُست روش پڑی درست۔ بیچ میں سُرخی گرد ہری دوب طبع کی مرغوب
بہت خوش اسلوب نہایت خوب۔ قوسِ قزح جس سے محجوب۔ یا ورقِ حنائی پہ جدولِ زنگاری
یا عارضِ گلرنگ کے گرد خطِ سبزے کی بہار ہے۔ نکہتِ گُل ہے یا آہ سردِ بلبل ہے۔ گلوں کے چٹکنے کی صدا
آتی ہے یا عندلیب رام کلی گاتی ہے۔ خوشی بکمال ہے۔ ہر درخت نہال ہے۔ شبنمِ گُل گویا عطرِ گُل
ہے۔ زلفِ مشکیں گیسوئے سنبل ہے۔ تحریکِ نسیم سے سبزۂ پامال نے سر اٹھایا ہے۔ اور دستگیری کو
ہر شاخِ گُل نے ہاتھ دوڑایا ہے۔ کیا چمن میں تصرفِ بادِ بہار ہے۔ کہ ہر برگِ خزاں دیدہ رشکِ یاسمن زار
ہے۔ اک طرف مرغانِ چمن میں ستونِ شاخِ گُل میں عشق پیچے کی رسی بنا کر ڈالی ہے بادِ صبا پینگ دیتی
ہے جھلانے والی بلبلیں بہار گاتی ہیں رنگین غزلیں سناتی ہیں طاؤس رقصاں ہیں وجد میں
قمریاں ہیں۔ ہر روش پہ محبوبانِ گلعذار خراماں ہیں۔ دلِ گم گشتۂ عاشق جویاں ہیں۔ رفتارِ دلربائی
کی جو بھاتی ہے مہندی ہر ہر قدم پسی جاتی ہے۔ پھول شاخوں سے گر کے پاؤں پڑتے ہیں۔ عاشق
کفِ رنگین دیکھ کر ایڑیاں رگڑتے ہیں ؎ ہجومِ لالہ رویاں اس قدر ہے ؛ مجھے بھی دل کے پیچھا نکالا ہے

[illegible]

گل افشانی

گل فشانی

ہفت اقلیم کی سیر کیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہر قلمرو کی ایک خاص زباں ہے تمام چین میں ہندو مسلمان سب ایک زبان بولتے ہیں اور اسی کو اپنی مادری زباں کہتے ہیں۔ جرمن۔ فرانس روس۔ انگلستان کی ایک زبان ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی بھی ایک زبان سنسکرت تھی پنڈت لوگ اس زبان کو مقدس زبان سمجھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی نیچ ذات ان کی زبان کو حاصل کرے عام طور پر جو سنسکرت بازاروں میں پھیلی تھی اس کا لہجہ سوفیانہ تھا۔ اس سبب سے پنڈتوں کی زبان مستند مانی جاتی تھی شادی بیاہ کے وقت اگر کوئی پنڈت نہ ہو اور وہ اشلوک نہ پڑھے تو ایسا بیاہ ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ پنڈت کی قرأت دوسروں کی اور ان کا املا صحیح ہوتا ہے۔ سنسکرت کی اس قدر عزت تھی کہ دوسرے لوگ اس کا صحیح لہجہ ادا کرنے سے معذور تھے۔ ضرورت تو ایجاد کی ماں ہوتی ہے تمام ہندوستان کو ایک عام زبان کی حاجت تھی وہ اس طرح پوری ہوئی کہ متھرا میں برج بھاشا زبان قائم ہوئی۔ اس میں فارسی الفاظ بھی شامل ہوئے اور سنسکرت کے لفظ توڑ مروڑ کر ملائے گئے۔ اگرچہ برج بھاشا اور سنسکرت زبان میں بہت کم فرق تھا تاہم پنڈت مہاراج نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ برج بھاشا ناپاک نجس اور نیچ ذات کی زبان قرار پائی ناپاک اس لئے کہ اس میں فارسی کے الفاظ بھی شامل تھے اور اس لئے کہ نیچ ذات کے لوگ اسے بولتے تھے۔ تاہم اس زبان میں تمام سنسکرت کی مقدس کتابوں کا ترجمہ ہو گیا اور رامائن۔ برج بلاس وغیرہ بھاشا میں پڑھی جانے لگیں۔

جب مسلمانوں کا دور دورا اس ملک میں ہوا تو اسی بھاشا میں فارسی کے الفاظ بکثرت ملنے لگے اور بھاشا کے ثقیل الفاظ ترمیم ترخیم تحلیل ہو کر دوسری صورت اختیار کرنے لگے جسے اردو کہو یا ہندی یہ اردو زبان تمام ہند میں رائج ہونے لگی اس وقت ریل نہ تھی نہ چھاپے خانے تھے اس لئے لوگ اردو زبان کو اس طرح نہ سیکھ سکتے تھے جیسی دہلی والے بولتے ہیں اس مجبوری نے ان کو اپنے

دوسری زبان

...ہدی شکل ہے۔

...ے الفاظ غور سے سُنو تو تم کو

...ہو جائے گا کہ یہہ بھاشا اور اُردو کی خراب ہٹی ہے

پشتو زبان کا بھی یہی حال ہے۔ فارسی اور ہندی کے بگڑے ہوئے الفاظ ہیں۔

بنگلہ زبان بھی اسی قبیل سے ہے۔

حیدرآباد دکن میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں سب بھاشا سنسکرت ہندی اُردو کی خراب صورتیں ہیں۔

مدراس کی زبان بھی اسی ہندوستانی زبان کا اچار ہے۔ جو ہماری زبان سے لی گئی ہے

گجرات کی بولی پر غور کرو تو یہی حالت ہے

تمام ہندوستان کی مختلف زبانیں اگر کان لگا کر سنو تو معلوم ہو جائے کہ یہہ ہمارے ماؤں کے خانہ کی آگ ہے جس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اور جس کا لہجہ ایسا بدلا ہے کہ ہم کو ایک دوسری زبان معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم اُن اضلاع کی بات چیت آپس میں سُنتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہہ دولت ہمارے خزانے کی ہے اختلاف لہجہ کے سبب سے سمجھ میں نہیں آتی

تو بھی سو میں دس لفظ ایسے ملتے ہیں جن کو ہم بھی اسی طرح بولتے ہیں۔

نیپال کی زبان کس قدر خراب ہے مگر اس میں بھی ہماری زبان کے تمام الفاظ ترمیم ہو کر موجود ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ یہہ لوگ مجبور تھے کہ ہندوستانی زبان بولیں لیکن ان کے پاس کوئی ذریعہ صحیح زبان بولنے کا نہ تھا نہ ریل تھی نہ کتابیں تھیں نہ آدمی آدمی سے مل سکتا تھا سُنی سُنائی باتوں پر زبان کا معیار تھا۔ اس لئے سب اپنے اپنے مرکز کی تقلید کرتے تھے اور یہی اس کا مرکز تھا۔

جب دہلی میں ایک بڑی زبان کی بنیاد قائم ہوئی یعنی اُردو نے اپنا جنم لیا اور وہ پروان چڑھی لکھنؤ میں اس نے قدم رکھا اور اس میں چار چاند لگے اور ریلیں جاری ہوئیں چھاپے خانے کھولے گئے مدرسے قائم ہوئے تو اور ملکوں کے لوگوں کو شوق پیدا ہوا کہ ہم بھی صحیح اور فصیح اُردو سیکھیں کتابوں کی سند سے لوگوں کی تعلیم سے جہاں جہاں غیر زبانیں مادری زبان بنی ہوئی تھیں وہاں اُردو سیکھی جانے لگی بولنے لگے اور سمجھنے لگے تو اُن کے دلوں میں یہہ وسوسہ پیدا ہوا کہ یہہ

وہی اُردو ہے جس کے الفاظ ہماری زبانوں میں شامل ہیں یہہ تو ہماری زبان ہے۔ اس لئے ہم کو کسی مرکز کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔

یہہ گندی ہوا پچاس برس سے ہندوستان میں چلنے لگی۔ اردو زبان کے نوسیکھوں کو ابھی اچھی طرح زبان کا لہجہ نہیں آیا تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے شامتِ اعمال سے دہلی اور لکھنؤ کی تقلید کا جُوا اپنے کندھے سے اتار کر پھینکدیا۔ اور سب نے ایک دم سے مرکزی زبان کا بائیکاٹ بول دیا۔

[1] امید تھی کہ دکن کا ملک اس اثر سے محفوظ رہے گا مگر وہاں ایک اکیلا بادشاہ کیا کرسکتا تھا۔ خوشامدیوں نے ہوا بگاڑ دی چند نوآموز غیر معروف ضلع کے رہنے والے جنکا نہ لہجہ صحیح نہ زبان درست۔ ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرکے یونیورسٹی عثمانیہ کی زمام ہاتھ میں لیکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جُدا بنانے لگے۔ اور بادشاہ کے خوش کرنے کو ایک نئی بات سوچی کہ چونکہ ولی دکنی جو اُردو آدم ہے اسی دکن میں پیدا ہوا تھا لہذا اُردو ہماری مادری زبان ہے اور ہم اس کے فرزند ہیں۔

اس خیال

اورنا اہل زبان مستعد ہ،

سے یہ بات پیدا کی کہ دہلی سے

میں نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ عرب سے اپنے باپ دادا کے ساتھ آئے تھے اور دکن میں قیام فرما چکے ہیں اس لحاظ سے اُردو زبان دکن میں تولد ہوئی۔

[2] اسی طرح دہلی کے تمام مایہ ناز شاعروں کا سلسلہ نسب دکن سے ملاکر نیا شجرہ تیار کرلیا اب دکن کے مرکز زبان ہونے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے۔

دوسرے خام خیال دیکھئے۔ پنجاب جو سب سے زیادہ خدمت اُردو کی کررہا ہے اس نے دہلی اور لکھنؤ کی تقلید سے منہ پھیر کر کہا کہ ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں اُردو ہماری بھی مادری زبان ہے (اگرچہ ہماری والدہ معظمہ آج تک پنجابی بولتی ہیں) لہذا ہمکو بھی اُردو زبان پر حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہے بولیں۔ اس کے مقتدر لوگوں نے فارسی عربی کے بڑے بڑے لغت اُٹھائے اور جابجا لفظوں کو ٹھونسنا شروع کردیا۔ ان کی تقلید علیگڈھ کے طلبا نے قبول کرلی

[1] اورنگ

...یں دہلوی

...غیر مانوس ترکیبیں

...ہدایت نا شروع کردی۔

جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ زبان اپنے مرکز سے دُور پڑتی جاتی ہے۔

اور ایک زمانہ آنے والا ہے کہ ایک صوبہ کی اُردو دوسرے صوبہ کے لوگوں کے لئے غیر زبان بنجائے گی۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جب دو تعلیم یافتہ بنگالی آپس میں اُردو زبان میں بات چیت کرتے ہیں تو اس کے چند الفاظ ہماری سمجھ میں آتے ہیں باقی تمام گفتگو کا ماحصل سمجھنے سے لکھنؤ اور دہلی والے معذور ہیں۔

اسی طرح پنجاب کے دو گریجویٹ جب اُردو بات چیت کرتے ہیں تو دوسرے ملک کا آدمی اس کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

ان بندگان خدا سے کوئی اتنا کہہ دے کہ بھائی تم اُردو پر احسان نہ کرو اپنے اپنے ملک کی زبان بولو۔ اور اگر اُردو بولنا چاہتے ہو تو اسے مرکز کے موافق بولو۔ یہہ سچ ہے کہ اُردو زبان تمہارے سے ذریعہ نجات ہے۔ لیکن جب سیکھتے ہو اور بولتے ہو تو اُسی مرکز کے موافق بولو تاکہ اُردو تمام ہندوستان میں ایک ہم قسم کے محاورے اور الفاظ کے جامہ میں زیب نما ہو۔

اور یہہ زبان تمہارے ملک میں علمی زبان کہی جائے۔ اسی زبان میں تمہاری تعلیم ہو اور ہر ضلع کا رہنے والا تمہاری گفتگو سنکر یہ سمجھ لے کہ تم اُردو بولتے ہو۔ ورنہ یاد رکھو تم جہالت کے سمندر کی طرف جا رہے ہو اور نتیجہ بد دیکھنے والے ہو۔ کوئی شخص کسی زبان پر حکومت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس کے مرکز کی اطاعت نہ کرے۔ پنجابی زبان سیکھنے والا اگر پنجاب سے سرتابی کرکے الفاظ ایجاد کرے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بنگالی زبان سیکھنے والا اگر بنگالی زبان کے محاوراتِ استعمالات میں اپنے قیاس کے موافق بنگالیوں سے سرتابی کرے تو اسکا انجام کیا ہوگا۔ اس بات کا جواب ہمکو سوچ سمجھ کر دو۔

ابتو ماشاءاللہ سے ہندوستان میں بیشمار ایسے لوگ ہیں جو انگریزی زبان کے ماہر عالم اور اُس زبان کو مادری زبان کی طرح سمجھتے ہیں۔ انگلستان کی تقلید سے الگ ہوکر کیوں نہیں ایک پنجابی انگریزی زبان بنالے اسکا کیا سبب آخر؟

(خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چہ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جایع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہوسکیں اُن کے پس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہیے۔

صلائے عام میں ہر طرحکے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو۔ یعنی لب ... عروس جمیل و لباس حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

صلائے ...

ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو انگریزی میں ہوں یا ناگری میں

زبانِ اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے۔

" "	چھ ماہ کیواسطے	۱۲
" "	تین ماہ کیواسطے	۶
"	نصف صفحہ ایکسال کیواسطے	۱۵
"	چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے	۵
" "	چھ ماہ کیواسطے	۳
" " "	تین ماہ کیواسطے	۲
"	ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے	۳
"	نصف " " ...	۲
"	چوتھائی " " "	۱

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دگنی اجرت ہے۔ اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہیے۔ اشتہار کا مضمون انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہیے۔

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:—

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خان بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد علی چھپا اور شائع ہوا۔
Printed and Published by Mir Nasir ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana Delhi

SALA-I-AM, DELHI. Regd. No. L. 1462



A [illegible] M[illegible] M[illegible]azine [illegible] d[illegible]d to the cause of Urdu [illegible] [illegible] [illegible] the preservation [illegible] and an especially Mohammadan culture and [illegible] and the [illegible] of [illegible] the [illegible] [illegible]

دہلی

جناب الاستاد ناصر علی صاحب [illegible] دار المطبع واقعہ [illegible] اور [illegible] چھاپا گیا

Mustafai Press, Karashkhana Delhi

فہرست مضامین

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۸ء عیسوی

صلائے عام

اس پرچہ کے مضامین کا تعلق زیادہ تر تاریخ و تحقیق اور اعلےٰ لٹریچر سے ہے۔ یعنی مضامین کی طرف سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے تو قدردانی کی ؎

دربلغ نہ سامانِ گل و لالہ کمی نیست ❊ چیزے کہ دریں فصل ضرور است دماغ است

تاریخ میں خاں صاحب مرزا محمد علی خاں رئیس دہلی کو کمال حاصل ہے۔ شاہ نامہ کی خوبیاں سمجھنے اور سمجھانے میں آپ کو ید طولےٰ ہے +

پہلا مضمون دادِ قدر شناسی (صفحہ ۵-۱۰) از رسالہ حرم صلائے عام کے طرز پر ہے۔ موازنۂ سخن۔ (صفحہ ۱۵-۱۶)۔ تاریخ و تحقیق (صفحہ ۱۱-۱۳)۔ شاہ نامہ کی خوبیاں (صفحہ ۲۳-۲۵) جناب خانصاحب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی کے مضمون ہیں: اور بہت اچھے ہیں۔ "موازنۂ سخن" معرکہ چکبست و شرر کے دیکھنے سے پہلے مرزا صاحب نے لکھا۔

سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ کی معاشرت (صفحہ ۱۷-۲۲) محض مورخانہ ہے۔ بہادر شاہ بادشاہ اور باغی پربیئے (صفحہ) بھی مورخانہ مضمون ہے: اس میں پربیوں کی زبان اور باغیوں کی ناشائستہ حرکتوں کا چربہ کھینچا گیا ہے + دلی میں سب سے بڑی مصیبت شہر پر باغی پربیوں کی زیادتیوں سے پڑی: سرکار انگریزی کی فتح مندی سے یہ شہر بچ گیا + مضمونِ پریشاں (صفحہ ۲۲-۲۶) دہی معمولی ہے +

دھلی

دھلی

مرزا نوشہ کا شعر ہے ؎

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے ✤ بلا سے گر نگہِ یار تشنۂ خوں ہے

صلائے عام چونکہ دلّی سے نکلتا ہے مناسب ہے کہ اس میں اس شہر کا ذکر بھی ہوا کرے ۔ جہاں اس رسالہ میں ہر طرح کی معلومات کا ذکر رہتا ہے آجکل کا حال بھی ضروری ہے ❊

جس طرح مسل میں فیصلہ لکھنے سے پہلے عرضی دعوے سے لگا کر جواب دعوے اور فریقین کی پیش شدہ شہادتوں پر غور کرنا لابُد ہے اسی طرح جس کام کا ارادہ کیا جائے پہلے اُس کے لئے پوری تیاری ضرور ہے ۔ عالی جناب لارڈ کرزن کی سوانح عُمری کے لکھنے والے فرماتے ہیں کہ آپ نے ہندوستان کی گورنر جنرلی کے عُہدہ جلیلہ کے لئے مُدّت سے تیاری کر رکھی تھی کہ ایک دن یہاں کا گورنر جنرل ہونا ہے اور ہو گئے : جناب لارڈ لارنس نے غدر کے مفسدہ کے سُلجھانے میں جو لاجواب کوشش کی اُسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ زلیخا کی طرح جو حضرت یوسف کی مُحبّت میں دوبارہ جوان ہو گئی تھی دلّی پھر آباد ہو گئی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ✤ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضور سر طامسن صاحب بہادر دام اقبالہم کو دھلی کی تاریخ کا ورق ورق

اور سطر سطر حفظ ہے۔ دہلی کی عمارتوں خاندانوں۔ گلی کوچوں کا حال آئینہ کی طرح روشن ہے: گویا دہلی کی حکمرانی کے لئے پہلے سے مسالہ جمع ہو رہا تھا۔ یہہ اس شہر کی خوش نصیبی ہے کہ اس وقت اس شہر کو ایسا اس کا قدرداں ملا: دلّی کو ایسا حکمراں اور ایسے حکمراں کو دلّی مبارک ہو:

زینت محل

دلّی میں اس نام کی ایک نامور حویلی سرکار کی طرف سے ریاست پٹیالہ کو مرحمت ہوئی تھی۔ عوام میں شور ہے کہ اس حویلی کی شکل بدلی جا رہی ہے: یہہ معاملہ حضور جناب چیف کمشنر بہادر دہلی کے گوش گزار ہوا: یہہ گزارش بےکار نہیں گئی۔ اور یہہ یادگار بنی رہی:

جامع مسجد دھلی

کی مرمت کے لئے چندہ کی ضرورت بیاں کی جاتی ہے۔ پچھلی دفعہ نواب صاحب بہادر ریاست رام پور نے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ عطا فرمایا تھا۔ اب کی دفعہ ریاست حیدرآباد (دکن) سے قریب اسی قدر رقم عطا ہونے کی خبر ہے: مگر مرمت کے لئے چھ لاکھ روپیہ کی ضرورت بتائی جاتی ہے اور اسکی تعمیر پر تمام اخراجات ملا کر آٹھ دس لاکھ سے زیادہ خرچ نہیں ہوا تھا:

شبنم کے قطرے

ایک بچہ۔ بیل پر شبنم کے قطرے دیکھ کر اپنی ماں سے کہتا ہے :-

" یہاں یہ شبنم کے قطرے کہاں سے آگئے۔ کل شام کو تو دکھائی نہیں دیتے تھے او دیکھو اماں یہ موتیوں کی طرح کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے کیسے ہیروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ اچھی اماں مجھے بتاؤ یہ بوندیں پہلے کہاں تھیں اور یہاں کیسے آگئیں!"

ماں نے بچے کو پیار کیا اور آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا :-

" یہ بہت دور دراز سے آئے ہیں۔ جہاں سورج چاند اور ستارے چمکتے ہیں اور جہاں سے ہمارے ہاں مینہ کی ہلکی پھوار آتی ہے۔ وہیں سے یہ آئے ہیں۔ تو بھی اسی جگہ سے ہمارے پاس آیا ہے "

اسپر بچے نے کہا۔ "مجھے ان کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اماں کیا میں انمیں سے دو ایک اُٹھالوں"

ماں نے کہا۔ "نہیں نہیں میری جان! تم ان کو نہیں لے سکتے۔ جبتک یہ یہاں ہیں ان کو دیکھ کر خوش ہو سورج ان کو بہت جلد گرم کرنوں سے اُٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا" یہ آخری جملہ کہتے ہی ماں کا دم گھٹنے لگا اور اپنے گزرے ہوئے بچوں کو یاد کرکے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے دعا مانگی "اے خدا کم از کم یہی بچہ میری زندگی کی برکت بنا رہے یہ کہکر اپنے بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔

(از رسالہ دین ودنیا)

دادِ قدر شناسی

یہہ عنوان ذرا بھدا ہے مگر صلائے عام سے خاص طور پر ملاقہ رکھتا ہے۔ اس لئے پہلے اس کی "شانِ نزول" لکھنی ضرور ہے۔ صلائے عام کے قدر شناسوں میں رسالۂ حرم کے "نگرانِ پالیسی" کا میں عرصہ سے احسان مند ہوں کہ گو مجھے اُن سے ملنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ مگر اُنہیں شروع سے صلائے عام کی طرف داری کا شوق ہے: اُنہیں صلائے عام کی قدر شناسی میں مزہ آتا ہے اور مجھے اُن کی قدر شناسی کی داد میں لطف آتا ہے۔

پہلے میں رسالہ حرم کی تعریف میں عرض کر لوں کہ یہہ رسالہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے بکار آمد ہے۔ معلومات علمی خاصکر اُردو لٹریچر اور دل و دماغ کی صحت کے لئے ستۂ ضروریہ کے برابر ہے: مردوں اور عورتوں یعنی جنٹلمین اور لیڈیز دونوں سوسائٹیوں کے لئے ضروری ہے۔ اتنا لکھکر اب "آمدم بر سرِ مطلب":—

رسالۂ حرم کے پچھلے پرچہ میں "اڈیٹر صلائے عام کے لطائفِ ادبی" کی سُرخی سے ایک مضمون تھا کہ "صلائے عام کے مختلف مضامین سے یہہ جواہر ریزے انتخاب کئے گئے ہیں":—

(۱) کسی کے ساتھ سلوک کرنے سے اگر وفاداری کی امید ہو تو بے وفائی سے پالا پڑ جاتا ہے۔

(مطلب یہہ کہ اگر آپ کسی سے محض اس غرض سے سلوک کریں کہ اس کا عوض ملیگا تو گویا اس کو بے وفائی کی تشبہ دینی ہے ؏ نیکی کن و بدریا انداز ؛)

(۲) حضرت اورنگ زیب بادشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ "انسان سے اگر امور عقبے کا سرانجام نہ ہوسکے تو دنیا کے کام کیا تھوڑے ہیں؟" (میری دانست میں دنیا ہی کے کام عاقبت کی درستی کا پیش خیمہ ہیں کہ الدُّنیا مزرعة الآخرة ؛)

(۳) "لڑکیوں میں مجھے وہ لڑکی پسند آتی ہے جس کو رونا آتا ہو۔ مگر کوسنا نہ جانتی ہو" (یہہ بات میری زبان سے نہیں بلکہ دل سے نکلی کہ ؏ خفا بھی ہوتے ہیں تو مسکرا کر ؛) اسی طرح یہہ بات دل سے نکلنے والی اور دل ہی میں چبھنے والی ہے کہ :-

(۴) "انسان آپ ہنسے یا نہ ہنسے (یعنی خوش ہو یا ناخوش) مگر دوسروں کے آنسو ضرور پونچھے" (واقعی یہہ بات ہزار نیکی کی جڑ ہے ؛)

(۵) "بڑھاپا پنچھی کی شام ہے"۔ اس پر ہزار مضمون لکھے جا سکتے ہیں کہ جس طرح خزاں میں پتے درختوں کو چھوڑ جاتے ہیں کہ گویا کبھی صاحب سلامت ہی نہ تھی اسی طرح بڑھاپے میں انسان کے قوائے منہہ پھیر لیتے ہیں۔ عزیز اقارب محبت چھوڑ دیتے ہیں : پرندوں کی طرح پنچھی کو نہ دانہ نہ پانی پسند ہے ؛)

"بڑھاپا پنچھی کی شام ہے"

یہہ سرخی ایک علیحدہ مضمون مانگتی ہے۔ شام میں نے اس لئے کہا کہ جسطرح جانور

دن بھر پھرتے رہے شام کو انہیں اپنے آشیانوں کی سوجھتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو جو نیک ہیں عاقبت کا خیال ہوتا ہے۔

بڑھاپے میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں آجاتی ہیں اُن کی تشبیہ اُن درندوں سے جو شام کے جھٹ پٹے اور رات کے اندھیرے میں جنگلوں اور ویرانوں میں شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں کہ جو کمزور بھولا بھٹکا جانور مل جائے تو نہ چھوڑیں۔ اسی طرح بڑھاپے میں آفاتِ آسمانی اور زمانہ کی بلائیں انسان کو گھیر لیتی ہیں۔

ابھی میں لکھ چکا کہ بڑھاپے میں بڑی مصیبت اکیلا رہ جانا ہے۔ اس سے میری غرض یہہ ہے کہ وہ صُحبت نہیں جس کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں ع جنکو یہہ آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں وہ نہیں رہے۔ شام کو آفتاب میں وہ گرمی کہاں جو دوپہر کو تھی۔ اور دوپہر کی گرمی جوشِ جوانی کی طرح جاڑوں میں پت جھڑ کے موسم میں بُری نہ تھی۔ اب تو برسات کے دن بھی جو پہلے بقول شعرائے ومعشوق کے لئے موزوں سمجھے جاتے تھے کسی رانڈ بیوہ کے رونے چلّانے کے برابر ہیں۔ بوندیں آنسو اور نسیم سحر آہوں کا جواب ہے۔

دلبری سے نہ غرض ہے نہ دل آزاری سے ✦ دل کو قابو میں کیا ہے بڑی ہشیاری سے

ہر دن پوری ایک سال کا جواب ہے

صُبح وشام آغاز وانجام کا نمونہ ہے۔ اندھیری رات بڑھاپے کی مثال ہے کہ ضعیفی میں اپنے سوا کسی کی نہیں سوجھتی۔ دوپہر عالمِ شباب ہے: دن ورات مل کر

بہار و خزاں سمجھیے۔ بڑھاپے میں کمر سیدھی کر کے چلنا گویا دن کو قیلولہ کی تمثیل ہے۔ یہہ خیال کہ مرنے کے بعد سارا جھگڑا مٹ جائے گا جمائی آنے کے برابر ہے۔ ذرّے جو دھوپ میں چمکتے ہیں ہماری آرزوؤں کے ولولے ہیں۔ جو کبھی کبھی پورے ہوتے ہیں اور اکثر نہیں ہوتے ؎

ذرّہ کا بھی چمکے گا ستارہ ٭ قایم جو زمین و آسماں ہے

رات کو جب دھوپ نہ ہو تو زمین و آسمان کیا کر لیں گے؟ دھوپ ہی نہیں تو ذرّے کیا خاک چمکیں گے۔ رات کو میں بڑھاپے سے تشبیہہ دے چکا۔ رات کو دھوپ کہاں؟ بے دُھوپ سُورج مُکھی کیا کر سکتی ہے کہ رات کو سُورج مُکھی کے لیے کیا دھرا ہے؟

بُڑھاپے میں آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے ؎

شبِ تاریکِ جُدائی سے نہیں دل کو فراغ ٭ تیرگی آنکھوں میں چھائی ہے مکدّر ہے دماغ

سب سے زیادہ آرام سے زندگی بسر کرنے کی تدبیر یہہ ہے کہ انسان ہر موسم و وقت کے موافق اپنی زندگی بسر کرے۔ بے فصل کا پھاگ اور بے وقت کا راگ اچھا نہیں۔ صُبح کو جب آفتاب سر پر آئے چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا رہنا مناسب نہیں۔ اور بارش میں کپڑے باہر ڈال کر سکھانا بے وقوفی ہے۔ جاڑوں میں خس کی ٹٹی خلافِ عقل۔ اور لُو میں انگیٹھی خبط ہے۔

ابھی میں نے کہا کہ ہر دن پورے سال کا پاکٹ ایڈیشن ہے۔ بیماری میں جس طرح ڈاکٹر نقلِ مکان اور تبدیل آب و ہوا کا حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح نیرنگیِ زمانہ

تبدیل آب وہوا ہے۔ یہہ گویا اچھا ہوجانا ہے: اور بیماری میں مرجانا نقل مکان ہے ٭ سوتے میں بڑانا اور خرّاٹے لینا گویا مرنے کے بعد کے خیال ہیں کہ خرّاٹوں سے معلوم ہے کہ یہہ شخص گو سو رہا ہے مگر زندہ ہے۔ لیکن دراصل اُسے خبر نہیں کہ زندہ ہے یا مُردہ کہ اَلنوم اَخُ الموت ہے ٭ زندگی میں مرنے جینے کے جھگڑے گویا سوتے وقت خرّاٹے لینا ہے کہ دوسروں کے آرام میں خلل ڈالنے کے برابر ہے سہ

خواب دیکھا جو پریشان تو بڑا اُٹھے ٭ سو گئے طالع بیدار تو چلّا اُٹھے

شام کو جو پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑے جا رہے ہیں کوئی خیال نہیں کرتا کہ یہہ بھوکے جا رہے ہیں یا پیٹ بھرے؟ ان میں سے بھوکے کتنے ہیں اور پیٹ بھرے کتنے؟ کسی کو کسی کے جھگڑے سے غرض نہیں ٭

جس طرح شام کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو اندھیری رات سے اچھی ہے اسی طرح بڑھاپا کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو مرنے سے اچھا ہے۔ گو سارا دن دوادوش میں گزر جائے شام کو اگر آرام سے سونا نصیب ہو جائے تو بڑی نعمت ہے! زندگی جس طرح کٹ سکے کٹ جانے دیجیے بشرطیکہ شام کو آرام نصیب ہو۔ صبح کو سو کر اُٹھنا اگر نعمت ہے تو دن چھپے سرِ شام سے نیند آجانی کیا بُری ہے؟

سینے والیوں کو میں نے دیکھا ہے کہ سوئی میں تاگہ ڈال کر تاگے کے اخیر میں گرہ لگا لیتی ہیں۔ تاگے سمیت سوئی کپڑے میں چلی جاتی ہے۔ اگر تاگے کے اخیر میں گرہ نہ ہو تو سارا تاگہ نکل جائے: یہہ اخیر کی گرہ زندگی کی شام ہے کہ یہہ شام اگر قابو سے نکل جائے

توقیامت ہے + انسان کا اخیر وقت اگر رائیگاں جائے تو پھر خدا حافظ ہے +

مضمون مندرجہ رسالہ حرم کے ۵ مدوں پر میں نے بے ساختہ حاشیے چڑھا دیئے ۔ باقی مدیں (۶) سے (۱۲) تک یہہ ہیں :-

(۶) جب محض خوشی پہ انسان کی زندگی کا مدار رہجائے تو سمجھ لیجئے کہ اب زندگی سے رخصت ہونے کے دن قریب آگئے (شادی مرگ اسی کا نام ہے) +

(۷) خواہشوں کا مارنا نیکی ۔ اور خواہشوں کے پورا کرنے کا سامان جمع کرنا عیش ہے +

(۸) لاکھوں موتیوں کی لڑی سے آنسوؤں کا تار اچھا ہے +

(۹) کسی حسین کے قابو میں لانے کا لطف اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ معلوم ہو کہ قابو سے نکلی جاتی ہے ۔ جو عورت قابو میں ہو اس کا خیال کم ہوتا ہے +

(۱۰) دُنیا میں جیسے کچھ کرکے بانا ہے وہ مرنے کا نام نہ لے +

(۱۱) جوانی میں انسان موت کو یار کی طرح ڈھونڈھتا ہے +

(۱۲) جہاں محبت ہے وہاں نیکی ضرور ہے +

یہہ مدیں ایک ایک علیحدہ علیحدہ مضمون مانگتی ہیں ۔ اگر کوئی صاحب انکی طرف توجہہ فرمائیں تو احسان ہی ورنہ میں بہ دیر یا بہ عجلت ان پر حاشیے چڑھانیکا ارادہ کررہا ہوں ۔ حاشیے چڑھانا عیب نہیں داخل ہے کوئی لکھیگا تو شرح و تفسیر سمجھی جائیگی +

بہرحال میں بہت خوش ہوں کہ رسالہ حرم نے یہہ جھوٹے سچے جو انکی نظر میں "جواہر ریزے" ہیں پسند گئے ؎

یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئی محمل سے تو پھر لیلیٰ ہی محمل میں

تاریخ و تحقیق

میرے ایک دوست مجھ سے دریافت
ہیں کہ ہندوستان کی تاریخوں میں کوئی
ح تاریخ راجپوتانہ کی بھی تیری نظر سے گزری
نہیں - میں اُس کے جواب میں عرض کرتا ہوں
راجستان سے زیادہ مفصل راجپوتانہ کی کوئی
میری نظر سے نہیں گزری - دوسری تاریخیں
ہنی ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور اُن کی معلومات
مد یہہ ہی ٹاڈ نامہ ہے - کرنیل ٹاڈ صاحب
ںیفت میں بہت بڑی محنت اور عرق ریزی
سس کتاب کو جمع کیا ہے -

بات یہہ ہے کہ ہندوؤں میں شروع
آج تک تاریخ نویسی کی طرف کسی کو توجہ
ا ہوئی بقول ایلفنسٹن صاحب کے - ہندوؤں
یح حالات اُسی زمانہ سے صحیح ملتے ہیں جس زمانہ
مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے
سے پہلے کے حالات جو کچھ ملتے ہیں اُن کا ماخذ
نہیں ہے بلکہ قصہ کہانی ہیں -

مسلمانوں نے اپنی عادت جبلی کے موافق کوئی وہ سالہ
قرن ایسا نہیں چھوڑا جس میں انہوں نے اپنے
بزرگوں کے صحیح حالات نہ قلمبند کئے ہوں چنانچہ
یہہ ہی قول ڈاکٹر اسپنسر صاحب کا ہے کہ دنیا میں
نہ ایسی کوئی قوم ہوئی نہ ہے جس نے اپنے بزرگوں
کے حالات لکھنے میں کوئی دہ سالہ قرن بھی بیکار
کھویا ہو - خلاصہ یہہ کہ مسلمانوں نے اپنے حالات
کے ساتھ ہندوؤں کے حالات بھی لکھے ہیں -
کرنیل ٹاڈ صاحب کو یہہ خیال ہوا ہوگا کہ مسلمانوں
کی کتب تاریخ سے ہندوؤں کے حالات منتخب
کروں گا تو وہ پچھلے حالات ہوں گے اور اُن کا
جمع کرنا کچھ بڑی بات نہیں اُنہوں نے فارسی کی
تواریخ سے قطع نظر کرکے زیادہ تر ہندوؤں کی
روایات اور حکایات پر اپنی تاریخ کا دارمدار
رکھا - ہندوؤں میں سے خاص گروہ راجہ مہاراجوں
کا ہے - انہوں نے تاریخیں تو نہیں لکھوائیں مگر
یہہ دستور چلا آتا ہے کہ تین گروہ ایسے ہیں جنکے

بڑائے نام یہہ کام سپرد کر دیا گیا تھا۔ ایک قوم چارن۔ دوسرے بھاٹ۔ تیسرے بڑوے۔ اوّل اوّل بڑے واسطے بڑوے کچھ حالات راجوں کے لکھ لیتے تھے پھر ان حالات کو چارنوں نے زبانی یاد کرنا شروع کیا اور بھاٹوں نے اُس کو نظم کیا۔ آخر بھاٹوں کی یہہ خدمت قرار پائی کہ راجہ مہاراجوں کے باہمی خانہ جنگیوں میں فوج کے آگے کچھ نظم میں حملہ آور کے بزرگوں کے حالات مبالغہ سے بھرے ہوئے فوج کے دل گرمانے کو پڑھا کرتے تھے۔ چارنوں کو راجہ مہاراجوں سے زیادہ قُرب رہا یہہ زیادہ ترنسب ناموں اور ضروری حالات کچھ لکھ لیتے تھے اور زیادہ تر زبانی یاد کرتے تھے۔ یہہ بھی اپنے راجہ کی تعریف میں اتنا مبالغہ کرتے کہ اُس سے صحیح امر کو معلوم کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہندوؤں میں پُرانی عمارات میں کتبے لگانے کا بھی کچھ زیادہ دستور نہ تھا۔ غرض کہ پچھلوں کو ایسا مسالہ میسّر نہیں آیا کہ اُس سے مرتب اور مسلسل اگلے زمانہ کا حال معلوم ہو۔ لیکن کرنیل ٹاڈ صاحب نے پُرانی نوشتوں کی تلاش میں اور پہلے حالات کی جستجو میں کمی نہیں کی مگر مسالہ نہ ملے تو کیا کریں۔

ٹاڈ صاحب نے پچھلے حالات کا فارسی عربی تواریخ سے مقابلہ بھی نہیں کیا۔ اس واسطے پچھلے حالات میں بھی بہت سی غلطیاں ہوگئی ہیں مثال کے طور سے چند امور ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) کرنیل ٹاڈ صاحب نے ماموں رشید خلیفہ عباسی کا ہندوستان آنا اور چتور گڈھ پر راول کھمان سے چند بار شکست کھانا غلط طور سے لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ماموں ہندوستان نہیں آیا۔ دوسرے اس کا زمانہ خلافت نویں صدی عیسوی ہے۔ اور راول کھمان سو برس بعد ہوا ہے یعنی دسویں صدی عیسوی میں۔

(۲) دوسرے ٹاڈ صاحب لکھتے ہیں کہ اپنے جیتے باپا راول کا چھوٹا فرزند جو چتوڑ میں پیدا ہوا تھا باپ کی جگہہ مسند نشین ہوا اور بڑا بیٹا اسیر یا اسیل جو راج ملنے سے پہلے پیدا ہوا تھا سوراشٹر کا مالک جا بنا ـــــ یہہ غلط ہے اس لئے کہ باپا نے چتوڑ ۲۰ برس کی عمر میں لیا اس سے پہلے اس کا بیٹا کہاں سے آیا۔ علاوہ اس کے ریاست کے نسب ناموں سے جو صحیح نتیجہ نکالا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ باپا کا فرزند کھل نامی تھا جس سے گھلوٹ قوم بنی۔ شاہجہان نامہ میں لکھا ہے

کہ آسٹیڑا اسا اہیر نے بنوایا تھا۔ اسی طرح
(۳) کرنیل ٹاڈ صاحب نے راہپ کی مسند نشینی
سن ۱۲۰۱ء لکھ دی ہے او تحقیق یہہ ہے کہ سن ۱۲۸۷ء
تک راول سمرسی کا عہد تھا جو راہپ سے ۴ پشت
پہلے تھا۔
(۴) اکبر کی فوج کی ہلدی گھاٹ کی لڑائی سن ۱۵۷۶ء
میں مہارانا پرتاپ سنگہ جی سے ہوئی ہے اُس
فوج کا افسر کرنیل ٹاڈ صاحب نے شہزادہ جہانگیر
کو اور اس کا نائب مہابت خاں کو لکھا ہے۔ یہہ
بھی غلط ہے۔ جہانگیر اُس وقت ۶ برس کا تھا
اور مہابت خاں عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا۔ اس
لڑائی میں شاہی فوج کا افسر کنور مان سنگہ
جے پوری تھا نہ کہ جہانگیر۔
(۵) مہابت خاں کو سگر جی سیسودیہ کا بیٹا ہونا
بھی غلط لکھدیا ہے وہ تو غیور بیگ کابلی کا
فرزند ہے اور اُسکا نام زمانہ بیگ ہے اس
لڑائی کے ۳۰ برس بعد جہانگیر نے زمانہ بیگ
کو مہابت خاں کا خطاب دیا دیکھو تزک جہانگیری
اسی قسم کی بہت سی غلطیاں ہیں مگر
اس کی وجہ یہہ ہی ہے کہ مسلمانوں کی تواریخ
پر نظر نہیں ڈالی گئی۔

ٹاڈ نامہ کا زیادہ تر سرمایہ ہی دلیسی روایات
ہیں۔ دراصل اگلے ہندوؤں کے حالات تلاش
کرنا ایسا ہے جیسے اندھیرے میں کسی شئے کو
ٹٹولا جائے۔ یہہ بُرا ماننے کی بات نہیں ہے
او واقعی یہہ ہے کہ مسلمانوں سے بہتر طریقہ
پر کسی نے تاریخ نہیں لکھی۔

دینی تاریخ اسلام کی سب کے نام سے
نامزد ہے اس میں تو یہہ کمال کیا ہے کہ روایت
کو راوی سے مدون تک بہ سند متصل بیان
کیا ہے۔ یہہ اہتمام کسی قوم سے نہ ہو سکا نہ
آئندہ ہوتا معلوم ہوتا ہے۔

مرزا محمد علیخاں سابق ممبر کونسل ٹونک
(رئیس دہلی)

"حاضر الوقت"

اگلے لوگوں کی خط کتابت میں یہہ دستور تھا کہ جو صاحب خط لکھنے والے کے پاس بیٹھے ہوتے وہ "حاضر الوقت" ہو کر خط لکھنے والے سے اپنا اپنا سلام ضرور لکھواتے تھے۔ یہہ خطوط نویسی کے آداب و اخلاق میں داخل تھا +

حضرت عطا فرخ آبادی نے اپنے دوست سے یار کو خط لکھا۔ خط تو جیسا ہے، عشقیہ مضمون ہوتے ہیں خوب لکھا "حاضر الوقت" کی طرف

حاضر الوقت ہیں یہہ رنج و غم و بیتابیٔ دل ∴ دلِ ناشاد و ستم دیدہ و جانِ بسمل
حسرت بوس و کنار آرزوئے لاطائل ∴ آہ و فریاد و فغاں، درد و مصیبت مشکل

یہی سب دوست مرے ہجر میں کہلاتے ہیں
خادمانہ تمہیں تسلیم بجا لاتے ہیں +

خط کے اخیر میں یار کے یاروں کو بھی سلام لکھنے کا دستور ہے:۔

میری جانب سے ترے غمزۂ بیجا کو سلام ∴ وصلِ اغیار کی امید و تمنا کو سلام
میری جانب سے مرے رخ زیبا کو سلام ∴ نگہ ہوشربا چشم فسوں زا کو سلام

اور جو ان کے سوا ہو کوئی پرساں میرا
دست بستہ ہے سلام اُس کو ضمیر جاں میرا

"فقط" خوب کہا ہے تمکو لازم ہے خیالِ دلِ ناشاد فقط + لکھ گیا نامۂ شوق اے ستم ایجاد فقط

دیکھئے کون یہاں پہلے پہل آتا ہے
تم کرم کرتے ہو یا پیکِ اجل آتا ہے

موازنۂ سخن

اگست کے پرچہ صلائے عام میں خان بہادر میرزا ناصر علی صاحب نے مباحثہ شرر و چکبست کے نام سے مثنوی گلزار نسیم کے متعلق کچھ قلم فرسائی کی ہے اور گلزار نسیم کے اکثر اشعار نقل کر دیئے ہیں ناظرین صلائے عام کو اس سے کچھ لطف نہ آیا ہوگا۔ کیونکہ جس بات کا سر پاؤں نہ معلوم ہو اُس کی نسبت کیا سمجھا جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مثنوی گلزار نسیم پر جس کسی نے جو کچھ اعتراض کئے تھے وہ نقل کئے جاتے اور جو کچھ اعتراضوں کے جواب دئے گئے تھے وہ بیان کئے جاتے۔ ان کی تحریر سے نہ یہہ معلوم ہوا کہ حضرت شرر اور حالی نے کیا کہا ہے اور چکبست صاحب کون بزرگ ہیں اُنہوں نے کیا طرفداری اور وکالت گلزار نسیم کی کی ہے۔ ضرورت ایسے امر کی تھی نہ یہہ کہ اکثر اشعار گلزار نسیم کے نقل کئے جاویں اس قسم کی تحریرات دل چسپی سے خالی ہوتی ہیں اور صاحب کمالوں کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ایک روایت ہے کہ ملا ہاتفی نے اپنے بزرگ اُستاد ملا جامی سے عرض کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ شیخ نظامی کی مختلف نظموں کا جواب لکھوں۔ ملا صاحب نے کہا کہ فردوسی کا ایک قطعہ محمود غزنوی کی ہجو میں ہے اُس پر ایک قطعہ تم بھی لکھ لاؤ تاکہ تمہاری طبیعت کا اندازہ ہو سکے وہ قطعہ فردوسی کا یہ ہے :-

درختے کہ تلخست ویرا سرشت
اگر در نشانی بہ باغ بہشت
ور از جوئے خلدش بہنگام آب
بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بہ کار آورد
ہماں میوۂ تلخ بار آورد

اسکے جواب میں ملا ہاتفی نے بڑی جانکاہی کے بعد یہہ قطعہ لکھا اور ملا صاحب پاس لائے۔

وہو ہذا

اگر بیضۂ

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت
نہی زیر طاؤس باغ بہشت
دراں بیضہ ہنگام پروردنش
زانجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل
دراں بیضہ دم دمد جبرئیل
شود عاقبت بیضۂ زاغ زاغ
برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

ملا صاحب نے یہہ قطعہ سُنکر فرمایا کہ قطعہ تو خاصہ لکھ لائے ہو مگر یہہ بھی دیکھا کہ شعر میں ایک بیضہ رکھا ہوا ہے۔ ملا باقی کو اپنا اندازہ ہوگیا۔

ایک بار علی حزیں ولی آئے مگر اپنی شاعری کے نشہ میں مدہوش تھے۔ میر فتح علی خاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے جو مرزا جان جاناں مظہر رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے جنہوں نے دولت کو لات مارکر فقیری اور گوشہ نشینی اختیار کی تھی ان سے علی حزیں ملنے گئے۔ میر صاحب کو شعر و سخن کا مرد میدان نہ جانکر کچھ اسی قسم کی باتیں کیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ میر صاحب کو کچھ مال نہ جانا۔ میر صاحب کو ان کا غرور توڑنا تھا۔ علی حزیں جب رخصت ہونے لگے تو میر صاحب نے فرمایا کہ آپ کے شعر و سخن کا ایران سے ہندوستان تک چرچا ہے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو فقیر کو بھی از کار تازہ سے شاد کام کیجیے۔ علی حزیں نے اپنی غزل کا یہہ مطلع پڑھا ؎

دل دوش گدائے سر راہ شد و برخاست
دریوزہ گر لطف نگاہ شد و برخاست

میر صاحب نے شعر سُنکر کچھ تعریف نہ کی اور دوبارہ پڑھنے کو ارشاد فرمایا۔ علی حزیں ناراض سا ہوگیا اور دریافت کیا کہ شعر میں کیا کچھ نقص پایا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ فقیر کی سمجھ میں یہہ نہیں آیا بھیک مانگنے نکلا اور باقر خانی کا ٹکڑا طلب کرتے ہو۔ اگر بجائے (لطف نگاہ کے) نیم نگاہ ہوتا تو اچھا تھا۔ علی حزیں سنکر سرد ہوگیا۔

مرزا محمد علیخاں (رئیس دہلی)

صلائے عام۔ حضرت مضمون نگار نے معرکۂ چکبست و شرر والی تصنیف نہیں دیکھی۔ اس کتاب کے دیکھنے کے بعد شاید آپ کی رائے بدل جائے۔

سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ کی معاشرت

اکبر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممالک محروسہ کے آدمی تین گروہ پہ تقسیم تھے۔ ایک اہلِ دولت وجاہ جس میں خاندانِ شاہی اور اُمرا و وزرا اور تمام اہلِ سیف (یعنی ملیٹری): دوسرے اہلِ سعادت۔ اس میں حکما و علما و صدور و سادات و مشائخ۔ قاضی و مفتی۔ اور اہلِ قلم اور اہلِ کار اور متوسط الحال (یعنی مڈل کلاس): تیسرے اہلِ نغمہ و ساز۔ گوئے۔ ارباب نشاط اور چھوٹے چھوٹے پیشے و حرفے والے۔ یہ اہلِ مراد کہلائے جاتے تھے۔

خس خانہ اور شورہ سے پانی سرد کرنے کی ایجاد سلطنتِ مغلیہ کے عہد کی ہے اور برف بھی کوہِ شمالی ہمالیہ سے لانے کی ہر شخص کو اجازت تھی اور بڑی قیمت پر بکتی تھی + اُمرا کے ہاں آبدار خانوں کا خاص اہتمام تھا +

تعمیرِ عمارت میں گنبد زیادہ اُبھار کر بہ نسبت پٹھانوں کے زمانہ کی عمارتوں کے بنائے جاتے تھے۔ یہانتک کہ نصف کُرہ سے زیادہ گول اور اونچے ہونے لگے اور بجائے ستون کے استوانوں پر ان کو قایم کیا گیا۔ اور محرابیں نہایت مدور اور خوبصورت ہونے لگیں۔ اور چھوٹی سی کانس کے بجائے چھجے پتھر کے توڑوں سے تیار ہونے لگے۔ اور بڑی بڑی چوڑی چکلی بنیادوں پر آثار قایم ہونے لگے: پچی کاری و منبت کاری سے سنگ مرمر اور سنگ موسٰے کے نقش و نگار سے زیب و زینت دو بالا ہو گئی: برجیوں۔ کنگوروں۔

میناروں اور صُراحیوں نے عمارت کا حُسن بہت بڑھا دیا۔ خاصکر اونچی چھتوں اور اونچے پیاؤں کی بدولت تعمیر میں زیادہ خوبصورتی آگئی ٭

اکبر کے وقت میں درباری لباس یہ قرار پایا تھا کہ ملکی اور انتظامی سرداروں اور امیروں کے سر پر دستار (پگڑی) اور گلے میں کورتہ اُس پر چپکن۔ چپکن کی شکل نیم پیشقبا کی سی تھی اور چپکن کے اُوپر نیم ساق چین دار جامہ (تلک نما) اور ٹانگوں میں ٹخنوں تک شلوار (گھیر دار پائجامہ) اور پیروں میں جرابیں۔ جرابوں پر جوتہ اور کمر میں پٹکا بندھا ہوتا ٭ فوجی افسروں کے سر پہ پگڑی یا خود (جنگی ٹوپی) اور کوٹ نما بٹن دار چست لباس۔ اور ڈھال تلوار پیش قبض کٹار سے مسلح ہوتے ٭

بوڑھوں کے لئے جو دربار میں حاضر ہوں بعض کے ہاتھ میں رنگین عصا۔ جس کے نیچے اُوپر سونے چاندی کی شام (پولا) ہوتا تھا: بعض کے پاس کمر میں قیمتی دوپٹہ یا سیلا ہوتا تھا ٭

اورنگ زیب کے زمانہ میں مسلمان مہین ململ کے جامے چنٹ دار اتنے نیچے پہنتے تھے کہ اُن کے زردوزی جوتے دامنوں کے تلے چھُپ جاتے تھے۔ حالانکہ شرع میں ٹخنوں سے نیچے کی اجازت نہیں اور اورنگ زیب نہایت متشرع بادشاہ تھا ٭ مگر یہہ لباس اُن مسلمانوں کا تھا جن کے آبا و اجداد ایک مدت دراز سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھے کہ قدیم اہل ہند کا لباس جامہ تھا ٭ درباری ہندو بھی اُس وقت کے مسلمانوں کے ہم لباس تھے اور ہندوؤں میں بھی پائجامہ کا رواج شروع ہو گیا تھا ٭

عالمگیر کے زمانہ کے فوجی سپاہیوں کا لباس یعنی وردی زرہ بکتر کی تھی۔ اس عہد کے سپاہی لڑائی کے میدان میں نرم اور چست کوٹ جو روئی اور اون و ریشم کے ٹکڑوں سے بھرے ہوتے تھے جن پر تلوار کم کام کرتی پہنتے تھے۔ کوٹوں پر زرہ اور چار آئینہ لگاتے تھے ؛

بہادر شاہ کے وقت تک درباری لباس وہی رہا جو سابق میں بیان ہوا لیکن غیر درباری میں جدید ایجادیں بہت ہوگئیں۔ بعض سر پہ ٹوپی اُس پر عمامہ باندھتے تھے اور گلے میں کرتہ اُس پر انگرکھا۔ مسلمان انگرکھا سیدھے پردہ کا اور ہندو اُلٹے پردہ کا۔ اور اچکن بجائے چپکن۔ اور بعض اُس پر جُبّہ پہنتے تھے ؛ ٹانگوں میں پاجامہ شلوار تنگ اور اُریب اور بعض ڈھیلا ؛ جوتہ اکثر چوڑے پنجہ کا یا سلیم شاہی یا گرگابی اکثر سادی اور بعض کا مدار ؛

بادشاہی خلعت چند در چند پارچہ کا ہوتا تھا۔ خلعت میں نیمہ آستین اور موتیوں کی مالا اور گلوبند اور گلو آویز اور بالابند اور سرپیچ اور چار قب داخل تھے اور کلنگ کے خاص پر سرپیچ اور پگڑی میں بہ نظرِ عزت مرصع کئے جاتے تھے۔ اور نیز جیغہ و دستار مُرصّع معہ کلنگ کے پر کے خلعت کے طور پر عطا ہوتا تھا ؛ خلعت میں ہندو مسلمان برابر تھے ؛ جس کو بادشاہ کی طرف سے سرفرازی حاصل ہوا اس کا نصیب ؛

کیمپ (یعنی سفر و کوچ میں بادشاہ کے واسطے بارگاہ اور شاہزادوں

کے لئے خیمے۔ بارگاہ کے لئے سُرخ ہونا مخصوص تھا اور کوئی شخص سُرخ خیمہ نہیں رکھ سکتا تھ + خافی خاں نے لکھا ہے کہ شاہجہاں نے کشمیر میں ایسے خیمے لپٹنے کے تیار کرائے تھے جن کے کھڑا کرنے میں دو مہینے صرف ہوتے تھے۔ یہہ خیمے سالگرہ کی تقریب میں نصب کئے جاتے تھے + سال گرہ کا خرچ ایک کرور ساٹھ لاکھ روپیہ تھا +

ہمایوں بادشاہ نے خون کے مقدمات کا حکم سُنانے کے لئے سُرخ لباس مخصوص کیا +

دربار شاہی میں تین کٹہرے ہوتے تھے۔ ایک کٹہرا رنگین سُرخ رنگ کا۔ دوسرا کٹہرا نقرہٖ خالص چاندی کا۔ اِن دونوں کے اندر طلائی کٹہرا خالص کندن کا: یہاں خاص الخاص اُمرا باریاب ہوتے تھے + اس طلائی کٹہرے کے اندر تخت شاہی ہوتا تھا اور بادشاہ کی نشست دو زانو ہوتی تھی اور گاؤ تکیہ پس پشت ہوتا تھا +

عفوِ جرایم کے واسطے شاہزادوں اور سلاطین سے معافیٔ تقصیر چاہنے کی یہہ صورت ہوتی تھی کہ گردن میں تلوار ڈال کر نہایت عجز سے دربار شاہی میں حاضر ہوتے تھے۔ اور عام سردار اور فوجی افسر اور حکام مالی و مُلکی عفو تقصیر کے لئے گردن میں کمان ڈال کر حضور شاہی میں دربار کے وقت حاضر ہوتے تھے +

قدیم طریقہ فریاد کا ایران میں کاغذ کا کُرتہ پہنکر حاضر ہونے کا تھا۔ مرزا نوشہ

۔ دیوان کا پہلا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ✦ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہندوستان میں بہت قدیم طریقۂ اظہارِ عجز و فریاد کا یہہ تھا کہ مُنھہ میں تنکا

سامنے جانا ✦

اکبر بادشاہ کے زمانہ تک دربارِ شاہی میں حاضر ہونے کے وقت بادشاہ

سجدہ کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں نے اورنگِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی پہلا حکم یہہ

ر فرمایا کہ سجدہ نہ کیا جائے اور بجائے اُسکے تسلیم چہارم مقرر ہوئی ✦ شاہجہاں کے

ت میں جب عُلما و مشائخ اور سادات و درویش حضور میں حاضر ہوتے تھے تو آتے

ت السلام علیکم اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھنے پر مامور تھے ✦

عالمگیر کے زمانہ ۱۰۷۹ھ تک یہہ ضابطہ رہا کہ بڑے راجاؤں کو راجہ بنانے

واسطے بادشاہ اپنے ہاتھ سے اُن کی پیشانی پر قشقہ کھینچتا تھا۔ بڑے بڑے راجہ

شاہ کے دستِ مبارک سے ٹیکا لگانے (قشقہ) کو اپنے اقران میں فخر و امتیاز

اعث سمجھتے تھے ✦ محمد شاہ کے عہد میں میت کے وارثِ اعلےٰ کے لئے رسم پگڑی

ہوتی۔ اور میدانِ جنگ کی روانگی کے وقت اور فتح پر سرپیچ بادشاہ کی طرف سے

ا ہونا آغاز ہوا ✦

بادشاہ ہمایوں نے سات دیوانخانے سات ستاروں کے نام پر بنوائے

۔ چنانچہ سپہ سالار اور فوج کے سردار خانۂ مریخ میں بار پاتے تھے۔ اور

مفتی و قاضی اور اہلِ قلم عطارد میں۔ اور سفیر و شاعر و سیاح خانۂ قمر میں طلب ہوتے تھے اور سازندے و مُطرب اور ناچ رنگ والے خانۂ زہرہ میں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

شاہ عبّاس (ایران کے بادشاہ) نے اورنگ زیب کو "عالمگیر" کا لقب اختیار کرنے پر نہایت طعنہ آمیز خط لکھا کہ باپ کو قید کرکے اور بھائی کو مار کر تم بادشاہ بن بیٹھے۔ اور اپنے تئیں "عالمگیر" سمجھتے ہو گویا تمام عالم فتح کرلیا + شاہ ایران کو یہہ معلوم نہ تھا کہ دارا شکوہ پر فتح پانے کے دوسرے روز اورنگ زیب نے اپنے باپ کی خدمت میں معذرت نامہ لکھا کہ اس لڑائی میں جو جانیں تلف ہوئیں اُن کی عذر خواہی کی: شاہجہاں نے معذرت نامہ کا جواب اور جواب میں ایک تلوار موسوم بہ "عالمگیر" اورنگ زیب کے لیئے روانہ فرمائی۔ اورنگ زیب نے اُسکو نیک فال سمجھ کر اپنے تئیں عالمگیر کے لقب سے ملقب کیا +

یہہ حالِ معاشرت زیادہ تر دہلی کا تھا۔ جب لکھنؤ میں بادشاہی قائم ہوئی وہاں کا لباس شرفا کا سر پر شملہ یا چوگوشیہ ٹوپی چپکن یا اچکن شروانی کی وضع کی یا اونچی چولی کا انگرکھا اور کلیوں کا غرارہ دار پائجامہ۔ پاؤں میں گھیتلہ جوتہ یا گرگابی یا خورد نوکہ +

اس مضمون کا مسالہ زیادہ تر مولوی محمد تراب علی صاحب کی تاریخ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے اکثر فارسی کی تاریخوں اور جابجا سے جمع کرکے ایک اچھی تاریخ تاریخ تراب نامے لکھی جس میں حضرت آدمؑ سے لیکر بہادر شاہ اخیر بادشاہ سلاطینِ مُغلیہ کے زمانہ تک کا حال درج کیا: تاریخ میں اکثر کتابوں کی سند بھی لکھی + دراصل یہہ مضمون زیادہ تر اُس تاریخ سے ماخوذ ہے اور بہت کم مضمون نگار کی طرف سے +

With acknowledgment to the author of "Târikh-i-Turâb."

شاہنامہ

(از روئے کمالِ شاعری)

سخنداں جانتے ہیں کہ شاعری کا کمال یہہ ہے کہ مقتضائے حال کو شاعر پیشِ نظر رکھے فردوسی کی شاعری میں یہہ ہی خوبی زیادہ ہے میں اپنے دلی دوست خاں بہادر میر ناصر علی صاحب کی بار بار کی تاکید پر شاہنامہ کے اُن اشعار کو اِدھر اُدھر سے ایک جا جمع کیا چاہتا ہوں کہ جو مجھے زیادہ پسند ہیں۔ میری پسند کا کوئی یہہ مطلب نہ سمجھے کہ جو شعر میں جمع کروں گا وہی عمدہ ہیں باقی اچھے نہیں بلکہ میرا مطلب یہہ ہے کہ میری سمجھ بوجھ کے موافق جو شعر مجھے پسند آئے ہیں اُنکو جمع کر کے پیش کرتا رہونگا ورنہ فردوسی کا کُل کلام موتیوں میں تولنے کے قابل ہے ❊

نوجوان رستم اول مرتبہ لڑنے نکلا ہے اور افراسیاب شہزادۂ توران سے اُس کا مقابلہ ہوا ہے۔ افراسیاب کو رستم گھوڑے سے کمر میں ہاتھ ڈالکر اُٹھا لیتا ہے افراسیاب کمربند ٹوٹ جانے سے زمین پر گر پڑتا ہے اور اُس فوج والے اُسے اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اس مختصر لڑائی کا ذکر افراسیاب اپنے باپ سے کرتا ہے :—

سوارے پدید آمد از نسلِ سام
کہ دستانش رستم نہاداست نام

چناں بر گرفت او ز زینِ خدنگ
تو گوئی ندارم بہ یک پشہ سنگ

کمربند بگسست در زیں قبائے
فتادم ز دستش نگوں زیر پائے

بداں شیر مردے نہ باشد ہزبر
دو پایش بخاک اندروں سر بابر

اس پچھلے شعر کی خوبی کو ملاحظہ کیجئے کہ

پہلی نظر

کیا تصویر کھینچی ہے۔

رستم کو کاؤس بادشاہ نے سہراب سے لڑنے کو اُس کے وطن سے طلب کیا اور گیو کو تاکید کی کہ جلد سے جلد رستم کو لیکر آوے مگر رستم کچھ دیر سے آیا۔ کاؤس بدمزاج تو تھا ہی بہت برہم ہوا اور حالت غصہ میں حکم دیا کہ رستم کو سولی دیدو۔ طوس نے ہاتھ بڑھایا کہ رستم کو بادشاہ کے سامنے سے فی الحال اُٹھا لے جاوے کہ بادشاہ غصہ میں ہے۔ رستم کو اس کی تاب کہاں غصہ آگیا۔ اُسے بھی ملاحظہ ہو۔ کاؤس کا حکم اور رستم اور رستم کا جواب

بفرمود پس طوس را شہریار
کہ رو بردو را زندہ برکن بہ دار
(یعنی رستم اور گیو کو)
بشد طوس و دست تہمتن گرفت
بدو ماندہ پرخاش جویاں شگفت
بزد تند یک دست بر دست طوس
تو گوئی ز پیل ژیاں یافت کوس
ز بالا نگوں اندر آمد بسر
برد کرد رستم بہ تندی گزر
ازاں پس برآشفت بر شہریار
کہ چندیں مدار آتش اندر کنار
ہمہ کارت از یکد گر بدتر است
ترا شہریاری نہ اندر خوراست
چنیں تاج بر تارک بے بہا
لیسے بہتر اندر دم اژدہا
من آں رستم زال نام آورم
کہ از چوں تو شہ خم نگردد سرم
ز مصر و ز چین و ز ہاماوراں ... ؟
ز روم و ز سگسار مازندراں
جگر خستہ تیغ و تخشِ من اند
ہمہ بندہ رنجش رخشِ من اند
تو اندر جہاں خود ز من زندگی
بکینہ چرا دل پراگندی
۹- تو سہراب را زندہ بردار کن
برآشوب و بدخواہ را خوار کن
چو خشم آورم شاہ کاؤس کیست
چرا دست یازد بمن طوس کیست
مرا زور و فیروزی از داور است
نہ از بادشاہ و نہ از لشکر است
زمیں بندہ و رخش گاہ من است
نگیں گرز و مغفر کلاہ من است

سپر نیزہ و گرز یار من اند
دو بازو و دل شہریار من اند
چہ آزاردم او نہ من بندہ ام
یکے بندہ آفرینندہ ام
دلیراں بہ شاہی مرا خواستند
ہماں گاہ و افسر بیاراستند
سوئے تخت شاہی نکردم نگاہ
نگہ داشتم رسم و آئیں و راہ
اگر من پذیرفتمے تاج و تخت
نہ بودی ترا ایں بزرگی و بخت
۱۹- ہمہ ہرچہ گفتی سزائے من است
نہ تو نیکوئی بجائے من است
۲۰- اگر کیقباد م ز البرز کوہ
بزاری نتادہ میان گروہ
۲۱ نیاوردمے من بہ ایراں زمیں
نہ بستے کمر بند و شمشیر کیں
۲۲ ترا ایں بزرگی نہ بودی و کام
کہ گوئی سخن با دستان سام
اگر من نرفتے بہ مازندراں
بہ گردن برآوردہ گرز گراں
کہ کندی دل و مغز دیو سفید
کرا بود یہ بازوے خود امید

ایک ناقدردان مالک نوکر کی اچھی خدمتوں کی قدر و منزلت نکرے تو نوکر مالک کے حفظ مراتب کا پاس کرتے ہوا اس سے زیادہ مناسب موقع اور کیا گفتگو کر سکتا ہے جو رستم نے کی۔ نمبر ۹ کا شعر کیا پُر لطف ہے کہ پہلے سہراب کو تو سولی دیلو پھر مجھے دینا۔

اشعار نمبر ۱۹ اور ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ موقع کے لحاظ سے کتنے مزیدار ہیں کہ جو کچھ تو کہہ رہا ہے میرے کئے کی سزا ہے۔ تیرا کیا قصور ہے۔ نہ میں ایسا کرتا نہ ایسا ہوتا اسی کو مقتضائے حال کہنا چاہئے +

ایک لڑائی میں رستم کا گھوڑا تلوا لنس گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آج کا معرکہ میں نہیں جا سکتا دوسرا کوئی جاے۔ اتفاق سے دشمن کی طرف سے ایک زبردست پہلوان اشک بوس نامی میدان میں آگیا۔ اس سے ایک ایرانی سردار نے مقابلہ کیا مگر اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ سپہ سالار نے خود لڑنے کا ارادہ کیا مگر یہہ اچھی بات نہ تھی کہ سپاہ کے ہوتے سپہ سالار ایک پہلوان

کامقابلہ کرے۔ مجبوراً جب رستم پیادہ لڑنے کو نکلا ہے کل اشعار ملاحظہ ہوں کس قدر پاکیزہ ہیں اوران میں کیا جدت ہے۔ رستم کے تیر مارنے کو کس خوبی سے بیان کیا ہے سپہ سالار سے رستم یہ کہکر لڑنے چلا ہے :-

توقلب سپہ را بہ آئیں بدار
من اکنوں پیادہ کنم کارزار
یکے تیر در دست رنگ آبنوس
خرامید و آمد بر اشک بوس
خروشید کاے مرد زور آزمائے
ہم آوردت آمد مبر باز جائے
کشانی بخندید و خیرہ بماند
عناں را گراں کرد او را بخواند
بدو گفت خندہ کہ نام تو چیست
تن بے سرت را کہ خواہد گریست
بدو گفت رستم کہ اے شوم تن
چہ پرسی تو نامم دریں انجمن
مرا نام من نام مرگ تو کرد
زمانہ مرا پتک ترگ تو کرد
کشانی بدو گفت بے بارگی
بکشتن دہی تن بہ یکبارگی
تہمتن چنیں داد پاسخ بدو
کہ اے مرد بیہودہ پرخاش جو
پیادہ ندیدی کہ جنگ آورد
سر سرکشاں زیر سنگ آورد
ہم اکنوں ترا اے نبردہ سوار
پیادہ بیاموزمت کارزار
پیادہ مرا زاں فرستاد طوس
کہ تا اسپ بستانم از اشکبوس
کشانی پیادہ شود ہمچو من
بدو روئے خنداں شوند انجمن
کشانی بدو گفت کو بت سلیح
نہ بینم ہمی جز فریب و مزیح
بدو گفت رستم کہ تیر و کماں
ببیں تا ہم اکنوں سرآوَر زماں
چو نازش بہ اسپ گراں مایہ دید
کماں را بہ زہ کرد و اندر کشید
یکے تیر زد بر بر اسپ اوے
کہ اسپ اندر آمد ز بالا بروے
بخندید رستم بہ آواز گفت
کہ بنشیں بہ نزد گراں مایہ جفت
سزد گر بگیری سرش در کنار
زمانہ برآسائے از کارزار

کماں را بزہ کرد پس اشکبوس
تن لرزہ لرزاں رُخ سندروس
بہ رستم برآنگہ ببارید تیر
تہمتن بدو گفت بر خیرہ خیر
ہمے رنجہ داری تن خویش را
دو بازو و جانِ بداندیش را
تہمتن بہ بند کمر برد چنگ
گزیں کرد یک چوبہ تیرہ خدنگ
خدنگے برآورد پیکاں چو آب
نہادہ برو چار پر عقاب
بمالید چاچے کماں را بدست
بچرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچے بخاست
چو سوفارش آمد بہ پہنائے گوش
ز چرم گوزناں برآمد خروش
چو پیکاں بہ بوسید انگشت او
گذر کرد از مہرہ پشت او
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ
فلک گفت احسن ملک گفت زہ
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد
تو گوئی کہ ہرگز ز مادر نزاد

(مرزا محمد علی خاں رئیس دہلی)

صلائے عام - شاہ نامہ کی تعریف میں ایک نہیں ہزار مضمون ہزار بار لکھے گئے ہونگے۔ پھر اس مضمون کی ضرورت کیا تھی؟ یہہ مضمون از رہِ ضرورت نہیں۔ مگر اس کی شانِ نزول اس طرح ہے کہ حضرت مضمون نگار سے شعر و شاعری کی گفتگو میں فردوسی کے اس مصرع کا ذکر آگیا ع گرہ داد شب را بہ پس آفتاب * یہہ جوڑے کی تصویر ہو تعریف ہو کہ بالوں کی سیاہی شبِ یلدا سے مشابہ ہے۔ چہرہ کے پیچھے انکا جوڑے کی شکل میں سمٹنا یعنی گرہ دینا آفتاب کے پیچھے رات کی گرہ لگانی ہے۔ یا ... کے چہرہ کو آفتاب سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ کیسی مشکل بات پیدا کردی کہ آفتاب کو رات سے باندھ دیا۔ اس طرح کوئی جوڑا باندھے تو بات ہے۔ اسپر میں نے صاحبِ مضمون سے گزارش کی کہ آپ ازراہِ کرم شاہ نامہ کی شاعری کی خوبیاں جمع کردیجئے آپکو فردوسی کا کلام سمجھنے میں ید طولےٰ ہے۔ آپ ہی یہہ مشکل کام کرسکتے ہیں کہ خود سخن سنج و سخن فہم ہیں۔ یوں تو بہتوں نے شاہ نامہ کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے مگر جس طرح خوشنویسی میں جو حرف سیر پنجہ کش کے قلم سے نکل گیا وہ اوروں سے بن نہ پڑا۔ اسی طرح جو خود سخن سنج و سخن فہم ہو وہ شاہ نامہ کی خوبیاں خوب لکھیگا۔ چنانچہ آپ نے میری خاطر سے یہہ کام اپنے ذمہ لیا۔ یہہ مضمون.. [illegible]

بہادر شاہ بادشاہ اور باغی پرپیڈ

مجھے چند ورق ایک مثنوی قلمی تبر دنامہ کے جو غدر کے حال میں کسی لالہ صاحب نے فارسی میں لکھی تھی اتفاق سے مل گئے۔ اس کی فارسی تو بہت اچھی ہے مگر اس میں لالہ صاحب نے دہلی کے مفسدہ کا حال کچھ کچھ نظم اُردو میں بھی لکھا ہے۔ نظم تو محض تک بندی ہے کہ بحر و ردیف و قافیہ بے کار سمجھا گیا: مگر واقعات خاصے قلم بند کئے ہیں + نظم اُردو کے چند اشعار جا بجا سے نقل کئے جاتے ہیں:۔

صوبے دار و کپتان اجیٹن تمام[1] ÷ کرا حضرت بادشہ کو سلام
کہا سُنئے اے مالک ہرا بچن ÷ بیٹھو تخت پر اور رہو تم مگن
گو بتیاں نے تم کو دیا تخت و تاج + سارے ہند میں تم کرو اپنا راج
خدا تعالےٰ نے تم کو اب سکہ دیا + تمہرا اوندھا نقارہ سیدھا کیا
یہہ جتنی آئی ہیگی فوج و سپاہ + کرے چاکری تم رہو بادشاہ
جہاں جہاں حکم ہو وہاں پہرہ لگائیں + دو ما ہا طلب کا ہمیں مدد لائیں
کہا بادشہ نے سنو بابا جان ÷ جو ہوئی اور ہوگی یہہ سب رب کی شان
جاؤ یہاں سے باہر کرو بسترا + جو دربار آؤ ادب سے ذرا
فقط لاکھ روپیہ پر گزران ہے + یہی بادشاہت یہی شان ہے

[1] باغی فوج کے افسر بادشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے +

فرنگی نے کچھ ہم کو دُکھ نہیں دیا + چھپّن برس عزت سے کھایا پیا
وہ کیا بات ہے جو ہوئے تم بیدل + مفصّل کرو عرض پوشیدہ کُل

(پُربیوں نے لمبی چوڑی کہانی کہہ کر پھر بادشہ سے کہا)

بڑھ ہو مرتبہ دُر و شادمانی کرو
خوشی سے بہت زندگانی کرو

اُٹھے بادشہ تخت پر ہو سوار + چلے محل میں گرد سب چوبدار
کوئی کہے بڑھئیو تم سنو تو سہی + ہمن سے کہو کیا بے ادبی بھئی
کسی نے جھپٹ کر پکڑا تخت کو + لگا کہنے ہمری عرض تو سنو
امیر اور نقیب اور سب چوبدار + پکاریں اور ماریں کہیں خبردار
ادب سے رہو یا نہ بے باہر کو جاؤ + بنا حکم ہرگز نہ اس جگہ آؤ
وگرنہ تمہیں خوب ہوگی سزا + یہہ جائے ادب ہے سنو بھیا

کہاں لال قلعہ کی زبان خاصکر بادشاہ کی زبان جو اُردو کے نامور مستند شاعر تھے اور کہاں اُن پربیوں کی زبان جو بادشاہ کو سُننی پڑی!

باغیوں نے قلعہ معلّےٰ کا یہہ حال کیا کہ:—

کہوں کیا سپاہ ایک ٹیڑھی دل چھایا + قلعہ کی چھت سے محل تک ڈھایا
دیوانِ عام اور خاص مہتاب باغ + لیا گھیر منڈلائیں جو چیل و زاغ
جہاں چمن تھے موتیا اور سمن + وہاں گھوڑے لے کے بیٹھے گمن

جامن آم نارنج کی ٹہنی کاٹ ✦ لگے پھو نکنے جولھوں میں پات ٹاٹ
سارے پھول اور میوہ ڈالی اُکھاڑ
کرے پردہ باناتی کے تار پھاڑ

دیرِ دہلی سے تا درِ قلعہ تک ✦ بچھا بستر ا بیٹھے سب یک بیک
بہت مال و اسباب تھا اُنکے پاس ✦ ہمیانی کمر میں اور مُنہہ میں بکواس
کوئی کہے تواری رسوئیاں بناؤ ✦ کوئی کہے آج مٹھیاں کھلاؤ
کوئی کہے ہمن کو پاں ہی دلاؤ ✦ کوئی کہے ہمن کو بجر یا تباؤ
کوئی کہے سنو بھیا اے رام دین ✦ گوسیاں نے یہہ کرپا کیا کر کے کین
کسی نے انگوچھے کو سر پر سے کھول ✦ کسی نے تماکو اور چونے کو گھول
جو شامت کسی کی وہاں آگئی ✦ وہ بولا کو لے ہے دو دھا دہی
مہادین بولے یہاں آ سسُر ✦ ارے کھاری سر پر سے نیچے کو دھر
ہمن کو چکھاؤ کیسا شیر ہے ✦ نخالص ہگا ما ہین ملا نیر ہے
کتن سیر بیچت ہے بولت نہیں ✦ بولا سیر کا لوں گا میں پیسہ تین
ایدھر اودھر سے جمع ہوئی گاگا رول ✦ اے کیا کہو مو کرو مت ٹھول
وہ بکتا رہا سب نے کر کے بانٹ ✦ مانگا مول تب مُنہہ دوں سے توڑی ٹانٹ
بہت سا لگا رہا وہ غل جو کیا ✦ دو تین مُنڈا اس کے سر پر دیا
سنو سسُر کے پتو اب یہاں سے جاؤ ✦ رسوئیاں بنا کھائیں جب تم پھر آؤ

سار سالہ نمبر

(سارے شہر و بازار کا حال اس سے کہیں زیادہ بدتر تھا۔ گھر میں رہنا اور بازار میں نکلنا مشکل تھا؛ شہر کے بدمعاش اور نایاب تلنگوں کو ساتھ لیکر گھر گھر پھرتے تھے)

تلنگوں کو لیجا رعایا کے گھر ✤ لٹیں مال و اسباب زیور و زر
جاویں دوڑ کر ماریں بندوقیں باڑہ ✤ پکاریں اُتر نہیں توڑیں کواڑ
کسو سے سنو مانگتے کسی سے ہزار ✤ کسی سے کہیں توڑ دے تو کواڑ
کسی سے کہیں سالے کو کھینچ لو ✤ کسی کے دوشالے کو کہیں لے لو
کسی کو کہیں یہہ بڑا ساہوکار ✤ جو چاہو سو لو کچھ سلو مت پکار

(از مثنوی نمبرد نامہ)

اس میں شک نہیں کہ باغی تلنگوں کے ظلم سے شہر والوں کا دم ناک میں تھا دوکانیں لُٹتی تھیں۔ ڈر کے مارے دوکان دار دُکانیں نہیں کھولتے تھے۔ مثنوی میں شاعری سے تو غرض نہیں مگر تلنگوں باغیوں کے ہاتھ سے جو دلّی پہ تباہی آئی وہ بہت مفصّل لکھی۔ لکھنے والا اُس وقت کے حالات سے خوب واقف معلوم ہوتا ہے۔ غدر کی تاریخیں تو بہت لکھی گئی ہیں۔ مگر باغیوں کے ہاتھوں سے جو شہر والوں پہ ظلم ہوئے کہ لوگ زندگی سے بیزار تھے وہ مفصّل دیکھنے میں نہیں آیا۔

افکار جناب مہر

نہ زندگی میں تو چھوٹے گا بوستاں ہم سے ☆ رہے خلاف جو رہتا ہے باغباں ہم سے
دُھنا کئے وہ ہماری مصیبتوں پر سر ☆ سُنا کئے وہ محبت کی داستاں ہم سے
جو امتیاز انہیں عشق و ہوس ہو جائے ☆ تو بے سبب نہ کبھی ہوں وہ بدگماں ہم سے
نیاز و ناز ہیں ہم مرتبہ محبت میں ☆ بس اس سے بڑھ کے نہیں کچھ نہ مہرباں ہم سے
کرے نہ مدح شراب طہور کیوں واعظ ☆ کہ سُن چکا ہے حدیثِ مئے مغاں ہم سے
تو اے کبوتر بام حرم چھڑی ذرا نی ☆ سُن آکے حالتِ سوز دل تپاں ہم سے
شباب تو ہم نہیں ہونے کے انکی محفل میں ☆ ہوا کریں جو وہ ہوتے ہیں سرگراں ہم سے

صلائے عام۔ یہہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ بہی سے ایسے کلام سُننے میں آتے ہیں :-

جو امتیاز انہیں عشقِ و ہوس میں ہو جائے ☆ تو بے سبب نہ کبھی ہوں وہ بدگمان ہم سے
نیاز و ناز ہیں ہم مرتبہ محبّت میں ☆ بس اس سے بڑھ کے نہیں کچھ نہ مہرباں ہم سے
کرے نہ مدح شرابِ طہور کیوں واعظ
کہ سُن چکا ہے حدیثِ مئے مغاں ہم سے

مضمونِ پریشاں

میں ہوں آشفتہ بیاں میری زباں ہے یہ سُنیں ؛ زُلف سے پوچھ لیں حال اپنے پریشانوں کا

یہ میں ہزار بار عرض کرچکا کہ پریشانی عیب نہیں۔ اگر عیب ہوتا تو حسینوں کا چہرہ پر بالوں کا پریشان کرنا حُسن میں داخل نہ ہوتا: بقول حضرتِ غالب ؎

ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ؛ زُلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے ؛

یہاں تک کہ ماتم میں بھی زلفِ یار کا پریشاں ہونا چاہنے ولوں کے لئے عجیب سماں دکھاتا ہے ؎

شرم آئیگی مجھے لوگ سمجھ جائیں گے ؛ تم نے گیسو مرے لاشہ پہ اگر کھول دیئے

پریشانیٔ زلفِ یار شہیدانِ ناز کا خوں بہا ہے: جس کے ماتم میں کسی کے بال کھلیں اس کا مرنا جینے سے بہتر ہے۔ کہ جیتے جی تو چاہنے والوں کو یار سے ملنے کا رونا رہتا ہے مرنے پر تو یار کے دل پہ اثر ہوا ؛ شبِ ہجراں کا جواب اگر ممکن ہے تو رُخِ تاباں پر سیاہ بالوں کا پریشاں ہوجانا ہے ؎

لاکھ تدبیروں سے میرے دل کی خاطر جمع کی ؛ خوب جھلکے وہ گیسوئے پریشاں کے گئے

انسان کو اپنی زندگی پہ اختیار ہے کہ ہو سکے تو عیش و آرام میں کاٹنے کو جی چاہتا ہے

ہے تو یہاں

نہ ہو سکے تو لاچاری ہے : مگر رونا یہہ ہے کہ مُنہہ مانگی موت بھی میسر نہیں ہوتی ؛ چاہنے والوں کو یار کے زانو پر سر رکھ کر مرنا عُمر خضر سے زیادہ عزیز ہے جو بغیر یار کے بسر ہو۔ رستم کے لئے جس کی تمام عمر لڑائی میدانِ جنگ میں کٹی گھر میں سر پٹک کر چارپائی پر مرنا قیامت تھا۔ سکندر کا لڑائی میں مارا جانا اس سے بہتر تھا کہ تین دن تپ ولرزہ کی شدت میں مرنا پڑا ؛ سلطان محمود غزنوی کا مرتے وقت تمام خزانے اور جواہرات منگا کر دیکھنا کیسا حسرتناک ہوگا۔ اس سے تو یہہ بہتر تھا کہ محتاج ہوتا اور تیسرے فاقہ سے مرتا ؛ نادر کو جب خیمہ کی سوائی کی رسی سے اُلجھکر مارا گیا سُنہری مسجد سے دلی والوں کے قتل عام کا حکم دینا یاد آگیا ہوگا کہ بڑے دریبہ کے خونی دروازہ سے پہاڑی تک خون کی ندی بہ گئی تھی ؎

بہت شبنم سے دھویا پر گلابی رہ گئی رنگت ؛ کسی صورت نہ چھوٹا خون بلبل گل کے دامن سے

انسان کے عزیز واقارب اور دوست آشنا زندگی میں مجھسے یا آپ سے کتنی ہی محبت سے پیش آتے ہوں بُرا نہیں۔ مگر مرتے وقت تو اکیلے ہی مرنا اچھا ہے کہ ناحق کیوں کسی کو تکلیف دیجاے ؎

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا ؛ وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں؟

نزع میں عزیز اقارب کا رونا پیٹنا جان کنی بڑھا دیتا ہے۔ جس طرح قربانی میں جانور کے چھری کے نیچے تڑپنے سے جانور ہی کو تکلیف زیادہ ہوتی ہے : بسترِ مرگ کی جان کنی اور اجل سے کشتی میں تماشائیوں کی ضرورت نہیں ؛ قبر کی تنہائی کی طرح مرتے وقت کا شور بے کار ہے کہ جس طرح گور میں خاموشی وتنہائی سے مفر نہیں مرتے وقت بھی خاموشی وتنہائی بُری نہیں ؛

مسافرانِ عدم رخصتی الفاظ کے محتاج نہیں۔ اُن کو "خدا حافظ"! "فی امان اللہ"! "اللہ بیلی"!
کی ضرورت نہیں۔ یہہ رسمِ الوداع آخرت کے مسافر کے لیئے رائیگاں ہے + زندگی میں تو
الوداع کا لطف ہے کہ پھر ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔ جس طرح رمضان شریف کی **الوداع**
کہ پھر اسی مہینے میں تشریف لائیں گے: اور یہہ بھی "ایسی" "الوداع" ہے کہ اس کے بعد ہی گھر
گھر عید ہوتی ہے + سه

کہیں لیجاؤ لیکن آرہوں گا کوئی جاناں ہیں + قفس سے جب چھٹیگی آئیگی بلبل گلستاں میں

ساری عُمر میں نے خدا جانے کن کن جھگڑوں میں کاٹی۔ جانے کن کن شغلوں میں
بسر کی۔ زمانہ سے کسی وقت فرصت نہ ملی۔ یہہ دو چار سکنڈ آخری ہچکیوں کے تو میرے
لیئے چھوڑیئے + ملازمت میں مجھے ایک دفعہ اپنے افسرِ اعلےٰ سے ملنے کی ضرورت ہوئی۔
صاحب شملہ پر تھے۔ میں شملہ پہونچا + صاحب سے مشکل سے ملنا ہوا۔ مجھے دیکھتے
ہی فرمایا کہ میں دلّی سے پہاڑ پر بھاگ آیا کہ تم سے پیچھا چھٹے۔ تم نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا +
انسان کے لیئے یہاں اور ضرورتیں ہیں۔ تنہائی کی بھی ضرورت ہے کہ اپنے خدا سے باتیں
کرسکے۔ یہہ مرتے وقت نصیب ہوتا ہے + یہہ توبہ نہیں۔ استغفار نہیں۔ کلمہ نہیں کلام
نہیں: اپنے تئیں چُپ چاپ اُسکے حوالے کردینا ہے کہ سه

سپردم بتو مایۂ خویش را + تو دانی حسابِ کم و بیش را

آپ میزانِ عدل کھڑی کرکے تولا۔ ناپا کریں۔ ہم سے تو اب حساب نہیں ہوتا۔ ہمیں تو
آپ یوں پڑا رہنے دیں ع ہمارا کیا ہے ہم تو بوجھ کا دیتے ہیں گردن کو سه

طاعت نہ کام آئے نہ بندوں کی بندگی ؛ جب تک شریکِ حال اُسی کا کرم نہ ہو

ہمیں تو میاں سے بڑی بڑی امیدیں تھیں اُدہر۔ گو موت سے سب پر پانی پھر تا دکھائی دیتا ہے ؎

تنکا تنکا جمع کیوں کرتے بناتے کس لئے ؛ ہم نہ سمجھے تھے کہ برباد آشیاں ہوجائیگا

اللہ رے اسیریٔ بلبل کا اہتمام

صیاد بات کونسی اس مشتِ پر میں ہے

مرتے وقت اجل سے ہاتھا پائی کہ سختیٔ کرب سے کسی پہلو چین نہیں۔ اُدھر مُنکر نکیر کے سوالوں کا ڈر۔ پھر پرسشِ اعمال اور میزانِ عدل جس میں پاسنگ کی بھی گنجائش نہیں۔ اور یہاں مرتے وقت یہہ تقاضہ کہ خُدا کو یاد کرو ؎

یہہ مُنہہ کو پھیر کے کیسے اشارے ہیں دمِ نزع ؛ حلال کرتا ہے ظالم کسے دکھاکے مجھے

دُنیا سے ہم کیا چلے ساری دُنیا ہمارے ساتھ چلدی ع دولھا کے دم کے ساتھ یہہ ساری برات تھی ؎

عاشق ہی کا یہہ دل ہے کہ ساکت ہے مریجاں ؛ پتھر بھی جو ٹوٹیں گے تو فریاد کریں گے

ہوا برباد تیری راہ میں مُشتِ غبار اپنا

جھٹکنا پر نہ چھوڑا تو نے ظالم اپنی دامن کا

قیامت کے لئے ہم دُنیا کو چھوڑتے ہیں۔ اور قیامت میری کیا حضرتِ نوحؑ کی زندگی میں بھی نہ آئی۔ حالانکہ طوفان آگیا: مُجھے شُبہہ ہے کہ شاید ہی حضرت خضرؑ کی زندگی

میں آئے۔ گو وہ ہزار بار آبِ حیات پا کریں + ہزار بار اس لئے کہا کہ بحرِ ظلمات کا راستہ آبِ حیات کی تلاش میں دیکھ چکے ہیں۔ ایسی جلدی بھولے نہ ہوں گے +

مرتے وقت چاہنے والوں کی یاد مرنے والے کی قبر پہ پھولوں کی چادر سے بہتر ہے۔ چاہنے والوں کے دل میں نقشِ لوحِ مزار سے زیادہ خوش نما ہے: اور انہیں کا احسان زیادہ ہے کہ وہ میری موت کا رنج محسوس کر رہے ہیں اور مجھ میں احساس کی طاقت ہی زائل ہو گئی +

عاقبت بخیر۔ ایمان کی سلامتی!

"عاقبت بخیر۔ ایمان کی سلامتی" کا خیال گو اقلیدس کی شکلوں اور جبر و مقابلہ سے ثابت کرنا مشکل ہے مگر اس خیال کے نیک ہونے میں شک نہیں + بقول جناب رشکی ؎

عشقِ رشکی کا زمانہ سے جدا ہے گویا + بندۂ بت ہے مگر فرق کچھ ایماں میں نہیں

انسان کی زندگی کا مدار آرزوؤں پر ہے۔ آرزوؤں کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو پوری ہوتی ہیں یا ان کا خون ہو جاتا ہے: پچھلی حالت میں تو اتنا نقصان نہیں جتنا کہ آرزوؤں کے پورا ہونے میں ہے کہ ایک کے پورا ہونے پر اور ہزار پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر سب پوری ہوں تو زندگی کا اعتبار کسے؟ ؎

نہ نکلی ہیں نہ نکلیں گی کبھی دل سے کسی عنواں + تمنائیں مرادیں آرزوئیں حسرتیں دل کی

خالی ہی ہاتھ جائیں گے آئے تھے جیسے ہم
لایا نہ ہو جو کچھ بھی تو پھر لے کے جائے کیا؟

ع پیری کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است

(بوڑھوں کی نگاہ سے)

۔۔نے میں بالقصد باتوں کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ آفتاب کا خیال روشنی کی وجہ سے اس قدر نہیں ہوتا جس قدر اندھیرے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گو روشنی دن بھر رہے مگر گرہن میں دو چار منٹ ہی کے اندھیرے کو دیکھنے کے لئے تمام دُنیا کے نجومی دوڑتے ہیں۔ ہم عُمر بھر بکیں تو کوئی خیال نہ کرے گونگا ایک حرف بھی اگر اتفاقاً زبان سے نکال دے تو معجزہ کرامات سمجھا جائے۔

کہتے ہیں کہ سے پیری ہیں۔ لوٹے وہ کہاں ہیں شباب کے؟ ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

آفتاب کے ساتھ دُھوپ نکلی رہے تو کچھ تعجب نہیں۔ ابر میں جب کبھی بارش میں تھوڑی سی بھی دُھوپ ہو جائے تو دھوپ چھاؤں بھلی لگتی ہے۔ جُھٹ پٹے کی تعریف ہے کہ تھوڑی روشنی اور زیادہ اندھیرا ہو۔ اس وقت کی ہلکی روشنی بھی دن بھر کی دُھوپ سے زیادہ سہانی معلوم ہوتی ہے۔ گائے بیل چرنے والے جانور جنگل میں چرتے پھرتے مجھے اتنے اچھے معلوم نہیں ہوتے جتنے کہ دوپہر کو دُھوپ سے بچ کر سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھے جگالی کرتے نظر آتے ہیں کہ اطمینان سے بیٹھے آرام کر رہے ہیں۔ ”نے غم دزد نے غم کالا“۔

جوانی اسی کا نام نہیں ہے کہ سبزہ آغاز ہے۔ سر کے بال سفید نہیں ہیں۔ اُچھلتے کودتے پھاندتے خوب ہیں۔ سبزہ تو باغ میں بہت ہے۔ کوئل کے پر بھی سیاہ ہیں۔ مینڈک بہت اُچھلتے ہیں۔ اور گھڑ دوڑ میں گھوڑے کدائے جاتے ہیں۔ جوانی سے میری غرض

دل و دماغ کی پاکیزگی۔ طبیعت کی نزاکت۔ خیال کی رعنائی۔ خاصکر نازک خیالی و پاکیزہ مزاجی ہے۔ بوڑھے کُشتی نہیں لڑ سکتے نہ سہی۔ نٹ کا تماشہ نہیں کر سکتے نہ سہی۔ قلا بازی نہیں لگا سکتے نہ سہی؛ کودنے پھاندنے کے کام کے نہیں۔ مگر سپید بال نازک خیالی و پاکیزہ مزاجی کے مزاحم نہیں ہو سکتے؛ نفس امارہ کے یا نہیں تو نفس مطمئنہ کو بس میں رکھ سکتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں میں گاما پہلوان سے بازی نہیں لے سکتے تو نفس سرکش کے دبانے میں رستم کو مات کر سکتے ہیں۔ جوانی میں کسی کی آنکھ پسند تھی تو اب نگاہ یار کی گردش پر مرتے ہیں کہ دیکھئے کدھر پھرتی ہے؟ نگاہ سیدھی ہے یا ترچھی؟ آگے یار کی صورت پر غش تھے اب صورت سے زیادہ سیرت کا خیال ہے۔ پہلے یار کے خط و خال دیکھنے کا شوق تھا اب دل و دماغ کی خوبیوں کی تلاش ہے۔

جوانی کو اگر اس بات پر ناز ہے کہ جوانوں کے چہرہ پر جھرّیاں نہیں۔ تو بوڑھوں کے بدن کی جھرّیاں بقول جناب انیس یہہ جھرّیاں نہیں ہیں بلکہ ع چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو (اگلے خوش پوشاک انگرکھے کی آستینیں چُن کر پہنتے تھے) ہمارے سر کے بالوں کی سپیدی ہماری صفائے باطن کا آئینہ ہے۔ جوانی کے لئے جو باتیں ہنر سمجھی جاتی ہیں بڑھاپے کے لئے عیب ہیں۔ بڑھاپے کے لئے بڑا عیب یہہ ہے کہ جوان بننے کی فکر میں رہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ انسان اپنے تئیں بوڑھا نہیں جانتا جب تک کہ آغوشِ گور میں نہ جائے۔ مرنے سے پہلے سب کو شباب کی ہوس رہتی ہے +

کہتے ہیں کہ شیر شاہ ہمایوں کو شکست دیکر دلّی میں بازار سے گھوڑے پر سوار ہوکر

بڑے ٹھُسّک سے نکلا۔ ایک بوڑھیا نے شیرشاہ کی سواری دیکھکر کہا کہ عروسِ دولت کو دولھا ملا مگر بوڑھا؟ یہہ سُنکر شیرشاہ گھوڑے پر جوانوں کی طرح اکڑکر اور تن کر بیٹھ گیا۔ بوڑھیا پھر بولی کہ "بوڑھا ملا اور مسخرہ" ؛ مطلب یہہ کہ بوڑھا اگر جوانوں کی نقل کرے تو مسخرہ سمجھنا چاہئے کہ جوانوں کا ہنر بوڑھوں کے لئے باعثِ ننگ ہے ؛ بوڑھے جو ایک پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھے ہیں جوانوں کی نقل میں دوسرے پاؤں سے گولف[1] کھیلا چاہتے ہیں ؛ ایک پاؤں تو قبر میں ہے ہی دوسرے کے بھی ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے ؛

جوانی سے زیادہ پیری کو نعمت سمجھنا چاہئے کہ پیر جوانی کا لُطف اُٹھا چکے اور جوانوں کو بڑھاپا ابھی نصیب نہیں ہوا ؎

چُبھے ہیں اس قدر کانٹے کہ تلوے ہوگئے چھلنی ؛ بہت اچھی طرح چھانیں گے اب ریگِ بیاباں کو

جوانوں کو اپنے دل پر قابو نہیں کہ جوانی "چنانکہ میدانی" دیوانی ہوتی ہے ؛ بوڑھے اپنے دل پر قابو رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح قابو رکھنے سے جوان بھی قابو میں آسکتے ہیں ؛ زندگی جوانی یا بڑھاپے کا نام نہیں۔ زندگی کا مدار دل پر ہے ع زندگی زندہ دلی کا ہے نام ؛

جس طرح حکما و شعرا یونان حُسن کا مدار محض جنسِ نسواں پر نہیں سمجھتے تھے۔ حُسنِ طبیعت۔ حُسنِ خیال۔ حُسنِ سخن۔ حُسنِ گُل و بُلبُل۔ حُسن خرام (بطکا) حُسن قدم و تیزیٔ رفتار عربی گھوڑے کی۔ حُسنِ آوازِ مرغانِ خوش الحان کی۔ حُسنِ اعضا و زرش ؛ پہلوانی غرض ہر چیز میں حُسن ہے۔ اسی طرح عشق کے لئے عُمر کی شرط نہیں۔ شرارتِ نفسی کو چھوڑ کر عشق کے لئے کوئی خاص وقت نہیں۔ حُسن و عشق توام ہیں ؛

[1] انگریزی کھیل جس میں پاؤں سے چمڑے کی گیند کو اُچھالتے ہیں ؛

کہتے ہیں کہ "جو جاگے نہ اس سے وہ جوانی ہے۔ اور جو آگے نہ جائے وہ بڑھاپا ہے"؛ بوڑھوں کو اب یہی زمانہ غنیمت سمجھنا چاہیے کہ جوانی کے بعد بڑھاپا آیا اب اس کے بعد اللہ کا نام ہے ؎

تو گرفتاری میں ہیںڈاں یا دگلشن کی رہی پر اب قفس سے چھٹ کے گھر یاد آئے گا صیاد کا

دُنیا میں جوانوں کی موت پر زیادہ رنج ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے بوڑھوں کے زیادہ جینے کا تعجب ہوتا ہے: بوڑھے جو مرنے میں دیر لگاتے ہیں یہہ عبادت میں داخل ہے کہ میاں کے حکم کی راہ دیکھ رہے ہیں ؎

نہ ہو جب ضعف سے طاقت کہ آمی جان ہو ترنگ پر تو ہم سے ناتوانوں کا کہو کس طرح دم نکلے

نہ آئی گھر مرے کیا جانے کیا سمجھ کے قضا

یہاں تو جان بھی حاضر ہے میہماں کیلئے

مگر سچ پوچھئے تو جینا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ مرنا دشوار ہے۔ خاصکر ضعیفی میں کہ ضعف سے گھر سے نکلنے کی تو طاقت نہیں اور سفرِ آخرت درپیش ہے: ہم تو دنیا کو عرصہ ہوا چھوڑ بیٹھے ہیں مگر یہہ کمبخت ہمیں نہیں چھوڑتی۔ تقاضائے مروّت ہے کہ ہم اس کا ساتھ دے رہے ہیں ؎

صیاد تیرے دام سے آساں تھا چھوٹنا ؛ مُشکل یہہ ہے کہ تجھسے مرا دل اٹک گیا

مے پی کے جواں دیتے ہیں ساقی کو دعائیں

تا دورِ فلک دور رہے پیرِ مغاں کا

دُنیا کی اکثر پائیدار چیزوں پر پیری کا اطلاق ہوتا ہے۔ سب میں پُرانا آسمان ہے

۹۰. پیر فلک

جو پیر فلک کہلاتا ہے اور بزم عیش میں مُغبچوں سے زیادہ پیر مغاں کا ادب و لحاظ ہوتا ہے + پیری میں کوئی ناشائستہ حرکت جوانی کی بہ نسبت زیادہ معیوب سمجھی جاتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی بڑھاپے کی شادی میں فرماتے ہیں ؎

سُنتا ہوں یہ کہتی ہوئی پنہاری گئی ہے + لو دیکھو بُڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے

جوانوں کی "مت ماری جائے" تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ بوڑھے ذرا سی لغزش پر آماجگاہ لعن و طعن بن جاتے ہیں: بُڑھاپا بہت پھونک پھونک کر پاؤں رکھنے کا وقت ہے + بُڑھاپا پارسائی و پرہیزگاری کی تصویر ہے۔ ذرا سا شیڈ یا داغ دُھبا نقشہ بگاڑ دیتا ہے ؎

کیا کہا کیا گھر سے آنے کی یہی ہوتی ہے شکل + ہونٹ سوکھے سانس پھولی بات گھبرائی ہوئی

جوانی بُڑھاپے سے کیا خاک بازی لے گی ؟ ؎

راہِ وفا کے کرب کو کیا جانے کوہکن
اسکو تو موت پہلی ہی منزل میں آگئی

خالی برائے اشتہارات

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضروری کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہو سکیں اُنکے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہیئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و ناکھیالی ضرور ہو۔ یعنی بیان عروس جمیل و لباس حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اسسے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبانِ اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے . [illegible]
" " چھ ماہ کیواسطے .. [illegible]
" " تین ماہ کیواسطے . [illegible]
" نصف صفحہ ایکسال کیواسطے . [illegible]
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے [illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے ...... [illegible]
" نصف " " . [illegible]
" چوتھائی " " . [illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دُگنی اُجرت ہو۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہیئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہیئے۔

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:-

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر محمد علوی چھپا اور شائع ہوا۔
Printed and Published by Mir Nāsir ali Khān Bahādur (Editor) at the Nasri Press, Farrāsh Khāna Delhi

SALA I-AM, DELHI. Regd. No L 1462

صلائے عام

16(11)

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

حسب الارشاد مولانا میر ناصر علی خان صاحب دہلوی کارپرداز مطبع ناظری واقعہ فراشخانہ دہلی اور چھپا کر

Mustansir Press, Farashkhana Delhi.

فہرست مضامین

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۸ء

دلّی : ایٹ ہوم

AT HOME.

دلّی کی خبروں میں ایٹ ہوم کی تقریب جو ۳۱ ماہ گزشتہ کو روشن آرا باغ میں منعقد ہوئی ذکر کرنے کے لایق ہے۔ اس تقریب میں میونسپل کمیٹی کے ممبروں اور شہر والوں نے عالی جناب سر جان طامسن صاحب بہادر چیف کمشنر صوبہ دہلی کی خدمت میں حضور کے خیر مقدم میں ایڈریس پیش کیا۔ ایڈریس میں اس شہر کی ترقی اور شہر والوں کی بہبودی و رفاہ عام کی تجویزیں تھیں جو حضور نے نہایت توجہ سے سُنیں اور بہت معقول جواب ارشاد فرمایا۔

جواب نہایت پاکیزہ اور بہت فصیح تھا۔ ایڈریس کے خیر مقدم کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :-

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

"I shall find it hard to live up to the character you have given me and in any case it is by

your memory rather than by your anticipations that I would wish to be judged."

اُردو میں انگریزی کی سی فصاحت ناممکن ہے۔ لیکن جہاں تک کہ ہماری زبان میں اس کا مطلب بیان ہوسکتا ہے یہہ ہے کہ:۔

میرے حق میں آپ صاحبوں نے جو اظہارِ حُسنِ ظن فرمایا اس کا میں شکر گزار ہوں۔ لیکن حُسنِ ظن کے موافق کرکے دکھانا ذرا مشکل ہے۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ میرے حق میں پیش از وقت خیالوں کے عوض بعد میں حافظہ اور یاد سے زیادہ کام لیا جائے۔ (یعنی وعدہ سے وعدہ کی وفا کے بعد رائے لگائی جائے)۔ × × × × × ×

× × × × × × × × اخیر میں حضور نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"ایڈریس کے اخیر میں آپ (ممبرانِ کمیٹی) تین بڑے شان کے تحفے پیش کرتے ہیں۔ اپنا اعتماد۔ اپنی اعانت اور اپنا ساتھ دینا: اور مجھسے تین بے بہا نعمتوں کی اُمید ہے۔ یعنی صحت۔ طاقت اور ہدایت کی ۔ جب آپ کے تحایف دیرپا نکلے اور آپ کی دُعائیں مستجاب ہوں تو کامیابی کسی نہ کسی طرح کم وبیش دُور نہیں۔"

"In the closing paragraph you offer me three splendid gifts—your confidence, your support and your cooperation. You have asked for three priceless blessings, health, strength and guidance. If your gifts endure and your prayers are answered,

success

success in some measure or form cannot be far away.

یہہ نمونے حضور کی پاکیزہ بیانی کے ہیں جو ترجمہ میں پورے ادا ہونے مشکل ہیں جیسطرح عرقِ گلاب کو ایک قرابے سے دوسرے برتن میں ڈالنے سے دستور ہے کہ مقدار و خوشبو میں کمی آجاتی ہے۔ خاصکر جب کہ شیشے کے برتن سے مٹی کے برتن میں اُنڈیلیئے کہ خوشبو ہوا میں اُڑ جاتی ہے اور گلاب مٹی کے برتن میں جذب ہوجاتا ہے +

ایک جگہہ حضور نے یہہ خوب فرمایا کہ شہر کی ترمیم میں ہمیں خیال رکھنا چاہئے کہ پُرانے داغ مٹانے میں نئے دھبے نہ پیدا ہوجائیں۔

"In removing the old plague Dpots. we should care not to create new eye-sores." × × × × × × × × × × ×

یہہ صلاح حضور نے بہت اچھی دی کہ میونسپل کمیٹی کے حساب کتاب آمد و خرچ کی جانچ پڑتال سرکاری آڈیٹر اعلےٰ درجہ کے محاسب سے باضابطہ کرائی جائے ؛

یہہ میں نے اس اسپیچ کے متعلق اپنے حافظہ سے لکھا ہے کہ جس قدر جلسہ میں یاد رہا۔ اور دیر میں یہاں لکھنے کی وجہ یہہ ہے کہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کا صلائے عام ۳۰ اکتوبر کو نکل چکا تھا اور یہہ تقریب ۳۱ اکتوبر کو وقوع میں آئی +

حضور نے یہہ بالکل بجا فرمایا کہ :-

"Delhi has always been to me a word of power" x x x x x

واقعی دہلی کا اثر حضور پر شروع سے ہے - یہہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں ہے ؛ دُنیا میں بعض کام گو اتفاق سے بھی ہو جاتے ہیں - لیکن جو کام فکر و غور سے سامان و اسباب کے ساتھ ہوتا ہے زیادہ اعتبار کے لایق سمجھا جاتا ہے : جو شخص جس کام کا اہل ہو وہ اجنبی سے زیادہ اُس کام میں کمال دکھاتا ہے ⁂ ناواقف کی بہ نسبت واقفکار سے زیادہ امید ہوتی ہے کہ اس کام میں کوئی کسر نہ رہے گی ⁂

حضور کو دلّی اور دلّی کی تاریخ و تحقیق میں جو کمال حاصل ہے شاید ہی کسی دوسرے کو ہو - یہاں کی تہذیب و شائستگی سے بزرگان عالی کو خاص مُحبت ہے - یہاں کے علوم و فنون کی تحقیق و قدردانی میں جو محنت وسعی حضور نے فرمائی یہہ آپ ہی کا حصہ ہے ⁂ جس شہر سے حضور کو اس قدر مُحبت ہو ممکن نہیں کہ حضور اُس کی ہر طرح کی ترقی و بہبودی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت فرمائیں گے - دلّی اور دلّی کی قدردانی کا حق حضور کو حاصل ہے ⁂

ترجمہ اسپیچ عالیجناب صاحب چیف کمشنر دہلی بالقابہم

میں لیڈی طامسن صاحبہ اور اپنی طرف سے آپ کے خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ مجھے اپنے تئیں اُس پیمانے تک ثابت کرنا جو آپ نے میرے لئے از روئے حسنِ ظن خیال کیا ہے مشکل ہے۔ ایسی حالت میں میں یہی چاہوں گا کہ آپ بجائے آئندہ اُمیدوں کے اپنے حافظہ اور یاد سے میرا اندازہ کریں۔ آپ کا خیال کہ مجھے شہر کی بہبودی سے زیادہ دلچسپی ہے امر واقعی ہے لہٰذا ہمدردی کے خیال سے ہم دونوں ہم خیال ہیں اور آئندہ زمانہ ثابت کر دیگا کہ تعلق زیادہ مضبوط ہوتا جائے گا ۔

دلّی کا نام مجھپر اس قدر حاوی ہے کہ اگر کوئی خدمت شہر کی یا صوبہ دہلی کی مجھسے ہو سکی اُسے میں اپنے اُوپر اس قرض کی جزوی ادائیگی میں تصور کروں گا۔ مگر اندیشہ ہے کہ پھر بھی یہہ قرض پورا ادا نہ ہو سکے مجھے زمانۂ حال کی رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ کس قدر مستقل و پائیدار کام شہر کی بہبودی کے لئے ہوا ہے۔ اس کا ذکر آپ نے نہایت ایثار و اختصار سے کیا ۔ گزشتہ چھ سال میں خرچ اسپتال وغیرہ کا ۶۰ فیصدی زائد ہوگیا۔ خرچ صفائی سڑک و مکانات دو چند ہوگیا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ روشنی کے انتظام پر اور سہ چند تعلیم پر ۔ امسال پانچ نئے شفا خانے کھلے اور گزشتہ دو سال میں بہت زیادہ بجلی کی روشنی کا انتظام اور اُس کی ترقی تمام بلند کوچوں میں

اچھے پیمانے تک پہنچ گئی اور بچوں کی بلا خرچ اور لازمی تعلیم کا کافی بندوبست کیا گیا۔

اس ترقی کے اسباب ضرور قدرتی طور پر آپ کی پریشانی کا باعث ہو رہے ہیں۔ آپ کا خرچ بجائے ۱۶ لاکھ روپے کے ۱۹۲۵ء تک ۲۴ لاکھ ہو گیا اور آپ کی آمدنی جس میں پہلے ۱ لاکھ روپے کی بچت تھی اب اس رقم سے زیادہ کمی ہو گئی ہے۔ جلسوں کی رپورٹ اور کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے اس بارہ میں بہت بڑی دانائی کی کہ خرچ کے حسابات کے جانچ کرنے کے لئے ایک نائب کمیٹی مقرر کی۔ مگر آپ کو ابھی کمیٹی کی رپورٹ و نتیجہ کا انتظار ہے۔ اگر کمیٹی کی رپورٹ دیکھنے پر آپکا خیال ہو کہ کوئی باہر کا غیر متعلق ماہر فن اس کام کے لئے زیادہ ضروری ہے یا مفید ہوگا تو میں نہایت خوشی سے اس خدمت کے انجام دینے کے لئے ایک اچھے افسر کا انتظام کر دوں گا۔

آپ کا یہہ اعتراض کہ سرکار نے آپ کے حقوق زمینوں کے مغربی اضافے کی نسبت جو زیر تجویز ہے پورا خیال نہیں کیا۔ میں اس کا مشکور ہوں کہ آپ نے صاف دل سے یہہ معاملہ میرے سامنے پیش کیا اور میں بذات خود اس پر بہت جلد غور کروں گا۔ مجھے آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے کہ شہر کے رقبے کا اور زیادہ اضافہ ہونا چاہئے۔ البتہ خاص خاص معاملے میں میری رائے آپ کی رائے سے متفق نہیں غالباً اس کی وجہہ یہہ ہوگی کہ پورا مسالہ جس سے مجھے اچھی طرح سے ہر معاملہ میں پوری واقفیت ہو جائے اس وقت مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد اپنی رائے کا اظہار کر سکوں گا۔ یہہ قطعی درست ہے کہ شہر کے لئے رقبہ کے اضافے کی بہت سخت ضرورت ہے اور میں آپ کے ساتھ اس کام میں ضرور ساتھ

دوں گا۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ مرض کے پُرانے دھبے مٹانے کے لئے آنکھوں میں کہیں نئے زخم نہ پیدا ہونے پاویں۔

آپ نے اپنے شہر کی پانچ سالہ ترقی کے پروگرام کا حوالہ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر سال ان تجویزوں کی تکمیل کا انتظار کرنے میں انسانوں کی زندگی میں سنگین نقصان کا اندیشہ ہے اور تکمیل کے لئے زیادہ خرچ کی ضرورت ہے۔ مگر میں اس بارے میں پوری کوشش کروں گا کہ ہماری تجویزوں کے لئے روپیہ بہم پہونچ سکے: لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تاوقتیکہ شہر میں پورا انتظام پانی۔ صفائی اور شفاخانوں کا نہ ہو اُس وقت تک اہل شہر کی صحت پوری طرح درست نہ ہوسکے گی۔ لوگوں کو تعلیم کی طرف رجوع ہونا چاہئے اور اس وقت تک ہم صرف آغاز ہی پر ہیں۔ ہر مدرسہ کے لڑکے یا لڑکی کو صحت کا پیغامبر ہونا چاہئے کہ بچے اپنے بڑوں کو یہ سب باتیں سمجھائیں۔ کیونکہ ترقی کے لئے ضرور ہے کہ بچوں کے دلوں پر مغربی ملکوں کے ذرائع ووسائل ترقی نقش ہونے چاہئے۔ اس میں سرکاری اور سبھی کی کوششیں بہت ضرور ہیں تاکہ ہر بچہ اچھی طرح واقف ہو کر آگے کو کاربند رہے۔

آپ امراضِ مُتعدّی کے اسپتال کے بارہ میں جو حکم ہو چکے ہیں اس کی دوبارہ غور کی درخواست کرتے ہیں اُس فیصلہ کے وجوہ پر پھر تحقیق کرنے کا حکم دے رہا ہوں: مجھکو ابھی تک معلوم نہیں کہ دوبارہ تحقیق کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک خاص زچہ خانہ کے اسپتال کی تجویز ابھی پیش نہیں ہوئی ہے۔ مگر آپ کے اس مد میں مالی گنجایش کے بعد اس کی تجویز پیش ہوی تو میں اس تجویز پر نہایت ہمدردی سے غور کروں گا۔

اطفال کی بلا خرچ لازمی تعلیم پر آپ کی کوشش مبارکبادی کی مستحق ہے۔ اس میں آپ کو یہہ دعوےٰ ہے کہ اس مد میں سرکاری امداد آپ کو اُس قدر نہیں ملی جس قدر کہ آپ سے کہا گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہہ بحث اُس بنیاد کے متعلق ہے جو گرنٹ ان ایڈ کے قاعدہ سے علاقہ رکھتی ہے۔ مارچ گذشتہ میں صاحب چیف کمشنر کے احکام اس بارہ میں آپ کے پاس پہونچے اس کے بعد کوئی تحریر آپ کی طرف سے نہیں آئی: لیکن جب اس کا وقت آئیگا میں اس معاملہ پر بخوبی غور کروں گا۔ بلا خرچ کی تعلیم بڑے خرچ کی تجویز ہے اور اس کا بار اچھی طرح سمجھ کر مقامی اور مرکزی اخراجات پر ٹھے ہونا چاہئے۔

حال میں تعلیم نسواں کے متعلق جو ترقی ہوئی ہے اس پر آپ جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ اس میں بھی آپ زیادہ فیاضی کی امداد کے خواستگار ہیں: اس معاملہ میں بھی جب یہہ میرے سامنے پیش ہوگا میں آپ کی درخواست یاد رکھوں گا۔

میں نے دیکھا کہ کرنیل بیڈن صاحب نے دس برس ہوئے کہ محتاج خانہ کی تجویز کی تھی۔ اور اس کا امتحان بھی کیا گیا: مگر بہت کامیابی نہیں ہوئی۔ اغلب ہے کہ آپ اس کی ناکامی کے وجوہ پر غور کریں گے۔ اور غور کرنے کا جو نتیجہ ہو اُس سے آپ مجھے آگاہ کریں۔

میں جب سے دہلی آیا ہوں میں نے اس صوبہ کی توسیع کی خواہش بہت سُنی۔ بلکہ اسٹیچواریری کمیشن کو جو درخواستیں گئی ہیں ان میں سے کم سے کم ایک میں اس امر کا بھی ذکر ہے۔ اس کے متعلق آپ نے دو تکلیفوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور میں اپنے جواب میں انہیں دو کا ذکر کروں گا۔

دلّی میں کوی سرکاری کالج نہیں ہے جس میں مُعلّموں کی تربیت وتعلیم ہو۔ نہ انجنیری کی تعلیم کا ہے نہ لڑکوں کے لئے ڈاکٹری کالج ہے + ان تعلیموں کے لئے آپ کے صوبہ کے لڑکوں کو ہمسایہ صوبوں کے کالجوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔ یہ گو اس کے لئے آپ ہمسایہ صوبوں کے شکرگزار ہیں مگر اپنی چیز کی اور ہی بات ہے کہ ہمارے ہی صوبہ میں ایسی تعلیم ہو سکے تو کیا کہنا: اپنی چیز پھر اپنی ہے +

اس کے ساتھ آپ کو یہہ بھی رنج ہے کہ اس تعلیم کے ذرایع کے نہ ہونے سے ہمارے صوبہ کے نوجوان سرکاری ملازمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں +

یہہ دونوں مسئلے ایسے ہیں جن کی نسبت مَیں ابھی بطور فیصلہ رائے نہیں دی سکتا۔ جب تک کہ ان معاملوں کی پوری تحقیق نہ کر لوں۔ آپ کی ایڈریس کا مسودہ میری نظر سے ابھی حال میں گزرا ہے۔ مجھے اتنا وقت نہیں ملا کہ مَیں اس کے مُتعلق کاغذات اور اعداد و نقشے اچھی طرح دیکھ سکتا + مگر میں اس کے متعلق ضروری مسالہ اور کاغذات بہم پہونچا کر اور بہمہ وجوہ تحقیق کر کے رائے قایم کروں گا +

صاحبو۔ میں پھر آپ کا شکریہ اس بات کا ادا کرتا ہوں کہ اس نامور شہر کی ضرورتوں سے جسکے آپ نمایندے ہیں آپ نے مجھے بے کم و کاست مطلع کیا +

اس ایڈریس کے اخیر میں آپ مجھے تین شاندار تحفے پیش کرتے ہیں (۱) اپنا اعتماد (۲) اپنی امداد۔ اور (۳) شراکت موالات: آپ تین بے بہا نعمتیں مانگتے ہیں۔ (۱) صحت (۲) طاقت اور (۳) ہدایت + اگر آپ کے تحایف دیرپا ہوئے اور آپ کی دُعائیں مستجاب

ہوئیں تو کامیابی کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی شکل میں بہت دور نہیں +

صلائے عام

یہہ ترجمہ بہمہ وجوہ مکمّل نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ صاحب ممدوح کی فصاحت بہت لاجواب ہے جس کا ادا کرنا غیر زبان میں ناممکن اگر نہیں تو مشکل بہت ہے: خاصکر اُردو جیسی کم مایہ زبان میں کہ اس میں اعلےٰ خیالات کا اعلےٰ طرز پر ادا کرنے کا مسالہ مفقود ہے + ترجمہ میں صرف الفاظ کا مطلب کم و بیش سرسری طور پر ادا ہو سکا +

× × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × کیا کہوں آپ کا کمالِ سخن گوئی و سخن سنجی عرصہ درازسے ہر نوع کی تعریف سے مستغنی و بالاتر ہو چکا ہے ورنہ آپ کے چمن نظم و نثر کی توصیف سے اوائے فرض ہی کر لیتا۔ × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × ×

دلّی

کے قابلِ ذکر واقعات میں ھز اکزالٹیڈ ھائی نس عالیجناب والاخطاب نواب حیدر آباد (دکن) کا تشریف لانا ہے۔ یہہ تشریف آوری گو غیر سرکاری یعنی نج کے طور پہ محض پرائیوٹ ہے جس میں تزک و احتشام کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی: مگر کسی رئیس والیئے ملک کا دولت کدہ سے برامد ہونا پبلک کی نگاہ میں بڑے وقار سے دیکھا جاتا ہے +

ریاستِ حیدر آباد کے شاہی سند و فرمان میں دکن کا ملک ممالکِ محروسۂ ایران کے برابر لکھا ہے۔ اس ریاست کا فرمانروا اس لحاظ سے گویا شاہِ ایران کا ہم رتبہ سمجھا جائے تو تعجب نہیں +

اسلامی ریاستوں میں حیدر آباد (دکن) کا سب سے بڑا مرتبہ ہے اور خاندانی حسب نسب میں ہندو والیانِ ملک میں ریاست اودے پور (میواڑ) کا: ان دونوں والیان ملک کا دہلی میں قدم رنجہ فرمانا معمولی بات نہیں +

سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ میں روسا جو دہلی آنے کا ارادہ کرتے تھے چھ چھ مہینے شاہ جہاں آباد کے باہر قیام فرماتے تب کہیں شہر میں قلعۂ معلّٰے تک رسائی ہوتی تھی +

شہر میں شاہی سواریوں کے نکلنے کا تزک و احتشام غایت درجہ کا ہوتا تھا۔ جن کا ذکر

تاریخوں میں بطور یادگار درج ہے: سلاطینِ مُغلیہ کی سواریوں کے مُرقعے اب بھی لاجواب دیکھنے میں آتے ہیں + معمولی بات سواری کے ساتھ یہہ تھی کہ لاکھوں کی اگر نہیں تو ہزاروں روپیہ کی خیرات سواری کے ساتھ ہوتی جاتی تھی + فقرا و غُربا و مُحتاج سواری کے سہارے جیا کرتے تھے کہ جب سواری نکلے گی سب دلدّر دور ہو جائیں گے + اس کی تقلید اُمرا و روسا بھی اپنے ذمہ سمجھتے تھے کہ امیروں کی سواری سے غُربا و مساکین نہال ہو جاتے تھے +

اگلے زمانہ کے اُمراو رؤسا بلکہ عموماً پبلک میں سرکاری اور نج کے اُمور میں امتیاز کا دستور نہ تھا۔ خداوندانِ دولت و جاہ کی ہر حرکت قابلِ اعزاز و امتیاز سمجھی جاتی تھی + اس لحاظ سے سواری کا بہت انتظار رہتا تھا۔ امیروں کی سواری ایک بڑے معرکہ کا واقعہ سمجھا جاتا تھا + اورنگ زیب عالمگیر اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام + زیرِ قدمت ہزار جان است

راقم الحروف نے جناب نواب علاؤالدین خاں بہادر مرحوم باروی جنکو تاریخ و تحقیق میں یدِطولیٰ تھا سُنا کہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں جب سلطنت میں ضُعف آچلا تھا بادشاہ نے وزرا ء قدیم کو مشورہ کے لئے بُلایا۔ دکن سے عالی جناب معلّے القاب نواب نظام الملک بہادر کو یاد فرمایا کہ آپ سلطنت کے قدیم رُکنِ اعظم رہے ہیں اسوقت صلاح مشورہ میں آپ کے دہلی آنے کی بہت ضرورت ہے + اُس زمانہ میں دُور کے سفر بہت مُشکل تھے۔ نواب نظام الملک بہادر شاہی حکُم کے موافق بعد طے منازل دہلی پہونچے + یہاں پہونچکر شہر کے باہر لاہوری دروازے کیمپ منعقد ہوا۔ کیونکہ بلا اجازتِ شاہی شہر میں داخلہ منع تھا: ایک عرصہ کے بعد دربار

شاہی میں باریابی کی اجازت ملی ۔ اب آپ لاہوری دروازہ سے لال قلعہ کی مسافت خیال فرمالیں کہ دورویہ نظام الملک بہادر کے لشکر کے آدمی اور بادشاہی سرکاری عہدہ دار ملازم اور شہر کے تماشائی جو ذرا انگلی ہلانے پر بے گنتی جمع ہوجاتے ہیں ساتھ ہولئے۔ اس جم غفیر کا ذکر میں خاصکر ذرا تاکید سے کرتا ہوں کہ آپ یاد رکھیں نواب صاحب ممدوح کے ساتھ بے تحاشہ جمعیت تھی۔ اس کا نتیجہ آگے چل کر نکلے گا ۔

غرض آہستہ آہستہ نواب نظام الملک بہادر قلعہ کے دروازہ پر پہنچے اور شاہی آداب تسلیمات تین جگہ ادا کرکے دربار میں داخل ہوئے۔ دہلی میں چونکہ ایک عرصہ دراز کے بعد آنا ہوا تھا بادشاہ نے بہت اخلاق سے خیریت دریافت کی۔ دیر تک گفتگو رہی کہ یکبارگی نواب نظام الملک بہادر کی نظر اپنی کمر کے پیش قبض پر پڑگئی۔ دیکھا کہ پیش قبض کا جواہرات کا قبضہ ندارد اور نری لوہے کی چھری موجود ہے سو وقت نواب صاحب ممدوح کی حیرت کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ نواب نظام الملک بہادر کا سا امیر اور واقفکار مراسم دربار بے قبضہ کی چھری کمر میں لگائے آگیا ۔ سارا پیش قبض نکل پڑتا تو اتنا تعجب نہ ہوتا مگر دربار میں بغیر قبضہ کی قصاب کی سی چھری لگاکر آنا قیاس میں نہیں آتا۔ کچھ تو لاہوری دروازہ سے قلعہ تک بھیڑ کے ساتھ پیادہ آنا کہ صبح سے دوپہر تک مشکل سے پہونچنا ہوا تھا اس پر اتنے عرصہ میں پیش قبض کے قبضہ کا ندارد ہوجانا ۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ بے قبضہ کی چھری لگاکر کیمپ

سے چلتا ہوا ہو۔ نواب نظام الملک بہادر کے چہرہ سے نہایت حیرت ٹپکنے لگی۔ بادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا تو نواب نظام الملک بہادر نے ان سے پیش قبض سے قبضہ کے نکل جانے کا تعجب عرض کیا۔

بادشاہ نے کہا کہ تم ایک مدت کے بعد دہلی آئے ہو اس واقعہ کا بہت تعجب نہ کرو۔ اوسی وقت کوتوال کو حکم دیا گیا کہ شہر کے تمام راستہ بند کردئے جائیں۔ دروازوں سے تمام آمد ورفت موقوف کی جائے اور نہایت تاکید سے پیش قبض کے قبضہ کا پتہ لگایا جائے

اوسیوقت شہر کے دروازے بند ہوگئے اور ہر طرف کی آمد ورفت کی بندی ہوگئی۔ شہر میں چیخ پکار شروع ہوئی۔ نواب نظام الملک بہادر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میری وجہ سے شہروالونکو تکلیف ہوگئی۔ لوگ کہینگے کہ میرا آنا منحوس ہوا شہر میں روک ٹوک کے عوض میری طرف سے دس ہزار روپیہ کا انعام مشتہر فرمایا جائے کہ جو شخص پیش قبض کا وہ قبضہ لائے اوسکو عطا ہوگا۔

نواب نظام الملک بہادر ہنوز قلعہ سے چاندنی چوک میں کوتوالی کے پاس تک پہونچے ہی تھے کہ ایک شریف صورت نیچی چولی کا انگرکھا پہنے کا مدار ٹوپی اوڑھے ریشمی رومال میں وہی قبضہ لے کر حاضر ہوئے اور قبضہ پیش کرکے واپس جانے لگے تو نواب صاحب بہادر نے فرمایا کہ انعام تو لیتے جائیے۔ اس پر حضرت کیا کہتے ہیں کہ انعام کی ضرورت بالکل نہیں مجھے تو قبضہ حاضر کرنا تھا۔ نواب صاحب

ممدوح نے بہ اصرار فرمایا کہ خیمہ گاہ تک تو چلے چیئے۔ مجھے دو ایک باتیں پوچھنی ہیں۔ پیش قبض کا قبضہ لانے والے نے کہا خیر آپ کی خوشی۔ میں چلا چلونگا۔ انعام کے خیال سے نہیں محض تعمیل ارشاد ہے ؛

نواب صاحب بہادر انھیں اپنے خیمہ میں لے گئے اور دریافت کیا کہ یہ قبضہ تمہارے ہاتھ کس طرح آیا؟ جواب دیا یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ حضور جب لاہوری دروازہ سے نکلے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ بھیڑ بہت تھی کسی نے خیال نہ کیا کہ میں کون ہوں و کسلئے آیا ہوں؟ میرے ہاتھ میں چاندی کی چوبڑی تھی اور حضور کے چنور برداروں کا سا لباس تھا۔ ملازمان و ہمراہیانِ خاص کی طرح میری کمر بندھی ہوئی تھی اور میری کمر کے اندر لمبی سُلفے کی مٹی کی چلم تھی جس میں جلتے کوئلے تھے ؛ میں جیسا کہ چنور برداروں اور چوبداروں کا طریقہ ہے حتی الامکان حضور کے بہت پاس ہوتا گیا؛ اور چونکہ قریب تر ہونے سے مجھے مطلب نکالنا تھا میں اور بھی حضور کے پاس ہوتا گیا؛ ملازموں کی کثرت میں کسی نے خیال نہ کیا کہ میں اصلی چنوربردار ہوں یا مصنوعی ؛ میں نے جہانتک ہو سکا لمبی چلم کا رُخ حضور کے پیش قبض کی طرف رکھا۔ حضور کو لاہوری دروازہ سے لال قلعہ تک چار پانچ گھنٹے لگے۔ اس عرصہ میں قبضہ کو آہستہ آہستہ چلم کی گرمی پہونچتی رہی۔ مجھے تو کچھ جلدی نہ تھی۔ جتنی دیر لگی میرے کام کیلئے مفید ہوئی۔ جاڑے کے دِن تھے چلم کی حرارت حضور کو محسوس نہ ہوئی۔ لیکن چونکہ پیش قبض کا قبضہ چیڑی لاکھ سے جُڑا ہوا تھا۔ لاکھ پر چار پانچ گھنٹے کی حرارت سے دستہ کا ڈھیلا

ہونا ضرور تھا۔ قلعہ کے دروازہ سے جو شاہی آداب وتسلیم کے مراسم کی وجہ سے حضور جھکے میں نے قبضہ کھینچ لیا۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی۔ اب میں آداب عرض کرتا ہوں ؛

یہ کہہ کر حضرت چلنے لگے نواب صاحب بہادر نے پھر روک لیا کہ آخر اس سے آپ کی غرض کیا تھی ؟

جواب دیا کہ مجھ جیسے معمولی آدمی کی حضور تک باریابی کب ممکن تھی ؟ حضور ایک مدت دراز کے بعد دہلی تشریف لائے ہیں اور خدا جانے پھر کب دہلی کے نصیب جاگیں ؟ یہاں کی کوئی بات یادر کھنے کے قابل ضرور چاہیئے ؛

زر انعام لیتے نہ تھے مگر عالیجناب نواب نظام الملک بہادر نے المضاعف انعام دے کر ذاتِ شریف کو رخصت فرمایا ؛

جناب راحت و مولانا غنیمت

پہلے میں ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی وجہ بیان کر دوں ؛

فارسی کی مثنویوں میں غنیمت کی مثنوی لاجواب ہے۔ مثنوی کا نام فارسی میں **نیرنگ عشق** ہے۔ یہ مثنوی مولوی محمد اکرم قدس اللہ سرہ نے لکھی جنکا تخلص غنیمت تھا ؛ آپ پنجاب کے رہنے والے تھے مگر فارسی میں قدیم و جدید شعراء ایران سے بازی لے گئے۔ اس طرز پر شعر کہنے والوں میں جلال اسیر کی شہرت تھی کہ ؎

اسیر طرزِ اندازِ جلالم ؛ کہ خواندار شوق بیتے حسب حالم

برافگن پردہ از رُخ بے محابا

یکے کُن وعدۂ امروز و فردا

جناب لالہ بھگونت رائے صاحب نے جنکا تخلص راحت تھا نگارستان راحت کے نام سے غنیمت کی مثنوی کا جواب اردو میں ترجمہ کے طور پر لکھا ؛ شاعری میں غنیمت اور راحت دونوں صاحب کمال ہیں۔ وہ فارسی میں اور یہ اردو میں ؛

پیروکر

یہ ذکر میں اس غرض سے کرتا ہوں کہ زبان کے معاملہ میں کبھی ہندو مسلمانوں میں کسی طرح کا اعتراض سُننے میں نہیں آیا۔ حضرت محمد غوث گوالیاری نے "پدماوت" ہندی بھاشا میں لاجواب لکھ ڈالی اور اہلِ ہنود نے بےگنتی کتابیں نظم و نثر میں فارسی و اردو میں بہت اچھی اچھی لکھیں۔

لالہ سریرام صاحب ایم۔اے دہلوی اپنے تذکرہ ہزار داستان میں جناب راحت کی نسبت لکھتے ہیں کہ آپ نے زہرہ و بہرام نامی مثنوی اور مثنوی نل دمن اور مثنوی سوزِ عاشقانہ لکھی۔ مگر اتفاق سے مثنوی نگارستان راحت ترجمہ مثنوی "غنیمت" صاحب تذکرہ کی نظر سے نہیں گذری۔

غنیمت کی مثنوی کی داد تو ہر سخن فہم کی زبان پر ہے۔ لیکن نگارستانِ راحت شاید اسقدر مشہور نہیں۔ عدم شہرت کمال میں نقص کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

حمد میں غنیمت کا پہلا شعر ہے ؎

بنام شاہدِ نازک خیالاں ✤ عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

کیونکہ شاہد و عزیز کا قصہ ہے۔ راحت نے حمد کے پہلے مصرعہ میں دونوں کو جمع کردیا کہ

ع اے شاہدِ دل عزیزِ ہر جاں

مثنوی گلزارِ نسیم میں اگلے اساتذہ کی تعریف میں نسیم نے خوب کہا ہے ؎

آگے اونکے فروغ پانا ✤ سورج کو چراغ ہے دکھانا

لالہ بھگونت رائے راحت فرماتے ہیں ؎

گذرے ہیں قدیم کے جو شاعر کیا اُن سے کوئی کہے گا بہتر
پر کس کے ہے دِل میں ضبط اِتنا
خاموش مرے جو شمع آسا

بے موسم ابر و آب باری ٭ دریا بہتے ہیں روز جاری ٭ جو مست ہیں فیض نکتہ داں سے رُکتے نہیں وہ کبھی زباں سے ٭ قسمت کرتی ہے جتنی یاری ٭ کہتے ہیں وہ بہر یادگاری عالم میں جسے عزیز فن ہے ٭ دیوانۂ شاہدِ سخن ہے ٭ دیکھے جو بدیدۂ حقیقت وہ سمجھے یہ مثنوی غنیمت

جنابِ راحت کا سوگند نامہ

سوگند جمالِ شاہدِ غیب	سوگند کمالِ شاہدِ غیب	سوگند محبّتِ عزیزاں	سوگند صداقتِ عزیزاں
سوگند سوادِ شامِ گیسو	سوگند سوادِ خالِ ابرو	سوگند سوادِ دیدۂ حور	سوگند سوادِ سُرمۂ طور
سوگند سوادِ خطِ مشکیں	سوگند سوادِ نافۂ چیں	سوگند سوادِ چشمِ آہو	سوگند سوادِ چشمِ جادو
سوگند سوادِ کشورِ دل	سوگند سوادِ چاہِ بابل	سوگند سوادِ حرفِ قرآں	سوگند سوادِ آبِ حیواں
سوگند سوادِ لالۂ باغ	سوگند سوادِ دیدۂ زاغ	سوگند سوادِ چشمِ طاؤس	سوگند سوادِ باغِ فردوس
سوگند سوادِ چشمِ دلدار	سوگند سوادِ مردمِ یار	سوگند سوادِ شامِ ہجراں	سوگند سوادِ زلفِ خوباں
سوگند سیاہیٔ شبِ آہ	سوگند سپیدیٔ سحرگاہ	سوگند سوادِ دردِ آتش	سوگند فروغِ شمعِ سرکش
سوگند سوادِ ابرِ گریاں	سوگند شعاعِ برقِ خنداں	سوگند سوادِ داغِ مہتاب	سوگند خمارِ چشمِ پُرخواب
سوگند ضیائے روئے روشن	سوگند نسیمِ صحنِ گلشن	سوگند عذابِ بیقراری	سوگند ملالِ انتظاری

سوگند قضائے آسمانی سوگند بلائے ناگہانی
سوگند کمانِ ابروئے یار سوگند لب خندک خونخوار
سوگند نگاہ چشم اختر سوگند شعاع مہرِ انور
سوگند شعاع شعلۂ طور سوگند فروغ شمع کافور
سوگند خراش زخم بلبل سوگند بہار خندۂ گل
سوگند کرشمۂ حسیناں سوگند ادائے نازنیناں
سوگند بہار شیشۂ مل سوگند ترانہ ہائے قلقل
سوگند جفائے لعل شیریں سوگند بلائے حسنِ نمکیں
سوگند جفائے بخت دوری سوگند بلاکشِ صبوری

سوگند کباب شعلہ دیدہ سوگند بخاک خون طپیدہ
سوگند صفائے آب شمشیر سوگند کمال خاک اکسیر
سوگند تراش ناخنِ یار سوگند ہلال چرخ دوّار
سوگند طوافِ کعبۂ رو سوگند سجود طاقِ ابرو
سوگند سر شکستہ حالاں سوگند شکستِ زلف خوباں
سوگند جمال دلفریباں سوگند جنون ناشکیباں
سوگند جفائے بے نیازاں سوگند تپ جگر گدازاں
سوگند نوائے نالۂ دل سوگند صدائے حلق بسمل
سوگند اسیرِ دامِ گیسو سوگند شہیدِ تیغ ابرو

تحصیلِ علم و ہنر اور مولانا غنیمت کا مکتب کی طرف جانا

تحصیل ہنر ہے عین بہتر انساں کیلئے حسنِ زیور
مانند سرشک چشم تر سے گرتا ہے ہر اک کی نظر سے
جو نخل جہاں میں بے ثمر ہے رنج دل و خار ہر نظر ہے
جس گل میں نہ رنگ و بو ہے پیدا کانٹوں سے وہ خار ہے زیادہ
جس شیشے میں رنگ مے نہیں ہے شیشہ نہیں وہ دلِ حزیں ہے
شاہ نے کہا کہ اے دلارام ہے حسن سے گرچہ شہرۂ عام
چرچا کرے علم کا تو بہتر آئینۂ دل کو ہے یہ جوہر
رتبہ ہے جمال سے پری کا جوہر ہے کمال آدمی کا
بیتاب تھی اس کے مثل گل جیب خوبی سے ہوا بہارِ مکتب
سکتہ تھا سکوت میں زباں تھی بے لطف بہارِ بوستاں تھی

کم ہوتی ہے بے ہنر کی توقیر جوہر سے ہے آبروئے شمشیر
موجود نہیں ہے جس میں یہ شے آئینۂ زنگ خوردہ وہ ہے
جس کی تہ میں فیض کچھ نہیں ہے بے لطف ہے خالی آسیا ہے
جو جام شراب سے ہے خالی عالم میں ہے ظرف لاابالی
آراستہ عقل سے جو تھا وہ تجویز پدر سے خوش ہوا وہ
ہو صرف ہنر جو تھوڑی اوقات حاصل ہو کمال لطف کی بات
عاقل کو اسی کی جستجو ہے گوہر سے صدف کی آبرو ہے
خواہاں جو ہوا عزیز استاد شاہد نے کیا قبول فی الفور
دیکھا وہیں گل نے کارِ روزِ خندہ ہر طفل نے چھوڑ دی گلستاں
صورت سے ہوئے جو اُس کی حیراں مطلق نہ رہا خیالِ قرآں

گنجینہ کی طرح ہو کے ابتر
تھا سن جو اوسکا غارت ہوش
آنکھیں تھیں نہ بس فریب مردم
وہ لعبت ہند آفت ہوش
اس گل میں جو تھی بہار دانش
اک ذرہ غنیمت سخنداں
سودے سی میں ہوت آشنا ہوں
اخلاق ولی سی پیش آیا

سب روز بہ ہوا برابر
آموختہ بھی ہوا فراموش
استاد کی عقل ہوگئی گم
کچھ دم رہا مثل غنچہ خاموش
سرتا بہ قدم عیاں ہوا غش
گزرا کہیں جانب دبستاں
سیپارۂ دل کو بیچتا ہوں
ہاتھوں سی بصد ادب اٹھایا
بولا کچھ کم کہو اجی واہ

بیٹھا تھا جہاں وہ بیٹھا
بیگانہ تھا مقصد سبق سے
جسونت کہا اسنے خوش آواز
ملنے ہوا آشنا سخن سے
کچھ دن میں وہ شوخ ہو چالاک
نار کیا شوق دل سی اکیا۔
وہ یوسف مصر جاہ اخلاص
پوچھا کہو مول کیا یہ بولا
بولا کہ کبھی کبھی سرِ راہ

تھا کچھ نہ خیال مثل پیسوں کا
مطلق تھا آشنا ورق سے
نام حق کی زباں سے ہو آغاز
گلریز ہوا لب و دہن سے
چمکا چہرہ بہ نور ادراک
کاہی حسن فروش جاں خریدار
وہ کوچہ نورد راہ اخلاص
ہے ایک نگاہ مول اسکا

مولانا غنیمت کا یہ سین خود مولانا نے اپنی مثنوی میں لاجواب لکھا ہے کہ ایک دن جی جو گھبرایا تو کسی نے مکتب کی تعریف کی جہاں شاہد پڑھتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں بھی ایک **سیپارہ** لیکر پہونچا۔

برآمد بر درِ مکتب خروشم ٭ کہ من سیپارۂ دل می فروشم

بگوشِ شاہد آمد نالۂ من
بغل پروردہ تپ خانۂ من

مرا از مہربانی ہا درون خواند[۱] ٭ خرد از ہمرہی بیرونِ در ماند

(۱) یہ غضب کی بات کہی کہ ع خرد از ہمرہی بیرون در ماند۔ مولانا ایک مشت دو دو انگشت ریش مبارک لیکر جبّہ و عمامہ کے ساتھ لڑکوں میں پہونچے اور حرکتیں یہ کہ) ؎

ز سرپا کردہ رفتم یک قدم پیش ٭ بلاگردانِ لطفِ طالعِ خویش

اسوقت کی گفتگو سُننے کے لائق ہے ؎

بگفتا بیشتر آ پیش رفتم ٭ تکلف برطرف از خویش رفتم

(پیش رفتم کیا معنی از خویش رفتم: غایت نازک بیانی ہے)

ز دستِ من لبعد اعزاز بردہشت ٭ غلط گفتم بچندیں ناز برداشت

سیپارہ کا اعزاز تو مولانا پر فرض تھا۔ لڑکوں کو کیا غرض ہے: وہاں تو "بچندیں ناز برداشت" زیب دیتا ہے۔ اس کے بعد جو حال گذرا اوسکا نقشہ جس خوبی سے مولانا نے کھینچا ہے اسطرح نہ مانی سے کھنچ سکتا ہے نہ بہزاد سے ؎

بہ مہر اوّل غبارش را برافشاند ٭ پس انگہ سورۂ اخلاص برخواند

مہر کے لئے غبار کا جھاڑنا ضرور تھا کہ جزدان میں خاک واک کبھی کبھی پڑجاتی ہے پھر سورۂ اخلاص جو قُل ھُوَ اللہ کا نام ہے کتنا موزوں ہے۔ کہ بچوں کو سیپارہ میں یہی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرائی جاتیں ہیں ٭ اب سودا ہوتا ہے ؎

بگفتا قیمتش گفتم بگاہے ٭ بگفتا کمترک گفتم کہ گاہے

بگفتا یافتم زیں پیش مخمر دش

مبادا بشنود آخوند خاموش

یہ پچھلا مصرع غضب کا ہے کہ مولانا بس چپ رہیئے میں سمجھ گیا۔ اُستاد جی کہیں سُن لیں اسمیں شک نہیں کہ نازک خیالی و پاکیزہ بیانی میں جناب راحت مولانا غنیمت کی شاعری کو نہیں پہنچتے نہ لالہ صاحب کو اس کا دعوے ہے مگر آپ کی مثنوی

سوزِ عاشقانہ سے چند اشعار جو صاحب **خمخانۂ جاوید** سے نقل کئے وہ البتہ غنیمت کے کلام سے کسی طرح کم مرتبہ کے نہیں۔ جناب راحت فدا سے ایسا دِل مانگتے ہیں جو ع

لاکھ زخمی ہو خنجرِ غم سے ؁ سینکڑوں کوس دُور بھاگے مرہم سے ؁ سینچے ہر دم لہو سے خاروں کو خار دیتا رہے ہزاروں کو ؁ ایسا دِل دے جو ع

قبلۂ رُخ کے رو برو برسوں ؁ چشم ترسے کرے وضو برسوں
چشم سے اسقدر ہو خوں افشاں ؁ رشکِ گلزار ہو تنِ عُریاں
شمع ساں ہو فدائے بیداری ؁ اشک سوتے میں بھی رہیں جاری

(کلامِ جناب لسان العصر اکبر آبادی)

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دور
کیونکر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک عرض کروں گا دبی زبان
گو خوشنما بہت ہے مگر بے اصول ہے

ترکیب تو دیکھو زمانہ کے چلن کی
افسوس کہ اس سے کوئی واقف بھی نہیں ہے
گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود
مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے
دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے
جب خود نہیں رہنے کے کسی اصل پہ قائم
کیا خاک وہ قائم کوئی بنیاد کریں گے
بارک کوئی کر دے گی عطا اُن کو گورنمنٹ
یہ کالونی اپنی کوئی آباد کریں گے

مرے اجداد بھی ڈرتے تھے اکبر میں بھی ڈرتا ہوں
مگر ان کو گناہوں سے تھا ڈر اور مجھ کو مرنے کا
نشاں اللہ کا اس راہ میں دیتا نہیں واعظ ؁
بجائے ہمتِ مسلم جو رُکتی ہے اُبھرنے سے
سعادت کا جو طالب ہے کھلا رکھ چشمِ عبرت کو

اثر دکھلائے گا یہ نقشِ ہستی آہ بھرنے سے
سرائے دہر کو جس نے محلِ خوف سمجھا ہے
دے کیا لطف آئے گا یہاں دل کو ٹھہرنے سے
خدا کے نام میں لذت نہ پائی اہلِ غفلت نے
تعجب اس میں کیا دل مرگیا دُنیا پہ مرنے سے
خدا کے خوف کو کچھ تو جگہ دے دل میں اے اکبر
بتوں کی کافری بڑھتی ہے تیری واہ کرنے سے

جس بات میں تم شکست ملت سمجھو
اوس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو
جو بندۂ نفس ہو مخالف اس کا
قومی غیرت کی اوس میں عزت سمجھو

کچھ منع نہیں ہر ایک کی تحریر پڑھو
لیکن قرآں کی بھی تفسیر پڑھو
عظمتِ دنیا کی جب دبائے دل کو
خالق کا کرو خیال تکبیر پڑھو

دُنیائے دنی کی یہ ہوس جانے دو
گلچیں ہو اگر خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ
اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

بندوں نے بھلا دیا ہے وہ عہدِ الست
نافہمی و حرص میں ہیں اکثر بدمست
کیا زید بکر پہ معترض ہوتا ہے
اک گور پرست ہے تو اک زر پرست

بے سود ہے یہ شکوۂ دلفاظی و سیر
افسوس ہے مخلصوں کو اور ہنستے ہیں غیر
چلیئے امجد سے رب یشرکہہ کر
ہوسکتی ہے تب اُمید تمت بالخیر

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا
مکتب میں سر سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر
لیکن اک عالم خموشی پایا

(از اشرف التقویم)

ادب کے ہاتھوں اُقلیدس کی دُرگت

خلیفہ مہتدی و معتمد عباسی وغیرہ کے خلافت میں ایک منشی بے بدل و دبیر بے نظیر احمد بن محمد بن ثوابہ گذرا ہے۔ جو ایسا عطارد تحریر جادو تقریر تھا کہ اس زمانے کے سارے ادیب اس کی عربی دانی لفاظی و لسانی کا لوہا مانتے تھے۔ یہ وزارت مآب کا کاتب تھا۔ کاتب سے ناظرین بنگال کا کرانی اور ہندوستان کا محرر یا منصدی نہ سمجھ لیں۔ کاتب کی شان اس زمانہ میں وہی تھی جو میرزا رفیع سودا نے بیان فرمائی ہے یعنی

کاتب سرنوشت کا اس کو
ہے بجا گر کہیں کہ نائب ہے

کاتب ہی اس زمانہ میں خلیفہ یا وزیر کی طرف سے سارے مقدمات کے فیصلے لکھا کرتا تھا اور موثر اور چنے ہوئے لفظوں میں تمام احکام سلطانی صادر کیا کرتا تھا۔ یہانتک کہ مہر خلافت بھی اسی کی تحویل میں رہا کرتی تھی۔ خود ہی احکام لکھتا تھا۔ خود ہی بعد پسندیدگی ان پر مہر ثبت کر دیتا تھا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا احمد بن محمد بن ثوابہ کے زور قلم کا اس قصہ سے جو ہم لکھنا چاہتے ہیں ناظرین خود ہی اندازہ کریں گے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مشہور فلسفی ابوحیان اپنی کتاب الوزیرین میں ایک اور فلسفی احمد بن طیب کی زبانی جو خلیفہ معتضد باللہ کے مصاحبین خاص میں سے تھا احمد بن محمد بن ثوابہ کی نسبت ایک عجیب و غریب روایت بیان کرتا ہے۔ احمد بن طیب کہتا ہے۔

ایک روز ابن ثوابہ کے ایک ہوا خواہ اور عقیدتمند نے اپنی خیرخواہی کا یوں اظہار کیا۔ "ادب فصاحت کا تو خدا نے اپنی عنایت بے نہایت سے آپ کو مالک بنا رکھا ہے" ایسا نہ کیجے کہ برہان قیاسی اور اشکال ہندسی کا علم بھی جس سے ساری چیزوں کے بھید اور گُر دریافت ہوتے ہیں قبضہ میں آجائے یعنی لگے ہاتھوں اقلیدس پڑھ لیجئے تو علم و فضل میں

چار چاند لگ جائیں۔ ابن ثوابہ نے پوچھا اقلیدس کون شخص تھا اللہ کیا جھک مارا کرتا تھا؟ ابو عبیدہ نے کہا شخص جسے روم کا ایک بڑا عالم تھا۔ ایک کتاب میں بہت سی شکلیں ایسی بنا یا گیا ہے کہ نہ صرف دکھائی دینے والی بلکہ بہت سی آنکھ سے اوجھل چیزوں کے حالات بھی ان سے معلوم ہوتے ہیں۔ (ابن ثوابہ) یہ کیونکر؟ (ابو عبیدہ) دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جب تک ان شکلوں کو آنکھ سے نہ دیکھ لیجے سمجھ میں نہ آئیگا۔ (ابن ثوابہ) خیر تیری مرضی۔ جو جی میں آئے وہ کر۔ ابو عبیدہ یہ سنتے ہی دوڑا گیا اور قویری نام ایک شخص کو پکڑ لایا اور اسے ابن ثوابہ کے سامنے کھڑا کر کے خود چنپت ہوا پھر کبھی صورت نہ دکھائی۔ ابن اس کتب نشینی کی کیفیت ابن ثوابہ احمد بن طیب کو اس کے استفسار پر یوں تحریر کرتا ہے" خدا کی مار ہو ابو عبیدہ پر اور اس کی مکاری و دغا بازی پر جس بدبخت نے میرے دین کو لولا لنگڑا بنانے اور مجھے ایمان سے بے بہرہ کرنے کو اچانک ایسی آفت میں پھنسا دیا جس کا مجھے کبھی شان و گمان بھی نہ تھا کہنے لگا اجازت ہو تو ایک ایسے گنی کو حاضر خدمت کردوں جو شریف و مفید علم سکھا کر حضور کے فضائل کو کامل بنا دے میری جو شامت آئی لالچ میں پڑ گیا کہ شاید خدا کی یہی مرضی ہو کہ اس ذریعہ سے کسی صنعت میں مہارت حاصل ہو جائے' کمال انسانیت باہم چشموں میں مفاخرت کا موقع ہاتھ آجائے بہت سی دگدا کے بعد منظور کر لیا کہ اچھا جا بلا لا بد نصیب ایک دیر کے رہنے والے' بیل کے سے پھٹے دیدے والے جھبڑ بوڑھے کو ساتھ لے آیا جس کی کمر پٹکے سے بندھی تھی اور جسم چیتھڑوں میں لپٹا تھا۔ میں نے جو دیکھا کہ اب شیطان دبوچا ہی چاہتا ہے تو بے اختیار آعوذ باللہ زبان سے نکل گئی مجلس اس وقت ہر طبقے کے شریفوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ سب بوڑھے کو گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ گویا مجھے اشارہ تھا کہ اس کا احترام و اکرام کروں اور پہلو سے قرب میں جگہ دوں۔ اس کے بعد سب نے اسے سرو قد تعظیم دی اور مرحبا کہا واللہ محیط بالکافرین۔ (اور خدا سارے کافروں کو گھیرنے والا ہے) غرضکہ بوڑھا آدمی اپنی جگہ بیٹھا اور باچھیں پھرانے گھمانے لگا۔ مجھے اس کے چہرے پر تو صاف نفاق کے آثار اور اس کے لفظوں میں شقاق کے انبار نظر آئے مگر احباب کی خاطر خوش اخلاقی کے لہجے میں کہا" میں نے سنا ہے کہ آپ کو ہندسہ

یا ایک ایسا علم آتا ہے جو انسان کو کمال پر پہنچا دیتا
ہو جو بوجھکڑ بنا دیتا اور ہر صناعت میں بڑھا چڑھا دیتا
ہے۔ آپ نے نا، ہمیں بھی اس کا کچھہ کرشمہ دکھا دیجئے
شاید کہ دین و دنیا میں کارآمد ہو، مروت و انسانیت
میں اضافہ کرے، ہم جنسوں میں مایہ ناز ثابت ہو،
یا زہد و عبادت میں سود مند ہو کہ یہی سب سے بڑی
فلاح و نجاح ہے۔ فمن زحزح عن النار
وادخل الجنۃ فقد فاز (جو آتش دوزخ سے جدا
اور جنت میں داخل ہوا وہ یقیناً کامیاب ہوا)
اور خدا کے نزدیک یہ کوئی بات نہیں۔ بوڑھا سب
سن سنا کے بولا تو کیا بولا کہ قلم دوات منگا دیجئے
تھہر درویش بجان درویش۔ میں نے منگا دیئے
اس نے گنوار کی لٹھ کی طرح قلم ہاتھ میں پکڑ ایک
ہولا ٹھونسا یا ٹھونگا دیا اور ایک نقطہ بنایا جس پر
میری نظر کو خیال اور میری آنکھ کو وہم ہوا کہ ذرے
سے بھی چھوٹا ہے۔ اس نے پہلے تو اس پر بد بد
کچھہ منتر دم کئے اور اپنے جھوٹ کے طوماروں
میں سے کچھہ پڑھا۔ اس کے بعد کھلم کھلا اپنے کذب
و افترا کا اظہار کرنے اور میری طرف منہ پھیر کر یوں
کہنے لگا ”اے شخص یہ نقطہ وہ چیز ہے جو جز نہیں رکھتا“
میں بے اختیار بول اٹھا ”جھوٹے پر خدا کی مار!

قسم ہے رب کعبہ کی تو نے مجھے ضرور گمراہ کیا۔ اے
کور سواد وہ کون سی شے ہے جو جز نہیں رکھتی؟“
کہنے لگا جیسے بسیط۔ میں مبہوت ہکا بکا رہ گیا اور
پروردگار عالم ہدایت نہ کرتا تو وہ میری سمجھہ بوجھہ
چھین ہی چکا تھا۔ کیونکہ اس نے وہ لغت جھاڑنے
شروع کئے جو میں نے عمر بھر کبھی عرب سے سنے
تھے نہ عجم سے۔ حالانکہ لغات عرب ہمیں ایسا حاوی
ہوں اور ان کی نہایت عرقریزی و جانفشانی کے
ساتھہ ایسی چھان بین کی ہے کہ کسی کو اس میں
اپنے سے آگے بڑھا ہوا نہیں پاتا۔ خیر میں نے
پوچھا ”اور وہ بسیط کیا بلا ہے؟“ کہنے لگا جیسے
اللہ اور نفس۔ میں بے ساختہ بولا ”تو بے شک
ملحدوں میں سے ہے۔ کمبخت خدا کی مثالیں تراشتا
ہے حالانکہ خدا خود فرماتا ہے۔ فلا تضربوا للہ الامثال
ان اللہ یعلم وانتم لا تعلمون (خدا کی مثالیں مت دو
بے شک خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) خدا تجھے
اس راہبر سے جو تجھے میرے پاس لایا اور اس رہنما
سے جس نے تجھے میرا پتہ بتایا یقیناً شومی بخت
کے سوا کسی نے تجھے اس طرف نہیں کھینچا۔ میں خدا
کو گواہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں سے اور تمہارے الحاد
سے بری الذمہ ہوں۔ قسم ہے اُس پروردگار کی

جو امیرالمومنین کا سرپرست ہے کہ میں تمہارے شرک سے بالکل بری ہوں۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اس نے جب میرے یہ لفظ سنے تو لاحول پر بہت بگڑا اور جھنجلا کر اس طرح میری طرف مڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنا پرایا خون پانی ایک کرنے پر تلا ہوا ہے۔ طیش میں بولا "میں کہتا ہوں کہ تیری زبان کی تیزی ہی نے تیری سمجھ کو کھٹل کر رکھا ہے اور تیرے لفظوں کی رسی ہی بجائے ہی تیری عقل کا وبال بن گئے ہیں"۔ خدا کی قسم اگر مجھے حضار مجلس کا پاس نہ ہوتا جو اس کے جھوٹوں کو سچ سمجھ کر اس کی خرافات کو کان لگا کر سن رہے کذب افترا پر سر دھن رہے اور اس کی گنگ پر آستینیں چڑھا رہے تھے تو جھوڑ رے کمینے کی گدی سے زبان نکلوا لیتا اور غضب و لعنت الٰہی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھلکوا دیتا۔ حاضرین کے چہروں پر غصہ کے آثار دیکھ کر میں نے کہا۔ کیا آپ لوگ ایماندار ہو کر ایک ایسے نصرانی کی وجہ سے خفا ہیں جو خدائے لم یلد و لم یولد کا شریک پیدا کر رہا اس کے عدیل و نظیر تراش رہا اور کھلم کھلا کفر بک رہا ہے۔ اگر آپ صاحبوں کا خیال نہ ہوتا تو ابھی اسے مزہ چکھا دیتا اس پر ایک حضرت بولے" دیکھیے وہ بیچارہ ایک مرد حکیم ہے علم کی بات کہتا ہے"۔ یہ سن کر میں اور جھلایا اور کہا "لعنت خدا کی اس حکمت پر جو کفر میں لتھڑی ہو" دوسرے صاحب بولے میں ایک مرد مسلمان سے واقف ہوں جو اس علم میں سرآمد روزگار ہے مجھے امید ہے کہ اس سے آپ کی ملاقات اسلام کے حق میں مفید ہو۔ میں نے خوش ہو کر کہا ان سے ضرور ملائیے۔ سننا تھا کہ جھٹ جا حضرت ایک ٹھگنے، گیہواں رنگ، گلگدے گال، چندی آنکھیں چوڑی چپٹی ناک، گنجی ٹانٹ والے بد قوارہ بد لباس کو ساتھ لے آئے۔ اس نے آتے ہی سلام پھینک مارا میں نے بھی پتھر رکھ کر جواب دیا اور نام پوچھا کہنے لگا نام نہیں کنیت سے مشہور ہوں۔ میں نے کہا وہی فرمائیے کہنے لگا بندہ کو ابو یحییٰ کہتے ہیں مجھے فوراً ملک الموت کا خیال آیا۔ روح قبض ہو گئی۔ ہاتھ اٹھا خدا کے آگے گڑگڑانے لگا" اے بندہ نواز مہندسہ کی آفت سے تو ہی بچانیوالا ہے۔ تو ہی اس بلا کو ٹالنے والا ہے تیرے سوا برائی کا منہ پھیرنے والا کوئی نہیں" اب بھی جی نہ ٹھہرا تو الحمد، معوذتین اور قل ہو اللہ کئی بار پڑھ ڈالیں۔ اب ذرا جان میں جان آئی تو میں نے اس سے کہا اس سے پہلے میرے ایک عنایت فرما ایک نصرانی کو میرے پاس لائے تھے جو میرے بہکانے کو

خدا کے عدیل وتظیر بال بچے بتاتا تھا۔ غیر الحمد للہ آپ تو مرد مسلمان ہیں اپنے ہندسہ اور حکمت سے کوئی ایسی بات بتایئے کہ خدا کی رحمت اور نجات کا باعث ہو کیونکہ یہی سب سے نفع کی تجارت اور سب سے کارآمد پونجی ہے۔ کہنے لگا قلم دوات منگائیے میرا ماتھا ٹھنکا کہ الٰہی خیر! پھر دی قلم دوات! انہیں ہتھیاروں کا مارا تو اب تک سسک رہا ہوں۔ ابھی تک زخم جگر آلے ہیں۔ کہنے لگا یہ کیونکر؟ میں نے کہا نصرانی سوئی کے ناکے سے باریک نقطہ بنا کر کہتا تھا کہ یہ ویسا ہی امر معقول ہے جیسی ذات خداوندی آپ ہی کہئے فرعون کے کفر میں اور اس میں بال برابر بھی فرق نظر آتا ہے۔ وہ بولا میں آپ کو نقطہ کی دقت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ خدا لعنت کرے تو ری پر جانگلو چھوٹتے ہی نقطے دوڑا بھلا نقطہ کا یہاں کیا کام تھا۔ آپ ابھی اس مرتبے پر ہی نہیں پہنچے ہیں کہ نقطہ کو سمجھ سکیں۔ مثال مشہور ہے "کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم"۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جی میں کہتا تھا یک نشد دو شد۔ اس گیدی خر نے تو نصرانی پر بھی حاشیہ چڑھا دیا۔ مرا کو دن ہی ٹھہرا دیا۔ خلافت کے سیاہ و سفید کی باگیں جسکے ہاتھ میں ہیں اور سارے رموز و اسرار سلطنت جسکے سینے میں ہیں اُسے یہ گاؤدی ایک کالے دھبہ کی باریکی کے ادراک سے عاجز بتاتا ہے۔ جی میں تو یہ گزرہی آتا تھا کہ چند تھے کو وہ سبق پڑھادوں کہ یاد رہے تک نقطہ تو کیا ہاتھی بھی نہ سوجھے مگر حلم کہتا تھا کس گنوار کی بات پر جاتا ہے اپنی طرف دیکھ۔ میں آج زناب ہی میں تھا کہ اس نے اپنے ساتھ کے چھوکرے سے کہا۔ "جانور سے تختہ تو لے آ" لڑکا وہ پر کالہ آفت نکلا پلک مارتے شئے مطلوبہ لا حاضر کر دی۔ جس کی صورت تو نہایت مکروہ تھی مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہے۔ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے نظر کو اتار چڑھاؤ دیتا خیال کے گھوڑے دوڑاتا سر نیچا کئے دھیان میں مگن چندیا کھجا رہا کہ آخر معلوم تو ہو یہ ہے کیا۔ صندوق؟ مگر دیکھتا ہوں تو صندوق بھی نہیں۔ تختہ ہے؟ جی نہیں وہ بھی نہیں۔ آخر ذہن لڑ گیا کہ تابوت ہے اور بے اختیار بول اٹھا کہ لحد کی لکھیے جس کے ذریعے سے لوگوں کو لحد میں پھنساتا ہے۔ میں ہنوز یہ پہیلی بوجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے آستین سے ایک بڑی موٹی سی سلائی نکالی مجھے شک گذرا کہ یہ کمبخت کوئی ختنہ کرنے والا ہے اور وہ بھی پرلے سرے کا گھاٹر۔ پوچھا کیوں جناب یہ کیا ہتیار ہے آپ کی ترجیحات سے انوکھی ہے۔ نا نیوں جراحوں

کی سلائیاں تو ہزاروں دیکھیں مگر یہ کچھ اور ہی چیز ہے
شاید آنکھیں پھوڑنے کے کام میں آتی ہو کہنے لگا
میں نائی نہ جراح ہندسہ کا شیدائی ہوں اشکال
ہندسی اس سے تختہ پر کھینچتا ہوں۔ میں نے کہا تم
مذہب کے حسابوں تو نصرانی سے مختلف ہو مگر کفر میں
اس کے بیچا نہیں تو پیچھے ضرور ہو۔ کیا یہ لکیریں اس
لئے کھینچتے ہو کہ صبح کی سفیدی کو شام کی سیاہی سے
جا ملاؤ اور لوح محفوظ اور کرام الکاتبین سے میرا منہ
پھر اگر روسیاہ بناؤ۔ مجھے بہکاتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو
میں تمہارے جھانسوں میں آکر ڈگمگا جاؤں گا؟
کہنے لگا مجھے سر دست نہ لوح محفوظ سے سروکار نہ
لوح ضائع سے نہ کرام الکاتبین سے غرض نہ
لیام الکاتبین سے چند اشکال ہندسی کھینچکر ازروئے
قیاس وحکمت بدلائل و براہین ثابت کرنا چاہتا ہوں
میں نے اوپری دل سے کہا اچھا کھینچو۔ کہنے کو تو کہدیا
مگر جب تک وہ کھینچتا رہا دل دھڑکتا رہا۔ وہ ایک لکیر
کھینچکر کہنے لگا دیکھو یہ ایک لمبائی ہے بغیر چوڑائی کے
مجھے فوراً صراط مستقیم کا خیال آگیا اور کہا خدا غارت
کرے کمبخت کچھ سمجھتا بھی ہے کہ کیا بک رہا ہے۔
خدا کی سیدھی راہ لکیریں کاڑھنے شالیں گھڑانے
آڑا ترچھا کرنے اور گمراہی میں ڈالنے سے کہیں بالاتر

ہے۔ خدا کی قسم وہ سیف برندہ سے زیادہ تیز بال
سے زیادہ باریک اور تم جن چیزوں کی مساحت کرتے
ہو ان سب سے زیادہ لمبی ہے۔ اس کا سرا بہت
دور اور اس کا ڈر بہت بڑا ہے۔ کیا تجھے امید ہے
کہ تیرے بہکانے میں آکر میں صراط مستقیم سے ہٹ
جاؤں گا؟ کیا تو نے مجھے کوئی گونگا بہرا مقرر کیا ہے
کہ تیری بات کی تہ کو نہ پہنچکر آمنا صدقنا کروں گا مگر
میں خوب سمجھتا ہوں کہ تو نے یہ لکیر صرف اس غرض
سے کھینچی اور اس کو بے چوڑائی کی لمبائی محض اسلئے
بتایا کہ صراط مستقیم سے میرا قدم ڈگمگا جائے اور جہنم
میں جا پڑوں۔ میں تمہارے ہندسے سے بھی اور
اس چیز سے بھی جس کی طرف وہ لیجاتا ہے خدا کی
پناہ مانگتا ہوں۔ خدا ہندسے سے اور نیز اس سے
جو تم زبان سے کہتے ہو یا دل میں رکھتے ہو اپنی حفاظ
امان میں رکھے۔ یقیناً تیرے دل نے تجھے بہت
بری سجھائی کہ دوزخ کی راہ دکھائی۔ وہاں بیڑیاں
ہتکڑیاں اور سانپ بچھو تیرا انتظار کر رہے ہیں۔
بے شرم اب بھی نہ چپ ہوا۔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا تو
میں نے لوگوں سے کہا خدا کے واسطے اس کا
منہ بند کرو۔ کہیں وہی اول فول نہ بک بیٹھے۔
جو پہلا گمراہ بکتا تھا۔ لوگوں نے اس طرح گلا دبایا

بد معا اس آگ میں جلا گیا جس کی نسبت کہا گیا
' وقودہا الناس والحجارۃ علیہا ملائکۃ غلاظ شداد
ن اللہ ما امرہم ویفعلون ما یومرون ۔"
کے بعد میں نے عہد نامہ لکھا اور ایسی قسم
اتھ جس کا کفارہ نہیں۔ خدا سے سچا اور پکا
کیا کہ ابدالآباد تک نہ ہندسہ کی کبھی
ت دیکھوں گا نہ نام لونگا۔ نہ بھول سے نہ
بوجھکر۔ کھلے بندوں نہ چوری چھپے۔ اور
پود کو بھی تاکید کی کہ مرتے دم تک نہ ہندسہ کا
بان پر آنے دیں نہ اس کا خیال دل میں۔

یہ ہے بیان اس بڑی آزمائش کا جس میں نجتی
نے مجھے ڈالا تھا اور جس کا حال تم نے دریافت کیا
ہے۔ والسلام خیر ختام۔

فدا علی خاں ایم اے (علیگ)
ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ
(از رسالہ معارف)
(ڈھاکہ)

صلائے عام ۔ جہاں اقلیدس و ریاضی کی یہ ذلت ہو وہاں سائنس اور
ل (خلاف منقول) کی قدر معلوم یہ مضمون سچا یا جھوٹا ہو واقعی ہو یا مصنوعی علمائے قدیم کی رائے
دہ نہ ہے۔ جو حضرات علم فضل کو عقلی اور سائنٹی **فک** علوم و فنون کی نسبت تھی۔ جب
دین کو جس چیز کی قدر نہ ہو وہاں کے عوام **سائنس** کو کیا جانیں؟ اس بطرح عقائد صوفیہ
اج وزور کہ "ہمہ اوست و ہمہ از وست" کے جھگڑے میں مبتلا چلے آئے
جن دیدی عالم ناسوت و ملکوت و فنائی الرخلد کے سامنے مجال ہے کہ **سائنس**
ار سکے۔

خطاب بہ پیری

ع۔ چُناہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

بہت کوشش کرتا ہوں کہ اب جبکہ گوشہ نشینی اختیار کرچکا ہوں بک جھک سے باز رہو مگر کیا کروں حُسنِ کلام اور حسنِ صورت اب بھی اکثر دولتِ القاے شعر گوئی پر مجبور کردیتا ہے۔ قبلہ خان بہادر میر ناصر علی کا مضمون ع پیر یکہ دم زعشق زند بس غنیمت است۔ پریشانیٔ خاطر کا باعث ہوا۔ جمع خاطر کے لئے پیری سے مخاطب ہوکر چند اشعار کہے۔ شاید صلائے عام کے پڑھنے والوں کے پیری کی عظمت کا سکہ بٹھا سکیں۔

(دیوانہ)

(۱)

آئینۂ حقیقتِ ہستی تجھے کہوں
خورشیدِ کمال پرستی تجھے کہوں

وارستۂ بلندی و پستی تجھے کہوں
آگاہِ ہوشیاری و مستی تجھے کہوں

کیا کیا کہوں بتا تو اے پیری مجھے شتاب
بے کل ہوں حسنِ یار کی میں مدحتِ شباب

(۲)

تو وہ ہے جس سے زیست کا رتبہ بلند ہے
پہلو میں تیرے کیا ہی دلِ دردمند ہے

تو وہ ہے جس سے آئینہ سود و گزند ہے
لب پر ہمیشہ کیا ہی دل افروز پند ہے

تجھکو نہال زیست کا پختہ ثمر کہوں
شام فراق یار کی تجھکو سحر کہوں

(۳)

دیتی ہے ہر دو صورت و سیرت کی داد تو
اوروں کے غم سے خستہ خوشی سے ہے شاد تو

ہر امر رب پہ صدق سے کرتی ہے صاد تو
تو ہے بلند حوصلہ عالی نژاد تو

تو ہے جو دور سے ہن سے بری اور ہوس سے پاک
تو ناگزیر ہے پس حشر امید و باک

از پروفیسر موہن سنگھ ایم اے
اورنٹیل کالج۔ لاہور

صلائی عام۔ میں بہت خوش ہوں کہ صلائے عام کے مضمون اصحاب کمال کی طبع آزمائی کا باعث ہوتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کے پرچہ میں اس عنوان سے کہ ع۔ پیری کہ دم زعشق زند بس غنیمت است جو مضمون نثر میں لکھا گیا وہ اس نظم کا محرک ہوا جو پیری کو مخاطب کر کے جناب پروفیسر موہن سنگھ ایم اے نے اورینٹل کالج لاہور سے صلائے علام کے لئے عنایت فرمائی۔ صلائے عام کے اس مضمون سے صرف یہ غرض تھی کہ جو چیز عیب سمجھی جاتے اُس کے ہنر دکھانے فصاحت میں داخل ہیں۔ میں خوش ہوں کہ یہ کام جناب پروفیسر صاحب نے مجھسے زیادہ فصاحت سے ادا کیا۔ خاصکر یہ مصرعہ کہ

ع شام فراق یار کی تجھہ کو سحر کہوں

اس سے بہتر کیا اس طرح کہنا مشکل ہے۔ اس کو کلام اساتذہ میں ملا کر رکھدیجئے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شعرائے پنجاب کی زبان ہے کہ ع تو ناگزیر ہے پس حشر امید و باک

یہاں میں خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد رئیس عظیم آبادی کی مثنوی چشمۂ کوثر سے اُس نظم کے چند شعر نقل کرنا چاہتا ہوں جو حضرت شاد نے "فقدان جوانی و شباب" کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔

فقدان جوانی و شباب

بد نظر آتا ہے انجام اپنا ؛ کچھ تو کر آہ سحر کام اپنا
وقت باقی نہیں شب ہے آخر ؛ نالہ اس وقت کا ہے پُر تاثیر
اب ستارے بھی فلک پر کم ہیں ؛ دو غنیمت ہیں جو باقی دم ہیں
سُن چکے کان گجر کی آواز ؛ آتی ہے مرغ سحر کی آواز
جب ہوئی شمع کبھی بے جا کر ؛ سو رہے دامن میں پتنگے آکر
چونکتے ہوتے ہیں مرغان سحر ؛ ارغنوں بجنے لگا شاخوں پر
گیسوئے شب کی سیاہی کم ہے ؛ رخ مہتاب کے کیا عالم ہے
رات ملتی ہے جو منہ پر غازہ ؛ رنگ ہے پیر فلک کا تازہ
اب شفق رخ سے اُٹھاتی ہے نقاب ؛ چھٹتی ہے چاند کے منہ پر مہتاب
بڑھتا جاتا ہے افق کا جو شباب ؛ دھو دیا رات نے بالوں کا خضاب
اُٹھ چکی بستر راحت سے نسیم ؛ کی ہر اک شاخ نے جھک کر تسلیم
پھول نے اپنا خزانہ نہ کھولا ؛ زر گل آکے صبا نے تولا
ہو چکی صحبت عشرت برہم ؛ رو چکی حالت گل پر شبنم
خواب سے پنچھی پکھیرو جاگے ؛ کوہ میں ڈر کے درندے بھاگے
آنکھیں جھپکانے لگے محو جمال ؛ نو عروسوں کو ہے راحت کا خیال
رات بھر درد نے رکھا بیدار ؛ چین پا کر ابھی سوئے بیمار

اور ہیں بلبل و گل کے انداز ؛ بڑھ گیا دیر تک کچھ راز و نیاز
کھلتا جاتا ہے بصارت کا خلل ؛ کچھ کچھ آتے ہیں نظر دشت و جبل
آشیاں زاغ و زغن نے چھوڑے ؛ اپنی روزی کی طرف منہ موڑے
بہتے دریا کی نظر آتی ہے موج ؛ چلی جاتی ہے حبابوں کی فوج
کوہ میں تیتر پیچ کر کے گونجے ؛ آشیانوں میں کبوتر گونجے
جب میں کیچوں کو گرا کر اژدر ؛ چھپ گئے سانپ زمیں کے اندر
چوکڑی بھول گئے اپنی غزال ؛ آنکھیں ہیں شرق کو رخ کیے سو چلے
گل نے پہنی ہے جو شاہانہ قبا ؛ نور برسانے کو آتی ہے صبا
رخصت ماہ کا ہر سو غم ہے ؛ کبک کی خندہ زنی بھی کم ہے
پھول نظروں میں تلا جاتے ہیں ؛ پیچ سنبل کے کھلا جاتے ہیں
توپچی آکے کھڑے ہیں در پر ؛ منتظر ہیں کہ نمایاں ہو سحر
ابھی ہر چند ضیا کم پھیلی ؛ چاندنی پھر بھی ہے میلی میلی
پاس نارنج کے ہے بار سنگار ؛ لئے پھرتی ہے صبا عطر بہار
کیوں نہ برسے لب ساحل حسرت ؛ ہوتے ہیں مرغ آبی رخصت
قدرت حق کو چھپاتی تھی جو رات ؛ کیا رہے اس کا زمانے میں ثبات
رہیں پھنسنے کو مہیا آزاد ؛ دام سلجھانے کو اُٹھے صیاد

آشیانوں سے نکل آتے ہیں ماں ۔ پر کو تولے ہیں کہ اب کی پرواز

کیا کہوں میں بھی کہانی اپنی ۔ صفت کالی ہے جوانی اپنی
اٹھ گیا بزم طرب سے ساقی ۔ رہ گئے حسرت و حرماں باقی
مٹ گئیں ساری امنگیں دلکی ۔ کیفیت اسے اب محفل کی
خم بھی ہے ساغر و مینا بھی ہے ۔ وہی صحبت کا قرینا بھی ہے
ہائے رونق نہیں اب سینکڑوں کمی ۔ عالم یاس ہے ہر سو افسوس
کوئی بیہوش کسیکو کچھ ہوش ۔ رند ہیں صورت تصویر خموش
ہے کبھی ساغر و مینا پہ نظر ۔ ہے کبھی اپنے سراپا پہ نظر
غرض اب دل کی عجب صورت ہے ۔ کچھ ندامت ہے تو کچھ حسرت ہے
جب مزے بزم کے یاد آتے ہیں ۔ آپ سے آپ تڑپ جاتے ہیں
دھیان غفلت کا اگر آتا ہے ۔ اشک خوں چشم میں بھر آتا ہے
ہمنے دنیا میں وہ دولت کھوئی ۔ کہ عوض اسکا نہیں اب کوئی

عمر خود روح بنی آدم ہے ۔ اس کی قیمت کہو جو کچھ کم ہے

داغ حسرت کر گیا عہد شباب
گوہر عمر کی جاتی رہی آب

اب تو ہم کہنے کو کہتے ہیں ہم ۔ مگر اس کوچے میں رہتے ہیں ہم
وہی ہم ہیں مگر کوئی اور سے اب ۔ ہے نیا رنگ نیا طور ہے اب

ہے وہی صبح مگر غم سے نزار ۔ وہی دل ہے مگر اب ہے بیکار
وہی بلبل ہے مگر اب خاموش ۔ وہی ساقی ہے مگر اب بیہوش
ہے وہی شمع مگر بے رونق ۔ ہے وہی بزم مگر بے رونق
ہے وہی پھول مگر پژمردہ ۔ ہے وہی قلب مگر افسردہ

ہیں وہی لفظ مگر معنی گم
نہ ہم اب وہ ہیں نہ اب تم ہو وہ تم

دست دعا جس کے بندھے ہوں لیکن ۔ جس کو صحت ہونہ کا ہو نہ سن
اسکی حسرت کا نکلنا معلوم ۔ پاؤں ٹوٹے ہوں تو چلنا معلوم
راہ پر خار ہے ہم آبلہ پا ۔ ہاتھ کوتاہ مگر کام بڑا
ہم میں کمزور یہ منزل ہے کڑی ۔ ہر قدم ہے اجل آمادہ کھڑی
کیجئے کس کا بھروسہ یا رب ۔ اقربا ہیں نہ احبا یا رب
ہیں جو بالفرض تو کس کام کے ہیں ۔ احبا تو فقط نام کے ہیں
سیل غم آئی تو گھر لا گیا آب ۔ موجیں ہی ہیں پیچ پہ پیچ نہ تاب
نہ حبابوں میں ہوا ہے نہ ہوس ۔ حوصلہ کب کہ بھریں سرد نفس
یہ جوانی تھی وہ پاکیزہ ثمر ۔ جس کی لذت کا ہے دیوانہ بشر
بحر غفلت میں ڈبویا اس کو ۔ کیا بری طرح سے کھویا اسکو

دل جو سینے میں پڑا روتا ہے
آج اس رونے سے کیا ہوتا ہے

(از کلام حضرت شاد مرحوم مثنوی چشمہ کوثر)

ؔ ع پر کو تولے ہیں کہ اب کی پرواز ۔ اس کی بہار لا جواب ہے ؔ ساقی بیہوش ہیں اب نہ پینے پلانے کا لطف ہے ہم نہ بیکار ہے ۔

قدیم وجدید شاعری

آج کل صیغہ نظم میں غزل کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے جو شمار سے باہر ہے۔ یہی نہیں بلکہ پرانے مستند شعراء کے سرمایہ ناز اشعار پر بدمذاقی اور پست خیالی کا داغ لگایا جاتا ہے۔

ہندوستان کی مردم شماری میں جتنے چودہ برس سے اسّی برس تک کے مرد ہیں خواندہ ہوں یا ناخواندہ سب شاعر ہیں عورتوں کا آٹھواں حصہ شاعر ہے۔ ہندوستان کا کوئی نامہ نگار کوئی رپوٹر کوئی ایڈیٹر سوا ناصر علی خان بہادر کے ایسا نہیں ہے جس کا کوئی تخلص نہ ہو۔

نوجوان شعراء نے ملکِ غزل کو تہذیب اور متانت کے دائرے میں لانے کے لئے ایک کسوٹی مقرر کی اور اسی لئے بعض الفاظ کو خلافِ تہذیب قرار دے کر غزل گوئی میں ترک کر دیا ہے اور جو کوئی ان کے ترک کردہ الفاظ کو نظم کرتا ہے اسے بدمذاق شاعر کہتے ہیں ان میں بعض متروک الفاظ بیان کئے جاتے ہیں۔

کنگھی چوٹی کے مضامین نہ لکھے جائیں۔ رقیب کا نام نہ لیا جائے۔ یہ بڑی بے عزتی کا باعث ہے۔ جوبن کا لفظ نظم کرنا شرم کی بات ہے۔ بوسہ کا لفظ خلافِ تہذیب ہے۔ اس کا نام غزل سے اُڑا دو۔ جانی نہ کہو۔ بہت خراب لفظ ہے۔ زُلف دوتانہ کہو۔ معشوق کا لفظ نہ باندھو۔ یار نہ کہو پیار کا قافیہ نکال ڈالو شب وصل نہ کہو معشوق کو بُت نہ کہو معشوق کے گال کی تعریف نہ کرو پستان کا لفظ نہ کہو۔ افشاں، چوڑیاں، پٹیاں، مانگ، چھپکا، ٹیکا، رخسار کا نظم کرنا جرم ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے مضامین جن میں کچھ عشق، عاشقی، پیار، محبت، کا تذکرہ ہو خلافِ تہذیب سمجھ کر نکال ڈالے۔

اگر اسی پر اکتفا کرتے تو بہتر تھا غضب تو یہ کیا جو جو اگلے مستند استاد نظم کر گئے تھے اور جن کے سبب سے زبان اردو نے دہلی و لکھنؤ میں سندی مرتبہ حاصل کیا جن کے دم سے اردو شاعری ہم تک پہنچی ان کے کلام

مذاق سے موازنہ کرکے پست خیالی اور
الزام دیا اور اس بدنامرکت کو اپنی عزت
سمجھے۔
سب حرکتوں کے ماسوا ان لوگوں نے
ے چند اشعار انتخاب کرکے ان کو اپنا نمونہ
اور اس روش پر غزل گوئی شروع
غالب کی معنوی تقلید تو ہو نہ سکی صرف
بیدرنگی نتیجہ یہ ہوا کہ کلام پھیکا بے نمک
ا۔

اس روش میں ایک اور جدت کی
ں فارسی کے غیر مانوس اور ایسے
آج تک اردو میں شامل نہ ہوئے
مرغزل کہنی شروع کی۔ اس رنگ سے
ن خراب ہونے لگی مگر کچھ تازگی نظر
ں تو اسکول اور کالج کے طلبا نے
قدم کیا۔ کیونکہ یہ طریقہ غزل کہنے کا
تھا۔

فارسی عربی کے لغت کی کتاب اٹھالی
سے بدیع اور غیر مانوس الفاظ چن کر
کرلیتے۔ جسے لوگ بغیر لغت دیکھے
ہیں نہ سمجھ سکیں معنی پیدا ہوں یا نہوں

سب کے پسند آنے کی بات تھی آسان اور نئی اس پر طرہ یہ ہوا کہ مشاعرے کر گانے والے شعرا نے زینت بخشی۔ اب تو مشاعرے چمک تھے اور تحت اللفظ پڑھنے والے شاعر گوشہ گمنامی میں خاموش بیٹھ رہے۔

اب فکر یہ ہو رہی ہے کہ غزل کا میدان جس واسطے اس قدر صاف کیا گیا ہے اس کا حاصل ابھی تک نظر نہیں آیا۔ یہی خیال تھا کہ غزل کو جب تہذیب سے بھر دیں گے تو مشاعرے میں مدارس کی لڑکیاں بھی شریک ہوکر مشاعرے کی دلچسپی کا باعث ہوں گی اور ان کو بھی اس فن شریف سے فیض پہنچے گا۔

لیکن ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ علاوہ نقصان زبان پہنچنے کے اور اگلے شعرا کو تیر ملامت کا نشانہ بنانے کے جو الزام لوگوں نے اپنے اپنے زعم میں ناسخ، آتش، صبا، رند، سحر، امیر، جلال، داغ پر قائم کئے ہیں اور جن اشعار کو قابل اخراج بیان کیا ہے نکال ڈالنے کے بعد کل اُن اساتذہ کے دیوان میں اس قدر کلام باقی رہتا ہے جو آجکل کے شعرا کے دیوان سے کہیں زیادہ مجلد معلوم ہوتا ہے۔

آج کل کے شعرا کے دیوان نہ تو سب ردیفوں میں ہوتے ہیں، نہ زیادہ بحروں میں، نہ مکمل ردیفوں وقافیوں میں۔ اس کل آدھا دیوان تو بے معنی ہو کر خارج ہو جاتا ہے۔ چہارم خلاف محل الفاظ کی نذر ہو جاتا ہے اور جو کلام ان معائب سے پاک ہوتا ہے وہ مرثیہ ہوتا ہے غزل کا اطلاق اس پر صادق نہیں آتا۔

جب ان مدعیان سخن کی نظر سے جن اساتذہ کے کلام پر نظر کی تو مجھے ان تمام اشعار کے نظر انداز کرنے کے بعد بھی ایسے جواہر گراں بہا ملے جن کا ایک سلک میں لانا ضروری سمجھا اور اگر اس پورے انتخاب کو پیش کیا جائے تو وہ بھی آج کل کے ایک دیوان سے کم نہ ہوگا۔ اسے بنظر اختصار میں اساتذہ قدیم کے دیوان سے وہی اشعار پیش کرتا ہوں جن پر آج کل کے شعرا بھی آنکھوں سے صاد کرتے ہیں۔

سحر لکھنوی

شیخ امان علی سحر ولد شیخ محمد امین ۱۲۲۰ھ میں قصبہ کرہ مانک پور ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے بعد فراغ تعلیم ۱۲ برس کی عمر میں شاعری کے شوق میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت غازی الدین حیدر بادشاہ کا زمانہ ناسخ کی شاعری کا زور تھا۔ یہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سال بھر کے بعد شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ رؤسا کو قصائد مدح دیتے تھے اور اس میں اچھی خاصی آمدنی ہو گئی۔

درگاہ کے قریب کا مکان کرایہ پر لیا اور وہیں رہنے لگے۔ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ان کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ آدمی وضعدار تھے۔ رؤسائے شہر کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں مرد مجرد تھے۔ اسی زمانے میں باپ کے انتقال کی خبر آئی۔ لوگوں نے ترکہ پدری کے واسطے لکھا انہوں نے وطن کی طرف توجہ نہ کی۔

جب ناسخ کا انتقال ہو گیا تو فتح الدولہ برق سے اصلاح لینے لگے اور ان کے ذریعے ان کی آمدنی میں ترقی ہونے لگی۔ امیرانہ ٹھاٹ سے بسر کرتے تھے مذہب سنی تھا مگر لکھنؤ کی صحبت میں مذہب شیعہ اختیار کیا۔

۱۲۷۳ھ میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ یہ بھی گھر کو مقفل کر کے کاکوری بلگرام فرخ آباد میں مارے پھرتے رہے۔ جب تسلط ہو گیا تو لکھنؤ آنے کا قصد کیا۔ کسی گاؤں میں وبا میں مبتلا ہو گئے

ں انتقال کیا ۶۲ برس کی پائی ۔
سنہ ۱۲۹۰ میں ان کے بھتیجے شیخ محمد قاسم
قاسم ہمارے پاس آئے، سب حال

انہوں نے بیان کیا اور وہ بھی لکھنؤ میں معلمی پیشہ
کرنے لگے۔ رؤسا کو قصیدے بھی دیتے تھے۔ آخر اشرف آباد
میں کسی کایستھ کے مکان پر بعمر ۷۰ سالی انتقال کیا ۔

نمونہ کلام سحر

سنہ سے جب حرف سزا نکلا
پھر سے لطیفے کا لطف لب نکلا

ہیں کیا جو ترث پہ میلے رہیں گے
و سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہیں گے

ابر و فلق میں مانند گہر پیدا کی
پ منظور ہوا اس کو ڈبونا اپنا

کر و رہتا ہے ملتفت احباب
سکر کو نہیں اس پاس نہیں

بلبل کا نشہ ہے ایک توڑے ہیں سحر
کہ دولت کہیں پاؤ یہ مگر چھپتی نہیں

سامان عیش سب ہیں بس ایک شے نہیں ہے
ہو نگر نہ دل بھر آئے شیشے میں مے نہیں ہے

حت کی خوشی رنج کا کچھ غم نہیں رکھتے
غالب جو کسی شے کا وہ دل ہم نہیں رکھتے

بے بنائے ہوئے بنتے کہیں گل بوٹے
لہجہ ہے کا ہے مقرر چمن آرا کوئی

جہاں گیا مرا حصہ مجھے وہاں پہنچا
اٹھا کے خوان کرم سر پہ آسماں پہنچا

ئے جو سیر چمن کو سنا خزاں آئی
شگوفہ اور نیا لیکے آسماں پہنچا

غرور جس نے موردِ عتاب رہا
معلم الملکوت آج تک خراب رہا

سے جو عالم ارواح میں وہ خوب رہے
جو اس خرابی میں آباد ہی خراب رہا

سحر ضعیف ہوئے اب ہماری توبہ کیا
گناہ لاکھوں کئے جب تلک شباب رہا

اعلیٰ سے نہیں ہوتا ہے اسفل کو کبھی اوج
ہاتھوں سے کبھی نقش کف پا نہیں اٹھتا

نہ گئی جوش جنوں میں بھی وہ مرزا منشی
بات اگر سخت سنی سمجھے کہ پتھر مارا

جو کچھ ہوا سو ہوا بس گذشتہ را صلواۃ
کہاں تلک کوئی رویا کرے گلہ دل کا

آغا علی مہر

نواب امین الدولہ سیف الملک سید آغا علی خاں بہادر فیروز جنگ مہر تخلص. خلف ارشد نواب معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ عرف آغا میر وزیر ہ۔

عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ میں جب آغا میر شہر بدر کیے گئے اور لکھنؤ سے کانپور بھیجدیئے گئے تو نواب آغا علی مہر کی عمر اسوقت ۱۶ برس کی تھی اسوقت کانپور کا مرتبہ کالے پانی سے کم نہ تھا. سلطنت اودھ کے تمام اہلکار جن پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا اس شہر میں بھیجدیئے جاتے تھے مہر کو ناسخ سے تلمذ حاصل تھا

ایک مرتبہ ناسخ کانپور میں مہر کی ملاقات کو تشریف لے گئے تھے اور کچھ دن تک وہاں قیام کیا. منشی محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی اسی موقع پر کانپور گئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے ہ

مہر کو لکھنؤ کی جدائی کا بڑا قلق تھا جا بجا فراق لکھنؤ کا اپنے اشعار میں اظہار کیا ہے. اور کانپور کے مصائب کا بھی نقشہ دکھایا ہے ہ

مہر فارسی عربی میں فارغ التحصیل تھے ہ

سنہ وفات صحیح نہیں معلوم ہو سکا. مگر ۱۸۵۹ء تک زندہ تھے. اور زندگی نیک نامی کے ساتھ بسر کی ہ

نمونہ کلام مہر

کھل گیا مرنے سے مضمون خلاف کثرت
اپنی ہستی کو میں قفل در وحدت سمجھا

وہ طائر باغ اے خزاں ہوں
جس نے لطف چمن نہ دیکھا

اے مہر بعد غربت کیوں ہو نہ قدر و قیمت
لعل دگہر کی صورت ہمنے وطن نہ دیکھا

اٹھائے غربت کے رنج لیکن تباہ ہوتے وطن نہ دیکھا
مقام شادی ہے ہمصفیر و خزاں میں ہمنے چمن نہ دیکھا

جب سرِ خاطر سے پردہ اٹھ گیا پندار کا
غیر میں عالم نظر آیا جمالِ یار کا

اہلِ تمکیں ناتوانوں سے نہیں پلتے گزند
کب سنا کانٹوں سے پھنستا دامن کہسار کا

جو راست ہیں رہتا ہے خلاف آن زمانہ
اس باغ میں ہر سرو ہے محتاج ثمر کا

اپنی نظر میں کچھ بھی باغ جہاں نہ ٹھیرا
اے باغبان قدرت ہم کو یہاں نہ ٹھیرا

مہر میں پرتو ہے تیرے روئے عالمتاب کا
منعکس ہے تیرے رخ سے آئینہ مہتاب کا

انداز و ربط و ہم جنسی حیلہ و فریب
تسلیم و بندگی و سلام و دعا غلط

جو آرام چاہے تو قطع سخن کر ٭٭٭
زباں شمع آسا بڑھانے سے حاصل

سلائیں گے تابوت میں تجھ کو اک دن
چھپر کھٹ میں آرام پانے سے حاصل

ہم کیے دیتے ہیں اسے خاطر شکن
دل کسی کا توڑنا اچھا نہیں

پھول اپنی بے ثباتی پر گریباں چاک ہیں
بلبلانِ رفتہ کا اس باغ میں ماتم نہیں

عشرت لکھنوی

صلائے عام۔ جناب عشرت لکھنوی کو انتخاب اشعار اور شعراء ماضی و حال کا تذکرہ لکھنے میں کمال ہے۔ بلکہ آگے کو جو اردو شاعری کا حشر ہونے کو ہے اس کی پیشین گوئی بھی ممکن الوقوع ہے۔

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضروری کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جاوے۔ جائے اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکیں اُنکے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپسی منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نا گفتنی ضرور ہو۔ یعنی بیان عجائب سرو سنبل و لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی یا عربی میں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:—

زبان اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے۔ [illegible]
〃 چھ ماہ کیواسطے۔ [illegible]
〃 〃 تین ماہ کیواسطے۔ [illegible]
〃 نصف صفحہ ایکسال کیواسطے۔ [illegible]
〃 چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے [illegible]
〃 〃 〃 چھ ماہ کیواسطے۔ [illegible]
〃 〃 〃 تین ماہ کیواسطے [illegible]
〃 ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے ۔۔۔ [illegible]
〃 نصف 〃 〃 ۔۔۔ [illegible]
〃 چوتھائی 〃 〃 ۔ [illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دگنی اُجرت ہوگی۔ اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:—
دلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خان بہادر، مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا۔
Printed and Published by Mir Nasir ali Khan Bahadur (Editor) at the Nusri Press Farrash Khana Delhi

SALA-I-AM, DELHI. Regd. No. L. 1462

صلائے عام



A [illegible] Monthly Magazine devoted to the cause of [illegible] the [illegible] Indian [illegible] Muhammadans [illegible] and the assimilation of the best qualities of the [illegible]

دہلی

باہتمام [illegible] ناصر علی خاں ایڈیٹر [illegible] مطبع [illegible] دہلی [illegible] چھپا

فہرستِ مضامین

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء

صلائے عام

توبہ تو مدت سے کی تھی ہم نے پر ای محتسب + ہو گئی مے کی ہوس کچھ ابرِ باراں دیکھکر

یہہ مہینہ اس سال کا اخیر مہینہ ہے اس میں اخبار اور رسالے والے قیمت کا تقاضہ کیا کرتے ہیں ۔ میں نے تقاضہ کی رسم ترک کر رکھی ہے لیکن بقول حضرت بیاںؔ

شمع کہتی ہے مرے سر سے دھواں اُٹھتا ہے + تو نے روکیں دلِ پُر سوز میں آہیں کیونکر

تمام ملک کے خیر خواہوں میں رسالے اور اخبار والوں کی ہمت کو سراہیے جو اپنا وقت اور روپیہ خرچ کر کے اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں ۔ خاصکر زبانِ اُردو والے کہ اس زبان کی بے قدری سب سے زیادہ ہو رہی ہے + اُردو کے رسالے نکالنے والوں کو آمدنی کی اُمید تو درکنار زیر بار سے بچے رہیں تو غنیمت ہے ۔ لیکن اکثر رسالے والوں کا تجربہ ہے اور مجھ پر گذر رہی ہے کہ زیر باری سے شاید ہی کوئی بچا ہو

ای فلک گردشِ ایام کا کیا رونا تھا + وصل کی رات اگر چار پہر کی ہوتی

اس شعر میں حضرتِ بیاںؔ نے کمال کیا ہے کہ مبالغہ ختم کر دیا اور پھر مبالغہ کا پتہ نہیں ۔ مایوسی تو اس درجہ کہ معمولی رات کے بھی برابر نہیں حالانکہ چاہنے والے شبِ وصل

لوہزار

کو ہزار راتوں سے بھی بڑی چاہتے تھے اور اسے بھی چھوٹی سمجھتے۔ برخلاف اس کے یہہ رات اور راتوں کے برابر بھی نہ نکلی: اگر معمولی راتوں کے برابر بھی نکلتی تو ہمارے آنسو کچھ تو پونچھ جاتے +

ہماری زبان سے خفگی کی بڑی وجہ یہہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ اور مبالغہ جھوٹھ میں داخل ہے سه

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ + بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

جس غرض سے جو بات کہی جائے اُس غرض کی تائید میں رسمی خیالات سے بڑھ کر کام لینا حسنِ بیان ہے۔ معمولی ملاقات میں ملنے والے کی خیر و عافیت پوچھنے سے یہہ غرض نہیں کہ پوچھنے والا ملنے والے کے لئے واقعی بے قرار رہا۔ لیکن نہ پوچھئے تو ناگوار معلوم ہوتا ہے + آسمان و زمین کے قلابے ملانا گو مبالغہ میں داخل ہے مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ آسمان و زمین کے قلابے مل نہیں سکتے + جو بات بدیہی غیر معمولی ہو اور سب جانتے بھی ہوں کہ غیر معمولی ہے تو جھوٹھ میں داخل نہیں۔ خاصکر جب کہ ہم کہہ دیں کہ ع بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے +

آپ خوب سمجھ لیں کہ جس جھوٹھ کے ہم خود اقبالی ہوں عدالت فوجداری میں گو فردِ جرم لگ جائے مگر شریعتِ اخلاق و مروت میں عفو کردنی سمجھا جاتا ہے کہ جس قصور کا اقبال کرلیا جائے اُس پر سزا دینی مروت کے خلاف ہے + بلکہ ایسا جھوٹھ جس کو سب نے پہلے سے جھوٹھ سمجھ رکھا ہو میری زبان سے نکلنے میں جھوٹھ نہیں ہو سکتا +

انوار سہیلی۔ کلیلہ دمنا۔ الف لیلہ۔ حضرت لقمان کی حکایتیں اور ایسی پند و نصائح ملکہ اکثر جی بہلانے کی کتابیں جرم میں داخل ہو جائیں گی: گو در اصل یہہ غیر واقعی ہیں مگر ان پر جھوٹھ کا الزام عاید نہیں ہوسکتا + توریت و انجیل اور اکثر متبرک کتابوں میں ایسی ہی مثالیں موجود ہیں جو محض تمثیلوں کے طور پر از روئے پند و نصائح بیان ہوئی ہیں مگر معاذ اللہ! ان پر کسی طرح کا الزام نہیں آسکتا +

اصل جھوٹھ وہ ہے جس کا آپ اقبال نہ کرسکیں۔ مبالغہ میں جب ہم پہلے سے اقبال کرتے ہیں کہ اس سے صرف حُسنِ بیان منظور ہے تو پھر مبالغہ پر دروغ و کذب کا الزام لگانا حُسنِ بیان کا خون نہ ہوا تو اور کیا ہوا؟ حُسن کسی طرح کا ہو حسینوں کا۔ پھول کا۔ پھل کا۔ حُسنِ خرام۔ حُسنِ کلام۔ حُسنِ خیال۔ حُسنِ بیان کسی حُسن کو مٹانا گناہ اگر نہیں تو غلطی ضرور ہے: بقول حضرت غالب

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے + قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

دُنیا میں ہماری زندگی ایک پاکیزہ حُسنِ خیال ہے۔ برخلاف اس کے مرنا ایک واقعی و وقوعی امر ہے: آپ جانتے ہیں کہ مرنے کا خیال ناگزیر ہو تو ہو مگر کسی کو پسند نہیں: زندگی حُسنِ خیال سمجھئے اور مرنا مجبوری۔ حُسنِ خیال کا خون کرنا اور مجبوری پر مرنا خردمندی نہیں +

اپنی زبان میں مبالغہ کی اس قدر تعریف کرنے کے بعد مجھے ایک امر واقعی و وقوعی کا خیال آگیا کہ یہہ پرچہ ۱۹۲۸ء کا اخیر ہے۔ اخبار والوں کا دستور ہے کہ گزرنے والے سال کا

روتا رہتے ہیں: اس پر مجھے حضرت تاباں کا شعر یاد آگیا ؎

تاباں تنے میں آنا کیا جو وہ آئے دمِ آخر ✤ تمنا میں تمنا کیا جو وقتِ واپسیں نکلی

مگر سالِ گزشتہ کی رخصت پر یہہ شعر زیادہ مناسب ہے ؎

تم اپنے وصل کے ارماں بھی ساتھ لیجاؤ ✤ پرائے مال کی ہم سے نگہبانی نہ ہو گی ✤

گزرا زمانہ اس لئے زیادہ یاد آتا ہے کہ زمانہ تو کیسا ہی کیوں نہ ہو کوئی زمانہ برائی بھلائی سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن جب گزر جائے تو اُس کی بھلائیاں یاد رہ جاتی ہیں ؎

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب گزر جائے ✤ نگاہِ یار کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

اتفاق سے یہہ پرچہ آغاز جنوری ۱۹۱۰ء کے آغاز میں پڑھنے والوں کی نظر سے گزریگا۔ سنہ ۰۹ء کی رخصت کے ساتھ سال آئندہ کے استقبال میں ابھی اسی قدر عرض کر دینا بس ہے کہ ؎

ہجر کی رات بری روزِ وصال اچھا ہے

بلکہ جس سال میں یہہ دن ہو وہ سال اچھا ہے

صلائے عام کی نسبت مجھے ایک بات اور بھی عرض کرنی ہو کہ لکھنو کی چھپائی میں کتابت کی صحت بہت مشکل ہو۔ خاصکر عالمانہ تحریروں میں کہ کتابت کی غلطیاں درست کرنے کے بعد کاپیاں پتھر پر جمانے تک کوئی نہ کوئی غلطی رہ جاتی ہے۔ حضرت ذوقؔ غلطیہائے مضامیں کو روتے ہیں کہ ؎ غلطیہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں۔ اس کا علاج ممکن ہے کہ نالے کو نارسا باندھیں گے۔ مگر کتابت کی غلطیوں کا کیا علاج کیا جائے؟ اس کی تدبیر یہی ہے کہ نثر میں آپ عبارت سے مطلب نکال لیں اور شعر میں سکتہ و وزن و بحر سے کام لے لیں۔ قدیم منشیوں میں خاصکر کاتب محرروں میں یہہ بات مشہور تھی کہ ع عاقلاں پیرو نقطہ نہ شوند۔

مضمون پریشاں

"مضمونِ پریشان" بھی مضمونوں میں کوئی مضمون ہے ؟ بعضوں کو اب تک عاشقوں کے ارمانوں کی طرح جو کبھی پورا ہوتے نہیں دیکھے اس کا سمجھنا بھی مشکل ہو رہا ہے ۔ اس میں مضمون کا قصور نہیں ؛ لیکن جب یہہ مضمون نہیں ہوتا ہے تو شکایتیں آتی ہیں ۔ اکثر تو اس طرز پر اتنے مٹے ہوئے ہیں کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے : اس میں اگر اور کوئی خوبی نہیں تو یہہ بات کیا تھوڑی ہے کہ بقول جناب تسلیم ع ہمصفیروں سے مرا طرز بیاں ملتا نہیں ۔ یہہ امتیاز برا یا بھلا جیسا ہے صلائے عام کے لئے کچھ کم نہیں کہ اس طرز کے لکھنے والے تھوڑے اور سمجھنے والے ان سے بھی زیادہ کم ہیں تو یہہ طرز اور بھی قابلِ قدر ہے کہ کیاب چیز کی تلاش زیادہ چاہئے ؎

شکر کر سر حلقۂ رندانِ بادہ نوش ہے ۔ اور کیا اے شیخ تو پیرِ مغاں ہو جائے گا

اس طرزِ بیان سے مجھے بڑا آرام ہے کہ ایک مضموں میں بہت مضموں پیدا ہو سکتے ہیں ۔ صلائے عام کے قدرشناسوں میں سے ایک صاحب نے جو اچھے لکھنے والوں میں ہیں مجھے لکھا ہے کہ "مضمونِ پریشان" کے چھوٹے سے چھوٹے جملہ پر

بڑے سے بڑا مضموں لکھا جا سکتا ہے ؎

کچھ نمک۔ کچھ مشک۔ کچھ الماس ہوائے چارہ گرو پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں مُنہ ناسور کا

کبھی جگر سے کبھی دل سے رسم و راہ رہے

مزہ تو تب ہے بلٹتی تری نگاہ رہے

شاہ تراب علی فرماتے ہیں ؎

کاکل جو چند موئے پریشاں کا نام ہے + دل کے لئے خدا نے اسے دام کر دیا

یہہ سلسلۂ عالم اسباب کہ ہر چیز ہر چیز سے وابستہ ہے "زنجیر جنوں" سمجھنی چاہئیے، کہ جتنا اس سے بھاگئے یہہ کڑی ہوتی جاتی ہے ؎

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو + دیوانہ کا پاؤں درمیاں ہے

زلف پُر پیچ کو کھولا ہے یہہ کس نے یارب + کہ مرے پاؤں کی زنجیر کئے دیتے ہیں

نہ دل زُلفوں سے چھوٹا اور نہ تم زُلفیں بنانے سے

یہہ وہ جنجال ہے جس سے نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

میں نے وعظ میں سُنا ہے کہ انسان عبادت کے لئے پیدا ہوا ہے کہ ماخلقت الجن و الانس الا لیعبدون یہہ برحق ہے: لیکن ظاہرا عبادت سے زیادہ مرنا برحق نظر آتا ہے + خیر ہم تو عبادت کے لئے پیدا ہوئے۔ دُنیا کس لئے پیدا ہوئی؟

یہی نہ۔ کہ ہم اس میں جئیں اور مریں؛ بلکہ زیادہ ترمرنے کے لئے۔ کیونکہ انسان جب مٹی کا پتلہ ہے تو مٹی ہی سے اس کو واسطہ رکھنا ضرور ہوا ؂

خم قد کا ہے پیری میں اشارہ + محبت بڑھتی جاتی ہے زمیں سے +

لیکن سچ پوچھئے تو ہم صرف مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ نہ پیدا ہوتے نہ مرتے ؂

بہار میں جو خیالِ غمِ خزاں ہوتا + تو شاخِ گل پہ نہ بلبل کا آشیاں ہوتا

لیکن جیتے جی تو کیا مرکر بھی ہم نے نہ جانا کہ ع کدھر آئے تھے جاتے ہیں کہاں کو؟ ؂

تہِ مدفن کھلی آنکھیں تو اس دنیا کو یہ سمجھے
نظر آتی تھیں کچھ شکلیں ہیں خوابِ پریشاں میں

زندگی کی تشبیہ کسی کے پریشاں بالوں کے ساتھ خاصی ہے مگر ان کا اُلجھ جانا بُرا ہے۔ بال اُلجھ جاتے ہیں تو بال والوں کے اُلجھ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے ؂

زلف اُلجھی تو آپ بھی اُلجھے + بال سُلجھائیے خدا کے لئے

زندگی بُری نہیں اگر سُلجھی رہے۔ جس طرح سلجھے ہوئے بالوں کا کیا کہنا! مگر زندگی کے ساتھ دُنیا کے جھگڑے بُرے لگے ہوئے ہیں + کم سن بچیوں کے لمبے بال نہایت خوبصورتی میں داخل ہیں مگر ان کی چاہنے والیاں (ماں۔ آپا۔ دادی۔ نانی) ان کا سر دُھلانے میں ان کے اُلجھے ہوئے بال جب کنگھی سے سلجھاتی ہیں تو بچیاں سر دُھلانا مصیبت سمجھتی ہیں ؂

شام کو سُن جو لیا تھا کہ بناتے ہیں وہ بال + رات بھر آج خیال آئے ہیں کیا کیا دل میں

عالم کی اک اسد نہ گزرے ہے جہاں میں + رکھتا ہے کوئی رات کے ارماں کوئی دن کی

رات کو زلفِ پریشاں اور دن کو رخسارِ تاباں کا خیال۔ یہہ گردشِ ایّام یونہی چلی جاتی ہے: اس گردشِ ایّام میں رونا یہہ ہے کہ عیش و آرام کا تو ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں اور رنج و مصیبت مہمانِ ناخواندہ قاضی کے پیادہ کی طرح ہر وقت موجود۔ اگر دونوں برابر رہتے تو پھر رونا کاہے کا تھا؟ شبِ ہجر تو کاٹے سے نہ کٹے اور شبِ وصل میں شام ہی سے صبح ہو جائے ؎

اس نے مارا خلق کو اُس نے ڈبویا اک جہاں + تیرا ہنسنا اور مرا رونا برابر ہو گیا

کہتے ہیں دینے کو وہ دیکھئے کیا دیتے ہیں + وُہ بھی یاں دیتے ہیں یا روزِ جزا دیتے ہیں

مرنے کے بعد عاقبت پر ہر شخص کو ایمان رکھنا ضرور ہے۔ اور سزا و جزا قطعی برحق ہے۔ مگر دُنیا میں حق و ناحق کوئی چیز نہیں۔ انتظامِ عالم دوسری چیز ہے ؎

حق کے کہنے سے نہیں ملتی ہے سُولی منصور + تو نے دعوےٰ کہیں الفت کا کیا ہوئیگا

روزمرہ میں غایتِ اُلفت کا نام مرنا ہے۔ یہہ بے موت مرنا ہے: تسکین کا شعر ہے ؎ تسکیں نے لیکے نام ترا وقت مرگ آہ + کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سُنا نہیں

مرنے کے بعد اگر عاقبت کا سہارا نہ ہو تو پھر زندگی سے زیادہ کوئی مُصیبت نہیں ؎

کچھ کہہ دو جھوٹھ سچ کہ توقع بنی رہے + توڑو نہ آسرا کسی اُمیدوار کا

یہہ آسرا نہ رہے تو خسر الدّنیا والآخرہ میں شک نہیں ؎

کچھ تو کچھ دل ہی بہل جاتا ہے تم آؤ یا نہ آؤ ✤ روز تم وعدہ کرو اور روز ہم ساماں کریں

کھو کے امیدوں کو اے یاس تجھے پایا ہے ✤ تو غنیمت ہے کہ غنیمت ہے تری ذات مجھے

جیتا ہوں نہیں جینے کی جب تک مجھے امید

مر جاؤں گا بالیں پہ مسیحا اگر آیا کو

دُنیا میں جب کوئی چیز پائیدار نہیں۔ یعنی خلاق دو عالم نے کوئی چیز بُری یا بھلی ایسی نہیں بنائی جو دیر پا ہو اور انسان ضعیفُ البنیاں ہو کر زیادہ ٹھرنے کا دعوے کرے یا امید رکھے تو حماقت نہیں تو کیا ہے؟ پہلے اپنی پائیداری کی فکر کرے پھر اور کسی چیز کی ناپائیداری کا رونا روئے ✤ خدا نے جو کوئی چیز دیرپا نہیں رکھی اس میں مصلحت تھی کہ نشیب و فرازِ عالَم عالَم کی پائیداری کا باعث یہی ہو سکتا تھا جو عالَم کو فنا ہونے سے بچا رہا ہے ✤ درخت کی شاخیں کاٹنے سے درخت بڑھتا ہے۔ اور انسان کی عمر بڑھ جانے سے ضعیفی میں قوا گھٹ جاتے ہیں: ایک کا گھٹنا اور دوسرے کا بڑھنا یہ نشیب و فرازِ عالَم ہے۔ پانی جو ہمیشہ نیچے کو جاتا ہے اونچی اونچی عمارتوں کو ڈھا دیتا ہے ؎

نہ پوچھو اتنے نشیب و فراز کا عالَم ✤ بہ شکلِ اشک گرے اور درد ہو کے اُٹھو

انسان میں اور عالَمِ اسباب میں جو مخاصمت ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنا قیام چاہتے ہیں اور عالَمِ اسباب اس کے خلاف ہے۔ ناچاقی میں اگر صلح بھی ظاہر

ظہور ہوگی

ظہور ہو گئی تو کچھ نہ کچھ بدمزگی کا اثر رہ جاتا ہے۔ دلوں میں نہ ہم عالم اسباب سے خوش ہیں نہ عالم اسباب ہم سے خوش ہے: ہم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رہے ہیں اور عالم اسباب دنیا اور مافیہا کے مٹانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ نواب کاظم علیخاں فرماتے ہیں

باغ عالم میں جو راحت ہے تو کچھ رنج بھی ہے ✦ تا کمر گل ہیں تو یاں تا سر زانو کانٹے

آپ کا یہ شعر غضب کا ہے

کیا گر قتل بھی قاتل نے ہم کو لاکھ منت سے
مگر اللہ رے شوخی! کہ چھوڑا نیم جاں پھر بھی

(لاکھ منتوں سے مارا بھی تو نیم جاں رکھا کہ عاقبت کا خوف لگا رہے)

غزل جناب مائل دہلوی

اللہ رے کریم کچھ اس کا تو غم نہیں ✦ یہ شکر ہے بتوں کے گنہگار ہم نہیں ✦ ملتا نہیں نشانِ خوشی کم سے کم نہیں

دنیا وہ غمکدہ ہے جہاں غم کا غم نہیں ✦ وہ نور کیا جو نورِ خدا سے بہم نہیں ✦ وہ نام کیا جو عرشِ بریں پر رقم نہیں

یوں سمجھے ہم کہ راز چھپانے کی چیز ہے ✦ قرآں میں جو تیرے دہن کی قسم نہیں ✦ جو کچھ بھی آپ ہیں وہ بس پردہ آپ ہیں

اس سے زیادہ واقفِ اسرار ہم نہیں ✦ پیماں شکن کو کہتے ہو پورے قول کا ✦ ثابت قدم کو کہتے ہو ثابت قدم نہیں

پہونچی ہے یوں حرم میں مری موت کی خبر ✦ لڑتی نہیں جو بتوں سے ان آنکھوں میں دم نہیں ✦ اب بچتے ہیں اسکو شفا جس کے ہاتھ ہے

اب چارہ ساز اے دلِ بیمار ہم نہیں ✦ جبتک ہے رہے نہ رہے اختیار ہے ✦ جانِ حزیں سے کوئی بھی قول و قسم نہیں

آ جائے وہ یقین ہے کرنے کو بے مزہ ✦ لذتِ غمِ فراق کی خط میں رقم نہیں ✦ یہ بات دل نے آج بتائی تمہیں کہ

ہے لُطف جو ستم میں وہ اُن کے ستم نہیں ✣ آبِ بقا کو پی کے بھی جیتے کبھی نہ خضر ✣ جیتے ہیں اس خوشی میں کہ مرنے کا غم نہیں
میں یہ سمجھ رہا ہوں جلانے لگے جو بُت ✣ شمعِ صنم کدہ ہوں چراغِ حرم نہیں ✣ اب ان کے نقشِ پا سے ملاتا ہوں سلسلہ
اب وہ نہیں ہوں خاک جو زیرِ قدم نہیں ✣ در پر تمہارے غیر نہ مر جائے کس طرح ✣ شداد کے نصیب میں باغِ ارم نہیں
مرغانِ باغ دیکھ کے عیشِ قفس مرا ✣ حسرت سے کہہ رہے ہیں گرفتار ہم نہیں ✣ غم ہو تو ان کو ہو جنہیں دھڑکا ہو موت کا
ہم تو مر چکے ہیں مرنے کا غم نہیں ✣ وسعت دکھائیں کس کو ہم اپنے مزار کی ✣ دو گز زمین ساری خدائی سے کم نہیں
قشقہ لگا کے آئیے ایمان کے خون کا ✣ مائلؔ صنم کدہ ہے یہ بیت الحرم نہیں

صلائے عام - جناب مائلؔ دہلوی کی شاعری تعریف کی محتاج نہیں - یہ دلی میں ہوں یا لکھنؤ میں جہاں ہوں ان کا کلام لاجواب سمجھا جائے گا : صلائے عام چونکہ دلی سے نکلتا ہے ہم حضرتِ مائلؔ کے کمالِ شاعری پر جس قدر ناز کریں تھوڑا ہے ✣ اس غزل کی بحر میں مضمون کی بہت گنجائش نہیں لیکن چھوٹی بحر میں بھی اچھے اچھے شعر نکالے ہیں - میں نے بعض اشعار پر صاد کر دیا ہے : خاصکر اس شعر کا مضمون بالکل نیا ہے ؎

وسعت دکھائیں کس کو ہم اپنے مزار کی ✣ دو گز زمین ساری خدائی سے کم نہیں

اس غزل کے ساتھ جو خط آیا ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہے - اُس کا اقتباس لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں ✣ حضرتِ مائلؔ آج کل علیل ہیں - جناب نے مجھے خط لکھوایا ہے کہ :-

"صلائے عام پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ سید صاحب (نیاز مند) کو کچھ نثر کی تعریف میں لکھوں مگر کیا کروں علالت سے مجبور ہوں۔ اس وقت ہندوستان میں علاوہ خان بہادر صاحب کے کوئی نثر لکھنے والا نہیں" + جناب صبا فرماتے ہیں:۔

× × × × × "اس پر میں نے عرض کیا کہ اب کے جو صلائے عام آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب چیف کمشنر دہلی کی اسپیچ کا اُردو ترجمہ ہے اور ایسا ہے کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ میرے خیال میں اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ اور خاں بہادر صاحب اپنے ترجمہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ اس میں وہ لطف کہاں جو ہونا چاہئے۔ یہہ بھی اک طرزِ ادا ہے اور اس متانت سے لکھا ہے کہ سبحان اللہ!"

اتالیق الامرا

میرے بعض دوست مجھے لکھ رہے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے رسالہ صلائے عام میں آپ کے مضامین اتالیق الامرا کے عنوان سے طبع ہوا کرتے تھے اور وہ مضامین بہت پسند کیئے جاتے تھے اب آپ نے اس سلسلۂ تحریر کو کیوں بند کر دیا۔ اس کا جواب یہہ عرض کرتا ہوں کہ اُن مضامین کے لکھنے سے میری بڑی غرض یہہ تھی کہ کسی طرح ہندوستان کے خاندانی ہندو مسلمانوں کو تربیت اطفال کی طرف متوجہ کروں اور اُن کو یاد دلاؤں کہ اُن کے بزرگ ہندو مسلمان امیر غریب نواب راجہ بادشاہ تربیت اولاد کا کس قدر اہتمام کرتے تھے اور تربیت اولاد کو تعلیم سے کتنا زیادہ ضروری جان کر اتالیقوں کی تلاش میں سرگرم رہا کرتے تھے اور اتالیقوں کی کیا کچھ قدر دانی کی جاتی تھی اور بلا خوف تردید کہا جاتا ہے کہ تربیت اولاد سے وہ مفید نتائج پیدا ہوتے تھے جو تعلیم سے نہیں پیدا ہوتے۔ اور چونکہ نواب راجہ بادشاہ غربا کے طبقہ سے اتالیق تلاش کرتے تھے۔ اس لئے زیادہ تر غیر دولت مند اپنے کو ہر اعتبار سے معراج کمال پر پہونچاتے تھے فی زمانہ اگلے خاندانی امیر غریبوں کو تربیت اولاد کا خیال جاتا رہا ہے اور کوئی اس طرف متوجہ نہیں ہوتا اسواسطے میں نے اُن قصوں کا یاد دلانا اور اُن مضامین کا لکھنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ اس کا اہتمام اور احساس اُسی زمانہ میں تھا۔ کہ کوئی شہزادہ اور امیرزادہ ایسا نہ تھا کہ اس پر اتالیق نہ رکھا جاتا ہو۔

اِس زمانہ میں ساری دُنیا صرف تعلیم کی طرف متوجہ ہے یہاں تک کہ گورنمنٹ نے بھی تربیت اطفال کو غیر ضروری سمجھ کر صرف تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے۔ ورنہ ممکن تھا کہ جہاں ہر ایک کالج اور مدرسہ میں لایق مدرس تلاش کر کے واسطے تعلیم اطفال رکھے جاتے ہیں وہاں فی

فی کلج اسکول ایک اتالیق بھی رکھا جاتا کہ وہ بچوں کی اصلاح حال کرتا۔ رئیسوں کے نابالغ بچوں پر انگریزی اتالیق ضرور رکھے جاتے ہیں اور کسی قدر اس سے نفع بھی پہونچتا ہے مگر عام تربیت کا کچھ بھی اہتمام نہیں ہے۔ اور رئیسوں میں سے بھی فی صدی دو چار ہی اپنے فرائض سے واقف ہوتے ہیں۔

یہاں یہہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم سے کیا تربیت اولاد حاصل نہیں ہوتی اور کیا تعلیم اور تربیت میں کوئی بڑا فرق ہے؟ جواب یہہ ہے کہ ہاں فرق ہے اور تعلیم سے تربیت حاصل نہیں ہوا کرتی۔ تعلیم اور چیز ہے اور تربیت اور شئے ہے دونوں کے حدود عمل علیحدہ علیحدہ ہیں ہم اِس وقت اس کے متعلق کچھ بیان کرنا نہیں چاہتے مگر ایک مثال پیش کرتے ہیں اُس سے سمجھ دار سمجھ لیں گے کہ ہمارا لکھنا کہاں تک حق بجانب ہے۔ اور اس سے یہہ بھی سمجھ لیں گے کہ تعلیم سے تربیت ضرور افضل ہوگی۔

ہمایوں بادشاہ جب دوبارہ ایران سے آکر ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اُس وقت اکبر جلال الدین کی عمر بہت کم تھی۔ ہمایوں نے بہرم خاں کو اکبر کا اتالیق تجویز کیا بہرم خاں نے ہمایوں سے کہا کہ اس شہزادہ کو ملا بناؤں یا بادشاہ۔ ہمایوں نے کہا کہ ملا بنکر کیا ہوگا۔ خلاصہ یہہ کہ بیرم خاں نے اکبر کی ایسی تربیت کی کہ ہندوستان کے تخت پر اکبر سے بہتر بادشاہ کوئی نہ ہوا، اور اکبر کے جاہل اور اُمی ہونے کی یہہ کیفیت تھی کہ بادشاہ ایران کے سفیر کے روبرو اکبر نے ایک نوشتہ اُٹھاکر دیکھا تو یہہ بھی نہ جانا کہ یہہ اُلٹا ہے یا سیدھا سفیر یہہ دیکھ کر مسکرایا تو علامہ فیضی اُس وقت موجود تھا اُس نے سفیر سے مخاطب ہوکر کہا کہ آنا پیغمبر ما نیز امی بود مگر کتب خانہ چند ملت بشست یعنی اکبر اُسی قسم کا امی محض ہے جیسے پیغمبر اسلام علیہ السلام امی محض تھے جسکی نسبت بزرگ جو مہر حکیم نے نوشیرواں سے بطور پیش گوئی کہا تھا: کہ درپیش گیر درہِ راستی ٭ نہ گردد پے کثری و کاستی ٭ بہ تخت سہ پایہ برآید بلند ٭ دہد مرجہان جملہ را نیز بند ٭ جہود و مسیحی نماند بجا ٭ برآرد ہمہ دین پیشیں زپا ٭ حاصل کلام یہہ ہے کہ اکبر کی صرف تربیت شاہانہ کا بیرم خاں نے اہتمام کیا تھا نہ تعلیم کا اگر تعلیم تربیت لازم ملزوم ہوتی یا تعلیم سے تربیت خود بخود ہوتی جیسے کہ عام خیال لوگوں کا ہے تو

لباسِ ہند

زمانہ کی تاریخ کے دس بارہ ورق اُلٹ کر دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہندوستان میں کس قسم کا لباس کیسا آرام دہ اور کتنا کم خرچ استعمال ہوتا تھا۔

سب سے پہلے جب بچّہ پیدا ہوتا تھا تو اُسے نہلا کر ایک نہالچہ دو چار پوتڑے چھوٹا تکیہ ایک کردھنی ہاتھوں میں اور پاؤں میں نیلے دھاگے کی لچھیاں ملتی تھیں۔

نہالچہ پُرانے کپڑے کا روئی دار دوہرا چھوٹا سا بچھونا ہوتا تھا۔ تکیہ بھی پُرانے کپڑے کا روئی دار سر کے نیچے رکھنے کے لئے بنایا جاتا تھا۔ کردھنی نیلے سوت کی کمر میں باندھی جاتی تھی جس سے پوتڑے لٹکا دئے جاتے تھے۔ پوتڑا ایک چھوٹی سی دو بالشت کی دوہری لُنگی ہوتی تھی۔ لچھیاں نیلے سوت کی ہوتی تھیں جو ہاتھ پاؤں میں باندھ دیتے تھے تا کہ بچے کو نظر نہ لگے۔ پُرانے کپڑے کی ٹوپی دوپلّی زیب سر ہوتی تھی۔

عموماً لوگ عمر دراز ہونے کے لئے بچّوں کو پُرانے کپڑے پہناتے تھے۔

قاضی صاحب شملہ۔ عبا۔ قبا۔ کُرتا استعمال کرتے تھے اور کفش پہنتے تھے۔ شملہ ایک سی ہوئی پیچ دار گول پگڑی ہوتی تھی جس کے پیچھے بطور جھلجھل کے ایک کپڑا گردن تک لٹکتا ہوتا تھا۔ یہہ شملہ اُونی پھول دار شال کا بنتا تھا۔

عبا ایک اچکن تھی جس میں دوہرا پردا ہوتا تھا اور ٹخنوں تک دامن ہوتے تھے۔

قبا ایک شال کی اچکن ڈھیلی ڈھالی بہت چوڑی لمبی ہوتی تھی جس کے کنارے پر گوٹ لگی ہوتی تھی اور جاڑوں میں استعمال کی جاتی تھی۔

کفش کیمخت کی ایک زیرپائی ہوتی تھی جس کی ایڑی اونچی اور نوک مڑی ہوئی ہوتی تھی۔

پاجامہ

پائجامہ بر کے پائنچوں کا مشروع کا پھول دار جس میں ریشم اور سوت ملا ہوا ہوتا تھا۔

علما سفید چکن پہنتے تھے جس کے بند اوپر کو ہوتے تھے اور عمامہ باندھتے تھے جو گول ہوتا تھا یا چوگوشیہ ٹوپی۔ پائجامہ سفید بر کے پائنچوں کا۔

مجتہدین۔ عمامہ۔ عبا چکن پہنتے تھے اور دوپلی ٹوپی جس کے سرے کانوں کی طرف ہوتے تھے پہنتے تھے۔ کفش زیب پا کرتے تھے اور ایک دوپٹہ سفید کندھے میں اڑا ڈالتے تھے۔

عام مسلمانوں میں روسا اُمرا۔ غُربا سب شامل ہیں۔ روسا نیم آستین۔ یہ ایک شلوکہ ہوتا تھا جسے نیمہ بھی کہتے تھے کہنی تک کی آستین اور صرف ناف تک ہوتا تھا یہ انگرکھے کے اوپر پہنا جاتا تھا۔ کرتا جالی دار جس پر چکن کی بوٹیاں پڑی ہوتی تھیں گھٹنوں تک کا لمبا ہوتا تھا۔ اس پر انگرکھا جامدانی کا پردہ دار جس میں دہنی طرف کچھ کھلا ہوتا تھا تاکہ کرتہ دکھائی دے۔

جاڑوں میں روئی دار دگلا مشروع کا پائجامہ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے چڑھواں مخملی سلیم شاہی جوتہ پاؤں میں۔

صدری مونڈھوں سے کمر تک کی مرزائی ہوتی تھی اس میں قیتونی یا فیتہ کا ساز لگا ہوتا تھا دونوں طرف جیبی دور تکمہ گھنڈیاں کلابتو کا یا ریشمی۔

جاڑوں میں شالی رومال تکونا اور گرمی میں جالی کا رومال تکونہ یا چکن کا رومال اوڑھتے تھے۔ ہاتھ میں چوکھونٹا ایک رومال ہوتا تھا۔ جراب دستانہ کا عام دستور نہ تھا۔

جاڑوں میں چوغہ ضرور استعمال کرتے تھے جس کو آجکل گون کہتے ہیں۔ عام لوگ گرمی میں چکن یا کنپل کے کرتے یا ڈوریئے کے کرتے اس پر تنزیب کا انگرکھا اکہرا کا پائجامہ سلیم شاہی یا بانات کا جوتہ یا میشے کا چڑھواں پہنتے تھے۔ ٹوپی دوپلی یا چوگوشیہ

جاڑوں میں چھینٹ کا روئی دار دگلہ اس کے نیچے مرزائی دھوتر کی۔ نردوں کی رزائی اوڑھتے تھے اور چوگوشیہ دوہری شال کی ٹوپی پہنتے تھے یا دوہری دوپلی گوٹ دار ٹوپی پہنتے تھے۔ گھر میں سب لوگ روی دار شلوکہ جاڑوں میں اور ایک لنگی باندھتے تھے گرمی میں بھی سب لوگ چھوٹی لنگی جسے غرقی کہتے ہیں صرف کولے تک کی باندھے بیٹھے رہتے تھے۔

کایستھ چپکن چوگوشیہ ٹوپی گھٹنا بابر کا پائجامہ پہنتے تھے۔ جاڑوں میں دوہری چپکن اور شروع کا پائجامہ جوتا مخملی پہنتے تھے۔ جوہری عموماً گول دار پگڑی چندری کی رنگین پہنتے تھے اور چپکن کمتر انگرکھا مگر اُن کے انگرکھے کا پردا بائیں طرف ہوتا تھا۔ عموماً ہندوؤں کے انگرکھے کا پردا بائیں طرف ہوتا ہے۔

بنئے مہاجن عموماً دوہری مرزائی کمر تک کی اور دھوتی باندھتے تھے۔ مرزائی نیم آستین کا شلوکہ ہوتا تھا۔

پنڈت جی۔ پگڑی باندھتے تھے اور انگرکھا دھوتی اور ایک دوپٹہ اڑا لپٹا ہوا گلے سے کمر تک پڑا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دوپلی ٹوپی بھی پہنتے تھے۔ جوتہ چڑھواں پہنتے تھے گھر میں صرف دھوتی باندھے رہتے تھے۔ عام لوگ ایک مرزائی گاڑھے کی اور مارکین کی دھوتی باندھتے تھے۔

جانگیا۔ یہہ ایک چھوٹا سا پائجامہ کسا ہوا صرف کولے تک کا ہوتا تھا۔ پہلوان لوگ اسے پہنتے تھے اور عام غریب لوگ بھی پہنتے تھے۔

لنگوٹ۔ ایک چیٹ لمبی ہوتی تھی جسے پہلوان جانگیا کے اوپر باندھتے تھے۔ اب لنگوٹ کی شکل بدل گئی ہے ایک مثلث کپڑا ہوتا ہے جسے پہلوان جانگیا اور لنگوٹ کے بدلے باندھتے ہیں۔

انگوچھا۔ ایک باریک کپڑے کا رومال ہوتا ہے جسے ہندو لوگ باندھ کر اشنان کرتے ہیں اور اسی کو کندھے پر ڈال کر رومال کے کام میں لاتے ہیں۔

کنٹوپ ایک ٹوپی ہوتی تھی جسے کانوں تک پہنتے تھے یہہ اکثر دوہرا روئی دار کپڑے کا ہوتا تھا۔ اکثر بچے بھی پہنتے تھے۔ مگر ان کے کنٹوپ میں بند لگا ہوتا تھا۔

سردی کے

سردی کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان ضعیف آدمی دوہرا روئی دار گھٹنا پہنتے تھے جس کا استر چھینٹ کا ہوتا تھا یہ کمر اور کولوں کو گرم رکھتا تھا۔

تہمد۔ یہ مسلمانوں کی شرعی لنگی ہے جو کمر سے ٹخنوں تک بدن کو چھپائے رکھتی ہے اسے باندھ کر نماز پڑھتے تھے۔ آج کل یہ عام طور پر پائجامہ کی جگہ لیتی جاتی ہے۔

صافہ کئی قسم کا ہوتا ہے سر میں باندھنے کی ایک پگڑی ہے۔ امیر لوگ ریشمی عمدہ عمدہ صافے باندھتے ہیں۔ غریب لوگ مختلف رنگ کے صافے باندھتے ہیں۔ مسجد کے ملا لوگ نیلا صافہ باندھتے ہیں۔ صافہ اور پگڑی میں فرق یہ ہے کہ صافہ کے دونوں کناروں پر مضبوط کام بنا ہوتا ہے۔

لحاف۔ روئی دار دوہرے کپڑے کا رزائی سے زیادہ دبیز جاڑوں میں رات کے اوڑھنے کے کام آتا تھا۔ اس کا استر نہایت عمدہ ہوتا تھا اور چاروں طرف سنجافی گوٹ لگی ہوتی تھی۔ آج کل اس کے بدلے کمل اوڑھتے ہیں کمل بہت اچھے اچھے قیمتی آتے ہیں مگر وہ آرام نہیں جو لحاف میں تھا۔

دولائی عموماً یہ عورتوں کا لباس ہے گلابی جاڑوں میں دوہرا کپڑا جس کا ابرا جالی یا چکن کا ہوتا تھا اور استر مہین تن زیب کا۔

دوہر یہ موٹے کپڑے کی دوہری چادر ہوتی تھی جسے غریب لوگ اوڑھتے تھے۔

انگیا کرتی۔ عورتوں کے سینہ کا لباس تھا اس میں بہت تکلف کئے جاتے تھے اکثر جالی کی کرتی بنائی جاتی تھی انگیا میں پشت پر مضبوط بند لگے ہوتے تھے جو کس کر باندھے جاتے تھے۔

موباف۔ یہ بالوں کا لباس تھا جو چوٹی کے ساتھ گوندھا جاتا تھا۔ یہ شال باف کا ہوتا تھا اکثر اس میں لچکا ٹنکا ہوتا تھا۔

ہمیانی۔ یہ ایک جالی دار موٹے کپڑے کی مضبوط تھیلی ہوتی تھی جس کے دونوں

کناروں پر بند لگے ہوتے تھے اس میں روپیہ پیسہ رکھ کر لوگ کمر میں باندھ لیتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے یہہ دولت کا لباس تھا۔

ازار بند۔ یہہ پائجامہ باندھنے کے واسطے ایک بند ہوتا تھا ریشمی یا سوتی لوگ اسی میں پیسے باندھتے تھے۔

بٹوا۔ کپڑے کا ایک تھیلا ہوتا تھا جس کا منہ ڈورا کھینچنے سے بند ہو جاتا تھا اور دوسرا ڈورا کھینچنے سے کھل جاتا تھا۔ اس میں لوگ روپیہ پیسہ رکھتے تھے اور بعض لوگ تمباکو ڈلی الائچی رکھتے تھے یہہ بھی کمر میں عورتیں باندھ لیتی تھیں۔

پاتاوہ۔ قصبات کی عورتیں پاتاوہ پہنتی تھیں جس کی شکل گاندھی کی جوتی سے ملتی جلتی ہے۔ پاتاوہ بہت سستا آتا تھا اور نہایت آرام دہ تھا یہہ پاؤں کا لباس تھا۔

پگیا۔ پگڑی کا بگڑا ہوا نام ہے ٹول کی پتلی بتی کی پگیا مارواڑی باندھتے ہیں بہت لمبی اور پتلی ہوتی ہے۔ مرزائی دوہری پہنتے دھوتی باندھتے ہیں۔ عموماً یہہ لوگ دیسی کپڑا پہنتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک رسم خاص ابتک جاری ہے کہ مُردے کو گاڑھے کا کفن دیتے ہیں۔ ان کی عورتیں چُنری اوڑھتی ہیں جو مختلف رنگ کا لہریا دوپٹہ ہوتا ہے اور انگیا کا استعمال بھی ابتک ان میں جاری ہے۔

لہنگا۔ خاص ہندوؤں کا پہناوا ہے۔ گھیر دار کپڑا ایک تھان کا جس میں کنارے پر بیل بنی ہوتی ہے اور متن میں چار خانہ عموماً تمام عورتیں پہنتی ہیں اور قصبات میں اسکا رواج بہت ہے۔ یہہ کپڑا دیسی سوسی کا بنتا ہے امیر لوگ ریشمی لہنگے استعمال کرتے ہیں۔ مارواڑی عورتیں عموماً ٹول کے لہنگے بہت گھیر دار لیکن ذرا اونچے پہنتی ہیں انکا گھیر حیثیت دار ہوتا ہے اور اونچا ہونے کے سبب سے پاؤں کے زیور کی نمود بھی قائم رہتی ہے کایستھوں میں اور بنیوں میں آج کل لہنگے کی جگہ ساڑی لے رہی ہے۔ مارواڑی عورتیں گھروں میں لہنگے کے بدلے دھوتی باندھتی ہیں۔ عموماً ہندو عورتیں گھر میں دھوتی باندھتی ہیں۔

لڑکیوں کی پوشاک اوڑھنی یعنی چھوٹا دوپٹہ گھنگریا یعنی مختصر لہنگا کرتی تھا۔
توشک۔ یہہ ایک بچھونا تھا روئی دار گدا جاڑوں میں بچھایا جاتا تھا۔ اُس وقت
ان چیزوں میں جو جو نزاکتیں پیدا کی جاتی تھیں قابلِ تعریف تھیں اب نہ وہ لباس ہے
نہ وہ اخلاق و آداب یہہ سب پُرانی خوبیاں رخصت ہو رہی ہیں۔

عورتوں میں عموماً ساڑی کا اس قدر رواج ہے کہ آئندہ ان کو لہنگا اور پائجامہ سینے کی زحمت سے نجات مل جائے گی۔ مردوں میں تہمد اور دھوتی اپنا راج کر رہی ہے اور متوسل طبقہ میں انگریزی لباس عورت اور مرد دونوں کا ستر پوش ہوتا جاتا ہے۔

یہہ لباس بڑے بڑے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو سینے پرونے کی تکلیف اُٹھانا نہیں پڑتی۔ لباس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب ہمارے لئے سرمایہ ناز متی جاتی ہے۔

اب دسترخوان تخت پہ بچھا کر کھانا کھانا اور ہاتھوں کو آلودہ کرنا جرم ہے۔
اسی طرح چوکا دیکر کھانا کھانا حماقت میں شمار کیا جاتا ہے۔ کھانے کے تکلفات کو زینت دینے کے لئے میز کرسی برقی روشنی کے ہم محتاج ہیں۔ کھانے کے بعد ہارمونیم نہو تو ہمارا کھانا بے مزہ ہو جاتا ہے۔ فونوگراف ہماری روحانی غذا ہے۔

جن دروازوں پر ہاتھی بندھتے تھے فٹن اور فینسوں کی کثرت تھی وہاں موٹر کار نظر آتے ہیں۔ دیوٹ چراغ شمع فانوس جھاڑ کنول اپنا اپنا بوریا باندھ کر سفر کر رہے ہیں۔ بجلی کی روشنی قدم ناز بڑھا رہی ہے۔ فراشی پنکھا تاڑ کے پنکھے بانس کے پنکھے کھجور کی پنکھیا کی جگہ بجلی کے پنکھوں نے چھین لی۔

لباس کی تبدیلی نے وضع اطوار کو بدل دیا۔ اگرچہ ہمارے بعض لیڈر ہم کو پُرانی وضع اور کھدر کی طرف کھینچ رہے ہیں مگر زمانہ کا رُخ دوسری طرف ہے۔

(خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت۔ لکھنوی)

تذکرۂ فردوسی

بادشاہ محمود کو جب شاہنامہ کو نظم کرانے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے عنصری کو یہہ خدمت سپرد کی اوّل اس نے رستم اور سہراب کی لڑائی کو نظم کیا اسی زمانہ میں فردوسی نے غزنی آنا چاہا اور ایک دوست کو لکھا کہ میں آنا چاہتا ہوں اُس نے جواب میں لکھا کہ اگر یہاں آؤ تو سمجھ کر آنا یہاں بڑے بڑے شاعر دربار میں موجود ہیں اُنکے نام بھی لکھ بھیجے کہ رودکی۔ عنصری۔ فرخی۔ عسجدی۔ ترمذی۔ فرخی۔ وغیرہ موجود ہیں۔ فردوسی نے جواب میں لکھا کہ ؎ چہ سنجد بہ میزان من عنصری + گیا چوں کند پیش گل ہمسری + زبے دانشی باشد و کودکی + کہ رائے فزدنی زند رودکی + بگوش ار سد و بشم بسے مژدہ ہاست ولم گنج گوہر زباں اژدہاست + فردوسی غزنی آیا اور ایک درباری کے ذریعہ سے اسکا نظم کلام پیش ہوا۔ اس نے اوّل رستم اور اسفندیار کی لڑائی کو نظم کیا تھا۔ جب محمود نے فردوسی کا کلام سنا تو دل وجان سے اس کا عاشق ہو گیا اور کل شاہنامہ کی نظم کا حکم دیا رستم اور اسفندیار کی لڑائی کے اکثر ملخص شعر میں درج کرتا ہوں۔ پہلے دن کی لڑائی میں اسفندیار نے رستم کو تیروں سے اس قدر زخمی کر دیا کہ اُس کو اپنی زیست کی امید نہ رہی۔ رستم کو یہہ مصیبت پیش آئی کہ جو تیر اسفندیار کو مارتا تھا وہ کچھ کام نہ دیتا تھا کیونکہ اسفندیار کا جسم زرتشت پیغمبر کی دُعا سے کانسی جیسا سخت ہو گیا تھا۔ اس پر کوئی ہتھیار کارگر نہ ہوتا تھا۔ جب رستم گھر آیا اور زال یعنی رستم کے باپ نے اُسے دیکھا تو زال بدحواس ہو گیا۔ زال کو سیمرغ نے پرورش کیا تھا۔ اس لئے کہ سام نے زال کو منحوس سمجھکر جنگل میں ڈلوا دیا تھا سیمرغ اُسے اُٹھالے گیا اور پرورش کیا۔

یہاں ناظرین کی دلچسپی کے لئے۔ یہہ بھی لکھتا ہوں کہ فردوسی نے سیمرغ کو جانور

پرندہ جانا ہے مگر یہہ غلط ہے سیمرغ آزاد دراصل ایک نامور حکیم متقدمین حکما ایران سے ہے بہت ازادطبع تھا اور تنہائی پسند اس کی طبیعت واقع ہوئی تھی کوہ البرز میں اس کا مسکن تھا یہہ ہی زال کو اُٹھالے گیا اور اس کو پرورش کیا تھا اور اس کی تعلیم تربیت کی اس لئے زال بھی متقدمین حکما میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک قول اسس کا شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے گلستاں میں نقل کیا ہے (دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد) اور سیمرغ کے اقوال علم الہیات میں بہت ہیں۔

خلاصہ یہہ کہ سیمرغ کو زال نے طلب کیا اور رستم کو دکھلایا اُس نے کوئی الیسا مرہم لگایا کہ رستم اور گھوڑے کے زخم فوراً مندمل ہوگئے۔ رستم نے کہا کہ کل لڑنے جاؤں گا تو پھر اسفندیار میرا یہہ ہی حال کردے گا۔ سیمرغ نے کہا کہ اسفندیار کا جان سے مارنا مناسب نہیں ہے جو اُسے مارے گا وہ بھی زندہ نہ رہے گا۔ بہتر ہے کہ اس کو اندھا کردے۔ رستم کو سیمرغ نے ایک دوشاخہ لکڑی بتائی کہ اسے آگ پر سیدھا تیر کی شکل میں بنالے اور اس سے اسفندیار کو مار وہ اندھا ہوجاوے گا۔ اب اس لڑائی کے ملخص اشعار ملاحظہ کیجئے صبح رستم لڑنے گیا تو اسفندیار نے کہا۔

توازجادوے زال گشتی درست ٭ وگرنہ کنارت ہمی دخمہ جست ٭ چنانت بدوزم تنت را بہ تیر
کہ نایدبہ ہر چارۂ زال پیر ٭ (رستم نے کہا)

نہ امروز من بہر جنگ آمدم ٭ پئے پوزشش نام و ننگ آمدم ٭ بہ ترس از جہاندار یزدان پاک
خرد را مکن بر دل اندر مغاک ٭ تو با من بہ بے داد کوشی ہمی ٭ دو چشم خرد را بپوشی ہمی
مکن نام من زشت و جان تو خوار ٭ کہ جز بد نیاید ازیں کارزار ٭ کشایم دیگنج دیرینہ باز
کیا گرد کردم بروز دراز ٭ کنم بار بر بارگی ہائے خویش ٭ بگنجور دہ تا براند زپیش
ہزارانت گوہر دہم شاہوار ٭ ہماں تاج با یارہ و گوشوار ٭ ہزارانت کودک دہم نوش لب
لونڈت پرستندہ در روز و شب ٭ ہزارت کنیزک دہم خلخی ٭ کہ زیبائے تاجے دہم فرخی
در گنج سام و نریمان و زال ٭ کشادہ کنم پیشت اے بے ہمال

زدل دور کن شہریارا تو کیں ٭ مدہ دیو را در تن خود کمیں

(اس ساری خوشامد کے جواب میں اسفندیار نے کہا)

مرا گوئی از راہ یزداں بگرد ٭ ز فرمان شاہ جہاں دیدہ مرد ٭ چو دانست رستم کہ با ہر دکار نیاید ہمی پیش اسفندیار ٭ (جب رستم سمجھا کہ خوشامد کام نہیں دیتی اور اس کی موت ہی مقدر ہو چکی ہے تو کہا کہ اچھا پشوتن اپنے بھائی کو بلا کہ وہ گواہ ہو)

خروشید و گفتا پشوتن بخواں ٭ کہ باشد گوا ہم براین داستاں ٭ کہ من چند گونہ یزدہش کنم نکردہ بدی راہ پورش کنم ٭ (اسفندیار نے کہا کہ پشوتن کون سا دور ہے قریب کھڑا ہوا سب کچھ سن رہا ہے) پشوتن نہ دور است داند ہمی ٭ زنا داستاں با بخواند ہمی (خلاصہ یہہ کہ پشوتن آیا اس سے رستم نے کہا) ؎ چنیں گفت پس با پشوتن بزند کہ اے پاک دل مرد گردن فراز ٭ بسے لابہ کردم با سفندیار ٭ نیامد برش لابہ کردن بکار تو دیدی و بینی ز من بندگی ٭ نہ پنہر رفت و سیر آمد ز زندگی ٭ اگر او شود کشتہ بر دست من زمن باز گوئی بہر انجمن ٭ کہ رستم بسے لابہ زاری کرد ٭ نہ بد سود نزدیک آزاد مرد (یعنی رستم نے کہا کہ تو دیکھ رہا ہے کہ میں کس قدر اس کی خوشامد کر رہا ہوں مگر یہہ لڑائی سے باز نہیں آتا اگر یہہ میرے ہاتھ سے مارا جاوے تو ہر جگہہ کہہ دینا کہ رستم نے تو خوشامد کرنے میں کمی نہیں کی مگر اسفندیار کی قضا ہی نہ مانا۔ جب دیر ہوئی تو اسفندیار سمجھا کہ رستم لڑائی سے جی چراتا ہے اور بہانہ کر رہا ہے تو اسفندیار نے للکار کر کہا۔ بیا تا چہ داری تو از کار جنگ ٭ کہ جستی بگیتی بسے نام و ننگ (اب اگلے شعروں کی خوبی کو ملاحظہ کرو) چو بشنید رستم غو رزم ساز ٭ بدانست کامد زمانش فراز ٭ کماں را بزہ کرد و آں تیر گز کہ پیکاں را دادہ بد آب رز ٭ ہماں گہ نہاد ش در آور کماں ٭ سر خویش کردش سوئے آسماں ہمی گفت کاے داور ماہ و ہور ٭ فزایندۂ دانش و فرّ و زور ٭ ہمی بینی ایں پاک جان مرا روان مرا ہم توان مرا ٭ کہ من چند کوشم کہ اسفندیار ٭ مگر سر بگرداند از کار زار

تو دانی کہ بے داد کوشد ہمی ✦ بمن جنگ و مردی فروشد ہمی ✦ بباد آفرین این گناہ ہم گمید
تو اے آفرینندۂ ماہ و تیر ✦ چو در کار چندی بد بدیش درنگ ✦ کہ رستم ہمی دیر شد سوی جنگ
بدو گفت کہ ای رستم نام دار ✦ بث رسیر جان تو از کار زار ✦ ببینی کنون تیر گشتاسپی
دل شیر و پیکان لہراسپی ✦ یکے تیر بر ترک رستم بزد ✦ چنان کز کمان جوانان سزد
(یعنی رستم نے خدا سے عرض کیا کہ تو دیکھ رہا ہے کہ میں لڑنا نہیں چاہتا اور یہہ چاہتا ہوں کہ یہہ لڑنے سے باز آئے مگر یہہ جان کھونے کو آمادہ ہے۔ اگر مارا جائے تو میرا گناہ نہ سمجھا جاوے جب دعا کرنے میں دیر ہوئی تو اسفندیار نے یہہ کہکر کہ تو لڑنے سے کچیا گیا۔ لے اب تیر میرا سنبہال اور یہہ کہہ کر تیر مار ہی دیا۔ اب رستم نے بھی ؎

تہمتن گز اندر کمان راند زود ✦ بدان سان کہ سیمرغ فرمودہ بود ✦ بزد راست بر چشم اسفندیار
سیہ شد جہان پیش آن نامدار ✦ نگوں شد سر شاہ یزداں پرست ✦ بیفتاد جاجی کمانش ز دست
گرفتش بش و یال اسپ سیاہ ✦ بخون لعل شد خاک آوردگاہ ✦ (اب رستم کی بن آئی اور اسفندیار سے کہا ؎ چنین گفت رستم زا سفندیار ✦ کہ اے تیغ زن پہلوے نامدار
من از تو صد و شصت خوردم خدنگ ✦ نہ نالیدم از نام در روز جنگ ✦ بیک تیر برگشتی از کار زار
بخفتی برایں بارۂ نامدار ✦ بخوردی یکے چوبہ تیر گزیں ✦ نہادی سر خود بقربوس زین
زگفتار رستم دل تہمتن ✦ بپیچید چوں مار بر خویشتن ✦ فقط

رستم اور اسفندیار کی لڑائی کا یہہ سبب ہوا کہ اسفندیار باپ سے تخت و تاج طلب کرتا تھا اور وہ ٹال رہا تھا۔ اُس نے چاہا کہ کسی طرح اسفندیار مارا جاوے ایک نجمی نے کہا تھا ؎ ورا مرگ در دست رستم بود ✦ ز تیرے کہ در دست رستم بود۔ یہہ معلوم کر کے اسفندیار کے باپ نے اس کو رستم سے لڑنے بھیجا تھا۔ آخر اسفندیار مارا گیا۔ یہہ کل داستان بڑے آب و تاب سے فردوسی نے لکھی ہے۔ اور بہت بڑی داستان ہے۔

(خان صاحب مرزا محمد علی خان صاحب رئیس دہلی)

تحقیق کی روشنی میں

رودکی کے سوانحی حالات

رودکی کے سوانحی حالات بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ حال کے وہ ہیں جنھیں پروفیسر ولیم جیکسن نے اپنی کتاب "EARLY PERSIAN POETRY" میں درج کیا ہے۔ وہ نصر ابن احمد سامانی (۹۱۳ء و ۹۴۲ء) کے دربار کا شاعر تھا۔ لیکن اس کی تاریخ ولادت کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مادرزاد اندھا تھا۔ اس کی شاعری کے متعلق اساتذہ فارسی نے جو کچھ لکھا ہے اور جس درجہ اس کی تعریف کی ہے اس کا اعادہ بے کار ہے۔ لیکن "راحت الصدور" کے ان دو عربی شعروں کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس سے رودکی کے مرتبہ پر کافی روشنی پڑتی ہے وہ اشعار یہ ہیں:-

لولاجریرو الفرزوق لمدیلم + ذکرٌ جمیلٌ من بنی مروان

وزی ثناء الرودکی فعلا أ + من کل باجمعت بنو سامان

رودکی کے سب سے زیادہ توجہ طلب سوانحی حالات "سامانی کتاب الانساب" میں ہیں۔

الرودکی بضم الراء و سکون الواؤ وفتح الذال المعجمۃ وفی آخرہا الکاف۔ ہذہ النسبۃ الی رودک ہی ناحیۃ بسمرقند وبھا قریۃ یقال لہا بنج القریۃ قطب رودک وہی علی فرسخین من سمرقند والمشہور منہا الشاعر الملیح القول بالفارسیۃ السائر دیوانہ فی بلاد العجم ابو عبد اللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبد الرحمن ابن آدم الرودکی الشاعر السمرقندی۔ کان حسن الشعر

متین القول۔ قیل اول من قال الشعر الجید بالفارسیۃ ہو د قال ابوسعد الدو یسی الحافظ ابو عبداللہ الرودکی کان مقدماً فی الشعر بالفارسیۃ فی زمانہ علیٰ اقرانہ۔ قال وکان ابوالفضل البلعمی وزیر اسمعیل بن احمد والی خراسان یقول لیس للرودکی فی العرب والعجم نظیر۔ ومات برودک سنہ ۳۲۹ھ

ملخص

رودک سے اس کے نام کو نسبت ہے جو سمرقند کا ایک ضلع ہے اس میں ایک بستی بنج ہے رودک کا مرکز ہے۔ سمرقند سے کوئی دو فرسنخ دور ہے۔ فارسی شعراء میں پہلا پہلا کہنے والا شاعر جس کا کلام ایران میں بہت مشہور ہے۔ عبداللہ جعفر بن محمد بن عبدالرحمٰن ابن آدم رودکی سمرقندی ہے۔ وہ شاعری کا ابوالآبا تھا۔ ابوسعد اللہ دریسی الحافظ کا قول ہے کہ ابوعبداللہ رودکی کا مرتبہ اس کے تمام ہمعصروں سے بلند ہے۔ ابوالفضل وزیر اسمعیل بن احمد والئے خراسان کہا کرتا تھا کہ رودکی عرب اور عجم میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کی وفات ۳۲۹ھ ہجری ہے۔

(ڈیرہ غازیخاں) صادق اثوبی

بہارستان جامی

۲ راحت الصدور روایات السرور۔ خاندان سلجوق کی تاریخ جو تیرھویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔ نیا سلسلہ جلد دوم (محشی محمد اقبال و ای۔ جی۔ ڈبلیو مموریل)

سک مطبو ای۔ جے۔ مموریل۔

سک ابوسعد اللہ دریسی کا بیان ہے کہ رودکی کا مدفن بستی "بنج" ہے۔ میں نے خود اس کا مقبرہ دیکھا ہے۔ بعض تذکرے رودکی کی وفات ۳۳۰ھ اور ۳۴۲ھ کے درمیان قرار دیتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم ۳۰۴ھ قرار دیتا ہے۔

(شعر العجم حصہ اول صفحہ ۴۴ مطبوعہ الناظر پریس) صادق اثوبی

داد کن

دلمیں شوق دید اور کعبہ مقام | منفعل ہے ایسی دینداری سے روح

آ مرے پاس ذرا دیکھ تڑپنا میرا | گر نہ رحم آئے تو پھر باندھ آ نالے سوخ

ترے ستم سے کروں قاتل اب کہاں فریاد | سنا دن کس کو میں کرتا ہے سب جہان فریاد
ترے فراق سے دل بیقرار ہونے لگا | ہجوم شوق سے کرنے لگی زبان فریاد
جگر کے پار ہے تیر نظر عجب کیا ہے | اگر کرے دہن زخم بے زبان فریاد
جو حسن برق نشاں ہو تو عشق رعد فغاں | وہاں ہے خندہ لب تو یہاں فریاد

عزیز شومی طالع سے تنگ آیا ہے
خدا کے واسطے اے دور آسماں فریاد

کھینچے وہ جبین جبین کا جو جبین پر نقاش | ان کی تصویر کو

ملتبس پر نہ پھول نہ جانیز کر کے پر | ہدہد وہ شوخ وہ ہو کہ رکھدے کتر کے پر
ہر دم ہوائے یار میں اڑتا ہے مثل تیغ | بازو میں نالے داغ ہیں گویا جگر کے پر
اس تیلکو جھکوں میں اڑاتا ہی میری بات | اسواسطے جائے اگر اور مگر کے پر
زاہد کو چھٹے دی جو بطے تو کیا عجب | اڑنے لگی ہے خبر کبوتر میں بھر کے پر
شان خدا ہے حسن خدا داد دلچلا | زیور کے زیور آپکے تیتے ہیں پر کے پر
جل ہی گیا اڑا ہی تجلی سے کوہ طور | نکلے عجب فروغ سے ہر ایک حجر کے پر

اے مور الحفیظ کہ نکلے خطر کے پر | ہیں دشمن حیات یہ عمر دگر کے پر

اب جاکے ہوگا بلبل سدرہ کا ہمسفیر | کھولے ہیں شاخ دل سے ہوائے نظر کے پر
وا بستگی ہے یوں گنہ کو محال ہے | ایسی طرح سے کھلتے نہیں مرغ تر کے پر
جاتا کہاں تک اڑکے جو ہوتے کھلے ہوئے | ہوتے ثمرہ دست میں ہیں تیغ تو رگ کے پر
بلبل سے دل میں جلوۂ گل سے یہ گل کھلا | سوز دروں سے جھلکے سب سینہ پر کے پر
حسن خدا نے خار دیا عندلیب کو | گلشن میں رستے پھرتے ہیں سب سوگ کھر کے پر
پہنچی فلک پہ راہ ہوا کا لشتا ہوا | خالق نے مرغ فکر کو بخشے ہنر کے پر
عاشق ہے شمع گل کے بری بات ہے مرفت | سچ کہتے ہیں کہ ہوتے ہیں ایسی خبر کے پر
اگر بان گل پہ جلکے نچا صبح دم قریب | بلبل نہیں ہے مجھے میں تیرے تجھ کے پر
زری ہے او معافی سے سر پر جگہ ملے | ورنہ کہاں کلاہ کہاں جانور کے پر

اڑتا ہوں بان پر دنسی جو بیٹا نہیں عزیز
زیبا ہیں بوئے گل کو نسیم سحر کے پر

عالم سے نرالا ہے مرے ناز کا انداز | دیکھا نہیں آنکھوں نے اس انداز کا انداز
مرنے نہیں دیتا ہے مگر مرتے ہیں عشاق | قاتل سے نکالا ہے کس اعجاز کا انداز

کر دیا عشق نے اب طور تجلی مجھکو | میں وہ شعلہ ہوں کہ ہے شیر و بنا دو آتش

کس سے لکھواؤں کہ پڑھکر اسکو وہ ناخوش نہو | کوئی لکھ سکتا نہیں اس قسم کا دشوار خط

چاہوں اگر مدعی داغ دل | مجھکو زبان دے کے بدلہ شمع

دل نہ ہے بت ہوش ربا کی طرف ۔ اب نہیں جاتا ہے خدا کی طرف

کوئی کیا جانے کہ کیا کرتا ہے عشق ۔ ہر دم اک فتنہ بپا کرتا ہے عشق
بس وہی پاتا ہے عیش زندگی ۔ جسکو غم میں مبتلا کرتا ہے عشق
خستہ کر دیتا ہے دل کو درد سے ۔ خون پلا کر پھر دوا کرتا ہے عشق
سر بسجدہ کر کے بت کے سامنے ۔ لاکو الا کر کے لا کرتا ہے عشق
دیکھتا ہے جس کو معنی آشنا ۔ غرق طوفان بلا کرتا ہے عشق

بنالہ ہے یا آہ رہ عشق میں ہمدم ۔ اس راہ میں ہمراہ نہیں کوئی دل تک
ہر آنکھ میں ہر دل میں ہے وہ صورت زیبا ۔ بتخانہ ہے گویا یہ خدائی ہے جہاں تک

رنگ بدلا جو وہ جوان ہوئے ۔ ہو گیا کھل کے آشکارا رنگ
بوئے گل تری بو کو مان گئے ۔ اور رنگ بدن سے ہارا رنگ

اس بت کی محبت میں عجب نعمت عظمیٰ ۔ کم ہو تو بہت ہو جو بہت ہو تو نہ ہو کم

جب سے عاشق ہوئے غم کھاتے ہیں ۔ آہ وہ دل وہ طبیعت ہی نہیں
اس کی ہر شان قیامت ہے آج ۔ کل جو ہو گی وہ قیامت ہی نہیں
میں نے دیکھی ہیں وہ آنکھیں ساقی ۔ جام مے کی مجھے حاجت ہی نہیں

سکھائی ناز نے قاتل کو بیدردی کی خو ورنہ ۔ رہی بیتاب سینہ میں ہماری آرزو برسوں

نہ پائی کو بکو پھر کر صبا نے جسکی بو برسوں ۔ یہاں وہ کاکل مشکیں ہی طوق گلو برسوں
گرا مجھے میں تجکو دیکھتے ہی واسطہ سوائی ۔ کیا تھا جس دلی نے آبِ زمزم سے وضو برسوں
نہ پوچھو بے نیازی آہ طرز امتحاں دیکھو ۔ ملائی خاک میں غیروں نے میری آبرو برسوں

دیکھ ظالم مرے اشکوں میں جگر کے ٹکڑے ۔ کیا شگفتہ نظر آتا ہے چمن پانی میں
زندہ کرتا ہے ترے منہ کی طراوت پاکر ۔ عجب اعجاز دکھاتا ہے سخن پانی میں
گریہ دے ان کے دل سخت کو جنبش کیونکر ۔ انکو دعویٰ ہے کہ بہتا نہیں کہن پانی میں
حضرت خضر چلو ان کے تکلم کو سنو ۔ غوطے کھاتے ہو کہاں تم لب من پانی میں
داغ ہو جائیں سراپا پر ماہی کے نقوش ۔ سکہ عشق جو دکھلائے چلن پانی میں
چاند ان ہے تلے آب رواں ہے اوپر ۔ یہ دو لائی ہے کہ نسرین و سمن پانی میں
میرے رونے پہ پڑے طول اگر نہیں سوال ۔ اینٹھ جاتی ہے اگر تر ہو رسن پانی میں

بے حقیقت نظر آتا ہے یہ عالم اس کو ۔ جس کو وہ اپنی حقیقت کی خبر دیتے ہیں

کل تو تجھ پر بھی ترا سایہ پڑے لے زاہد ۔ رات بھر اک بت کافر نے جگایا مجھ کو

منہ پر افشاں چنی نہیں جاتی ۔ شرم دوشیزگی نہیں جاتی
جان جائے تو آرزو جائے ۔ یہ بلا جیتے جی نہیں جاتی
الفت زندگی نہیں جاتی ۔ جان بے عشق دی نہیں جاتی
جائیگی ایکدن فراق میں جاں ۔ کیا ہوا گر ابھی نہیں جاتی

کیا کہوں طرفہ ماجرا ہے عزیزؔ | دل گیا بے خودی نہیں جاتی

کس طرح سر نہ جھکے کون ادھر دیکھے | دل ہی جب مائل طاق خم ابرو ہو جائے

دل کو کچھ غم نہ ہو سر میں کوئی سودا نہ رہے | انتہا عشق کی یہ ہے کہ تمنا نہ رہے
اتنے سوراخ ہوں پسلیں کہ جگر خون ہو جائے | فکر دنیا نہ ہو اندیشۂ عقبیٰ نہ رہے
آنکھیں اس نے درد بھی ہوں کہ لہو کا لیں | بہے پھر خشک ہوں سد رہے کہ قطرہ نہ رہے
کبھی نالہ ہو کبھی آہ کبھی خاموشی | سارے غم ہوں مگر آخر میں کچھ اصلا نہ رہے

نالہ لیلے یہ ہوا قیس کا انجام بخیر
وہی عاشق ہو کہ جسکو کوئی پروا نہ رہے

کیا بتاؤں کس طرح جاتا دل | دل اگر حال دل کا دیکھتے

دل سے دیتا ہوں دعا شور تبسم کو ترے | سر نگوں زخم جگر پر یہ نمکداں ہے

کاکل کے پیچ و تاب میں حلقے ہیں جال کے | پہنے جدا جدا ہیں ترے بال بال کے
دیکھا جو تم کو آنکھوں نے دل بے خبر ہوا | جاتے رہے خیال سے مضمون خیال کے

مسلمان ہو وہی جسکا کسی کافر پہ دم نکلے | جہاں کعبہ سر سجدہ وہی نقش قدم نکلے
دل عاشق میں بجز عشق کچھ باقی نہیں رہتا | اگر چاک پروانے کا دل شمع حرم نکلے

کسی چشم سیہ کا غمزۂ افسوں بجا ہی | نہ پوچھو ہم سے کچھ تم کو بھی افسانا آتا ہے

ہے اصل شفق نہیں کی ابرو | شمشیر ہلال خون بہو کی
جکڑ دیا ہے اونکے غم سے اب دل | کہتا ہے قسم مرے لہو کی
لائی ہے نسیم ان کی خوشبو | حاجت نہیں ساغر و سبو کی

جناب عزیزؔ کو فارسی زبان سے ایک خاص ذوق ہے۔ لیکن اردو سے بہت کم دلچسپی ہے جس کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ جس زمانے میں غالبؔ اور ذوقؔ کے سہروں کے متعلق موازنے اور مباحثے ہو رہے تھے اس وقت جناب عزیزؔ نے بھی اسی زمین میں ایک سہرا لکھا ہے۔ سہرے کے چند اشعار سخن شناس ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

سہرا

کیا ہر دو ناز سے ہے پہو یہ سطر سہرا | دامن باد بہاری ہے سرا سر سہرا
چن کے گلہائے بہشتی کو ملک لائے ہیں | تار انفاس مسیحا سے بنا کر سہرا
رخ جو مصحف کا ورق ہو تو یہ لڑیاں سطریں | چومیں حوریں جو دیکھیں یہ منور سہرا
اوڑھے اسکو کوئی پردہ نشین عفت | اس تمنا سے بنا نور کی چادر سہرا
غمزہ و حیلہ و انکار و حیا و شوخی | سب کو کر لیگا کمند دنسے مسخر سہرا
آنکھ ہے دنیں فروغ اسکی تجلی شب روز | کس قدر بڑھ کے شعاعوں سے ہے پر زر سہرا

غنچہ و گل ہی کھلائیگا شگوفہ کچھ اور | خلوت ناز میں سہرے کے برابر سہرا
ہنس کے یہ ہو گو کہ ہانہے تماشائے بہار | سر پہ باندھے ہوئے وہ آئینہ پیکر سہرا
حجلۂ وصل میں کیا خوب ستارے ٹوٹے | ہو گیا فرش بنالی پہ نچھاور سہرا
دونوں صیادوں میں وہ دونوں ہم تا مین میں | ہے ادھر زلف ادھر زلف کا ہمسر سہرا
جھوم کر باؤ نسیم گر نہ ب دیتا ہے | مست ہے دیکھ کے حسن رخ انور سہرا
سر جو قبلہ ہے تو ناق خم ، و محراب | حرم اللہ میں زیبا نہ ہو کیونکر سہرا
عیش ہم سو رہا بیش کر جو عروس دا ماد | عطر ٹمو عہ بنا دونیں لیں کر سہرا
کا پہنا ہے کر بہو بار تمساں نازک | سر پہ دولہا کی ٹھہرتا نہیں دم بھر سہرا
حوریں جن جنکو اٹھائیگییں زیور کے لئے | رہ گیا ٹوٹ کے جتنا سر بستر سہرا
چمنستان نظر آتے ہیں ستارے شب کو | کس قدر ہے دل انجم میں مصور سہرا
وقت رخصت کا جو آیا تو ہوا پژمردہ | سر و دستار سے نوشہ کی لپٹکر سہرا
راحت خلوت و ننگ طرب و روز عروس | گل گل افروز سر ناز گلو ہر سہرا
نہ ہے ذوق جو کہتا ہو تو کامل ہے امیر | کیوں دل آ در نہ ہوا کس طرح پر سہرا
فارسی گو ہوں میں اردو کا مجھے شوق ہے کم | برسوں کہتا بھی نہیں اور کہوں اس پر سہرا

ہاشمی نے بہت اصرار کیا مجھ سے عزیز
پاس خاطر سے لکھا اشل سخن در سہرا

انتخاب خستم فکر

حلق پر خنجر چلا اور تہ ہم رہا | جان دینے پر بھی اسکا غم رہا
کعبہ کیسا سجدہ کیا کیسی نماز | عمر بھر سر ان کے در پر خم رہا

سخت جانی سے نہ ٹوٹا آبلہ | درد پیدا کر کے دل پر جم رہا
دل خود اپنا جوش پی جایا کیا | دیدۂ خوں شوق سے پرنم رہا

محبت زہیں مرکر بھی رکھا شتہ جا برسول | زمیں کی خاک نہ کھا ئی ہمارے استخوان برسوں
نہ پایا چین مرنے پر بھی دم بھر زخم خنجر سے | تپیدیں خاک میں ہے کفن کی دھجیاں برسوں
رہو نگا مرکے بھی انکے حرم میں خاک در ہو کر | رہا ہے سجدہ گاہ عشق سنگ آستاں برسوں
جنون عشق ہی پہانہ چھوڑا جان لینے پر | اڑائی خاک مدفن جنے زیر آسماں برسوں
کمر باندھی جب انہوں عاشقوں کو قتل کرنے پر | پکاری قضا چار طرف سے الاماں برسوں

ہو کے آزاد جنوں ہم سخت ناداں ہو گئے | جاتے ہیں گردوں یہ دنیا کو بیاباں ہو گئے
شور محشر پوچھتا ہے اک دبی آواز سے | کیا وہ خواب ناز سے اٹھکر خراماں ہو گئے
بیٹھے بیٹھے کیوں اٹھا یہ کیا کیا اے شور عشق | ولولے جتنے آپنے تھے سب نکو ہل ہو گئے

کیسے ہم آشفتۂ شام غریباں ہو گئے | عمر بھر کے خواب خواب پریشاں ہو گئے
ہو گئے تحلیل دلمیں اب کہیں ملتے نہیں | سینۂ زخمی میں گم تیروں کی پیکاں ہو گئے
تم نے جب پردہ اٹھایا سنہ سے خنداں ہو گئے | زخم دل سنبل ہی کے پردے میں پنہاں ہو گئے
کیا صفائی حسن رخ ہی کیا بہار باغ دل | تم جو آئینہ بنے ہم بھی گلستاں ہو گئے
ہاتھ میں خاتم سر پہ حسن پر گئی فردز | گر لڑکپن میں پری تھے اب سلیماں ہو گئے

تم آؤ دلمیں نکر ہر جان ورہ جنیں نکلی | الہیٰ کوئی کیونکر آرزو دل سے نہیں نکلی
مجھے دیکھا تو انکے دل سے وحشت ہی نہیں نکلی | غضب نکلا ستم نکلا کجی کیا تہ کہیں نکلی

نگاہ ناز نے چشم سرگیں سے شرنگیں نکلے — یہاں جان لے کے آنکھوں سے نگاہ و پیکاں نکلے
وہ انکی بدگمانی کس بلا کی نکستہ چین نکلی — کہ دل سے جبکہ اس خال سیہ کی قسمیں لیں نکلی
بہت اندیشہ ہے کیا پیش لائے چین پیشانی — وہ بہو لیں گے مجھے گر انکی پیشانی سے چین نکلی

عزیزاں نے جو پوچھا مجھ سے میری وحشت دلکو
کہا میں نے کہ ہاں نکلی کہا ضد سو نہیں نکلی

کم ہیں جو خائف آفات منازل نہ ہوئے — طالب ہمرہیٔ رہبر کامل نہ ہوئے
سُنے واعظ کے بیانات بہت ہم نے مگر — خلل انداز ملامت کشیٔ دل نہ ہوئے
سنتے ہیں بلبل سدرہ کے نوا میں ہر وقت — ہم کبھی والہ گلبانگ عنادل نہوئے
صوت سرمد نے جنہیں مست کیا مست ہوئے — کبھی مشتاق بم و زیر جلاجل نہوئے
نہ ہوئے ہمسر زلفیں شعاعوں کے خطوط — حد یہ ہے طول امل کے بھی سلاسل نہوئے
وہ تڑپتے ہی رہے چین نہ پایا دم بھر — جو کسی خنجر بیداد کے گھائل نہ ہوئے

بہولے سب حیلے کوئی حیلہ بنائے نہ بنے — ایسی بیچینی سے کھنچوں کہ بن آئے نہ بنے
لن ترانی جو وہ کہتے ہیں کہیں بسم اللہ — ہم وہ موسےٰ ہیں کہ بے جلوہ دکھائے نہ بنے
عشق اک شعلہ جوالہ ہے اعوذ اللہ — لاکھ پردوں میں اگر کوئی چھپائے نہ بنے
آپ خوش ہو کے ملیں ہم سے یہ ہے امر محال — ممتنع کو اگر اللہ بنائے نہ بنے
آپ کے کوچہ میں بیٹھا ہوں میں دیوانۂ شوق — لیلیٰ بھی آئے تو بے پردہ اٹھائے نہ بنے
بگڑے ہیں ایسے وہ ہم سے کہ الٰہی توبہ — ہم کو اور ان کو جو تقدیر ملائے نہ بنے

احقر سید احمد حسن اثر صفی پوری

صلائے عام۔ مجھے افسوس ہے کہ حضرت عزیز صفی پوری کے انتقال سے ہندوستان ایک بڑے ذی کمال سے خالی ہو گیا۔ جناب اثر نے یہ مضمون انکی وفات سے ذرا پہلے لکھا تھا گو آپ کی عمر زیادہ تھی۔ مگر آپ جس قدر زندہ رہتے آپکا زندہ رہنا ہی ایک کمال عزت کا باعث تھا۔ فارسی نظم ونثر میں آپ کا ہمسر غالب دہلوی کے بعد دوسرا پیدا نہ ہوا۔ اور آگے بھی مجھے اندیشہ ہے کہ شاید ہی اس مرتبہ کا شاعر و نثر نگار پیدا ہو۔ فارسی میں تو آپ کی ہمسری کی مجال نہیں۔ مگر اردو میں بھی آپ کا کلام اساتذہ سے کسی طرح کم رتبہ کا نہیں۔ میں نے سرسری نگاہ سے جابجا صاد کر دیا ہے۔ جناب اثر کا احسان ہے کہ آپ نے بہت اچھا انتخاب کیا جناب سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر کا میں شکر گزار ہوں۔ کہ آپ نے حضرت عزیز جیسے صاحب کمال کے حالات اور تصنیفات سے مجھے واقف کیا۔ اور سچ پوچھئے تو جناب سید صاحب موصوف ہی کی کوششیں حضرت مرحوم کی تصانیف کی شہرت و مقبولیت کا باعث ہوئیں۔

صلائے عام

عرصہ سے یہہ دستور ہوگیا ہے کہ اکثر رسالوں کے خاص نمبر نکلا کرتے ہیں صلائے عام نے یہہ طریقہ اختیار نہیں کیا : اگر تعلّی نہ سمجھی جائے تو از روئے خوبیٔ مضامین صلائے عام کا ہر پرچہ خاص نمبر ہوتا ہے +

خاص نمبر نکالنے کے عوض صلائے عام شروع سے سال بہ سال ترقّی کرتا چلا آتا ہے۔ اس وضع کے نباہنے کے لئے ارادہ ہے کہ آئندہ سال یعنی جنوری ۱۹۲۹ء سے صلائے عام کے خوبیٔ اہتمام و مضامین پر خاص توجہ کی جائے + مستقل مضامین مثلاً **مضمونِ پریشاں** اور **صلائے عام** کے عنوان وغیرہ کی پیشانیوں کے بلاک انگریزی ٹائپ میں تیار ہو رہے ہیں۔ مضامین کی زبان کلاسیکل یعنی اساتذہ کی زبان کی یادگار ہوگی۔ ہر مضمون پاکیزہ بیانی و متانت و شائستگی کا نمونہ ہوگا : اور ساتھ ہی معلومات و تحقیق کا خاص خیال رکھا جائے گا + صلائے عام کا آئندہ سال گویا خاص نمبروں کا مجموعہ ہوگا + زیادہ کیا عرض کیا جائے +

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چہ روپئے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نیز یہ ضروری ہے کہ ہر مضمون خواہ وہ شائع کیا جاوے یا نہ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہیئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کی اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی بسان عروسِ جمیل و لباسِ حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے +

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی +

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں :-

زبانِ اردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے۔ [illegible]
" " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " تین ماہ کیواسطے۔ [illegible]
" نصف صفحہ ایکسال کیواسطے ... [illegible]
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے [illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایکدفعہ کیواسطے ... [illegible]
" نصف " " . [illegible]
" چوتھائی " " [illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دگنی اُجرت ہوگی۔ اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہیئے +

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ :-
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد علوی چھپا اور شائع ہوا۔
Printed and Published by Mir Nasir ali Khān Bahādur (Editor) at the Nasri Press, Farrsh Khāna Delhi

SALA-I-AM, DELHI. Regd. No. L. 1462

صلاے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A [illegible] Monthly Magazine devoted to the cause of [illegible] literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement and the assimilation of the best features of the new civilization.

[illegible]

[illegible] Press, Farashkhana Delhi

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ جنوری ۱۹۲۹ء

صلائے عام

SALA-I-AAM DELHI

یہ عنوان کسی خاص مضمون کا نہیں ہے، صرف دو ایک معمولی و غیر معمولی باتیں بیچ میں عرض کرنی ہیں: یعنی آگے چل کر مضامین تو آپ باضابطہ آفیشل سمجھئے، یہ ڈیمی آفیشل ہے: جسطرح فارسی کے فن حسابداری میں حساب کی مدیں اکثر رسمی ہوتی ہیں مگر سب بکار آمد ع بیکارم و باکارم چوں مد حساب اندر ۔ اس پرچہ میں کوئی معمولی مضمون ہیں جو ہمیشہ ہوتے ہیں مگر صلائے عام کے معمولی مضمون بھی طرز بیان [illegible] خاص اور غیر معمولی مضامین سے کم نہیں سمجھے جاتے ۔ مضمونِ پریشاں (صفحہ ۱۰-۱۴) [illegible] پہلا [illegible] ہے پھر بھی عجیب خیال ہیں اور کہ ہر مضمون نیا سمجھا جاتا ہے ۔ استقبالِ سالِ حال (صفحہ [illegible]) [illegible] گلستان [illegible] حضرت ریاض کا ساقی نامہ داد طلب ہے ۔ جناب فانی کا کلام مجھے بہت [illegible] پسند ہے [illegible] (صفحہ ۵ تا ۱۲) ۔

فریب زمانہ (صفحہ ۱۰-۲۲) نیا مضمون ہے۔ اس طرز کے مضمون ذرا کم دیکھنے میں آتے ہیں: صلائے عام کے اکثر مضمونوں میں خیال کی تعلّی کے ساتھ اُسی مرتبہ کی ادائے بیان کی بھی تلاش رہتی ہے ۔

ہندوستانی و انگریزی تہذیب (صفحہ ۲۲-۳۴) سر سید احمد خاں بہادر کے **تہذیب الاخلاق** میں نکلا ہوتا تو زیادہ کارآمد تھا مگر یہاں بھی حضرت ہی کی کاسہ لیسی سمجھنی چاہئے کہ آپ کے دسترخوان سے جو کچھ بچا کھچا رہ گیا وہ پیش ہوتا رہیگا کہ "حاضر میں حجت نہیں" ع بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست ۔

نوشیرواں کا خواب اور تعبیر خواب (صفحہ ۴۱-۴۳) خاں صاحب جناب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی نے **شاہنامہ** کی قدرشناسی میں بہت خوب لکھا ۔ مرزا نوشہ (جناب اسداللہ خاں غالب) کی شاعری کے متعلق جناب آغا صاحب دہلوی نے نئی بات پیدا کی ہے کہ حضرت نہ صرف لاجواب شاعر تھے بلکہ ولی اللہ بھی تھے ۔ جناب صادق ایوبی نے **توازن عمل** کا مضمون بہت عمدہ لکھا (صفحہ ۲۹-۴۰)

جناب مولوی مقتدر خاں صاحب شروانی کی عنایت سے اس مہینہ کے تیسرے عشرہ میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے چند کتابیں بغرض ریویو میرے پاس آئیں۔ ان کے پہونچنے کا وقت میں نے عمداً لکھا ہے کہ اس سے پہلے پہونچتیں تو مجھے بڑا آرام ملتا کہ ان کا ریویو اس مہینہ کے صلائے عام کا بہت اچھا مسالہ تھا۔ مجھے اپنی طرف سے مضمون نہ گھڑنے پڑتے ۔ حضرت امیر خسروؒ کی مثنوی **مطلع الانوار** کے دیکھنے کا مجھے عرصہ سے شوق تھا۔ اگر جیتا رہا اور خدا نے چاہا تو اگلے مہینہ میں یہ آرزو پوری ہو جائے گی : جناب مولوی صاحب شروانی کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ابھی سے میرے مشغلہ کا نہایت پاکیزہ سامان مُہیّا کر دیا ۔ جب ایسا لذیذی مسالہ جمع ہو تو اگلے مہینہ کے صلائے عام کی نسبت کہنا کہ کیسا ہوگا بے کار ہے ۔

استقبالِ سالِ حال

(غرۂ ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء)

کل ۳۱ دسمبر کی رات سنہ ۱۹۲۸ء سے جدائی کی تھی۔ آج کی صبح سنہ رواں سے ملاقات کا پہلا دن ہے: دن کا شمار کوئی کہیں سے کیا کرے یار لوگ یعنی ہندوستان میں صبح سے دن نکلنا قرار دیتے ہیں۔ اس لئے جنوری کی پہلی تاریخ ہم آج کی صبح سے سمجھتے ہیں ٭ کل تک جو ہوا وہ سنہ ۱۹۲۸ء کے ماتھے گیا۔ یکم جنوری سے سنہ ۱۹۲۹ء سے ہماری پہلی ملاقات سمجھئے ؎

ہجر کی رات بری وصل کا دن اچھا ہے ٭ بلکہ جس سال میں یہہ دن ہو وہ سال اچھا ہے

جس طرح ہر شخص کو نئی صورت سے پہلے پہل ملکر خاطر مدارات کا خیال ہوتا ہے۔ شعرا جب زبان کھولتے ہیں تو پہلے ساقی کو یاد کرتے ہیں ٭ شعر و سخن میں یہہ رسم سنتِ موکدہ میں داخل ہوگئی ہے کہ سامانِ عیش میں ساقی و بادہ گلگوں جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں: حضرت حافظ رح اور عمر خیام اور تمام شعرا، ماضی و حال گواہ ہیں ٭ شعرا

یونان بھی اُس کے عادی تھے اور اس شغلہ کو عبادت میں سمجھتے تھے۔ بیکس[1] نامے دیوتا کے نام سے پکارتے تھے + میں قسم تو نہیں کھاؤں گا مگر تمام قدیم و جدید زمانوں کی شاعری میں آغازِ کلام اکثر ساقی ودئے خوش رنگ سے دیکھنے میں آیا ہے سرد ملکوں میں بوجہہ ضرورت اس کا خیال رہا کہ دماغ گرم کرنے کی تدبیر یہی موزوں تھی: بقول حضرت جوشش ؎ جز چشمِ بتاں میکدۂ دہر میں جوشش: ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا +

اتفاق سے اس وقت میرے سامنے فرانس کے ایک قدیم شاعر کا ساقی نامہ ہے جو حسنِ بیان میں ہمارے ہاں کے فارسی عربی و اُردو کے ساقی ناموں سے کسی طرح کم نہیں۔ ترجمہ میں اصل کی خوبیاں ممکن نہیں اور پھر نظم سے نثر میں اور بھی مشکل ہے + لیکن نئے سال کی تقریب میں یہہ تحفہ خاصہ ہے +

اُس ساقی نامہ کا شاعر اس طرح شروع کرتا ہے کہ :-

بے کار فکرِ سخن میں شعرا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اور جمائیاں لے لیکر کسی کے خط و خال کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔ جمائیاں لے لیکر اسلئے کہا کہ ہزار بار وہی کہے جاتے ہیں جس میں جی نہیں لگتا + لیلےٰ و شیریں۔ ہیر و دمن کی تعریف اوروں کو مبارک! مجھ سے ان کہن سال لعبتوں کی مدح سرائی کی امید نہ رکھئے + وہ سیاہ رنگ کی لیلےٰ کہ اسم بامسمےٰ تھی۔ اس کا ریگ بیابان میں محمل پر نکلنا تماشے سے زیادہ نہ تھا۔ کہاں یار کی محشر خرامی اور کہاں شتر بے مہار کی چال کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے + شیریں کی تعریف کوئی خاک کرے جس کے

چاہنے والوں میں لوہار تھا جس کا پیشہ پتھر پھوڑنا تھا۔ یہاں تک کہ نصیب پھوڑ لیا۔ یہی حال اور دقیانوسی سہ وشوں کا سمجھو جن کی تمام عمر وصل و ہجر میں روتے کٹی کسی کو مرتے دم تک عیش میسر نہ ہوا۔ بہت ہوا تو آخر کو قاضی جی نے ایک دو بول پڑھ کر قصہ ختم کر دیا ۔

ساقیٔ گلفام کے سے جشن کسی کو نصیب نہ ہوئے کہ دورِ ساغر گردشِ ایام طعنہ زن ہے۔ مے و معشوق دونوں نعمتیں ایک جگہ جمع ہیں گویا قرانِ السعدین ہے ۔ مے کش پکار رہے ہیں کہ نگاہِ مست کا صدقہ اک نظر ادھر بھی! تجھے اپنے تبسم زا اشارہ کا صدقہ۔ ہماری بے تابی کی قسم۔ تجھے اپنی کم سنی کی سوگند۔ کباب و گزک کا واسطہ۔ نغمۂ مطرب کا صدقہ۔ مے و مے خانہ کا صدقہ۔ کہ اسی طرح دور چلتا رہے۔ ہمارے ہاتھ سے ساغر نہ چھوٹے۔ نہ تیرے ہاتھ سے شیشہ چھوٹے۔ یونہیں ڈھلے جا اور پلائے جا

آج میخانہ میں یہ غل کر رہے ہیں مے فروش ۔ بادۂ رنگیں بیاشامید تا دارید ہوش ۔

یہاں میں لسان الملک حضرت ریاض کا سالِ نو کا ساقی نامہ اخبار مشرق سے بجنسہٖ نقل کئے دیتا ہوں کہ حضرت کی شاعری بلا کی ہے۔ کیا خوب کہا کہ ع

بے حشر کے وعدے سب نہ فاتے ۔

سالِ نو

(تراوشِ کلکِ حضرت ریاض)

ساقی مجھے مے دے صاف و خوش رنگ ۔ ہونے پائے نہ ننگ میں بھنگ ۔ نشہ سارا نہ کرے کرا ہو کر
ایسا نہ ہو اس میں کچھ ملا ہو ۔ چلنا مجھ سے نہ تو نئی چال ۔ دینا نہ مجھے مے کہن سال

نوزت بونی

نفرت ہوتی ہے جام مے سے ٭ ایسی مے ہو تو نام مے سے ٭ یہ مے ہو تو ذوق کیوں مجھے ہو
یہ مے ہے تو شوق کیوں مجھے ہو ٭ گھر کر چکی ہے دلِ عدو میں ٭ برسوں رہی محفلِ عدو میں
ہرجائیوں کے ہیں طور اس کے ٭ ہر بزم میں آج دور اس کے ٭ دُنیا بھر کی یہ لاڈلی ہے
ظالم کس کس کے مُنہ لگی ہے ٭ میرے لئے اس کی بُو بُری ہے ٭ انگور کے زخم سے کھنچی ہے
دشمن کو رہے جنون اس کا ٭ دشمن سے ملا ہے خون اس کا ٭ مے کاہے کو پیپ ہے لہو ہے
پکا پھوڑا ہر ایک سبو ہے ٭ ہم نے اس کی نہ بات پوچھی ٭ برسوں یہ پڑی ہوئی سڑا کی
ہم ہند میں رند پاک طینت ٭ اوروں کی سی نہیں طبیعت ٭ ساقی آیا ہے یہ **نیا سال**
ایسی مے دے ٹپک پڑے رال ٭ گو حشر میں جا کے خاک اُڑائیں ٭ واعظ کے فرشتے بھی نہ پائیں
وہ بادہ اڑے جو رنگ بن کر ٭ آ رہے دل میں اُمنگ بن کر ٭ ہو بادہ الگ تو رنگ الگ ہو
سب سے اپنی ترنگ الگ ہو ٭ ہو رُخ پر نقاب کی طرح رنگ ٭ ہو رنگ شباب کی طرح رنگ
جی چاہے تو بے نقاب دیکھیں ٭ جی چاہے تو بے حجاب دیکھیں ٭ شیشے میں پری ہو آنکھ میں حور
دل میں رہے بن کے موجۂ نور ٭ جو داغ پڑیں وہ گل نظر آئیں ٭ دھبے دامن میں پھول بن جائیں
جو موج اٹھے وہ ستم اٹھائے ٭ جو موج اٹھے تجلیاں گرائے ٭ چھائی ہو گھٹا شمع نور پہ ہو
ساغر سے اٹھے تو طور پر ہو ٭ رنگِ ساغر نقاب سے ٭ ساغر جیسے حباب سے ہو
دیکھے سے نظر میں نور آئے ٭ بے بادہ پئے سرور آئے ٭ ہاں ہاں مرے ساقی گل اندام
دے ہاتھ پہ رکھ کے پھول سا جام ٭ وہ مے کہ ہیں سرور آ جائے ٭ ساغر میں تری نظر کھنچ آئے
ٹپکے جو کچھ کہ رنگ رُخ سے ٭ ساقی رنگت اُسی کی دیجے ٭ موجِ مے ناب کا ہو دھوکا
سایہ لہرائے گیسوں کا ٭ اس مے میں تری حنا کی بو ہو ٭ ساقی یہ مے ہو اور تو ہو
کچھ ہوش ہے کس کی انجمن ہے ٭ کچھ ہوش ہے کیسی انجمن ہے ٭ دے جی سے اٹھیں عدو سوز
مشرق کے یہاں ہے بزمِ نوروز ٭ دنیا کے حسین ہیں رونقِ بزم ٭ [illegible] رونقِ بزم
کہنا یہ تھا کہ آفت آ گئی ٭ اٹھا ساقی [illegible]

کچھ اور سے اور ہوگیا رنگ ☆ کچھ اور سے اور ہوگیا ڈھنگ

آنکھوں میں کھبی ادائے ساقی

اک شور اٹھا کہ ہائے ساقی

باقی رہے جو حوصلے جی میں ☆ کیا کیا مزے آئے بیخودی میں ☆ صدقے اس بے ہوشی کے صدقے

صدقے اس بیخودی کے صدقے ☆ اللہ رے انجمن کے ساماں ☆ نکلے کیا کیا نہ دل کے ارماں

کیسے وعدے کہاں کا محشر ☆ کیا کچھ نہ کیا مزے میں آکر ☆ بے ہوشیوں میں مزے سوا تھے

بے حشر کے وعدے سب وفا تھے ☆ گزری جو کچھ کہ جی پہ گزری ☆ کیونکر کہوں کیا کسی پہ گزری

اے واہ رے انجمن کے بانی ☆ اللہ رے انجمن کے بانی

ساقی مجھے سالِ نو مبارک

ساقی تجھے سالِ نو مبارک (ساقی نامہ از مشرقی)

× × × × × × × ”آخری شاہ اودھ کے حالات آپ سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ آپ کے عدل و انصاف کو تیموریوں سے لکھئے۔ ان کی ایک بات قابلِ تعریف کے ہے جتنی عورتیں محلِ شاہی میں ناکتخدا یا بیوہ یا بے شوہر کی نوکر تھیں وہ غیر محرم تھیں۔ اس لئے بادشاہ نے ان سب سے متعہ کر لیا تھا کہ ان پر نگاہ پڑ جانے سے معصیت میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا ذکر بادشاہ نے اپنی کتاب میں کہیں لکھا ہے۔ مجھے نام یاد نہیں رہا بہر حال یہہ کتاب بڑے پایہ کی ہوگی۔ اس کے لئے آپ کا نام کافی ضمانت ہے۔ یہہ احسان آپ کا اہلِ لکھنؤ پر ہوگا۔ واجد علی شاہ بھولے اور مخیر بادشاہ تھے“

(عشرت لکھنوی)

صلائے عام۔ اس مختصر نوٹ کی شانِ نزول یہہ ہے کہ ایک شخص نے بہادر شاہ بادشاہ دہلی کا حال لکھنا شروع کیا [illegible] کی کے ہاتھوں واجد علی شاہ بادشاہ کا بھی حال لکھ ڈالوں۔ حضرت عشرت لکھنوی کو خوا لذکر [illegible] کے بارے لکھا جس کے جواب میں تحریر بالا میرے پاس پہونچی۔

مضمون [illegible]



پھر وہی "مضمون پریشاں"! مضمون پریشاں نہ ہوا گویا صلائے عام کی چڑ ہو گئی۔ جسطرح فاکر
فیس کہتے ہیں کہ دیوانہ رہا جو ہے بس سنت ولیکن اسکی اپنی تشبیہ سرو و ہستان عدو انیت ویسی ہی ہے کہ خیال کے
ساتھ یہہ فکر لازمی ہو کہ ہزار بار لکھنے کے بعد اب کیا لکھنا رہ گیا ہے؟

جوشِ وحشت میں مرا پھر دلِ ناشاد آیا ✦ کونسا دشت ہے باقی جو اُسے یاد آیا

مضمونِ پریشاں لکھنے میں اسوقت زیادہ پریشانی ہوتی ہے جب کہ لکھنے کے لائق کوئی بات
ذہن میں نہو۔ اور پھر بھی لکھنا پڑے۔ جسطرح کسی پریوش کے بال بکھرے ہوئے ہوں تیوریوں میں بل ہو اور مزاج
بھی بگڑا ہوا ہو تو پھر کس کس کا علاج کیا جائے بقول صاحب عالم حضرت جودت

بل جبیں پر بھی ہیں زلفوں میں بھی معلوم نہیں ✦ وہ ہیں بگڑے ہوئے یا زلفِ پریشاں برہم ہے

جب کوئی بات ذہن میں نہ آئے تو زلفِ سیہ فام کے بل پانے ہی کی رگِ خدائی کا اثر

ہو گیا۔

سمجھ لینا چاہئے کہ یار کے بالوں کے بل چاہنے والوں کے مقدر کے بل ہیں: یا خوش ہو کر یوں سمجھئے کہ چمن دہر میں ع عارضِ گل پر ہیں بکھرے زلف سنبل کے بال +

اپنی کہیں کہ اس دلِ خانہ خراب کی + تم کو جو ہو پسند وہی گفتگو کریں

جب آپ اپنی پسند سے مجھے بے خبر رکھیں تو خالی بیٹھنے سے میں اپنی ہی پُرانی کہانی کیوں نہ چھیڑوں؟ میری کہانی گویا آپ کی کہانی ہے۔ کہ عالمِ محبت میں دو دل ایک ہو جاتے ہیں سہ

یہہ جُوڑا کھولنا بھی پیچ سے خالی نہیں اُن کا + اُلجھ جاتا ہے دل جب بال شانوں پر بکھرتے ہیں

بادی النظر میں ہم زندگی کو مصیبتوں کا گھر سمجھتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہہ ہے کہ ان کا علاج سب سے بڑی مصیبت ہے کہ مرضِ عشق کی طرح موت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ جس طرح اکثر امراض میں زہر سے زہر کا علاج مناسب ہوتا ہے حکیم مطلق نے چھوٹی مصیبتوں کا علاج ایک بڑی مصیبت یعنی موت سے قرار دیا ہے موت سب سے بڑی مصیبت ہے لیکن افیوں کے اثر کی طرح "خود مرض و جملہ مرض را دوا" موت ساری مصیبتوں سے چھڑا دیتی ہے + لیکن موت ہی کا ڈر ہے جو سوسائیٹی کو نیک رکھ سکتا ہے: جس کو مرنے کا ڈر نہ ہو اُس کو کسی بد ارادہ سے روکنا مشکل ہے۔ مرنے کا خوف خدا کے خوف سے کم نہیں +

ہر شخص کو موت کا اختیار نہ دینا چاہئے۔ غیر تو غیر اپنی موت پر بھی اختیار بُرا ہے

یہ اختیار اور بکان خدا کے ہاتھ میں رہنا مناسب ہے کہ جس طرح بچے جن کو ابھی سمجھ نہیں اُسترے وچاقو اور تیز دھار کے اوزار اگر بے اختیار چلاتے پھریں تو اپنے ہی ہاتھ پاؤں کاٹ لیں +

دُنیا میں جو ہم مصائب عالم برداشت کرتے ہیں تو گویا ع ور پردہ مزہ چکھتے ہیں ہم روزِ فنا کا + دُنیا میں جب ہر چیز کو زوال ہے تو زندگی پر زوال آنے کا قلق کیوں کیا جائے؟ عالم اسباب میں جب کوئی چیز غیر فانی نہیں تو ہمیں اپنے فنا ہونے کا افسوس بے کار ہے کہ جس فقیر کی جھولی میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی نہ ہوں وہ شیرمال و باقرخانی پر نخرے کرے + عالم اسباب کو میں بھیک مانگنے والوں کی جھولی سے اس لیے تشبیہ دیتا ہوں کہ اس کی جھولی میں سوا دو چار سوکھے روٹی کے ٹکڑوں کے تکلف وناز ونعم کی چیزیں شکل ہیں + عالم اسباب میں ہر چیز ناقص نظر آتی ہے کہ مثل گداگی طرح پیٹ بھر کے روٹی مُیسر نہیں یعنی کسی کی تمنائیں پوری ہوتے نہیں دیکھیں +

یہہ کیا سبب ہے کہ گانے میں اونچے سُروں کے الاپنے والوں کا گلہ تو بیٹھ جائے مگر وہ ننھے بچے ماں سے ضد میں کتنے ہی زور سے چیخیں چلائیں ان کا گلہ نہیں بیٹھتا؟ سبب یہہ کہ بچے کی خواہشیں محدود ہیں۔ برخلاف اس کے میری خواہشوں کی حد نہیں جو بقول حضرت سعدیؒ دُنیادار کی ہوس قناعت سے پوری ہو یا خاکِ گور سے ع

یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور +

تمناؤں کو بس میں رکھنا غایت عبادت ہے۔ جو ایڑیوں کے بل اونچا ہو کر چلنے کا ارادہ کرے دیر تک نہیں چل سکے گا نہ وہ جو دونوں پاؤں اندازہ سے زیادہ پھیلا کر چلے گا چلا نہیں جائے گا + خُدا جس حال میں رکھے وہی بہتر ہے +

دُنیا میں زندگی و موت دونوں کی ضرورت ہے۔ چار دیواروں کا نام مکان ہے جو چاروں طرف سے گھری ہوتی ہیں اور اوپر چھت بھی کہ ہر طرف سے حفاظت رہے۔ لیکن پھر بھی دروازے رکھے جاتے ہیں کہ باہر کس طرح نکلنا ہوگا + گھر سے فائدہ یہی ہے کہ ہم آ اور جا سکیں۔ قید ہو کر رہنا عقلمندی نہیں + عدم کے بغیر وجود کا ثبوت مشکل ہے کہ جب کچھ نہ تھا تب تو سب کچھ موجود ہوا۔ اندھیرا نہ تھا تو روشنی کو کیسے جانا۔ کجی نہ تھی تو راستی کی قدر کیوں ہوئی؟ ہر چیز کا لُطف بالضد سے ہے۔ مرنے سے جینے کی محبّت ہے +

نرمی کی قدر سختی سے ہے۔ اور ظاہرا سختی گو مضبوطی کی علامت ہے: مگر زندگی کا مدار نرمی پر ہے کہ بچہ جو ابھی پیدا ہوا کیسا نرم اور لچیلا ہوتا ہے۔ اور بُڑھاپے میں مرتے وقت بوڑھوں کے ہاتھ پاؤں سخت ہو جاتے ہیں: سختی موت کی نشانی ہے: پیدائش بچے کی نرمی سمجھئے اور موت سختی ہے +

انسان اگر آج بچ گیا تو کل نہ بچے گا ؎

بچ گیا نقدِ دل اب کے تو نظر سے اُس کی + آئے گا پھر بھی اگر چور نے گھر دیکھ لیا

بلائیں تو پھر بھی آ جاتی ہیں۔ بھلائیاں نہیں آتیں : اگر آئیں بھی تو ہم کہاں ؟ موسم گل تو ہزار بار آئے گا مگر ہماری جوانی کہاں جو دیوانہ بنا دیتی تھی سے

پیری میں ایک ہی سے رہیں گے ہمیشہ دن ✤ وہ اور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بُو نہیں

وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

دُنیا میں پیدا ہونے کی خوشی سے یہاں سے جانے کا قلق زیادہ ہوتا ہے۔ اور جس قدر اس سے جُدائی کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے یہہ قلق بڑھتا جاتا ہے : جس طرح سے

نامہ بر نا امید آتا ہے ✤ ہائے کیا سست پاؤں پڑتے ہیں

جب شبِ وصل کی صبح ہے تو شبِ فراق کی بھی صبح ضرور ہوگی کہ رات کتنی ہی بڑی یا چھوٹی ہو صبح ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ لیکن کس کی کس طرح کٹے اس کی خبر اللہ ہی کو ہے سے

ہوگی ضرور صبح تری اے شبِ فراق

ہم کو نصیب دیکھنی ہو یا سحر نہ ہو

باقیاتِ فانی

"مضمونِ پریشاں" کی تائید میں مجھے چند فلسفیانہ خیال کی تلاش تھی۔ نثر میں تو اس وضع کے خیال بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے حضرت فانی کا دیوان باقیاتِ فانی میری نظر سے گزرا۔ شعرائے زبانِ اردو میں حضرت فانی نے زندگی و موت کے متعلق بہت اچھے اچھے فلسفیانہ مضمون نکالے ہیں۔ اس مضمون کے سارے شعر جمع کرنا باقیات کا دوسرا ایڈیشن شایع کرنے کے برابر ہو جائیگا۔ اس وقت مجھے صرف چند اشعار کی تلاش ہے جن سے مضمونِ پریشاں میں جان پڑ جائے +

زندگی بھی تو پشیمان ہے یاں لاکے مجھے + ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانی

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانیکا

ظہورِ جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار + کوئی اجل کی طرح دیدہ آشنا نہ ملا

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاس میں بھی نہیں

یہاں بھی فانی آوارہ کا پتہ نہ ملا

ہزار ڈھونڈیئے اس کا نشاں نہیں ملتا ✤ جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی ✤ تری نگاہ سے تیرا بیان نہیں ملتا

(دل کچھ کہتا ہے اور زباں کچھ)

مجھے بلا کے آپ چھپ گیا کوئی

وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور نہیں ✤ یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی

ہائے اِن دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے ✤ کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

(ہم جب تک زندہ رہے تقدیر کے نصیبوں کو روتے رہے۔ یعنی جب تک زبان نے یاری دی چیخا کئے۔ جس پر ہم موردِ الزام ٹھہرے کہ بڑے زباں دراز ہو: اب مرنے کے بعد کفن کھول کے دیکھ لو کہ زبان نہیں ہلتی۔ اس پر غضب ہے کہ آپ منکر نکیر جواب و سوال کے لئے تعینات فرماتے ہیں ✤)

یہہ شعر غضب کا کہا ہے ؎

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے ٭ میں جو رویا مُسکرا کر رہ گئے

اب برقِ نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب ٭ جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی

(میرے مرنے پر تمام دُنیا کو ستانا کیا ضرور!)

نیرنگئ روزگار سے

شُعبدے آنکھوں سے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں ٭ آنکھ کُھلی تو دُنیا تھی بند ہوئی اف نہ تھا:

(شعبدے نہ رہے الٹا اف نہ رہ گیا) ٭ انسان کی زندگی کا حال اس سے زیادہ نہیں کہ سے

دُنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ ٭ بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

(برق و باراں کی تشبیہہ اس سے اچھی مشکل ہے)

کچھ بھی ہو برق و باراں ہم تو یہہ جانتے ہیں ٭ اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رو یا

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے ٭ میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

مر اقتل اس کے ہاتھوں یہہ تو باتیں ٭ کچھ اُس کے مُنہہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا

آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

اس میں شک نہیں کہ بقول صاحب رسالہ شمع حضرت فانیؔ "زندگی کے سچّے نوحہ خواں ہیں"۔ زندگی سے بیزاری کے فلسفیانہ مضموں بہت پاکیزہ نکلے جسے انگریزی میں پے سیمزم کہتے ہیں : یہہ طرز ذرا مشکل ہے ٭ (اشعار از رسالہ شمع)

فریبِ زمانہ

لفظِ "فریب" جس خوبی سے غالبؔ نے ذیل کے شعر میں باندھا ہے دوسرے سے ممکن نہیں ؎

فریبِ شُہرہ محوِ زکوئے آشنا نیست ❊ ستم دیدۂ گردشِ جام نیست

اس میں حضرت جامیؒ کو مخاطب کرکے کہا کہ حضرت کے دامِ پند و نصیحت کے فریب میں نہ آجانا کہ آپ نے گردشِ جام کے ستم نہیں دیکھے۔ گردشِ ایّام کے ستم اور ہیں اور گردشِ جام کے ستم اور۔ یہ ستم وہی کچھ جانتے ہیں جن کو دورِ ساغر سے کام پڑا ہے ❊ یہ میرے مضمون کے عنوان کے پہلے لفظ کی تمہید ہوئی ❊

دوسرے لفظ زمانہ سے میری غرض ہر طرح کا وقت ہے۔ رات دن۔ گھڑی ساعت ماہ و سال۔ ماضی و استقبال۔ امروز و فردا۔ بلکہ ازل سے ابد تک بُرا بھلا۔ چھوٹا بڑا عرصہ سب آگیا۔ روزِ فراق و شبِ وصل۔ عمرِ نوح اور اُس پروانہ کی زندگی بھی جس نے ابھی آنکھیں کھولیں اور شمع کو دیکھکر جل مرا ❊ وقت سے زیادہ کوئی چیز گریزپا نہیں نہ زمانہ سے زیادہ کوئی لیچڑ ہے کہ کسی طرح کسی حال میں کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کسی کو اس کے آغاز کا پتہ نہیں۔ اور اس کے انجام کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ میاں کے

کس کی مجال ہے کہ پوچھ سکے ؟

لیکن جس طرح ہر چیز کے اندازہ کا معیار ہے کہ مسافت میلوں سے طے ہوتی ہے۔ کپڑا گزوں سے ناپا جاتا ہے۔ وزن تولہ۔ ماشہ۔ من۔ سیر۔ چھٹانک سے تولے جاتے ہیں: زمانہ کے اندازہ کا مدار ہماری زندگی پر ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے کے زمانہ کی خبر ہمیں مطلق نہیں نہ مرنے کے بعد کا حال معلوم ہے یوں ساری خدائی کی باتیں سُنا کیجیے: زمانہ کی ساری گردشوں کا پیمانہ یہی ہماری مختصر زندگی ہے۔ اور یہہ بھی جب سے کہ ہم نے ہوش سنبھالا: یعنی دس بارہ برس کی عُمر سے کہ تکالیفِ شرعی عموماً اس عمر سے عاید ہوئیں۔ اس سے پہلے ہم معصوم سمجھے گئے۔ کسی بچّہ کو جب تک کہ اُسے بتایا نہ جائے بچپن کی خبر نہیں ہوتی۔ جس طرح گہری نیند کے سونے والے جب تک سوتے رہیں آنکھ کُھلنے سے پہلے کے وقت کا اندازہ نہیں کر سکتے: نیند کتنی ہی ہوشیار ہو پھر بھی نیند۔ نیند ہی ہے۔

ہمارا بچپن ہم کو ہماری عُمر سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کے جانے سے ہم بالغ ہوئے اور بالغ ہونے سے جوانی و بُڑھاپے کا پتہ لگا: یہاں تک کہ موت آگئی۔ پھر خبر نہیں کیا ہوا کیا نہ ہوا۔ کیا ہوگا کیا نہ ہوگا۔ واللہ عالم بالصّواب! یہیں کام آئیگا۔ کہ ہمارا ایمان ہے: خدا نے چاہا تو اچھا ہی ہوگا کہ ع خوش نویس است و نہ خواہد نوشت: اس لئے جو کچھ تقدیر میں لکھہ دیا اچھا ہی لکھا ہوگا۔ میر پنجہ کش کے ہاتھ کا لکھا کتنی ہی جلدی میں لکھا ہو اور کسی حال میں لکھا ہو بدخط ہو نہیں سکتا۔

جلیل حسن

میں نے ابھی عرض کیا کہ معصوم ننھے بچوں کو زمانہ و وقت کا اندازہ نہیں ہوتا بچہ کے بہلانے والیوں کی لوریاں جو بچہ کو سُلا دیتی ہیں یہی بچہ کے لیئے زمانہ کا آغاز ہے۔ جب لوریوں سے سوگیا تو پھر خبر نہیں کہ زمانہ کا آغاز کب سے ہوا اور کب تک رہے گا؟ جس وقت بچہ کی آنکھ کھُلی بچہ کے لیئے اس وقت سے زمانہ کا آغاز سمجھئے بچہ نے آفتاب کو دیکھا۔ جانا کہ آفتاب آج پیدا ہوا ہے۔ اس کی گردش سے شام ہوتی ہے اور پھر کل ہو گی اور اسی طرح ہوتی رہے گی + قطب صاحب کی لاٹ دیکھی اُسی دن سے اُس کا آغاز سمجھ لیا۔ اہرامِ مصر جو ہزاروں برس کے قدیم سمجھے جاتے ہیں بچہ کی نگاہ میں جسدن نظر پڑیں اُسی دن سے اُن کا وجود ہے + بچہ کو مکتب میں جب پہلے پہل قاعدہ بغدادی پڑھایا جاتا ہے تو اُس کے ذہن میں حروف تہجی آج ایجاد ہوئے اور بسم اللہ کا آغاز اُس وقت سے سمجھتا ہے جب "بسم اللہ" کی تقریب میں اِقرأ باسمِ ربِّک پڑھایا گیا تھا + کرمکِ شب تاب کو وہی شب قدر ہے جب برسات میں رات کو نکلے اور سورج مکھی کے لیئے سورج کی پیدایش کا وہی دن ہے جب سورج مکھی نے سورج کو دیکھا + وہ کیڑا جو صبح کو پیدا ہو دوپہر اُس کے لیئے معراج ہے اور شام شب لحد اُس کے لیئے ایک ہی دِن صبح سے شام تک دُنیا کا آغاز و انجام ہے ؎

محمل نشیں جب آپ تھے لیلےٰ کے روپ میں + مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا

بچوں کے لیئے زمانہ کی رفتار گھوڑے کی قدم قدم چلنے کی سی نہیں ہوتی۔ گھوڑ دوڑ کی دوڑ سے زیادہ تیز اور فانوس خیال کے چکروں سے زیادہ چکر میں رہتی ہے

بچپن کے خیالوں کی رفتار بڑے وسیع میدان کی محتاج ہے جو وہ جلدی جلدی طے کیا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا: اس کی نگاہ آگے کو رہتی ہے۔ یہاں تک کہ جب بوڑھا ہو کر تھک کر بیٹھ جاتا ہے تب پچھلا زمانہ یاد کرتا ہے۔ جس طرح گائے بیل چراگاہ میں چرنے کے بعد کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر جگالی کرتے ہیں ؎

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں ✤ گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

سچ پوچھئے تو یہہ تعین ماہ و سال و صدی و جگ سب میرے ذہن کے کرشمے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ میرا ذہن صحیح ہے یا نہیں ہے ✤ زمانہ کا اثر مجھ پر میرے ذہن کے موافق ہوتا ہے۔ رات وہی ہے شب ہجر ہو یا شب وصل۔ دن وہی ہے روز فراق ہو یا صبح عید: بقول جناب فانی ؎

کہیں بلائے شب غم کہیں بہار شباب ✤ کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

یہہ سارے تغیر عالم دراصل **فریب زمانہ** کے نمونے ہیں۔ مزاج یار کی طرح زمانہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے: مزاج یار سے تو امید بھی ہے کہ آج نہیں تو کل راہ پر آ جائے۔ مگر زمانہ مڑ کر نہیں دیکھتا ؎

نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے ✤ سلام اس نے ہمارا لیا۔ لیا نہ لیا

زمانہ کی درازی کی یہہ تمثیل کتنی اچھی ہے کہ ؎

یارب یہہ سچ ہے بات کہ محشر کی صبح سے ✤ دامن سلا ہوا ہے شب انتظار کا

یہہ خیال بھی کتنا نازک ہر کہ ؎

ڈھونڈھتے ہیں وہ کہیں ملتا نہیں میرا مزار + خشک ہوتی جاتی ہے پھولوں کی چادر ہاتھ میں

زمانہ بھلا ہو یا بُرا۔ شبِ وصل سے چھوٹا یا روزِ فراق سے بڑا ہو جتنا جس قدر ہاتھ لگے غنیمت ہے + مرنے کے بعد بہشت ملے تو انکار کسے؟ مگر دُنیا میں جس قدر زمانہ ہاتھ آئے اس کو دانتوں سے پکڑ کے رکھنا چاہئے + یہہ رات دن آپ سے بھاگنے کی فکر میں رہتا ہے۔ آپکی ہوشیاری ہے کہ آپ اس کے دھوکے میں نہ آئیں + اس کا ایک لمحہ کا بھی قیام اگر ہماری تمنا کے موافق ہو خضر کی زندگی سے بہتر ہے ؎

لوچ گئے جو آکے کہا تم نے مر کہیں + اچھی گھڑی کے کوسنے ہم کو دعا ہوئی

یہہ محض دھوکا ہے کہ زمانہ بھلا یا بُرا ہوتا ہے۔ بلکہ جس وقت جیسے ہم ہوں وہی صورت زمانہ اختیار کرلیتا ہے: بُرائی بھلائی کے معاملہ میں زمانہ کی تشبیہہ رنگین عینک کی سی ہے کہ اگر عینک کے شیشے ہرے رنگ کے ہیں تو ساون کے اندھے کی طرح ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے ؎

تیرے سب ناز ہیں گو زندہ ہی کرنے والے + ڈھونڈھ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے

یہہ بھی سُنا گیا ہے کہ جس چیز کو اچھی طرح "نظر جما کر" دیکھئے تو دُور کی چیز پاس دکھائی دیتی ہے بلکہ جو چیز غائب ہو حاضر نظر آتی ہے۔ یہہ نظر کے فریب ہیں: اسی طرح زمانہ کا فریب ہے کہ جیسے آپ ہوں ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ بقول جناب جلیل ؎

مجنوں ذرا نظر تو جما دل کے سامنے + محمل میں جو نہیں وہ ہے محمل کے سامنے

ناقہ چلا ہے نجد کو لیلےٰ کی ہے دُعا + پردہ اُٹھے تو قیس ہو محمل کے سامنے

ہندوستانی انگریزی تہذیب

تہذیب سے میری مراد یہاں معمولی روزمرّہ کی دو چار باتیں ہیں جو ہر مُلک و ہر قوم میں عادت و خصلت کی طرح رائج ہو جاتی ہیں۔ یہہ خصائل گو ظاہرا بہت ضروری نہیں مگر اکثر ضروری سے بھی زیادہ رواج پا جاتی ہیں: جس طرح لباس میں رومال گو چھوٹی چیز ہے مگر بہت کار آمد ہے کہ ہندوستانیوں میں ہاتھ منہہ دھو کر ہاتھ مونہہ پوچھنے میں کام آتا ہے جیب میں پڑا رہے تو بڑے کام نکلتے ہیں: ریل میں جب گاڑی چل نکلے تو نئی تہذیب والے دوست آشناؤں کو رومال ہلانے سے "خدا حافظ" کا کام لیتے ہیں۔ جانے والا کھڑکی سے اور رخصت کرنے والا باہر رومال ہلانے سے رخصت کا اظہار کرتے ہیں* ہندوستان دولہ کا سارا لباس گو زرق برق نہایت تکلّف کا ہوتا ہے مگر رومال بھی ضرور ہے جس سے دولہ میاں کا منہہ چھپا رہتا ہے کہ منہہ پر رومال نوشہ میاں کی شناخت ہے* غرض چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی وقت بے وقت کام دے جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مُلک اور قوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت باتوں کا پتہ لگ جاتا ہے*

ہمارے ہاں مہمان کے ساتھ نہایت درجہ کی خاطر یہہ ہے کہ دعوت میں مہمان

سے تقاضہ پر تقاضہ کرکے دسترخوان پر جو کھانا ہو بہ تکرار یہہ کہکر کھلانا کہ جناب ضرور کھائیں پسند ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی میں مہمان کو جس چیز کی رغبت نہ ہو اُس کے کھلانے کا تقاضہ نہیں کیا جاتا + وہ ہندوستانی تہذیب ہے اور یہہ انگریزی +

کہنے کو تو ہم کہتے ہیں کہ رزقکم فی السّمآء مگر کھانا ختم ہونے پر شگون کے طور پر کہا جاتا ہے کہ "دسترخوان بڑھایا جائے"۔ کھانے میں جو شریک نہ ہوسکے تو اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ "خدا زیادہ دے"۔ گویا افراط سے کھانے کی امید بہت نہیں تب تو ہر وقت دُعا دیجاتی ہے +

یہہ عام رواج ہے کہ جہاں تک ہوسکے خط کتابت میں **پوسٹ کارڈ** پر خط کا مضمون لکھا جائے۔ انگریزی میں اس کا رواج بہت کم ہے: بلکہ انگریزی میں پوسٹ کارڈ جواب کا مستحق نہیں سمجھا جاتا + آپ ڈاکخانہ کے محکمہ سے پوچھ لیجئے کہ ہندوستانیوں میں پوسٹ کارڈ کا رواج کس قدر بڑھا ہوا ہے: عوام میں گھر کے تمام خانگی حالات مرنے جینے کی خبریں۔ بیاہ شادی کے قصّے۔ بیماری دُکھی کے رونے پیٹنے۔ شکوہ شکایت۔ جہاں تک ممکن ہو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ سے طے ہوتے ہیں۔ بلکہ مستورات کے ذکر اذکار بھی + انگریزی تہذیب میں یہہ بڑا عیب سمجھا جاتا ہے کہ خانگی ذکر پوسٹ کارڈ میں آئے + پوسٹ کارڈ میں کسی کا یا اپنا خانگی ذکر نہ کرنا چاہئے۔ ذکر میں کسی کا نام ونشان نہ آنے پائے: برخلاف اس کے ہندوستانی پوسٹ کارڈوں میں ساری خانگی تاریخ درج ہوتی ہے اس کے سوا پوسٹ کارڈ کے جواب بھی پوسٹ کارڈ ہی پر منگائے جاتے ہیں۔ اور کوئی

خفا نہیں ہوتا + پوسٹ کارڈ پر زیادہ خط کتابت کا بڑا سبب کفایت شعاری ہے۔ اس کفایت شعاری میں پردہ دری ہوجائے تو خیال نہیں +

دعوتوں میں پہلے تو دستور تھا کہ کاغذ پر نام لکھکر نائی کو دے دیئے جاتے تھے کہ صاد کرا لاتا۔ اب بہ تقلید تہذیب انگریزی دعوتی کارڈ اور رقعے جاری ہوتے ہیں۔ مگر میزبان کو یہہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون صاحب تشریف لائیں گے کون نہیں؟ انگریزی میں نہ آنے والے اپنے نہ آنے کے سبب ومجبوری کی اطلاع میزبان کو دے دیتے ہیں + ہمارے ہاں بُلائے ہوؤں سے بغیر بلائے زیادہ آجاتے ہیں اور کھانا وقت پر بہت کم نصیب ہوتا ہے انگریزی میں وقت کی پابندی شرط ہے +

انگریزی میں کم عمر بچے دعوتوں میں ضرور نہیں کہ بڑوں کے ساتھ شریک ہوں ہندستانی صحبتوں میں سب سے پہلے بچے پیش ہوتے ہیں کہ " بندہ زادہ " ہے: اور یہی بس نہیں " بندہ زادے " کے وقایع نعمت خاں عالی کے وقایع سے زیادہ تفصیل وار بیان کئے جاتے ہیں۔ اور انتظار ہوتا ہے کہ آپ ہمہ تن مصروف ہوکر ساری کہانی سنیں + اس معاملہ میں آپ کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت کبیرہ گناہوں میں داخل ہے +

بالکل بیگانہ گفتگو میں پہلے یہی یہہ سوال ہوتے ہیں کہ " صاحبزادے کتنے ہیں؟ بڑا کیا کرتا ہے؟ چھوٹے کی کیا عمر ہے؟ لڑکیوں کی شادی ہوگئی یا نہیں؟ شادی کہاں ہوئی؟ ابتک نہیں ہوئی تو سبب کیا ہے؟ بڑا لڑکا آپ کے ساتھ ہے یا علیحدہ؟ بچوں کی والدہ اگر انتقال کرگئی ہوں تو پوچھنے والے کو بڑا افسوس ہے کہ گھر کا آرام نہیں رہا

انہی

آپ کی رشتہ داری فلاں بزرگ فلاں خانداں سے بھی تو ہے ؟ اُن کی منجھلی لڑکی کی شادی میں
مَیں بُلایا گیا تھا۔ وہاں آپکا بھی ذکر آیا تھا ۔ انگریزی تہذیب میں مہمانوں سے یا ریل میں ساتھ
کے ہم سفروں سے خانگی امور کا ذکر و استفسار بڑا عیب ہے ۔ گفتگو میں عامیانہ
الفاظ اور جگت ضلع سے اس طرح احتراز چاہئیے جس طرح زہر ہلاہل سے۔ زیادہ
بازاری معلومات ذلیل صُحبت کی نشانی ہے ۔ اسی طرح اپنے مرتبہ سے بڑھ کر ڈون
کی لینی کم ظرفی ہے ۔ روزمرہ میں ہر بات پر فقہ حدیث یا کفر و بدعت کو تکیہ کلام
کرنا تاکہ لوگ آپ کو بڑا مُتقی و زاہد جانیں اور مُجھ پر شُبہہ کریں ہُنر نہیں ہے ۔
کسی صُحبت میں یہہ ذکر کرنا کہ میں نے آپ کے ساحبزادہ کو نوکر رکھوادیا
یا کوی احسان کیا معیوب ہے ۔ اپنی زیر باری یا دوسرے کی آمدنی سے زیادہ خرچ
اخراجات کی صلاح مشورہ عیب ہے ۔

ہماری تہذیب میں بڑی خوبی یہہ ہے کہ مردوں کی صُحبت میں ہم عورتوں
کا ذکر بڑا عیب سمجھے ہیں ۔ انگریزی تہذیب میں یہہ بات میسّر نہیں ۔

اسد اللہ الغالب

مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ یوں کہنے کو تو ایک آدمی کا نام ہے جس کی شاعریت کو شہرت دینے والا تخلص **غالب** اپنے ممتاز ہمعصر شاعروں پر بھی غالب تھا۔ لیکن جب اس کے بہارستان خیال میں ہم قدم رکھتے ہیں۔ نہیں نہیں سر کے بل اور آنکھوں سے اُس عجایب گاہ تخیل کی زیارت کرتے ہیں۔ تو اُس عالم میں عالم عالم نئی دُنیا نظر آتی ہے ؎

واماندگیٔ شوق تراشد پناہ ہا　+　بخود در شد دشکل غالب گرفت

یہ حیرت ناک ہستی اپنے غیر محدود اور آسمان رس تخیل سے عالم آب و گل سے عالم ارواح تک یا یوں کہوں کہ عالم دل سے عالم دماغ تک محیط نظر آتی ہے: فلسفۂ عشق و محبت۔ جذبۂ مذہب و ملت سلسلۂ فطرت و حکمت جس فن اور طبقہ میں اُس کے مسلمات کو جانچوگے اور جس کسوٹی پر اُس کے کلمات طیبات کو پرکھوگے وہ انسان عین اور عین انسان منتہی نہیں۔ بلکہ خلاق اور رب النوع ثابت ہوگا + مرزا کو شاعر کہنا انصاف کی توہین کرنا ہے + مرزا ایک پورا فلسفی الٰہی حکیم اور کامل ولی ہے جو شاعری کے لباس میں جلوہ آرا ہے +

میرے دوستو! خوب سمجھ لو کہ بغیر دل کی صفائی اور باطن آرائی کے ظاہری شکل صورت ٹیپ ٹاپ کچھ کام نہیں دیتی۔ جب تک نہاں خانۂ قلب شاہد حقیقی کا خلوت کدہ نہیں بنتا آرایش گفتار اور زیبایش کردار نہیں آتی ؎

شمع فروغ حُسن سخن دور ہے اسدؔ　+　پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مرزا کو ولی کہنا کانوں کو مشکل سے گوارا ہوگا اور یہ ناآشنا لفظ ایک دم سب کو بھڑکا دیگا مگر آگے چلکر ہم اُن کی کرامات جو پرتوۂ ولایت ہے گوش گزار کریں گے +

حالی مرحوم نے "یادگارِ غالب" لکھکر مرزا علیہ الرحمۃ کی شاگردی کا پورا حق ادا کیا ہے۔ لیکن یہی مضمون خدا جانے نادانستہ یا دانستہ کہ موجودہ طبائع پسند نہیں کرتے مرزا کی حیاتِ پاک سے حذف کر دیا۔ حالی پانی پت میں پلے جہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ مدفون ہیں اور بستی کا ہر شخص اُن نامور بزرگوں سے عقیدت رکھتا ہے۔ مگر جب پایانِ عمر میں سید احمد خاں مرحوم کے انصار بنے تو نئی تہذیب میں جہاں اور جدید خیالات پھیلانے ضرور ہیں وہاں پرانے خیال بھی مٹائے جاتے ہیں۔ خصوصاً مسئلہ تقدیر کہ اس پر توکل کر لینا ہاتھ پیر توڑ کر بیکار بیٹھ جانا ہے جو منافی ترقیِ دُنیوی ہے اور یہ سبق اہل اللہ کے یہاں زیادہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس لئے پہلے وہی مکتب بند کرنے پڑتے ہیں۔ قوم کے جگاتے والے جو نئی تہذیب اور نئے فلسفہ کے علم بردار اور حامی ہوتے ہیں عالمِ مادّی میں روحانی نام و نمود پسند نہیں کرتے: اگرچہ دل پر ہیبتِ اہلِ حق طاری ہو مگر معرضِ بیان میں نہیں لاتے۔ گویا اہل اللہ کا معتقد ہونا دورِ جدید کی ترقیات کو روکتا ہے۔ حالاں کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں اہل اللہ ہی کی امداد سے کام چلا ہے ع کیمیائیست کہ در خدمتِ درویشانست۔

مرزا غالب کی شاعری اور ان کی ہمہ دانی پر کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا کہ کوئی نظم یا نثر یا مقدمہ یا تبصرہ اخبار یا ادبی رسالوں میں نہ نکلتا ہو اور جس قدر فلسفہ اور حکمت پھیلتی جائے گی۔ مرزا غالب کی وقعت اور عظمت دلوں میں بیٹھتی جائے گی + وہی دیوان غالب جس کو ہر شخص ادق اور مشکل سمجھتا تھا آج ہر شخص کے زینت کتب خانہ ہے۔ اس کے شعر ہر موقعہ پر بے تکان پڑھ دئے جاتے ہیں + سردار ولی خاں پر مقدمہ تھا۔ مصطفےٰ علی خاں عرف منا صاحب سے بچپنے کی دوستی تھی منا صاحب مخالف شہادت دینے عدالت ججی میں آئے تو سردار ولی خاں نے منا صاحب سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا ؎ زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام + تجھکو کس نے کہا کہ ہو بدنام: جس وقت سردار ولی خاں کو پھانسی کا حکم سُنایا گیا اور پھانسی گھر میں لائے گئے تو پھانسی کی طرف انگلی کا اشارہ کرکے تماشائیوں سے فرمایا ؎ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام + ایک مرگِ ناگہانی اور ہے + شعرائے ماضی و حال میں سے کسی کے کلام کو ایسے نازک وقت میں مطابقت حال

پانا نصیب نہیں ہوا ؎

جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک پارسی + گفتۂ غالب ایک بار پڑھکے اُسے سُنا کہ یوں

اب اس یوں کو یوں ملاحظہ فرمائیے +

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

جاناں اگر بہ شب دہنے بر دہن نہم + خود را بخواب سازد گوکایں دہان کیست؟

گفتۂ غالب ؎ ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن + ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذر مستی ایک دن:

پہلے مصرعہ میں معشوق کو صلاح دیتے ہیں کہ نشۂ شراب کا بہانہ کرکے ہم سے کھل جاؤ کوئی یہ نہ جانے گا کہ تم اپنی خواہش اور آرزو سے ملے مستی شراب سمجھکر کوئی معترض نہ ہوگا: اور اگر یہہ مفید مشورہ نہیں مانتے تو ہم نشہ کا بہانہ کرکے لپٹ جائیں گے۔ ہماری یہہ پیش قدمی بھی نشہ کی زیادتی سمجھی جائے گی۔ تم بھی ہم کو معذور سمجھوگے۔ ملا عبداللہ بیاضی لکھتے ہیں ؎

بیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کرمن + از ذوق وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم +

گفتۂ غالب ؎ ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا + کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا +

وعدہ کو جھوٹا سمجھکر زندہ رہنا کیسی انوکھی اور سچی بات ہے +

ملا نظیری نیشاپوری ؎ نشاط رفتہ زدوماں بصبر بستانم + کہ بدمعاملہ آزردہ از تقاضا نیست +

گفتۂ غالب ؎ فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے + متاع بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر +

متاع بُردہ کو رہزن پر قرض سمجھنا کیسا بھولا پن اور آسمان سے عیش رفتہ کا تقاضہ کیسی سادہ لوحی ہے۔ متاع بردہ اگر رہزن پر قرض ہوتا تو تقاضہ بھی ٹھیک تھا + بدمعاملگی دوراں سے مولانا نظیری تقاضہ کرتے ہیں کہ بدمعاملہ آدمی تقاضہ سے آزردہ نہیں ہوتا: مرزا متاع بُردہ کو رہزن پر قرض سمجھکر متقاضی عیش رفتہ ہیں +

اہلی شیرازی ؎ زخضر عمر فزوں است عشق بازاں را + اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را +

عمر خضر کا حوالہ دیکر عاشقوں کی عمر کو محدود کردیا +

گفتۂ غالب ؎ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں + شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں +

اس شعر سے غیر محدود زمانہ پیدا ہے۔ "کب سے ہوں کیا بتاؤں" کے دلچسپ ادائے کلام نے وہ مزا دیا کہ کیا بتاؤں؟

ملا فیاض قمی ؎ ہر کس کہ زخم کاریٔ مارا نظارہ کرد + تا حشر دست و بازوے او را دعا کند +

گفتۂ غالب ؎ کہیں نظر نہ لگے اُس کے دست و بازو کو + یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

بجائے دُعا دینے کے دیکھنے والوں کی نظر لگنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اور کمال عاشقی یہ کہ زخم ایسا کاری کہ لوگ دیکھنے کو آئیں اور عاشق اتنا ثابت قدم کہ اپنے ہوا خواہوں اور تیمارداروں سے اس لئے متنفر ہے کہ اُس کے دست و بازو کو ان کی نظر نہ لگ جائے۔ سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے!

میر شرف قزوینی ؎ ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا + چوں بایں تقریب می آرد بیاد او مرا +

گفتۂ غالب ؎ گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ + ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے +

علاوہ خوبی بندش اور روانی کلام مرزا اپنے ذکر کو اپنی موجودگی پر ترجیح بھی دیتے ہیں +

ملا نسوانی تبریزی ؎ با وجودی رسم آزردہ می شوم از دور + ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف +

گفتۂ غالب ؎ اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق + وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے: پہلے مصرعہ میں عاشق کی حالت کا فوٹو ہے۔ دوسرا مصرعہ معشوق کے عندیہ کا ترجمان ہے +

مرزا حسن بیگ رفیع ؎ خوشم لم زیں کہ با و نامہ نویسم شب و روز + مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نہ رسد

گفتۂ غالب ؎ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو + ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

کس قدر زبردست تخیل ہے کہ مقصد کچھ نہیں مگر ہم کو تو تمہارا نام پیارا ہے۔ بے مطلب کے خط لکھنا نام پر عاشق ہونے کا پورا ثبوت ہے ورنہ صورت پر عاشق ہوتے ہیں نام سے مطلب نہیں ہوتا + لیے نقش ماسوا مٹا کر اسم ذات کا ذکر بالجہر تصوف کا سبق اولیں ہے یہاں نام کا عاشق بنا پڑتا ہے بغیر اس ذکر کے لطائف ستہ نہیں کھلتے درحقیقت یہ شعر تعلیم نفی و اثبات ہے اگرچہ مقصد نفی و اثبات نہیں مقصود صرف ذات ہے مگر ع بنتی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر +

ملا عرفی شیرازی سے بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید۔ ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید ٭
گفتۂ غالب سے پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار ٭ رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے ٭

یہہ بھی مرزا علیہ الرحمۃ کی کرامت ہے کہ گفتۂ غالب ایک بار" نے نوشاعروں کو بے دم کر سلوا دیا اور منوا دیا ٭ حق یہہ ہے کہ ولی را ولی می شناسد مرزا غالب کا صحیح اندازہ قایم کرنا ایک ایسے بلند پایہ شاعر کا کام ہے جو اعلیٰ فصاحت و بلاغت کے ساتھ پورا فلسفی اور حکمت کا ایسا ماہر ہو کہ تہذیب۔ تمدن۔ تعلیم۔ تربیت۔ فطرت زندگی کے ہر شعبہ پر نظر غائر ڈال کر غالب کی نگاہِ تیز کو جانچے کہ یہہ دیدہ ور اندرونی کیفیت کے مشاہدہ سے متاثر ہوکر بیرونی کیفیت کو کس فلسفیانہ منطق سے سمجھاتا ہے۔ اور اس ارضی زبان سے آسمانی خیالات کو وصل دیکر لطیف روح اور مکدر مادہ سے کیا کیا دلربا حسین پیدا کرتا ہے ٭

ہائے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری تجکو اس جوانی میں کس کی نظر کھا گئی۔ ہائے جواں مرد تو ہماری نا قابل صحبتوں سے اکتا کر صدر نشین انجمنِ روحانیاں ہوگیا ع کرتا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور ٭ ہائے تو یورپ نہ جاتا اور السنہ مشرقی و مغرب کا ڈاکٹر نہ بنتا یا سواد کلام شعرائے یورپ کا سرمہ اپنی چشم حقایق بیں میں نہ لگاتا۔ لگاتا تو دیوان غالب نہ پڑھتا۔ پڑھتا تو اُس پر اپنی قلمِ عطارد رقم سے تبصرہ نہ لکھتا۔ تو ضرور تو اور جیتا رہتا ٭ ہائے وہ کام جو ہزاروں لاکھوں افراد قوم سے نہیں ہوا تو نے بیک چشم زدن اُس کو پورا کرکے اپنے محبوب ممدوح کو گلشن جنت میں جا سنایا ٭ ہائے جس دریا دلی اور وسیع النظری سے تو نے مرزا کو روشناس عالم کیا کیا اُس بلبل ہزار داستان غالب شیریں بیاں نے تجھے دل کھول کر نہ سراہا ہوگا؟ ہائے تیرا تبصرہ تو نقارہ کی چوٹ کُل ہندوستان میں گونج گیا۔ مرزا نے جو تہدیہ تجھے پیش کیا ہوگا وہ کیسے سُنیں کہاں سے لائیں؟ اے جاں باز فلک پرواز تو نے مرزا غالب کا مقابلہ اکابر شعرائے یورپ سے کیا اور بہت صحیح کیا اور دکھا دیا کہ اس اُجڑے دیار ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے شاعر کا دُنیائے ادب میں کیا درجہ ہے جس کو زمانہ ایک شاعر سمجھے ہوئے تھا تیرے ہی

نظرِ عمیق نے تیرے ہی فلسفیانہ دماغ نے تیری ہی شاعرانہ طبیعت نے اُس کے اصلی خط و خالِ حقیقی رنگ و روپ میں سب کو دکھا دیا ۔ اللہ تعالےٰ تیرے مُنہ کو نعماے بہشتی سے شاد کام رکھے تو نے ہی اُس رمز شناس فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم کی معجونیں ہم کو کھلائیں جس سے خفتہ قوم کا مرضِ سبات وجمود دُور ہو رہا ہے ۔ کاش تیرے لیئے بھی کوئی تیرا ہی سا دل و دماغ لے کر آئے جو تیری ہمہ داں طبیعت کے جوہر قوم کو سُنائے اور صدیوں کا کام جو تو نے ہنستے بولتے کھیلتے کُودتے برسوں میں کر لیا دُنیا کی مصائب سے دل تنگ ہو کر کبھی تیری پیشانی پر بل نہ آیا ۔ تیرے ہم سبق ہم عمر احباب ہی تجکو عزیز نہیں رکھتے تھے بلکہ مہربان اُستاد اور بزرگ اصحاب بھی تجکو ہونہار نوجوان سمجھ کر اپنا ہمدرد اور غمخوار سمجھتے تھے ۔ تیری خندہ پیشانی اور متین خاموشی ہر وقت جلسۂ احباب میں تجھے اپنا پیشوا بنائے رہتی تھی تیری تنازع البقا کی بحثیں تیری جواں مرگی کی خبر دیتی تھیں مگر یقین نہ آتا تھا اور سچ تو یہہ ہے کہ سب کو مرنا ہے مگر تو نہیں مرا تیری موت تو عالم کی موت ہے جب تجھسا فرزند مادرِ گیتی جنے تو تجکو موت کا ڈر ہو سکتا ہے ۔ جب تجھسا پیدا ہی نہیں ہوا تو تُو کس طرح مر سکتا ہے ۔ جب تیرا لکھا دُنیا سے مٹ جائے گا تو تُو مُردہ سمجھا جائے گا تیرا یہہ تبصرہ جو تو بچپنے ہی میں اُس کی مبادل کھینچ چکا تھا کافی سے زیادہ ہے گو نا تمام ہے ۔ اُٹھ اور دیوانِ قدیم کے مقدمہ پر قلم اُٹھا ۔ یہہ کام تیرا ہی تجھی سے ہو سکتا ہے ۔

اللہ اکبر ڈاکٹر عبد الرحمن مرحوم مغفور کا خیال ہی آیا تھا کہ ایک بجلی دل پر گری دل گھبرا دماغ چکرا گیا طبیعت قابو سے باہر ہو گئی اُس خود فراموشی میں کیا سے کیا لکھ گیا : دیوانِ غالب کا تذکرہ تھا ۔ فاضلِ اجل ادیبِ بے بدل فخرِ قوم بحر العلوم حکیم الملت ڈاکٹر محمد عبد الرحمن صاحب بجنوری مرحوم بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ بیرسٹرایٹ لا ڈی ۔ جے کا ماتم کرنے لگا ۔ جن کے دلوں کو ٹھیس لگ چکی ہو گی وہ اس بے آہنگی اور بد رنگی میں معذور سمجھیں گے ۔ بیدرد دلوں سے کام نہیں یہ بھلا یہہ کیسے ممکن تھا کہ مرزا غالب کا نام آئے اور ڈاکٹر صاحب بھلا دیئے جائیں ؎

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزم نہ ناصح ۔ بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر صاحب مرحوم مغفور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کی دو کتابیں الہامی ہیں ایک وید مقدس دوسرا دیوان غالب اور یہہ کوئی نیا خیال نہیں مرزا غالب یہ پیشین گوئی بچھتر برس پہلے کر چکے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے اس مقولہ سے مرزا غالب کی پیشین گوئی کی یا یہہ کہوں اُن کی کرامت کی صداقت اب ہوئی ہے۔ وہ ابوالوقت قادر الکلام لسان الغیب آوازِ بلند صلائے عام دیتا ہے ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے ✦ دیوان مرا شہرت پرویں بودے

واللہ در ؎ غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے ✦ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ع شاعری جزویست از پیغمبری ✦ اور اس میں شک نہیں کہ ایسے ہی شعرا تلامیذ الرحمٰن سمجھے جاتے ہیں جو فطرت کے ترجمان اور بہار قدرت کے باغبان ہوتے ہیں ✦ یہہ رمز قدرت کا اظہار نہیں تو کیا ہے؟ کس حسرت بھرے دل سے فرماتا ہے ؎

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن ✦ ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

آگے الہام ہوتا ہے ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی دادہ است ✦ شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یہ بھی کیسی زبردست پیشین گوئی اور کھلی کرامت ہے کہ جس قدر اُن کے ہم عصر شعرا اُن کے کلام پر معترض رہتے تھے اور طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے رہتے تھے۔ ہائے وہ کیا کشتہ چھوٹے جاتے ہوں گے جس سے یہہ خونابہ فشانی ہو رہی ہے۔ اور وہ کیسی چٹکیاں لی جاتی ہوں گی جس کا جواب یوں دے رہے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ✦ سن سن کے اُسے سخنوران کامل ✦

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش ✦ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ✦

ہے ہے یہ تو کسی زبردست کاری چوٹ کا دنداں شکن جواب ہے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ✦ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی ✦

اس تکرار مقولہ عوام سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا علیہ الرحمت کی زندگی میں عموماً اُن کا کلام بے معنی سمجھا جاتا تھا ع

اسدا ے ہرزہ درانالہ بہ غوغا تا چند ✦ حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا ✦
ع اسد ارباب فطرت قدردان لفظ و معنی ہیں ✦ سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا ✦
ہائے وہ تحسین جس کے وہ قابل تھے کون دے سکتا تھا۔ مگر آج اُن کا وہی کلام جو اُس وقت موردِ الزام تھا چار دانگ عالم سے خراج تحسین وصول فرما رہا ہے ✦ علامہ سر اقبال حضرت شوق قدوائی۔ مولانا طباطبائی۔ حسرت موہانی۔ حکیم جمشید علی خاں صاحب اختر۔ مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے اکسن جیسے باکمالوں نے مرزا غالب کے کلام کو ہر فن اور ہر پہلو سے جانچا اور دل کھول کر سراہا ہے ✦ پبلک کی دل بستگی بھی اس خریداری سے تصدیق ہو رہی ہے کہ سات مرتبہ تو مولانا نظامی بدایونی کے مطبع سے نئی آن بان اور دلچسپ شان کے ساتھ دیوان غالب چھپ کر بڑی بڑی لائبریریوں کی بہار ہے۔ اچھے کاغذ اور خوشنما طباعت کے ساتھ مختلف شان و صورت کے متعدد ایڈیشن چھپکر شایع ہو چکے ہیں مگر مانگ برابر جاری ہے ✦ ایک دارالاشاعت نے تو یہانتک ہمت کی کہ سمندر پار برلن میں دیوان غالب چھپوا کر منگوایا جو اپنی خوبصورتی میں اگر ہندوستانی مطبوعہ دیوانوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ اور خدا جانے آئندہ اس فرید العصر قطب الوقت کے کلام کی کیا کیا قدردانی اور عزت افزائی ہوگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ نسلیں اس حقایق بیں حقیقت شناس کو قبولیت دوام کی سندیں کیسی کیسی دیں گی اور وہ ترقی جو اس حکیم الفلسفہ کے کلام کو سمجھ کر آئندہ قوم میں پھیلے گی کیا کچھ رنگ دکھائے گی اور کب تک یہ سنوائے گی ع

آہ اس اُجڑی ہوئی دلی میں تو آرمیدہ ہے ✦ گلشن دیگر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے ✦ باقی دارد
(حکیم محمد میاں آغا دہلوی)

صلائے عام۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے متعلق مضمون اسی رسالہ یعنی

صلائے عام میں زیب دیتا ہے کہ حضرت غالب کو آگرہ سے بھی تعلق سمجھا جاتا ہے مگر از روئے شاعری اور فضیلت و کمال آپ کی شہرت دلّی سے وابستہ ہے۔ صاحبِ مضمون نے حضرت کے کلام پر تبصرہ اچھا لکھا ہے کہ اس میں یہہ نئی بات پیدا کی ہے کہ غالب کو ولی بھی سمجھنا چاہیئے ❋ یہہ وفورِ محبت نہیں بلکہ صاحبِ مضمون کی وفورِ عقیدت کا ثبوت ہے ❋ مگر اسے کیا کیجئے؟ ؎

یہہ مسائلِ تصوف یہہ ترا بیان غالب ❋ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مجھے یہہ دیکھنا ہے کہ اس مضمون کی دوسری قسط میں جس کا وعدہ صاحبِ مضمون نے کیا ہے آپ کیا لکھتے ہیں؟

دسمبر ۱۹۲۸ء کا صلائے عام

حضرت احسن مارہروی کے نوازش نامہ کا اقتباس :-

× × × × × ”آج دسمبر کا صلائے عام ایک جگہ دیکھا۔ بیتاب ہو گیا اور اسی وقت سے تمام کام چھوڑ کر یہہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ ایزد تعالے آپ کے سائے کو ابھی بہت دنوں تک خادمانِ اردو کے سروں پر قائم رکھے ❋ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!“ × × × × × × × × × × × ×

(از مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑہ)

صلائے عام - حضرت احسن کی قدردانی دراصل قدردانی ہے کہ آپ خود اردو کے نامور لکھنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کی قدرشناسی پر جس قدر ناز کیا جائے تھوڑا ہے کہ آپ زبان اردو کے مستند سخن فہم اور سخن سنج ہیں۔

صلائے عام کے مضمون ”پریشاں“ کی نسبت مجھے شبہہ تھا کہ شاید اکثر طبائع کی سمجھ کے موافق نہ ہو۔ یہہ شبہہ اس طرح رفع ہو گیا کہ ایک صاحب نے جو پاکیزہ لکھنے والوں میں ہیں مجھے لکھا ہے کہ :- × × × ×

× × × × × × × × × × × × ×

[illegible]

اُونٹ اور شیر کی حکایت

نقل ہے کہ کسی جنگل بیابان میں ایک شیر بڑا زبردست غرّاں رہتا تھا کہ عدو کو اُس کی غُرّش سے غش آجائے۔ دیکھ پائے تو گاؤزمین کو ایک لقمہ کرکے کچّا کھا جائے۔ نیل فلک کو اپنے سامنے بکری سے کمتر جانتا تھا۔ آدمی تو کیا پشّہ ہے سیمرغ کو نہیں مانتا تھا۔ پنجہ اُٹھا دے تو پتھر کو موم بنا دے ناخن لگا دے تو فولاد کے پار ہو جاوے۔ حریف کو تو کیا سمجھتا تھا اپنی پرچھائیں سے آپ اُلجھتا تھا۔ جانوروں کو اس کثرت سے کھایا۔ کہ جنگل میں ہڈیوں کا پہاڑ بنا دیا۔ چرند کا کیا مذکور پرند کا دُور دُور تک گزار نہ تھا۔ خاک کا کیا مقدور۔ ہوا کا بھی اُس تک بار نہ تھا۔ پانی میں اپنی صورت دیکھ کر آگ ہو جاتا تھا۔ برق کو اپنی گرمی کے آگے ہوا بتاتا تھا۔ ایک بھیڑیا اور ایک کوّا رفاقت میں سرفراز تھا۔ دونوں کو اُس کی مصاحبت پر ناز تھا۔ دونوں جستجو کرکے شکار کی خبر لاتے تھے۔ پس خوردہ انعام میں پاتے تھے۔ اتفاقاً ایک اُونٹ آفت کا مارا منزلوں کا ہارا۔ اُس جنگل میں آگیا۔ بھیڑیا اُسے دیکھتے ہی خاک اُڑانے لگا۔ کوّے نے خبر پہنچائی کہ غیب سے روزی آئی۔ حکم ہوا کہ جاؤ۔ اور اُس کو یہاں بُلا لاؤ۔ جب کوّے نے آکر یہ حکم سُنایا تب اونٹ نے کان نہ ہلایا۔ بے عذر حاضر ہو کر پاؤں پہ گردن رکھ دی۔ اور امان طلب کی۔ شیر نے کہا کہ کچھ اندیشہ مت کرو۔ اب کسی سے نہ ڈرو۔ اس جنگل میں شوق سے رہو۔ پتا پھل نرم چارہ چرو۔ اُونٹ مُطلق العنان ہو کر اُس مرغزار کی سیر کرنے لگا۔ برگ و بار وہاں کے بے تکلف چرنے لگا۔ چند روز میں اتنا فربہ اور تیار ہوا کہ اُس کا گوشت اُس کے بدن پر گراں بار ہوا۔ اب شیر کی حقیقت سُنو۔ کہیں شکار کو گیا تھا۔ آدمی زاد کو تو تم جانو اگرچہ ضعیف البنیان ہے۔ مگر کیسا اُولوالعزم اور عظیم الشان ہے۔ کسی آزمودہ کار اور مرد میدانِ کارزار نے حملہ کیا اُس نے تیروں کا نشانہ بنا دیا۔ شیر جان سے تو نہ مرا۔ مگر مجروح ہو کر پھرا۔ اور بسترِ خاک

پھر گیا۔ اپنا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹتا تھا۔ اپنا خون اپنی زبان سے چاٹتا تھا۔ کوّے نے بھیڑیے سے کہا کہ ناحق بھوک سے مرتے ہیں۔ فاقہ پہ فاقہ کرتے ہیں۔ کہیں شکار کو جو نہیں جاتے ہیں تو اونٹ کو کیوں نہیں کھاتے ہیں۔ چلو کھا دیں کہ گھر میں جانور فربہ موجود ہے۔ آپ بھی کھا دیں ہم کو بھی کھلا دیں۔ بھیڑیے نے جواب دیا سنو بھائی اگرچہ تم سیانے ہو۔ مگر غذا کے مقدمہ میں بڑے دیوانے ہو۔ بندہ شیر کا مزاجداں اور رفیق دیرینہ ہے۔ تم نہیں جانتے وہ بڑا ثابت کینہ ہے۔ اُس نے اونٹ کو امان دی ہے۔ پناہ کی زبان دی ہے۔ ایسی بات اُس سے کہنی کیا ضرور ہے۔ شتر بر کدام پہلو نشیند مثل مشہور ہے اگر وہ اس امر پر راضی ہو جاتا ہے۔ تو آئندہ اپنا بھروسا کیا ہے۔ کوّے نے کہا کہ جی تو تمہارا بھی چاہتا ہے۔ ہم کو اُڑاتے ہو چبا چبا کر باتیں بناتے ہو۔ چل کر سمجھاؤ تو سہی مان لے گا تو مار لیا ہے۔ نہ مانا تو اپنا نقصان کیا ہے۔ تم اگرچہ گرگ باراں دیدہ ہو۔ مگر سا تار دہن کی باتوں کو جانے دو۔ یہاں ایک تم اور ایک ہم ہیں۔ صلاح مشورہ کے لئے کیا کم ہیں۔ القصہ دونوں شیر کے پاس گئے مزاج کا حال پوچھا۔ کوّے نے التماس کیا کہ آپ نے چند روز سے کچھ تناول نہیں فرمایا ہے۔ دل ہمارا بہت کڑھتا ہے ہم تو آپ ہی کا تصدق کھاتے ہیں اور آسودہ ہو جاتے ہیں۔ کیا کریں اتنی طاقت نہیں کہ کچھ لا دیں اور آپ کو کھلا دیں۔ استخواں شکنی ہمارا کام ہے سو آپ کرتے ہیں۔ ہم بھی بھوک کی شدت سے مرتے ہیں۔ گستاخی معاف اونٹ اگر آج شرط خدمت نہ بجا لائے گا۔ تو پھر کس دن کام آئے گا۔ شیر نے آنکھ بند کر کے جواب دیا کہ ہاں یہہ سچ ہے مگر میں نے اُس کو پناہ دی ہے۔ عہد شکنی کب ہو سکتی ہے۔ تب بھیڑیا بولا اگر آپ نے اُس کی رفاقت کا خیال کیا ہے تو یہہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے ایسے جانوروں کو باوجود رفاقت کے انسانوں پر بھی حلال کیا ہے۔ آدمی بھی اُن کو پالتے ہیں۔ اور عند الضرورت ذبح کر ڈالتے ہیں۔ آپ کو تین دن سے گرسنگی کمال ہے۔ تیسرے دن تو مردہ بھی حلال ہے۔ اونٹ اگر اپنی جاں نثاری پہ تیار ہو تو آپ کو انکار کیا ہے۔ شیر یہہ بات سنکر چپکا ہو رہا۔ تا معلوم ہو خاموشی نیم رضا ہے پس دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کہا کہ ہم جاتے ہیں۔ اور اونٹ کو حضور میں لاتے ہیں۔ الغرض

دو نوحریف اُونٹ کے پاس آئے اور شیر کی مجروحی کی حقیقت ظاہر کر کے عیادت کے لئے اپنے ساتھ لائے۔ پہلے کوّے نے روغنِ قازیوں طاکہ شیر مالک ہم سب کا ہے۔ تین دن ہوئے کہ بھوکا پیاسا ہے۔ یار وگواہ رہو کہ میں نے اپنا خون بخشا کاش میرا گوشت پسند آوے تو بے تکلف تناول فرماوے۔ بھیڑیا بولا اوّل تو میں قدیم ہوں۔ مدت سے میرا اُس کا ساتھ ہے۔ دوسرے تجھ مُشتِ پر کے کھانے سے کیا ہوگا۔ بگلا مارے پنکھ ہاتھ ہے۔ اگر مجھے نوش فرماوے۔ تو کسی قدر آسودہ بھی ہو جاوے۔ کوّے نے جواب دیا کہ تو خدمت گزار قدیم شیر کی خدمت بجا لاتا ہے۔ ایسے رفیق کو کوئی کھاتا ہے۔ اونٹ بیچارے کو تقلید کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ اِس تقریر کو محض دھوکے سمرقندی سمجھا۔ دوست دشمن سادہ لوحی سے پہچانتا نہ تھا۔ شیر کی شترگربگی اور روباہ بازی۔ بھیڑیے کی آشتی۔ کوّے کی کیا دی۔ اور غمازی جانتا نہ تھا۔ سمجھا کہ یکبارگی مار نہ ڈالیں گے۔ میری بات کا بھی جواب ویسا ہی دیں گے۔ بے تامل بول اُٹھا کہ میں بھی تو اُس کا تابعدار ہوں۔ فدائی اور جاں نثار ہوں۔ آج اگر فدا نہ ہو جاؤں گا تو پھر کس دن کام آؤں گا۔ یہہ سُنتے ہوئے کوّے نے شاباش شاباش کہتے ہوئے چونچ سے اُس کی آنکھ پھوڑی۔ بھیڑیے نے ٹینٹوا لیا۔ گردن مروڑی۔ اُونٹ چاروں شانے چت زمین پر گرا۔ بہتیرا بلبلایا بلبلایا۔ شغیرے نے سینہ کاٹ کھایا۔ کوّا کاؤں کاؤں کی جگہ کھاؤں کھاؤں پکارنے لگا۔ بھیڑیا کُود کُود کے مُنہ مارنے لگا۔ اُونٹ سے کوئی تدبیر بن نہ آئی مُفت میں اپنی جان گنوائی۔ شیر نے آپ بھی سیر ہو کر کھایا۔ اپنے رفیقوں کو بھی خوب کھلایا۔ بالآخر اُسی زخم کی سرایت سے شیر بھی چند روز کے بعد مرگیا۔ بھیڑیا جنگل سے فرار ہو گیا کوّا صحرا کا ہوا نہ گھر کا۔ نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ حاصل یہہ کہ ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ برا ہی ہے۔ اور یہہ بات بدیہی ہے۔ دیکھئے اگر یہہ کوتہ اندیش ذرا بھی عقل سے بہرہ رکھتے۔ تو آج کاہے کو خاں وماں سے برباد ہوتے۔ آپ تو بدخواہ پھنسے تھے۔ چاہتے تھے کہ اوروں کو بھی پھنسا دیں۔

آپ تو ڈوبے۔ تو اوروں کو بھی اپنے ساتھ ڈبا دیں ؎

منقول از گلدستہ
(مصنفہ خان محمد عبدالعزیز الٰہ آبادی)

طرز خاص

طرزِ خاص

دفترِ رسالہ بہارستان فرنگ لاہور

میر صاحب قبلہ۔ آداب و نیاز۔ مُدّت سے محرومِ التفات ہوں ہرچند کہ اپنی خاموشی کا اعتراف ہے لیکن ساتھ ہی آپ کی بزرگانہ توجہات کا گلہ مند بھی ہوں۔ آپ کچھ ہی خیال فرمائیں بندگانِ محبت کی وحشت سرائیاں۔ بہرحال۔ جواز و عدم جوازِ شکایت سے بے نیاز ہوتی ہیں اور یہ

ع مرا بسادہ دلی ہائے من تواں بخشید ✦ خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

پھر خطا بھی کیسی کہ اُلٹی شکایت کے رنگ میں ع میں پنی دُخود دے لوں کہ میں بھی کیا مست ہوں! بات یہ ہے کہ یہ سب ناز و نیاز مندی کی شرارتوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میرا کیا مُنہ تھا کہ خواہ مخواہ کی شکوہ طرازی کے جُرمِ بے ادبی کو روا رکھتا۔ اور پھر آپ کے حضور میں! میری توبہ ہے

اب سُنیئے کہ "بہارستان" کی ایک خاص اشاعت کے لئے حضور کی تصویر اور مختصر حالاتِ زندگی کی ضرورت ہے۔ نیز ایک مضمون کی بھی جو تصویر کے ساتھ شائع ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مضمون اُردو نثر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہو تو زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ آپ جہاں نثر میں ایک لطیف رنگ یا طرز کے مالک ہیں وہاں اس کے مختلف دور اور ان کی حیثیات سے بھی بجائے خود باخبر ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نثر کی ارتقائی کیفیات کی داستان کو آپ سے بہتر نہ تو کوئی سمجھتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تینوں چیزوں کی فراہمی میں آپ کی نوازشیں مجھے محروم رکھنا گوارا نہ فرمائیں گی! خدا نہ کرے! ✦

(آپکا۔ آپکی محبت کا — اختر

صلائے عام ۔ ہماری زبان چونکہ ہر طرز پر ترقی کر رہی ہے ۔ یہہ نمونہ خاص طرز کا ہے جو آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ پارٹی میں کم و بیش رائج ہوتا جاتا ہے ۔ اس میں فصاحت کے ساتھ جدّت ملی ہوئی ہے ۔ بلکہ جدّت کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے ۔ زبان کی ترقی کے لئے ہر طرز پر لکھنے کی ضرورت ہے ۔

زندگی سے خطاب

کسی کی میٹھی میٹھی باتیں سُننے کو جی چاہا ۔ صلائے عام کا ایک نمبر اُٹھایا ۔
"مصیبت کی زندگی کو جانے دیجیئے ۔ عیش و آرام والے بھی اُس کی جان کو روتے ہی رہے ۔" اِن الفاظ نے مجھے ایک دوسری ہی دُنیا میں پہونچا دیا ۔ کتاب بند ۔ آنکھیں بند ۔ دربار لگا ۔ میں نے زندگی کو اپنے حکم سے سامنے لا کھڑا کیا ۔ اور اُس سے یوں گویا ہوا ۔ دیوانہ (وحشت لاشعور)

اپنا دُشمن کون ہے تیرے برابر زندگی ۔ شکر یہہ کس بات کا تیرے ہو لب پر زندگی
رات دن دیتی رہی تو مجھکو چکّر زندگی ۔ میں نہ مانگوں گا تجھے ہرگز مکرّر زندگی

ہے تعدّی پر ترے شاہد پریشانی مری
کیا کہوں میں کس قدر اب ہے پشیمانی مری

اِک گھڑی کی دی ہنسی رونا دیا اِک ماہ کا ۔ آسماں کب ہے ۔ دھواں ہے دِل جلوں کی آہ کا
رنج بے حاصل ملا ہر اِک کو تیری چاہ کا ۔ روے زیبا کس نے دیکھا عیش خاطر خواہ کا

جو گیا در سے ترے رونا رُلاتا ہی گیا
داغ دیتا ہی گیا اور زخم کھاتا ہی گیا

بحر تو شوریدہ سر گُل تو گریباں چاک ہر ۔ ہے شفق تو خوں چکاں شبنم تو رو در خاک سر

لرزہ بر اندام انجم ہیں بڑا تش ناک ہے + اسپ نیز سے پر ہے آموختہ فتراک ہے

تو ہی کہہ اسے زندگی دم سے ترے ہے شاد کون

عصمت دروزہ میں ہے کامران داد کون

سچ بتا مجھکو ہے معشوق جفا جو تو کوئی + ہے بہ رنگ زلف پیچاں شاخ آہو تو کوئی

قاتل بے دل غ ہے شمشیر ابرو کوئی + لال ڈورے والی یا ہے چشم جادو تو کوئی

تیرے دیوانے ہیں سب اور سب ترے رم کردہ ہیں

تیرے شیدائی ہیں سب اور سب ترے آزردہ ہیں

توازنِ عمل

از

صادق ایوبی

عربی ہیتم کے دیس میں بستی "عنا" جو قلب صحرا واقع ہے۔ اُس میں دو شخصیتیں ایسی سانس لیتی تھیں کہ ایک کو دنیا حُسنِ عمل کے لحاظ سے "زاہد" اور دوسرے کو افعالِ قبیحہ کے باعث "گنہگار" کہتی تھی۔

"زاہد" کی نظروں میں تقدس تھا۔ دنیا اس سے محبت کرتی تھی۔ "گنہگار" کی زندگی تاریک تھی۔ لوگوں کو اُس سے تنفر تھا۔

ملیحۂ شب کے سر پر چاند اپنی کرنوں کا تاج رکھ چکا۔ تو وہ دونوں وفورِ شوق سے بیخود ہو کر ملے۔ اُن کی پہلی نظر کا ایک دوسرے کی نگاہوں سے ملنا تھا کہ اُن کی کایہ پلٹ گئی۔ ایک مسکرا دیا ــــ اور دوسرا رو دیا۔ دیکھتے دیکھتے "گنہگار" نے وہ کیا جو اُس نے عمر بھر نہ کیا تھا

اور "زاہد" نے وہ کیا جو اُسے نہ کرنا تھا ۔!

ہیچ لوگوں کی زبان پر یہ تھا "کمبخت! تو نے کیا کیا ۔؟" "گنہگار" کے عمل کو دنیا نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ۔ قبولیت کے کانوں سے سُنا اور تحسین کی زبان کو حرکت دی ۔ یہ لفظ گونجنے لگے :۔

"تیری پُر اسرار شخصیت کا ہمیں غلط اندازہ تھا ۔ ہائے! ہم کو کس ہستی کی پرستش کرنی تھی اور کس کی کرتے رہے ۔ اُف!"

"زاہد" خائب و خاسر ہو کر ٹھوکریں کھاتا ہُوا بھاگا ۔ تکان سے چور ہو کر دم لینے کی کوشش کی ۔ انفعال و تاسُف کے آنسو جو عقیق اور رنگِ حنا کی طرح سُرخ تھے ۔ ابھی آنکھوں سے گر ہی رہے تھے کہ فرشتۂ رحمت نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یوں صدائے خروش بلند کی :۔

"نادان یہ رونے کا مقام نہیں ۔ اُٹھ اور سبق لے ۔ بُرے عمل کا ایک قطرہ حُسنِ عمل کے دریا میں مل کر نفرت اور ہلاکت کا سبب ہوتا ہے ۔ اور بُرے عمل کے دریا میں حُسنِ عمل کا ایک اور محض ایک قطرہ تقدُّس اور ترحُّم پیدا کرتا ہے!

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ پانی میں بال تو جلد ڈھونڈھ لیا جاتا ہے ۔ لیکن سیاہی میں کلنک نظر نہیں آتا!!"

(ڈیرہ غازیخاں) صادق ایوُبی

نوٹ ۔ اخیر میں اس پرچہ کے ساتھ چند انگریزی کے اسناد و خطوط کا اقتباس انگریزی میں چھپا ہوا شامل ہے جو مستنصر پریس واقع فراشخانہ ۔ دہلی میں چھپوایا گیا ہے اور ٹائٹل پیج یعنی لوح کا صفحہ بھی مستنصر پریس میں چھپوایا گیا ہے ۔

نوشیرواں کا خواب اور تعبیرِ خواب

(فردوسی کے قلم سے)

نوشیرواں بادشاہ نے خواب میں دیکھا

دریں سال یک شب نیایش گرفت	بخواب اندروں شد ستایش گرفت	چناں دید روشن روانش بخواب	کہ در شب برآید یکے آفتاب
چہل پایہ نردباں از برش	کری رفت تا اوج کیواں سرش	برآمد برایں نردباں از حجاز	خراماں خراماں بکشتی و ناز
جہاں قاف تا قاف پر نور کرد	بہر جا کہ بد ماتمے سور کرد	بہر جا کہ بد نور نزدیک راند	جز ایوانِ کسریٰ کہ تاریک ماند
چو برتیغ بر افگند از چہر مہر	بخواندش بر خویش بوزرجمہر	بدانا شہنشاہ اندر نہفت	زخوابے کہ دیدہ بد باز گفت
چو بشنید بوزرجمہر این سخن	نگہ کرد آں خواب سرتا بہ بن	چنیں گفت کاے خسرو کامراں	ہمانا کہ رازیست اندر نہاں
ازاں پس چنیں گفت بوزرجمہر	کہ اے راے تو برتر از ماہ و مہر	ازیں روز تا در چہل سال بیش	نہد مردے از تازیاں پائے پیش
کہ در پیش گیرد رہ راستی	بہ پیچد ز ہر کژی و کاستی	بہم بر زند دینِ زردشت را	بہ مہ چوں نماید سر انگشت را
بہ دو نیمہ گردد ز انگشتِ او	بگوشش نہ بیند کسے پشت او	جہود و مسیحی نماند بجاے	درآرد ہمہ دینِ پیشیں زپاے
بہ تخت سہ پایہ برآید بلند	دہد مر جہاں جملہ را نیز پند	شود نو جہاں قرن تا قرن شاد	جز ایوانِ شہ کاں برآید بباد
پس از وے ز تو یک نبیرہ بود	کہ با پیل و کوس تبیرہ بود	سپاہے بتازد بر او از حجاز	اگرچہ ہزار و سلیح و جہاز
ز تخت اندر آرد مر او را بخاک	ز گرداں کند مر جہاں جملہ پاک	نہ آتش گزارد نہ آتش کدہ	شود ہر دو از دستش آتش زدہ

دوسرے روز نوشیرواں سو رہا تھا کہ سخت آواز ہوئی اور معلوم ہوا کہ طاقِ ایوان ٹوٹ گیا ہے بزرجمہر کو بلا کر دکھلایا کہ یہ کیا بات ہے۔ فردوسی لکھتا ہے

چناں شد کہ از شب گزشتہ سہ پاس	یکے بانگ آمد چناں پر ہراس	کہ گوئی جہاں سر بسر گشت پست	پس آنگہ یکے گفت ایواں شکست
بہ بوزرجمہر آنگہ آواز کرد	ز طاقِ شکستہ پس آغاز کرد	چو آں دید دانا ہم اندر زماں	چنیں گفت کاے شاہ نوشیرواں
بخواب اندروں ہر چہ دیدی تو دوش	ازاں چہار شب برآمد خروش	چناں داں کہ ایوانت آواز داد	کہ آں ماہ پیکر زمادر بزاد
دریں بود آمد سوارے چو گرد	کہ آذر گشست ایں زماں گشت سرد	ازیں کار دل تنگ شد شاہ را	ہمی ہر زماں بر کشید آہ را

بد دلگفت

* وگفت بزرجمہر آں زماں * کزیں کارشاہا چہ باشی تواں * زماں چوں ترازیں جہاں کردو * پس از تو جہاں رانچہ ماتم چہ سود *

اس حکیم دانشور کا نام اصلی بزرگ چوہر ہوگا کثرت استعمال سے بزرجمہر ہوگیا ہے۔ فارس کے بہترین حکما میں سے تھا نوشیرواں کا نفس ناطقہ تھا۔ اُس نے خواب کی کیا خوب تعبیر دی کہ بالکل اُسی کے موافق ظہور میں آیا۔ ایس ایوان کے ۱۴ کنگرہ گرے تھے اس سے یہہ اشارہ تھا کہ نوشیرواں کے بعد ۱۴ بادشاہ ہونگے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آخر بادشاہ یزدگرد کے زمانہ میں دوسرے خلیفہ نے ایران پر فوج بھیجی اور صرف تین لڑائیوں میں ایران جیسی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح ہوگئی۔

الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں ایک سوال اٹھایا ہے کہ اس کی کیا وجہہ ہوی کہ اہل ہند (ہندو) کئی سو برس تک مسلمانوں سے برسر پیکار رہے تو بھی نہ کل ہندو مارے گئے نہ جلاوطن ہوئے نہ ہندوستان سے اُن کی حکومت بالکل مٹی۔ اور ایران جیسی زبردست سلطنت فارسیوں کی صرف تین ۳ لڑائیوں میں مٹ مٹا گئی۔ اس کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہندو (اہل ہند) اپنے مذہبی پیشوایوں کو بڑی عزت سے دیکھتے تھے اور اُن کا بہت ادب کرتے تھے۔ بخلاف فارسیوں کے کہ وہ موبدوں سے ذلیل کام لیتے تھے اور عام خاص کی نگاہ میں اُن کی کچھ عزت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ جب ہندوؤں کی دنیاوی قوت کمزور ہو جاتی تو وہ دینی جوش سے بذریعہ برہمنوں کے کام نکالتے اور برہمنوں کے وعظ کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ یہہ بات فارسیوں کو نصیب نہ ہوئی اور جلد اُن کا خاتمہ ہوا۔ مگر تاریخی حیثیت سے بھی یہ جواب دلنشین نہیں ہے اس سلئے کہ ہندوؤں سے زیادہ عیسائی پطریق اور پادریوں کی عظمت کرتے تھے اور تاریخ گواہ ہے کہ ہرقل بادشاہ کی فوجوں کے پادری جو عام لوگوں کی نگاہ میں خدا کے نائب تھے اور جنت دوزخ کے مالک تھے۔ بہت ہی کچھ فوج کی دل گرمی کرتے تھے مگر پھر بھی کم تعداد بے سروسامان فوج اسلام عیسائیوں پر غالب آتی رہی۔ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں دینی و دنیاوی دونوں قوتیں بے کار ثابت ہوتی رہیں۔ ہاں فارسیوں اور عیسائیوں میں یہہ ضرور فرق تھا کہ عیسائی جزیہ پر صلح کر لیتے تھے اور اسی طرح اپنے جان و مال کو برباد ہونے سے بچا لیتے تھے۔ اور فارسیوں کے غرور نے کبھی صلح کرنے کی نوبت نہ آنے دی اس لئے جلد برباد ہوئے۔ دوسرے مسلمان خیال کرتے ہیں کہ یزدگرد کے پاس رسول خدا صلعم کا

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

Among others received in English and Urdu the following Critique on the " SALA-I-AM ", Delhi was Published by the Pioneer. In its issue of the 3rd November 1909.

— ooo —

"The Sala-i-Am, published at Delhi" keeps up its high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature

Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine

His style is marked by refinement and culture and his readers should increase in number as the merit of his work become disclosed The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading"

Extract from letter a from Colonel D. C. PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

— ooo —

"I have obtained the opinion of some of the Board on the 'Sala-i-Am.' We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents

I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact, I have been doing so"

From Lieutenant Colonel D. C. PHILLOTT, M., A. Ph. D., F. A S B, late Secretary, Board of Examiners,, Calcutta.

—.ooo —

The printing paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu.

Cambridge
1923.

D. C. PHILLOT, (Lieut. Colonel)

Late Secretary Board of examiners Calcutta.

Extract from a letter from R. P. Dewhurst, Esquire, I. C. S. Session Judge, dated 11th 1911.

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end," * * *

— ooo —

Extract from a letter from the Honourable Mr. W MERK, L. L D., I C. S, Late Chief Commissioner, N W Frontier Province, Dated 6th August 1911

—ooo —

"I thought it (Sala-i-Am) a Periodical that might be encouraged with advantage for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen caling on Deputy Commissioners.

— ooo —

Extract from a letter from A. L GORDON WALKER, Esqr., I C S Punjab Commission dated 11th October 1911

— ooo

I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting rooms of all Deputy Commissioners Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it

— oo

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab, Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board"

"I like your Paper personally It is always written in chaste and pure, and if I may say so, in classical style"

(NOTE—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division, Punjab)

L. WHITE KING Esqr L L D, C S I F R S, Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number."

Dated 5th October 1908

Extract from a letter of L. WHITE. Esqr L L D, C S. I., Indian Civil Service, Retired.,

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent My friend Colonel Story takes great interest in it"

NOTE—(The gentleman has since been knighted, Sir Lucas King)

Extract from the Gazette of India, June 6th 1914, Examinations.

—.ooo —

... addition to the Grammar and Magazines recommended for the Proficiency ... Urdu Magazine, Sala-i-Am, Delhi.

Presentation of Mir Nasir Ali, Khan Bahadur, of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

Extract from a letter from J P THOMPSON Esqr., I. C. S.
Dated 12th December 1911

(NOTE,—The gentleman has been Knighted, Sir John Thompson K C. I. E., now Chief Commisoner Delhi.)

Dear Mir Sahib,

"I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour" "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty"

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE. K. C. I E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab
Dated 25th Feb 1912

Dear Mir Nasir Ali

'My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty the King Emperor"

I am,

Yours Sincerely,

Extract from a letter from Major (Now Lt Colonel) J C. C. ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar.

نامہ مبارک گیا تو اس نے پارہ پارہ کر دیا اور کہا کہ محمد صلعم میرا غلام ہو کر اپنا نام میرے نام سے اوّل لکھتا ہے۔ حالانکہ عربی خط کتابت کا یہہ دستور ہے کہ مکتوب منہ کا نام اوّل ہوتا ہے۔ اور قیصر وغیرہ عیسائی بادشاہوں نے نامہ کی عزت کی تھی حضرت حبیب صلعم نے یہہ سنا کہ میرے نامہ کے پرزہ پرزہ کئے گئے تو یزدگرد کے حق میں آپ نے یہہ بددعا کی کہ خداوند اسی طرح فارسیوں کی سلطنت کے پرزہ پرزہ کر دے۔ اس دعا کی مقبولیت کا یہہ ثبوت ہے کہ اس تیرہ سو برس میں ہی کوئی فارسی بھی دو ہزار میل مربع زمین کا مالک نہ ہوا۔ مولوی نظامی نے خوب کہا ہے۔ در یدا و نامہ گردن شکن را ✤ نہ نامہ بلکہ نامہ خویشتن را ✤

ہندوؤں کی حالت فارسیوں اور عیسائیوں دونوں سے علیحدہ رہی کہ یہہ اوّل مسلمانوں سے لڑے جب قوت نہ رہی تو اطاعت قبول کر لی۔ ایسی صورت میں زیادہ نقصان نہ ہونے پایا اور حکومتیں ہندوؤں میں باقی رہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا یہہ منشا کبھی نہ تھا کہ قوموں کو ملکوں کو برباد کریں بلکہ قوموں کی اصلاح حال مدِنظر تھی جس نے اطاعت و تابعداری کی اُسے اُس کے حال پر بحال رکھا۔ جس نے سرتابی کی اُسے برباد کر دیا۔ فقط

(حال صاحب مرزا محمد علی خاں رئیس دہلی)

صلائے عام ۔ فردوسی سے بہتر قدیم فارس کا حال کسی نے نہ لکھا۔ اور فردوسی کے کلام کی داد حضرت مضمون نگار پر ختم ہے کہ آپ شاہنامہ کو خوب سمجھتے ہیں: میں صرف واہ واہ میں شریک ہو جاتا ہوں مگر فردوسی کے کلام کی خوبیوں کا سمجھنا حضرت کا حق ہے ✤ اس مضمون کے تاریخی حالات اور رائے سے مجھے بحث نہیں: یہہ بحث دوسری ہے ✤

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون لازماً شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون کی ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُنکے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانے کی ضرورت ہو تو محصول الڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کی اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جسمیں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی لسان عج عروس جمیل و لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایکسال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت حسب ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:—

زبان اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کے واسطے عـــہ
" " " چھ ماہ کے واسطے عـــہ
" " " تین ماہ کے واسطے شے
" نصف صفحہ ایکسال واسطے عـــہ
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے عـــہ
" " چھ ماہ کیواسطے تہ
" " تین ماہ کیواسطے للعہ
" ایک صفحہ ایک دفعہ واسطے سے
" نصف " " " عہ
" چوتھائی " " " عہ

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اُجرت انگریزی میں ہو تو اُردو سے دوگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہیے۔

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:—

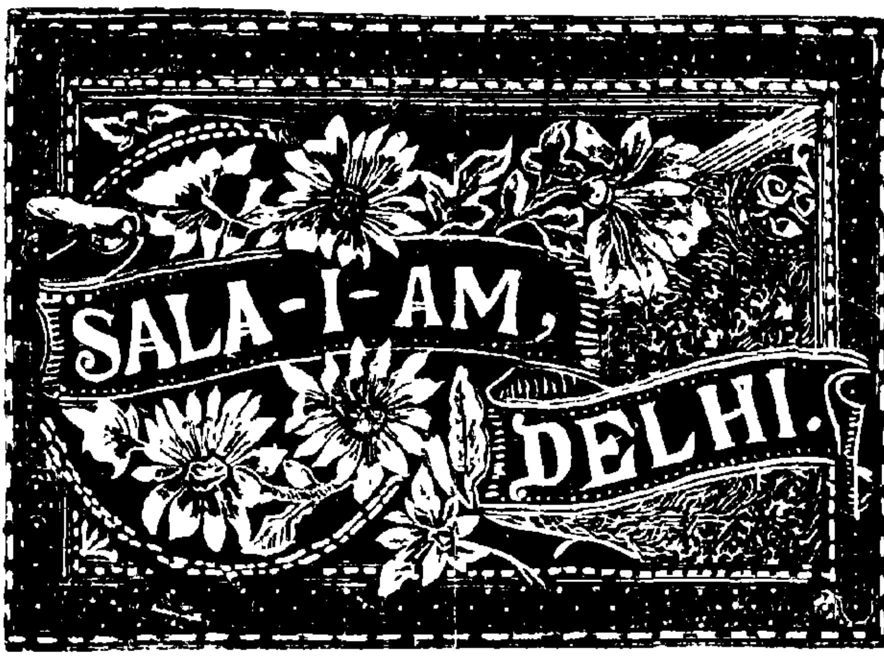
دہلی، فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خان بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام ... دہلوی چھپا اور شایع ہوا

Printed and Published by Mir Nasir ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana Delhi.

SALA-I-AM, DELHI. REGD No L 1462

صلائے عام



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement and the assimilation of the best features of the new civilization

دہلی

حسب الارشاد ناصر علی [illegible] مطبع [illegible] واقعہ فراش خانہ دہلی [illegible]

فہرست مضامین

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۹ عیسوی



مثنوی مطلع الانوار

یہ مثنوی حضرت امیر خسرو رح کی تصنیف ہے جو بہ تنقید و نگرانی جناب مولوی محمد مقتدی خاں شروانی مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں چھپی اور بغرض ریویو میرے پاس آئی +

حضرت امیر خسرو رح کی شاعری میں کیسے کلام ہو سکتا ہے ؛ حضرت کی شاعری سے زیادہ آپ کے کمالاتِ باطنی کی شہرت ہے۔ اس شہرت کی وجہ سے آپ کے کلام اور کلام کی وجہ سے صوفیاء کرام میں آپ کی بہت عزت ہے ۔ مجھے جو آپ سے عقیدت ہے اُس کا تقاضہ تھا کہ میں اس مثنوی کا ریویو بہت محنت سے لکھتا۔ یہ محنت جناب مولوی صاحب شروانی کی تنقید نے بچالی کہ آپ نے جس تفصیل سے مثنوی کی

تحقیق و تنقید لکھی ہے اس سے زیادہ کیا اچھا لکھنا مشکل ہے۔ جناب شیرانی نے اپنی تنقید مثنوی کے آغاز میں لگا کر مطلع الانوار کے دیکھنے سے مستغنی کر دیا۔ تنقید ۹۰ صفحوں میں ہے اور تنقید کے مضامین کی فہرست دو کالم کے چار صفحوں میں آئی۔

قدیم مصنفوں کی تصنیفیں اچھے اچھے مجموعی ایڈیشن شائع کرنا ولایت (یورپ) کے علم دوست اہلِ مطابع کا دستور ہے کہ تکلف کے (ڈی لکشی) ایڈیشن علیحدہ۔ لائبریری ایڈیشن (کتب خانوں میں رکھنے کے) علیحدہ۔ ارزاں قیمت کے علیحدہ نکالتے ہیں: ہمارے ہاں کی لٹریچر میں جہاں تک کہ میں واقف ہوں یہ اہتمام کلیاتِ خسرو میں دیکھا گیا جو مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے شائع ہو رہا ہے۔ مثنوی مطلع الانوار اس کا اچھا نمونہ ہے۔ چھپائی۔ کاغذ۔ خوشخطی۔ بلکہ نگرانی بھی سب سامان عمدہ ہیں۔ اس سلسلہ کا شور شورِ زنجیرِ جنوں سے زیادہ ٹھہرا کہ اس کا زور تو فصلِ گل سے زیادہ نہیں ٹھہرتا مگر کلیاتِ خسرو کی اشاعت کا غلغلہ ۱۹۱۴ء سے چلا آتا ہے ("غلغلہ" صاحبِ تنقید کا لفظ ہے)

شعر کہنے والے برا نہ مانیں۔ شاعری میں حسن و عشق کے سوا کوئی مضمون چھری کٹاری کا کام نہیں دیتا جو خدنگِ مژگانِ یار کی طرح دل تک چیرتا چلا جائے۔ بقول مرزا نوشہ

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب گزر جائے ✦ نگاہِ یار کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

پند و نصائح کے لئے نثر میں کیا کم گنجائش ہے جو نظم کا خون کیا جائے۔ شاعری کے تکیہ کلام تو واعظ و ناصح۔ تقوے و زہد کی شکایت اور ان کے بالمقابل ساقی و پیرِ مغاں و مغبچوں کی تعریف کیا بلکہ پرستش تک جائز ہے۔ جب یہ حال ہو تو شاعری میں

نصائح کا ذکر اذکار اجتماع ضدین کا معاملہ ہے +

اس مسئلہ کو میں یہاں ذرا صاف کردوں کہ زبان سے آپ کچھ ہی کیوں نہ کہا کریں دل کے اشارے اور ہوتے ہیں. کوئی عورت اپنے چاہنے والے کا پابند وظائف و نوافل ہونا اس قدر پسند نہ کرے گی جس قدر کہ اس کی خوبصورتی وجوانی و رعنائی پر جان دے گی. بقول جناب فانی ؎

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی + تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

جس طرح روزمرہ میں بیاہ. شادی اور چیز ہے اور نکاح اور بات ہے۔ نکاح میں نماز روزے کی طرح محض ایک فرض کے ادا کرنے کا نام ہے: بیوہ کی دوسری تیسری ازدواج کی تقریبیں نکاح کہلاتی ہیں۔ پہلی تقریب میں جس قدر نمود وشور کیا جائے تھوڑا ہے۔ نکاح میں کہہ دیتے ہیں کہ شادی تھوڑے ہے صرف "نکاح" ہے یعنی تکلف و دھوم دھام سے خالی نکاح شرعی ہے + دولہ کم عمر اور دلہن کم سن ہو تو برات میں سب دیکھنے کو دوڑتے ہیں۔ عورتیں دولہا سے پردہ نہیں کرتیں۔ یک مشت دو انگشت والے ریش مبارک کے دولہ کو دیکھنے کے لئے بیتاب نہیں ہوتیں۔ دولہا کے ماتھے پر نماز کا گٹا اس قدر زیب نہیں دیتا (گو سجدہ کا نشان زیادہ متبرک ہے) جسقدر کہ دولہا کے چہرہ پر سہرا زیب دیتا ہے جس کی تعریف میں سہرے لکھے جاتے ہیں +

اسی طرح پند و نصائح کے لئے شاعری اس قدر موزوں نہیں جس قدر کہ نثر ہے + حافظ رح کا کلام جس میں مے وساقی کے ذکر میں زیادہ توغل کیا گیا پند و نصائح کے

شعرا کے کلام سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا۔ لوازمات شاعری میں مے و ساقی کی تعریف مقدم ہے۔ ثقہ سے ثقہ شعراء قدیم اس کے پابند تھے۔ سبب یہ کہ شاعری دل و دماغ کے خوش کرنے کا ذریعہ ہے اور انکے لیئے عیش و آرام درکار ہے۔

حضرت امیر خسرو رح نے بھی مطلع الانوار میں پند و نصائح کے ساتھ بہار و شباب کے مضمون بہت پاکیزہ باندھے ہیں:-

بہار

باغ در ایامِ بہاراں خوش ست ۔ موسمِ گل باغِ یاراں خوش ست ۔ چوں گلِ نوروز کند نافہ باز ۔ نرگسِ سرمست درآید بناز ۔ سبزہ برآرد خطِ عاشق فریب ۔ از دلِ بینندہ رُباید شکیب ۔ ہمگی شود برگِ گلِ نسرین فراخ ۔ آب چکد از برِ اندامِ شاخ ۔ سرو تر اندام ز لطفِ صبا ۔ از خوبے تار بوِ شد قبا ۔ تازہ شود لالہ چو رخسار دوست ۔ غنچہ (تو خیز) نگنجد بہ پوست ۔ بہ رخِ گلِ غازہ کند لالہ زار ۔ جلوہ کناں دست برآرد چنار ۔ از خطِ سنبل کہ معنبر شود ۔ خاکِ چمن غالیۂ تر شود ۔ ابر بگوید بہ رخِ بوستاں ۔ باغ بخندد چو لبِ دوستاں ۔ تا بنہد بر جگرِ لالہ داغ ۔ گل ہمہ از باد فروزد چراغ ۔ بلبل ز ترانہ کہ بہ رود آورد ۔ فاختگاں را بسرود آورد ۔ گرچہ کند مرغ ز مستی خروش ۔ نیز نہد بر سرِ گل پا بہوش

شباب

تا بود اسبابِ جوانی بہ تن ۔ روئے چو گل باشد و تن چوں سمن ۔ تازہ بود مجلسِ یاراں بہ تو ۔ جلوہ کند صفِ سواراں بہ تو ۔ شیفتگاں دیدہ بروئیت نہند ۔ رخت ہوس بر سرِ کویت نہند ۔ نکہتِ گیسو چو نسیمِ سحر ۔ رنگِ بناگوش چو نسرینِ تر ۔ نرگسِ تو بادہ نداند گناہ ۔ غنچۂ تو خندہ ندارد نگاہ ۔ تابِ مہ چہرہ زبر تابیت ۔ میل کند سینہ بر عنایت ۔ دیدہ سوئے فتنہ پرستی کشد ۔ دل ہمہ در شوخی و مستی کشد ۔ نازکی ۔ ناز کشند ت بجاں ۔ دل طلبی ۔ نیز دہند ت روا

سوزش چو نے شعبت آں پسر ❊ تا مشتری بیزہ پایاں رسد

فلسفیانہ مضامین میں حضرت نے اس مثنوی میں یہہ بات بہت معقول فرمائی کہ اولاد کی پرورش میں ماں باپ کو اولاد سے خدمت کی اُمید رکھنی غلطی ہے۔ یہہ امید بیجا آخر کو رنج کا باعث ہوتی ہے: جس طرح حافظ سے جب تیمور نے اُن کے "بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارارا" پر خفا ہوکر کہا کہ اِن ملکوں کے فتح کرنے میں ہزاروں مُسلمانوں کی جانیں گئیں تب کہیں یہہ فتح ہوئے اور تم خالِ ہندو کو بخش رہے ہو۔ اس پر حضرت نے جواب دیا کہ "ازہمیں داد و دہش بیجا بایں حالت رسیدہ ام" یعنی فقیر ہوگیا: یہی نتیجہ "بیجا" اُمید کا سمجھ لیجئے کہ مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ❊

پرندوں میں بچوں کو کس محبت سے پالتے ہیں مگر جب بچے خود کھانے پینے کے لایق ہوجاتے ہیں ماں باپ اُنہیں نکال دیتے ہیں ❊ اولاد سے محبت دراصل اپنی ذات سے محبت ہے کہ انسان خودغرض پیدا ہوا ہے۔ یہہ چاہتا ہے کہ میں نہ رہوں (اور خود ہمیشہ رہ نہیں سکتا) تو میرا نام ہی بنا رہے: اولاد سے خدمت کی اُمید اس لئے ہوتی ہے کہ جب ہم میں اپنی خبرگیری کی طاقت نہ رہے تو اولاد خدمت کرے تاکہ ہماری زندگی زیادہ ہو ❊ انسان کو اپنی ہستی کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہستی کے بعد نیست ہونا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نیچر کو میری خواہش سے غرض نہیں: میں بکا کروں اُسے پرواہ نہیں ❊

اولاد سے خدمت کی اُمید

بچۂ طاؤس چو از بیضہ جست ❊ دانہ خورد و جست زِ مالا دست ❊ بچہ کہ گنجشک و کبوتر گشتہ ❊ لرزہ کناں لانہ نہا در گشتہ

صید ہمان بہ کز بشکست خود است + راحت مرد از کف دست خود است + خواجہ مبادا کہ بہ پیرانہ سر + بندۂ فرزند شود بہرہ خور
دہ پسر از یک پدر آسودہ گشت + یک پدر از صد پسر افتد بدست + ناخلفے را کہ بود شوم چہر + برپد و مادر و خویشا چہ مہر
سگ چو گوشم فغان برکشد + لقمہ ز دندانِ برادر کشد

نیز یہ کہ پیدائیش اور پرورش کے زمانہ میں والدین کے اندر یہ جذبات[1] تو ہوتے بھی نہیں ہیں۔
شفقت پدری و مادری کا فلسفہ کچھ اور ہی ہے ؎
پرورش زادہ وسوار زیست + آنکہ نہ زادہ است چہ داند کہ چیست + سہل نماید بر استر دناں + محنتِ زائیدنِ آبستناں
گیرنہ مادر کند از بہرِ خویش + پرورشِ زادہ بامید بیش + چیست صدف را کہ زجانِ دونیم + پرورد اندر دل دُرِّ یتیم
دست قضا کیں ہمہ باہم نہاد + از پئے آبادیٔ عالم نہاد + گرنہ دہ آتش زہ در خوئے شدے + دہر پُر از جانوراں کے شدے
مطلع الانوار میں اندر وسے شاعری خمسہ کی جان حضرت رح کا یہ شعر ہے ؎

دبدبۂ خسرویم شد بلند + زلزلہ در گورِ نظامی فگند

شاعری میں تعلّی ہنر ہے خاص کر جب کہ کسی کے جواب میں کچھ کہنا پڑے کہ اگر آپکا جواب مدِمقابل سے گرا ہوا ہے تو جواب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو بزرگ اسے عیب سمجھتے ہیں وہ از راہ کرم شعر و سخن کے جھگڑے میں نہ پڑیں: آپ دیکھ لیں کہ حضرت کے اشعار میں یہ شعر کس قدر مشہور ہوا + دبدبۂ خسروی کے ساتھ "زلزلہ" کتنا مناسب ہے +

صاحبِ تنقید کو ہمارے ہاں کے لب و لہجہ سے انگریزی میں زیادہ دخل معلوم ہوتا ہے

[1] "جذبات تو ہوتے ہی نہیں ہیں"۔ "جذبات" جیسے ثقیل لفظ سے بچنے کے لئے یوں کہنا بہتر تھا کہ والدین کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں ہوتا: "جذبات" دراصل انگریزی لفظ Passions کا ترجمہ سمجھ رکھا ہے۔ یہ ارز رے فلالاجی (علم الفاظ) ذرا بحث طلب ہے+

کامیاب

"کامیاب مقابلہ"۔ "بہ الفاظِ دیگر"۔ "کلام کے بین السطور"۔ "شہزادہ دارا شکوہ" (دارا شکوہ نیں تھا)۔ "کلام کا کوئی حصہ محفوظ نہیں ہے"۔ "جذبات" وغیرہ + اور مثل اس کے عربی و فارسی کے بیگانہ الفاظ و ترکیبیں اور ساتھ ہی بہت ہی معمولی اُردو کے الفاظ۔ یعنی "مٹی پلید"۔ "بہار کی بہار"۔ "بڑھاپے کی گھاتیں" وغیرہ + "حضرت امیر خسرو دہلوی"۔ "دہلوی" بے کار ہے: دلّی کو حضرت پر فخر ہے نہ کہ حضرت کے لئے دلّی باعثِ ناز ہے۔ اگر دس بیس اور بھی اس نام اور اس مرتبہ کے دُنیا میں ہوتے اُس وقت بھی "دہلوی" لکھنا مناسب تھا نہ کہ جب ایک ہی شخص اس کمال اور مرتبہ کا ہو تو مسکن کا پتہ فضول ہے +

لیکن از روئے تنقید و نگرانی جناب مولوی صاحب شروانی کی تحقیق و معلومات میں مجھے کیا کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ "ہر کہ شک آرد الخ" (آگے آپ لگالیں) +

لفظِ مثنوی کی تحقیق میں آپ نے بہت خوب لکھا کہ لفظِ مثنّٰی سے مشتق ہے اور مثنّٰی کے معنی بھی فرما دیئے کہ دو ہیں۔ یہ مولویانہ مکتب کی تحقیق ہے + مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں جب یونان کے اکثر علوم اپنی زبان میں لے لئے تو اسلام کے پردہ کے عقیدہ کی وجہ سے ڈراما اور تھیئٹر کا اپنی زبان میں لانا پسند نہ کیا کہ ڈراما اور تھیئٹر میں عورتوں کے پارٹ لینے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں بے پردگی کا اندیشہ ہے + لیکن چونکہ شاعری میں کمال اہلِ عرب و عجم کی فطرت میں تھا مثنوی سے ڈراما کی کسر نکل گئی۔ فارسی میں اس قدر مثنویاں ہیں کہ شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں: خمسوں کے جواب میں تو صاحبِ تنقید نے چھبیس مثنویاں گنوا دیں محض مثنویوں کی گنتی تو صلائے عام کے ایڈیٹر کے گناہوں کی طرح خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا +

ابنائے زمانہ

جیسا کہ قدیم شعرائے فارسی کا دستور ہے کہ ہر تصنیف میں حمد و نعت کے ساتھ زمانہ کی شکایت کا عنوان بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حضرت امیر خسرو رح نے مثنوی مطلع الانوار میں **ابنائے زمانہ** کی شکایت میں لکھا ہے کہ:۔

ایں چہ زمان ست کہ در ہر طرف ٭ ہست بفسق اہل جہاں را شرف ٭ ہر نفسے کار گنہ بیشتر
خواری دیں باشد ازیں بیشتر ٭ آں کہ بہ فرضے نہ کند کاہلی ٭ متقی اش نام کنند و ولی
بس کہ شد از کفر جہاں پر ز دود ٭ آں کہ شرارے ست چراغے نمود ٭ وائے نہ یک بار کہ صد بار وائے
زیں ہمہ گبران مسلماں نمائے ٭ دعوی دین و دل بے ترسناک ٭ خندہ مزن بیہدہ بر دین پاک
اے ہمہ بر نسبت گبرانت زیست ٭ نام مسلمانیت از بہر چیست ٭ آنکہ تنگ از شرع فراتر زدہ است
اللہ و یا رب کہ ز نذر عربدہ است ٭ زشت بود از عز کابل ستیز ٭ غلغل تکبیرہ زدن در گریز

اس کے متعلق جناب مولوی صاحب شروانی فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت امیر نے اپنے زمانہ کی جو شکایت کی ہے وہ سوا چھ سو سال پہلے کی ہے۔ اسی پر اس زمانہ والوں کی حالت کو قیاس کیجئے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس وقت بھی گناہوں کی ایسی ہی کثرت تھی جیسی اب ہے بلکہ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے اُجلے کپڑے پر ذرا سا دھبہ بھی بدنما معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے میلے کپڑے کے بڑے بڑے داغ بھی نظر نہیں آتے"

× × × × × × × × × × × ×

ماہ مرشال

یہ مثال جس پر میں نے خط کھینچ دیا ہے واقعی بے مثل ہے مگر عربی کی ایک مثال مجھے [illegible] آئی جس کا ترجمہ ہے کہ:-

یوں تو آسمان پر بے گنتی ثوابت و سیارے بے شمار تارے و ستارے ہیں لیکن گہن بصرف چاند و سورج دو ہی کو لگتا ہے ؛ انگریزی میں کہتے ہیں کہ کمہار جو مٹی کے کھلونے بناتا ہے اُن کے عیب و ہنر اس قدر غور سے دیکھے نہیں جاتے جس قدر غور سے سونے چاندی کے زیور کے عیب و ہنر پہ غور کیا جاتا ہے: بچوں کی لکیروں پر نکتہ چینی بے کار ہے۔ مانی و بہزاد کے ہاتھ کی تصویروں میں ذرا نقص بھی نظر آجائے تو اُنکی شہرت میں داغ لگ جاتا ہے ؛

لیکن یہاں مجھے ان مثالوں سے بہت غرض نہیں۔ مجھے یہہ عرض کرنا ہے کہ "سوا چھہ سو سال پہلے" یا سوا لاکھ برس پہلے اور آج سے ہزاروں کروڑ برس بعد بھی جب تک قیامت نہ آئے "ابنائے زمانہ" کا حال کم و بیش اسی طرح چلا جائے گا ؛ ظہوری کے ساقی نامہ کا شعر جو اسی عنوان کے آغاز میں لکھا لاجواب ہے سہ

عیان است بیداد و عدلِ جہاں ؛ نہ حجاج ماند و نہ نوشیرواں

زمانہ کو نہ حجاج کے ظلم کی پروا ہوئی نہ عدلِ نوشیرواں کی۔ حضرت فخر رازی فرماتے ہیں کہ ع نہ اُو ماند نہ تو ماند نہ ماند فخر رازی ؛



مجھے اندیشہ ہے کہ صلائے عام کے پڑھنے والے "مضمون پریشاں" سے کہیں پریشان نہ ہونے لگے ہوں کہ درازی میں یہہ سلسلۂ مضامین زلف یار سے بڑھا جاتا ہے ؎

تم پریشاں عاشقوں کی بھیڑ سے ہوتے ہو کیوں ٭ ہوں اگر لاکھوں پتنگے شمع گھبراتی نہیں

اگر آپ کو یہہ طرز بیاں پسند نہیں تو اس کا علاج آسان ہے کہ یہہ مضمون چھوڑ دیا کیجئے ؎

بال بکھرے ہیں تو کیوں اتنے پریشاں ہیں حضور ٭ نہ ہوا زلف میں شانہ تو بلا سے نہ ہوا

لیکن جہاں مجھے اس کے ناپسند ہونے کا اندیشہ ہے وہاں یہہ بات بڑے اطمینان کی ہے کہ اس طرز کے مقبول ہونے کی تحریریں زیادہ آرہی ہیں۔ ایک صاحب سخن

نے "مضمونِ پریشان" کی نسبت لکھا ہے کہ اس طرز کی مثال یہہ ہے کہ :-

ع کوئی حسین سر کے بال کھولے چراغِ مرقد جلا رہا ہے

آئینہ نے جو کہا عکس ہوں حیرانوں کا
بول اُٹھی زُلف کہ سایہ ہوں پریشانوں کا

کوہ کن کا سر سمجھ کر روئی وہ تقدیر پہ ٭ جب حباب آئے نظر شیریں کو جوئے شیر پر

میں دیکھتا ہوں کہ موت کی طرح انسان کی زندگی بھی عبرت سے خالی نہیں۔

شیخ سعدیؒ جیسا درویش بے ریا اور اس خوبی کے ساتھ زبردست فلاسفر اپنی عمرِ گرانمایہ کی نسبت کہتا ہے کہ ؎ چہل سال عمرِ عزیزت گزشت ٭ مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت

جب چالیس برس تک تو لڑکپن میں گزرے تو پھر جوانی و بڑھاپے کے لئے کیا رہ گیا؟

حضرت نظامیؒ فرماتے ہیں ؎ دریغا کہ عہدِ جوانی نماند ٭ جوانی گو زندگانی نماند ٭ مرا برف بارید بر پرّ زاغ ٭ نہ شاید چو بلبل تماشائے باغ ٭ عتابِ عروساں درآمد بہ گوش ٭ صُراحی تہی گشت و ساقی خموش ٭ اسی طرح عربی میں ایک شعر کا مضمون ہے جو بڑھاپے میں جوانی کو یاد کر کے کہہ رہا ہے کہ :- "کاش کہ جوانی اس وقت پھر آجاتی تو میں بڑھاپے کو ایسا مزہ چکھا دیتا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجاتا" ٭

مشہور ہے کہ ع ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ مرگ جوانی اس قدر رونے کی جگہ نہیں جس قدر یہہ رونے کا مقام ہے کہ انسان جب بوڑھا ہو جائے اور خیال آئے

کہ عمر یوں ہی بے کار گزری۔ یا بڑھاپے میں یاد آے کہ جوانی میں بقول جناب شکوہ ؎

اقبال تھا جو کام کیا ہم نے بن پڑا ✤ روتا تھا اپنی جان کو چرخ کہن پڑا:

اور بڑھاپے میں اب کوئی نہیں پوچھتا ✤ مجھے اُن اہلِ کمال کے مرجانے کا زیادہ افسوس ہوتا ہے جنہوں نے اپنے کمال کی وجہہ سے پہلے تو بڑی نمود و شہرت حاصل کی پھر بڑھاپے میں زمانہ کی کس مپرسی کی جان کو روتے چلے گئے۔ یا جوانی میں بال بچوں کی امیرانہ خرچ سے پرورش کی اور وہی بال بچے آپ کے بڑھاپے میں آپ کے کام نہ آئے ✤ جوانی میں جب اقبال ساتھ تھا تو یگانہ و بیگانہ سب آپ کے پُرسانِ حال تھے۔ بڑھاپے میں آپ کے رات دن کے جاننے والے بھی آپ کو نہیں پہچانتے۔ یہہ مصیبت عوام سے خاص کو زیادہ شاق گزرتی ہے اور مردوں سے زیادہ عورتوں کو کہ حسین عورتیں جب تک جوانی رہی پجا کیں زیادہ عمر ہو جانے سے اُس نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں جس نگاہ سے جوانی میں دیکھی جاتی تھیں۔ غرض بڑھاپے میں عورت ہو یا مرد زمانہ کی نظر میں بے قدر نہیں تو بے کار ضرور سمجھے جاتے ہیں ✤

اب یہاں یہہ دیکھنا ہے کہ بقول حضرت سعدی رح چالیس برس کی عمر تک آپ کو یہہ حق حاصل نہیں ہوا کہ آپ دنیا کے معاملات میں چوں چرا کر سکیں کہ آپ ابھی اس لایق ہی نہیں ہوئے پھر چالیس برس کے بعد آپ چپکے زمانہ کا رنگ دیکھا کریں ؎

بتائیں ہم تجھے آسائشِ جہاں کا راز ✤ اگر زمانہ نہ سازد تو با زمانہ بساز : زندگی نہ ہوئی لڑکوں کا کھیل ہوا ✤

دنیا میں اہل و عیال کی قید (گو قیدِ فرنگ سے زیادہ ہو) آزادی و آوارگی سے بدرجہا

بہتر ہے کہ اس قید میں پڑ کر آپ اور قیدیوں کے دُکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں صحیح ہمدردی کہتے ہیں ۔ فارسی میں مشہور ہے کہ مُرغانِ حَرم جو قید و قفس سے آزاد ہیں مُرغِ زیرِ دام کا حال کیا جانیں ؟ آپ جب تک بھوکے نہ رہیں آپ کیا جانیں کہ فقر و فاقہ والوں کی جان پر کیا بن جاتی ہے ؟ ؂ شاہدانِ بازاری کی بے وفائیاں دیکھکر شُرفا کو نکاحی بیاہی شریف نادیوں کی قدر ہوجاتی ہے ؂ حضرت لقمان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے تمیز کس سے سیکھا فرمایا کہ بے تمیزوں سے کہ جن حرکتوں سے بے تمیزوں کو خلق میں بار و لعن طعن دیکھا وہ حرکت چھوڑ دی ؂

دُنیا میں قید خانہ کی تکلیف جب ہی تک مصیبت ہے جب تک کہ ہم اس سے رہائی کی فکر میں گرفتار رہتے ہیں اور اسی فکر کو مآلِ زندگی سمجھتے ہیں ۔ جب یہہ خیال نہ رہے تو پھر تکلیف نہیں ؂ انسان دراصل قید و آزادی کا پُتلہ ہے ۔ جو چاہے کرے چاہے نہ کرے ؎

گہے بر طارم اعلےٰ نشینم ؂ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اس کی زندگی کبھی تو نفس پروری کی دُھن میں کبھی نفس کُشی کے خیال میں گزرتی ہے : دو بی بیوں والے شوہر کی طرح دونوں کو برابر نہیں رکھ سکتا جو مختلف المزاج مختلف العادات اور مختلف العُمر ہیں ۔ نفس پروری کا تقاضہ اور ہے اور نفس کُشی کا اور : آہ ، آہ ! اور چیز ہے اور واہ واہ ! اور چیز ہے ۔ نالہ و فغاں اور چیز ہے اور ہنسی و قہقہہ اور چیز ہے : جب گرانے کا وقت ہو قہقہہ دور بھاگتا ہے ع در خرابات نہ از بہرِ نماز آمدۂ ؂ جب دل دو طرف ہو تو دھوبی کے کُتہ کی طرح انسان سے کچھ بن نہیں پڑتا ۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ؂

دُنیا میں ضرورت سے زیادہ جنّت کی تلاش بے کار ہے ۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ

کی مسجد علیحدہ بنائے تو نمازیوں سے زیادہ مسجدیں ہو جائیں اور جب سب ڈیڑھ ہی ڈیڑھ انیٹ کی ہوں تو جدّت کہاں رہی؟ جدّت درکنار پہلی نبی بنای عالیشان مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔ پہلے آپ پرانی عمارتوں کو آباد کریں تو زیادہ لبکار آمد ہے کہ نئی عمارت میں اول تو کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو پرانی میں نہ ہو۔ اور یہہ آپ کو بلا درد سر اور بغیر تلاش کے مل رہی ہے: یہہ مسئلہ آپ شعر وسخن میں دیکھ لیجئے کہ آپ ہم کتنی ہی محنت کرکے جو بات پیدا کرتے ہیں وہ اساتذہ کے کلام میں مل جاتی ہے بلکہ جدید سے قدیم میں بہتر: بقول لسان الملک جناب ریاض ؎

کعبہ میں بہت زور سے چیخے تو موذن ؛ پر ان سے نکلتا رہا ناقوس صدا میں

حیاتِ اَبدی اُسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو تمام دُنیا کے مصائب جھیلتا رہی اور پروردگار کے فضل وکرم پر بھروسہ رکھے ع ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق۔ اسی کا نام ہے: دنیا میں سب سے بڑی مصیبت مرنا ہے۔ مرنے سے نہ ڈرے تو پھر مرنا کہاں؟ عشق میں مرنے کا نام وصل ہے: عالمِ اسباب میں دو عالم ہیں۔ ایک عالمِ فنا دوسرا عالمِ بقا۔ ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہونچنے کا نام مرنا ہے۔ یہہ پُل صراط ہے جس پر سے ہر ذی روح کو گزرنا ہوتا ہے۔

یہہ عجیب بات ہے کہ یوں تو ہم انصاف انصاف بہت پکارتے رہتے ہیں

اور جہاں تک ہوسکتا ہے ظلم سے بچتے ہیں مگر عورتوں کی طرح موت کی جان کو رات دن کوستے ہیں۔ رستم سے نہیں ڈرتے شیر کا سامنا کرنے کو موجود مگر موت کے نام سے کانپتے ہیں۔ شعرا جو رستم و اسفندیار کی لڑائی میں غضب کا سماں دکھاتے ہیں۔ کسی کے مرنے پر نوحہ میں موت کو گالیاں سناتے ہیں کہ موت نے یہہ غضب کیا وہ غضب کیا: یہہ نہیں جانتے کہ ساری مصیبت جینے جی کی ہے موت تو تمام مصیبتوں سے چھڑانے کو آتی ہے۔ اسے کیوں کوستے ہو؟

میں نے مانا کہ زندگی سے جدائی کا نام موت ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے بھی انسان زندگی سے جدا تھا اُس کا نوحہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ قبر میں جو تکلیفوں کا ڈر ہے وہ زندوں کے باعث سے ہے کہ "مردہ بدست زندہ"۔ موت کسی کو دفن کرنے نہیں آتی؟ موت کا صرف اتنا قصور سمجھ لیجئے کہ زندگی کے جھگڑوں سے چھڑا دیتی ہے۔ اگر یہہ کہا جائے کہ خوف اس بات کا ہے کہ مرنے کے بعد خدا جانے کیا ہوگا؟ اُس میں موت کا کیا قصور ہے کہ ہم کو خبر نہیں۔ پیدا ہونے سے پہلے کی بھی خبر نہیں: اپنی بے خبری کا الزام آپ اجل کے سر لگاتے ہیں۔ دراصل موت کا آنا خوف میں داخل نہیں۔ بلکہ زندگی سے جدائی کا رنج ہے: لیکن جدائی کی بیماری تو تپ کہنہ سے بہت پرانی ہے کہ خدا جانے انسان عدم میں کب سے زندگی کی جدا رہا تب کہیں زندگی کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی۔

بچوں کی موت ماں باپ کے رنج کا سبب ہوتی۔ جوانی کا غم ہم عمروں کو

ہونا چاہیئے۔ بوڑھے کا مرنا شاید ہی کسی کے افسوس کا باعث ہوتا ہو: جب کسی کو ہماری جدائی کا رنج نہ ہو تو پھر ہم کیوں کسی کی جدائی کا افسوس کریں ؎

سرِ طور اے کلیم اللہ کیجے ہوش کی باتیں ✦ جسے دیکھے نہ کوئی اس کے ملنے کی تمنا کیا

اقتباس از نوازش نامۂ جناب مآئل دہلوی

× × × × × × "آپ کے فقرے نے دماغ کو ترو تازہ کر دیا (الکہ شعر میں صلائے عام کی نثر سے رنگ پیدا ہونے کا خیال تھا)۔ آپ میری نظر میں یوں ہی نہیں سمائے ہوئے ہیں کہ دلی کے قدیم یادگار اور اکابر کے صحبت یافتہ ہیں: نہیں حضرت۔ آپ کی تیغ نثر میرا کام کر گئی: یہہ بلاغت یہہ فصاحت یہہ دلکشی یہہ سلاست مِل گئی جسکو ملنی تھی۔ آگئی جسکے ہاتھ آنی تھی ✦ قلم اُٹھا کر آئیں بائیں شائیں لکھ جانا تو سب جانتے ہیں۔ مگر ہم تو اُسے مردِ میدان گنتے ہیں جو نثر میں آپ کی سی خوبیوں کے ساتھ تاثیر بھی پیدا کرے ✦ میرے اُستاد مولانا سلیم الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نظم میں تو خداداد اثر ہوتا ہے نثر میں رنگِ دلکشی بھرنا کارے دارد۔ گستاخی معاف! بعد آپ کے ندارد" ✦ × × × × × × ×

× × × × × "آپ کی قدردانی کا شکریہ میں کیا ادا کروں سخن کی زبان ہوتی تو ادا کرتا۔ ادا کیا کرتا سجدہ ادا کرتا" ✦ × × × × × × × × × ×

صلائے عام۔ یہہ زبان اساتذہ کا بہت پاکیزہ نمونہ ہے کہ قلم برداشتہ بے تکلف لکھنے میں آگیا: ہماری زبان میں اس طرز کی زیادہ ضرورت ہے جس میں تصنّع کی گنجائش نہ ہو ✦

غزل ۔ جناب مائل دہلوی

اُن کا جوشِ شباب ہونا تھا
کہ قیامت مآب ہونا تھا

ہو چکا جو عتاب ہونا تھا
ہوگیا خو خطاب ہونا تھا

ید بیضا پہ ناز کیا موسےٰ
حُکم میں آفتاب ہونا تھا

کیا ہوا عرش جو بنا بیٹھے
میرے دل کا جواب ہونا تھا

مجھ سے پوچھو تو بحرِ ہستی کا
قطرہ قطرہ شراب ہونا تھا

کیوں نہوتا دلِ تپاں پہ مرے
داغ کو آفتاب ہونا تھا

شیخ سر پر عمامہ کے بدلے
اک سبوئے شراب ہونا تھا

اِن حوادث کی زندگی سے ہمیں
بحرِ غم کا حباب ہونا تھا

اُس نے اپنے کرم سے بخش دیا
کیا مرا آب آب ہونا تھا

شبِ وصلِ عدو ہے آج فلک
ماہتاب آفتاب ہونا تھا

لے جبیں تو تو پاک ہونی تھی
دیر کعبہ خراب ہونا تھا

تیری تیغِ ادا سے بچ نکلا
جسے ناکامیاب ہونا تھا

مر چلے از روئے سجدہ میں
کبھی تو بے نقاب ہونا تھا

مے فروشوں نے مجھ کو آگھیرا
یہ بھی روزِ حساب ہونا تھا

رشک کہتا ہے میری آنکھوں کا
تو سراپا حجاب ہونا تھا

آپ کیوں ہولئے میرے پہلو میں
دل پُر اضطراب ہونا تھا

آنکھ ملتے ہی بزمِ دشمن میں
ہوگیا جو جواب ہونا تھا

آزمائش تھی حوصلہ کی مرے
بے سبب کب عتاب ہونا تھا

میں تو موسےٰ نہتا کہ غش آتا جلوہ گر بے نقاب ہوتا تھا
نامرادانہ زیست کرنے کو میں ہی کیا انتخاب ہوتا تھا
سنگریزوں سے کفر کے واعظ گھر خُدا کا خراب ہوتا تھا
دِرِ مے خانہ کے مقدّر میں کاش رحمت کا باب ہوتا تھا
ہوگیا زندگی کے محشر میں ہم پہ جو کچھ عذاب ہوتا تھا
آ نکلنے تھے ساقیِ کوثر مے کدہ لاجواب ہوتا تھا
دفن مائل ہُوا ترے در پہ مر کے عالی جناب ہوتا تھا

صلائے عام۔ یہہ غزل جناب مائل کے دیوان میں ابھی درج نہیں ہوئی۔ یعنی اذکارِ تازہ میں داخل ہے: اس کی بحر بہت چھوٹی ہے جس میں زیادہ الفاظ کی گنجائش نہیں۔ تعریف یہہ ہے کہ مختصر الفاظ میں مضمون زیادہ نکالا گیا ؛ اس غزل کے اکثر شعر صاد کے لایق ہیں۔ اِن صاد شدہ اشعار میں جو شعر مجھے زیادہ پسند آئے دوبارہ نقل کئے دیتا ہوں:۔

(۱) یدِ بیضا پہ ناز کیا موسےٰ ؛ حکم میں آفتاب ہوتا تھا ؛ (حضرتِ موسٰیؑ جیسے مرتبہ کے پیغمبر کا دعوے یدِ بیضا کا کتنا گرا گرا ہوگیا کہ آفتاب کو قبضہ میں لاتے تو ناز کرنا بجا تھا)

(۲) کیا ہوا عرش جو بنا بیٹھے ؛ میرے دل کا جواب ہوتا تھا ؛ (اول الذکر شعر میں تو خیر حضرت موسٰیؑ تک خیریت تھی۔ یہاں عرش بیکار ہوگیا۔ اور کس کے آگے ؟ حضرت مائل کے دل کے آگے؛ یہہ تعلیاں غضب کی ہیں ؛) (۳) اے جبیں تو تو پاک ہوئی تھی ؛ درِ کعبہ خراب ہوتا تھا ؛ (نہایت پاکیزہ مضمون ہے کہ جبیں تو ہماری سجدہ سے پاک ہوئی۔ مگر درِ کعبہ خراب ہوا : ہماری جبیں کی عزت تو فردوس مگر جس جگہ سجدہ کیا اُس جگہ کی ذلت سمجھئے ؛) ذیل کا شعر بھی کم و بیش اسی وضع کا ہے:۔

(۴) سنگریزوں سے کفر کے واعظ ؛ گھر خدا کا خراب ہوتا تھا ؛

(REVIEW:)

JOURNAL OF THE PANJAB HISTORICAL SOCIETY.

رسالہ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی

(جلد دہم حصہ اوّل)

اس میں ڈچ (سلطنتِ ہالینڈ) کی سفارت کا حال ہے جو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم بہادر شاہ اور جہاں دار شاہ (سلاطینِ مُغلیہ) کے زمانہ میں ہندوستان میں بھیجی تھی۔ یہہ وہ زمانہ ہے جب کہ یُورپ کی چھوٹی بڑی سلطنتیں ہندوستان میں ایک دوسرے کی رقابت میں اپنا اپنا قدم جمانے کی فکر میں تھیں: اُس زمانہ کی تاریخ کا مسالہ مختلف سفارتوں کی رپورٹوں اور تحریروں سے جو سفیروں نے اپنی اپنی سلطنت کو وقتاً فوقتاً لکھیں بہت اچھا ہاتھ لگ جاتا ہے۔ خاص کر سرکارِ انگریزی کے عروج و اقبال کا حال جو اُس وقت کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں میں انگلستان کی آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو نصیب ہوا مفصّل معلوم ہو جاتا ہے کہ سرکارِ انگریزی ڈچ۔ فرنچ۔ پرتگال سے کس طرح بازی لے گئی اور ہندوستان میں کس طرح سرکارِ انگریزی کا آفتابِ دولت اقبال طلوع ہوا +

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں کئی دفعہ سفارتیں بھیجیں۔ اس رسالہ میں

۱۷۱۱ء کی سفارت کا حال ہے: یہہ حال ڈچ زبان میں تھا جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور جناب ڈاکٹر ووگل صاحب بہادر پی ایچ۔ ڈی نے جا بجا بہت پاکیزہ نوٹ لکھ دے۔ ان نوٹوں سے اکثر مشکل مشکل مقام آسانی سے حل ہو گئے ؛ صاحب ممدوح ہندوستان میں محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل رہ چکے ہیں۔ آپ کو تاریخ میں بہت اچھا دخل ہے ؛

ڈچ والی سفارت کے روزنامچہ میں زیادہ تر تو اُن کی تجارت کا تذکرہ ہے کہ اُنہوں نے کس طرح مغل بادشاہوں کے مزاج میں رسوخ پیدا کیا اور مغلیہ سلطنت میں کس طرح اپنی ترقی تجارت کے لیئے رسائی پیدا کی۔ یہہ رسائیاں ہندوستان میں ان کے تجارت اور اُن کے ملک کی تجارت سے تعلق رکھتی تھیں ؛

اُن دنوں محل شاہی میں ایک رومن کیتھلک لیڈی کو بڑا رسوخ تھا جن کا نام ڈانا جولیانہ تھا۔ سفارت کے مورخ نے لکھا ہے کہ نہ صرف محل میں بلکہ تمام امرا سلطنت میں لیڈی کا بڑا وقار تھا ؛ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ وہ زمانہ ہے جب کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹوں میں عالمگیر کے بعد سلطنت کے لیئے لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں کا حال نعمت خان عالی نے جنگ نامہ میں نہایت فصاحت سے لکھا ہے کہ تقدیر ایزدی سے ایک شاخ کے دو پھول۔ ایک پھولا دوسرا مرجھا گیا اور آخر کو بھائیوں میں یہہ خانہ جنگیاں سلطنت کی بربادی کا باعث ہوگئیں ؛ ان خانہ جنگیوں میں سے سفارت مذکورہ کا مورخ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ لڑائی میں شاہ عالم بہادر شاہ اپنے بھائی سے جنگ میں ہمت ہارنے لگا تو لیڈی جولیانہ نے بادشاہ کو سمجھایا کہ حضور ہراساں نہ ہوں تمام عیسائی حضور کی

Dactor J.P.H. Vogel, P.H.D.

باقی

فتح کے لئے دل سے دُعا مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کو فتح ہوئی اور ڈانا جولیانہ کو خطاب ملا کہ :-

"فدویہ دُعاگو جولیانہ"

یہہ بیان سفارت کے مورّخ کا ہے ÷ اس کے معنی انگریزی میں یہہ لکھے گئے کہ "Juliana devoted to prayer" یعنی جنگ میں جولیانہ کی دُعا سے جو بادشاہ کو فتح ہوئی اس لئے "دُعاگو" کا خطاب ملا ÷ یہہ ذرا غلطی ہے۔ "دُعاگو" خطاب نہیں ہے بلکہ جولیانہ کی مُہر میں گندہ تھا کہ :-

"فدویہ بہادر شاہ جولیانہ"

اُمرار سلطنت کی رسموں میں فدویہ۔ دُعاگو وغیرہ مُہروں میں لکھنا لازمی تھا۔ کسی خاص دعا کی اجابت کے صلہ میں "دُعاگو" لکھنا خطاب کی رسم نہیں ہے ÷ دربار شاہی سے جولیانہ کا خطاب دراصل خانم تھا۔ جناب ڈاکٹر ووگل صاحب بہادر "فدویہ دُعاگو جولیانہ" کے معنی لکھتے ہیں کہ :-

"Juliana the slave of him that prays."

یہہ غلطی فارسی کے فنِ انشا کے نہ جاننے سے ہوئی ورنہ "دُعاگو خطاب ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ عاجزانہ لفظ ہے جو عرضی لکھنے والے ہمیشہ ازروے ادب بڑے کو لکھتے ہیں ÷

اسی طرح "پیش خیمہ" کو پیش خانہ لکھا ہے۔ سفر و کیمپ میں پیش خیمہ کا دستور ہے نہ کہ "پیش خانہ" کا ÷ لال کنور نامے ایک رقاصہ تھی جس کو سفارت کے مورّخ نے

سب سے بڑے مرتبہ کی ملکہ شہنشاہ بیگم لکھا ہے۔ محل شاہی میں بعض عورتیں بادشاہ کی منظورِ نظر ہو جاتی ہیں۔ یہ اُن میں تھی ۔ اس کی نسبت سفارت کے مورّخ نے ایک عجیب قصّہ لکھا ہے کہ لال کنور کا ایک رشتہ دار نام دار خاں نامے گویا نشۂ شراب میں بادشاہ پر ہاتھ چلا بیٹھا اور تلوار مانگنے لگا۔ جب کسی کی جُرأت نہ ہوئی تو بادشاہ نے بڑے استقلال سے فرمایا کہ اس احمق کو تلوار دے دو دیکھیں کیا کرتا ہے؟ مگر اُس حرام زادے کو ہمّت نہ ہوئی: بادشاہ نے فرمایا کہ اس کورنمک کو تلوار کی ہمّت نہیں تو تلوار میں لیتا ہوں۔ اس پر وہ حرام زادہ خوف کے مارے بھاگا ۔ بادشاہ باہر آئے تو دیکھا کہ پہرہ کے سپاہی سب سو رہے ہیں اُنہیں غفلت پر لعنت ملامت کی کہ اتنے میں وہ بدمعاش کٹاری لئے نظر آگیا۔ سپاہیوں نے چاہا کہ قتل کرڈالیں کیونکہ سلاطین کے سامنے جو ہتھیار لئے دکھائی دے جاوے اُسکو فوراً قتل کر دینے کا حکم ہے۔ مگر لال کنور آکر بادشاہ کے قدموں میں گر پڑی اور بہت روئی۔ بادشاہ نے نام دار خاں کی ساری جائداد ضبط کر کے دایم الحبس کر دیا ۔

ایسے قصّے اکثر بازاروں میں سُن سُنا کر یورپ کی سفارتیں اپنی اپنی سلطنتوں کو لکھا کرتی تھیں۔ منوکائی نے اس طرح کے قصّے زیادہ لکھے ہیں جو بازار میں قلعہ کے نوکروں سے سُنا کرتا تھا ۔

لیکن اس سفارت کے نگارندہ نے تخت طاؤس کا حال اچھا لکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

تخت طاؤس جو شاہجہاں بادشاہ نے بنایا خود شاہجہاں اس تخت پر کبھی نہیں بیٹھے۔ سب سے پہلے اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی تخت نشینی پر اجلاس فرمایا۔ یہ تخت سر بسر طلائے بے غش کا ہے۔ تخت نہایت صنعت سے بنا ہے اس کے آگے پیچھے تین تین محرابیں اور پہلو میں دو دو ہیں۔ چھت گنبد نما سونے کی ہے اور چاروں کونوں پر چار مور پر پھیلائے ہوئے ہیں جن کی دُمیں اصلی طاؤسوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ صرف جان پھونکنے کی کسر ہے۔

ان موروں کے بیچ میں سونے کا گلدستہ ہے جس میں کئی قسم کے طلائی پھول ہیں۔ اور بیچ میں زمرّد کا ایک بے مثل سبز پتہ ہے۔ یہ زمرد بیضۂ مرغ کے برابر ہے۔ سارا تخت بے بہا جواہرات میں جڑا ہوا ہے۔ جس میں ہیرے لعل، زمرّد، یاقوت وغیرہ بے تعداد ہیں اور جتنے جواہرات ہیں سب غیر معمولی لمبائی چوڑائی کے ہیں جن کا جواب نہیں۔

چھت پر سرخ مخمل کا سائبان ہے جس میں بیش قیمت موتی لٹک رہے ہیں۔ یہ سائبان چار مینا کار چوبوں پر استادہ ہے جن میں ہیرے جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ تخت سے تین قدم کے فاصلہ سے ایک سونے کا کٹہرا ہے جس میں ٹھوس سونے کی بارہ انچ موٹی سلاخیں ہیں۔ اس کٹہرے سے نکل کر تخت تک پہونچنے کا زینہ ہے۔ یہ تخت پہلے تخت سے ذرا چھوٹا ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر چار گلدستے ہیں جن کے پھول پانچ پانچ پتیوں کے مختلف بلندی کے مخروطی شکل کے ہیں اور مختلف

پھولوں سے لدے ہوئے ہیں + اس تخت سے چھہ قدم آگے ایک اور تخت ہے جس کے آگے تیسری نہایت شاندار سنگِ الاباسٹر[1] کی جگہہ ہے جو خالص سونے کی ہے + یہاں ایک طلائی تیلیوں کی چک پڑی ہوئی ہے جہاں محل شاہی کی بیگمات کا گزر معلوم ہوتا ہے +

وہ عمارت جس میں تخت طاؤس رکھا ہوا ہے لاجواب ہے جس میں ۹ محرابیں ہیں جہاں سے وہ تینوں تخت نظر آتے ہیں جن کا ذکر ابھی ہوا اور قلعہ کا دروازہ آمد کا دکھائی دیتا ہے + دیوان کی چھت سے سونے کے گولے سونے کی زنجیروں سے سر سے اونچے لٹک رہے ہیں +

یہہ تخت جو از روئے صرف و صنعت دنیا کی عجائبات میں لاجواب ہے یہہ ۹ نو کروڑ روپیہ میں تیار ہوا +

اِس سفارت کی تاریخ میں دربار شاہی میں کورنش و تسلیم اور آداب کی تفصیل بہت اچھی لکھی ہے کہ نذر و خلعت دو پیشی کا کیا طریقہ تھا؟

فروری سنہ رواں کا صلائے عام تیار ہی پر ہے۔ اس میں زیادہ گنجائش نہیں : فرصت میں پھر عرض کرونگا +

(ماخوذ از جرنیل پنجاب ہسٹاریکل سوسائیٹی)

---

[1] نہایت سپید نرم سنگ مرمر +

رسالۂ مُبصِّر لکھنو

اُردو رسالوں کی طرف سے لاہور عرصہ سے دلّی و لکھنو سے بازی لے رہا ہے یعنی تعداد و صرفِ کثیر اور کاغذ و چھپائی اور تصویروں کے لحاظ سے ہندوستان کے اور رسالے لاہور والوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ لیکن اس ہفتہ میں لکھنؤ سے اُردو کے چند رسالے ایسے آئے جن کو دیکھ کر مجھے کہنا پڑا کہ از روئے لٹریچر لکھنؤ دلّی سے آگے نکل رہا ہے ÷ اس کے ثبوت میں مَیں رسالۂ مُبصّر پیش کرتا ہوں جو خوبیٔ اہتمام و خوبیٔ مضامین میں بہت پاکیزہ رسالہ معلوم ہوتا ہے ÷ نثر کے مضمون اکثر نامور لکھنے والوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ نظم میں شعراء لکھنؤ کے کلام کو کوئی پہونچ نہیں سکتا ÷

اس پرچہ میں انتخابِ مشاعرۂ سراج الادب کے شعر میں نے اپنی بیاض میں نقل کرلئے۔

جناب گہر: دلِ گُم گشتہ جو پوچھے گئے دیوانوں سے ÷ ایک اک ذرّہ اُٹھالائے بیابانوں سے

"بیابانوں" کا مضمون حضرت عمادؔ نے بھی خوب باندھا ہے

بستیاں چھٹ گئیں ہم چاک گریبانوں سے ÷ شب کو آتی ہیں یہہ آوازیں بیابانوں سے

بیابانوں کا یہہ مضمون بھی نیا ہے

جناب آہ سیتاپوری: اللہ اللہ تری راہ کے ذرّوں کی کشش ÷ کھینچے لاتا ہے کوی جیسے بیابانوں سے

پہلے میں مطلع کے شعر یہاں لکھ دوں پھر اور شعر سناوں:۔

جناب منظر: دستِ وحشت نہیں رُکتے ترے دیوانوں سے ﴿ دامنوں پر اُتر آئے ہیں گریبانوں سے

"گریبانوں" سے "دامنوں پر اُتر آنا" بہت خوب کہا ﴿

جناب سراج: تیری محفل میں الگ بیٹھے ہیں دیوانوں سے ﴿ یہہ سلوک اور بُلائے ہوئے مہمانوں سے

"بلائے ہوئے مہمانوں سے سلوک" بہت اچھا رہا

مہمانوں کا مضمون جناب قدیر کا لاجواب ہو گیا ہے ۵

کتنی اے شمع جلن ہے تجھے پروانوں سے ﴿ ایسا برتاؤ اور اک رات کے مہمانوں سے

جناب قدیر: کتنا گہرا تھا تعلق مرے ارمانوں سے ﴿ پوچھ لو خون میں ڈوبے ہوئے پیکانوں سے

جناب شمس: زُلفیں سُلجھانے کو کہتے ہو پریشانوں سے ﴿ تم نے پھر چھیڑ نکالی وہی دیوانوں سے

یہہ مضمون جناب ذہین نے بھی خوب نباہا ہے ۵

جانِ دنیا بھی نہیں دُور پریشانوں سے ﴿ چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں دیوانوں سے

جناب مُطہر: غنچے کہتے ہیں چٹک کر ترے دیوانوں سے ﴿ فصلِ گُل آگئی ہشیار گریبانوں سے

جناب آشفتہ: سُرخیاں چھانٹنے والے مرے افسانوں سے ﴿ حشر کیا حشر بنے گا انہیں عنوانوں سے

جناب شوخ: بھڑ پڑے ہیں ترے دیوانے جو دربانوں سے ﴿ مُشکیں کس لیگئے سب مل کے گریبانوں سے

(جب اور کچھ نہ ملا تو دیوانوں کی مُشکیں گریبانوں سے نہ کسی جائیں تو اور کس سے؟ دیوانوں کے پاس چاکِ گریباں کے سوا کیا رکھا ہے؟)

جناب آشفتہ نے مطلع میں "عنوانوں" سے بہت کام لیا۔ اس شعر میں "عنوان" غضب کا ہے ۵

آؤ عنوانِ تلافی بھی بتا دیں تم کو ﴿ لو یہہ دل جوڑ دو توڑے ہوئے پیمانوں سے

ہ سیتاپوری: جب اسیری میں تصور کبھی وحشت کا کیا ✦ آگے صحرا کی حدیں مل گئیں زندانوں سے

مضمون بالکل نیا ہے۔ صحرا کی حدیں زنداں سے ملجانا اسیری و وحشت کا نقشہ اس سے بہتر نہیں کھنچ سکتا)

مہر: جب نہ دیوانوں کا زنجیروں سے کچھ زور چلا ✦ ہاتھ اُلجھا لئے آخر کو گریبانوں سے

تنویر: ٹوٹنا سیکھا ہے تاروں نے فلک کے شاید ✦ آپ کے عہدوں سے اور آپ کے پیمانوں سے

منظر: ذکرِ دل۔ ذکرِ جنوں۔ ذکرِ وفا۔ ذکرِ فراق ✦ کم کیا جائے گا کیا کیا مرے افسانوں سے

س: ذکرِ مجنوں بھی سُنا قصۂ یوسف بھی پڑھا ✦ چاک دامن ہی بھلے چاک گریبانوں سے

جناب صفدر مرزا پوری

چار دن بھی تو حرم میں نہیں رہنے پاتے ✦ روز پیغام چلے آتے ہیں بتخانوں سے

نشاط: تیرے دیوانوں کا سب جوش ہے محتاجِ بہار ✦ ہاتھ پڑتا ہے ابھی ہٹ کے گریبانوں سے

رواں: آج نوروز ہے خُم لب سے لگا دے ساقی ✦ کام چلتا نظر آتا نہیں پیمانوں سے

مہدی: شادی و غم کا اثر عشق میں یکساں دیکھا ✦ شمع ہر حال میں گھر جاتی ہے پروانوں سے

مختصر میں لسان الملک حضرت ریاضؔ کی غزل کا کیا کہنا ؎

تو سہی حشر کا دن رات ہے نیند آئے ✦ وہ سنیں تو سرِ محفل مرے افسانے کو

اس طرح کہنا حضرت ریاضؔ ہی کا حق ہے!

دل تو مجھے شاعری میں دخل نہیں۔ دوسرے میں غلطی سے سمجھ رہا ہوں کہ شاعری میں اب کوئی بات باقی

اساتذہ سے چھوٹی ہو۔ مگر وہی بات جب نئی ادا سے بیان کیجاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں ابھی گنجائش

بیان تو واقعی اُردو شاعری پر ختم ہے۔ خدا کرے ہماری نثر میں یہہ بات پیدا ہو جائے ✦

ب کی کہی ہے ستہ ؔ کام چلتا لاجواب ہے ✦

فردوسی کے دو شعر

ایک صاحب مجھ سے فردوسی کے دو شعروں کے معنی اور مطلب معلوم کرنا چاہتے ہیں اس کی وجہہ یہہ ہے کہ خاں بہادر میر ناصر علی صاحب کے اصرار پر میں بعض اشعار فردوسی کے صلائے عام میں لکھتا رہا ہوں۔ اس پر خاں بہادر نے بجائے اس کے کہ فردوسی کے کلام کی تعریف فرماتے میری تعریف اس امر کی کی کہ میں کلام فردوسی کو خوب سمجھتا ہوں۔ اسی بنا پر مجھ سے دو شعروں کے معنی دریافت کئے جاتے ہیں ان کے معنی تو عرض کرتا ہوں مگر یہہ بھی ظاہر کرتا ہوں کہ ممکن ہے کوئی شعر ایسا ہو کہ میری سمجھ سے باہر ہو اس واسطے مجھے ہر شعر کے معنی سمجھانے میں معذور سمجھا جاوے۔ مذکورہ اشعار میں ایک شعر یہہ ہے:۔

بہ بالیست بر کوہ آتش گزشت ٭ ببن زار بگریست آہو بدشت

یہ قصہ طلب شعر ہے۔ کاؤس بادشاہ کی بی بی سودابہ جو بہت خوبصورت تھی وہ سیاوش پر عاشق ہوگئی تھی کہ جو کاؤس کی دوسری بی بی کا لڑکا تھا۔ سیاوش سے جب سودابہ نے اپنی مطلب برآری ہوتے نہ دیکھی تو اُس کو متہم کیا۔ آخر سیاوش کی پاکبازی اس پر قرار پائی کہ آگ جلائی جاوے اور سیاوش اُس میں سے سلامت نکل جاوے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ وہ ایک بڑی آگ سے سلامت گزرا۔ پھر سیاوش نے آئندہ کی سلامتی اس میں دیکھی کہ وہ ایران سے کسی بہانہ نکل جاوے۔ اُسی زمانہ میں ایرانیوں کی تورانیوں سے لڑائی ہوئی اور ایران کی فوج کا افسر اعلیٰ سیاوش بنکر گیا اور شتاب شاہ توران سے صلح کرلی۔ اس صلح کو اُس کے باپ نے اچھا نہ جانا تو سیاوش تنگ آکر توران چلا گیا۔ اور کاؤس کو خط میں لکھ بھیجا کہ میں اپنی زندگی ایران میں خطرہ سے خالی نہ دیکھکر دشمن سے صلح کرکے وہیں زندگی گزاروں گا اور اس خط میں ان مصائب کو بیان کیا جو سودابہ کے کہنے سے ایران میں برداشت کیں ازانجملہ آگ سے گزرنا بھی بیان کیا کہ مجھے آپ نے آگ میں جھونکا کہ اس مصیبت کو دیکھ کر جنگل کے جانور بھی میری حالت پہ روئے۔

ببالیست

بیت بر کوہ آتش گزشت - یعنی یہ فیصلہ میرے حق میں ہوا کہ آگ کے پہاڑ سے گزرنا چاہیئے - یہہ
ت تھی کہ جنگل کے ہرن بھی میرے حال پر رو دئے -

دوسرا شعر یہہ ہے - بفرمود تا اسپ را زین کنند * دم اندر دم نائے زریں کنند - رستم لڑائی
تیار ہوا تو گھوڑا تیار کرایا اور بگل بجوانے کا حکم دیا کہ فوج جمع ہو - اس شعر میں لفظ دَم میں جھگڑا
ہے یادُم ہے - میری رائے میں دَم بمعنی دہن - مونہہ کے ہیں - مگر مشکل یہہ ہے کہ لغت والے
ی مونہہ یا دہن کے نہیں بیان کرتے اس واسطے خیال ہوتا ہے کہ دُم نائے ہے جس کے معنی آخر
- نائے کا جو گا دُم ہوتا ہے وہ مراد ہے - مگر یہہ میرے نزدیک بالکل غلط ہے - دَم بمعنی
یں خواہ لغت والے لکھیں یا نہ لکھیں - میں فردوسی کا دوسرا شعر اس کی تائید میں
ہوں - جب رستم کاؤس بادشاہ سے ناراض ہوا ہے تو اُس نے یوں کہا تھا - کہ یہہ
ے سر پر ہے بہتر ہوتا اگر سانپ کے مونہہ میں ہوتا - یہاں دوسرے معنی سوائے دہن
ہی نہیں - وہ شعر یہہ ہے :-

چنیں تاج بر تارک بے بہا * بسے بہتر اندر دم اژدہا

ے سوا کچھ اور معنی ہوں تو کوئی صاحب مہربانی کر کے سمجھا دیں - والسّلام *

مرزا محمد علی خاں - (خاں صاحب)

جناب سیّد اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر تحریر فرماتے ہیں :-

× × × × × × × × ×

نثر لکھنا آپ کا حصّہ ہے - دہلی کی ٹکسالی زبان صرف آپ کی وجہہ سے زندہ
ہندوستان میں آپ سے بہتر کوئی پاکیزہ نثر نہیں لکھ سکتا" × × × × × ×

نمونۂ زبانِ عوام

(کارخانہ کے ایک کاریگر کی زبانی)

(ذیل کا مضمون دیکھتے وقت زیروزبر اور الفاظ کی عجیب وغریب تبدیلیوں کو ملحوظ خاطر رکھیے)

جمعرات کا دن اور بُلاوے چلاوے کی بھرمار اور میں اس فکرِ وحشت میں گرفتار کہ پہلے کس کیاں جاوں۔ وہ جو مثل مشہور ہے کہ سو بیمار اور ایک انار۔ وہی میری حالیت تھی۔ خیر پہلم پہل میں مجو کرخندار کیاں گیا۔ واں جاکر دَروزہ کھٹکھٹایا۔ میاں کرخندار! اے میاں کرخندار!! ایک بچّہ نکل کر آیا۔ کہنے لگا کرخندار بازار گئے وے ہیں۔ میں نے کیا ہمارا تو آنا ہی بے فضول ہوا۔ لاچار واپس چلا۔ اتفاق ایسا آن کے پڑا کہ کرخندار رستے میں برلبِ سڑک کے کنارے ہی کھڑوے مِل گئے۔ میں نے کیا بھئی کرخندار ہمیں تو بڑی حریاں گتی ہوئی۔ کرخندار کہنے لگے۔ خیر سلا تو ہے؟ مینے کیا اب تو ڑی تو خیر سلا تھی مگر اب نہیں نظر آتی۔ مَردے آدمی تم نے تو آج میٹھے چاول کی دعوت کی تھی۔ کرخندار بولے کیوں نہیں۔ میں بھی تو اسی لئے بازار نکلا ہوں۔ بنیا آجائے وِس کا انتظار ہے۔ پھر میں گُڑ اور چاول گھرلے کرجاؤں میں نے کیا غضب ہے اندھیر۔ چار بجنے میں کچھ بلٹ کی دیر ہے اور تمنے ابھی دعوت کا سامان بھی نہیں خریدا کرخندار نے کیا میں کیا کروں۔ دس روپے کا لوٹ لئے پھر رہا ہوں۔ سارے بازار بھر میں تا نتواں نہیں ملا۔ اس لئے ذرا دیری ہوگئی۔ میں نے کیا کرخندار تو میں تو اجازت چاہتا ہوں۔ کرخندار بولے واہ! تمہارے بغیرز تو لُفط نہیں آئے گا۔ لو یہ پیسہ لو۔ چلی قبر سے دھیلے کا کرُوا اور دھیلے کا سادہ تمباخو خرید لانا۔ اور گھر چل کے تُوے کا حُقّہ بھر کر پینا۔ میں نے کیا کرخندار میں رات کے دَخت آوں گا۔ غرض بڑی مشکلوں سے پیچھا چھٹایا اور اپنے پڑوسی کلّو حلوائی والے کیاں پہنچا۔ واں دس بارہ ایک آدمی بیٹھے وے ہے

نے۔ میں بھی وہیں ایک کنارے میں کونے میں جا بیٹھا۔ شامت جو آئی تو جوتیاں اٹھانی بھول گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے اور سب یونہی بیٹھے ہیں۔ تم جانو میری عادت اس قسم کی ہے نہیں۔ گھبری ہو ہوئی میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ اس درمیان کے بیچ میں کلو بھی گھبرایا ہوا اندر آیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو جوتیاں ندارد۔ مسلمان ہو تو یقین کرنا۔ خون ہی تو خشک ہو گیا۔ یوں کہ تم جانو وہ جوتیاں ہماری اپنی نہیں تھیں۔ بلکہ ہمارے محلہ میں ایک ٹلیٹار رہتا ہے۔ ہم نے وس سے ایک دن کے لئے مانگ لی تھیں۔ میں نے کلو سے کیا۔ کیوں بے تو نے یہ دعوت کی تھی یا عداوت اور چپکے سے کیا کہ جوتیاں پرانی تھیں اور کوئی وہاں کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ کلو ایک ہی حلالی ہے۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ کہ ابے مانگے کی چیزیں کیوں پہنتا ہے پھر کہنے لگا۔ ڈھونڈ لے یہیں کہیں پڑی ہوں گی۔ کلو کے غل غپاڑے سے مجھے بڑا جوش آگیا۔ مگر بچپنے کے یارانے کا خیال کر لیا ورنہ جی میں تو یہ آئی تھی کہ اکھیڑ میں بیٹھ کے دے ماروں۔ میں نے کیا جوتیاں ڈھنڈوا۔ وہ کہنے لگا مجھے تو دم لینے کی فرصت نہیں۔ یوں کہ چھوٹے بھائی کے ختنہ ہیں اور وس کا صبح سے پتہ نہیں اور خلیفہ (حجام) بھی حریاں بیٹھے ہیں۔ ساری دعوت کا مزا کرکرا ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا مار دیا ؤلی۔ جب تک لمڈے کے ختنہ نہیں ہوں گے دعوت ہونی مشکل ہے۔ چپکے سے ایک مسجد میں گیا۔ واں ایک گدھے والا جوتیاں دروزہ پہ اتار کر اندر پانی پی رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا۔ وس کی جوتیاں اٹھا اور بھاگا۔ دوسری گلی میں جا کر پہنیں اور سوچا کہ نانی سقے کیاں چلو۔ وس نے وعدہ کیا تھا۔ بھتر والے پے ڈراما چل کر دیکھیں گے۔ وس کے گھر پہ آواز دی۔ ایک لمڈا روتا وا آیا اور کہنے لگا وہ تو گھر کے اندر نہیں میں نے سوچا پانچ بجے ہیں۔ ابھی سے بھتر والے بائیسکوپ پہ چل کر بیٹھو۔ اپنے آپ واں ملجائے گا۔ چھ بجے پھر ساڑھے چھ۔ کھیل شروع ہو گیا اور نانی سقے کا پتہ نہیں۔ اندر ایک ٹو ہا ہو رہی۔ ڈرامہ زور کا تھا۔ میں غصہ میں کھول رہا تھا۔ وہ تو یوں کہو کہ میری جان پہچان کا ایک شخص مل گیا۔ وس بندۂ خدا سے چار آنے کے پیسے ادھار لے کر ٹکٹ خریدا اور جھٹ پٹ گنگشن کرا۔ اور آٹھ والے میں جا بیٹھا۔ مذاق کا حصہ ہو رہا تھا اور وہی چھنیا عینک والا وخ مچا رہا تھا۔ جب ہاف ٹیم ہوا تو ہم باہر نکلے۔ دیکھا تو نانی شنا ہو پنواڑی کی دکان پہ کھڑا وا تھا۔ مجھے دیکھ کے بولا۔ یار مجھے ذری دیر ہو گئی کیونکہ میری لگائی وقت پہ

وس کی

وس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے کہا تو بھی بڑا بے غافل ہے۔ اپنی جوزہ کو اکیلا چھوڑ کر کہاں چلا آیا۔ کہنے لگا خواہ ہزار سے بارہ سو رہ جائیں مگر بائیسکوپ تو میں کبھی ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ میں نے کہا پیارے تو مختیار ہے۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ آگ کھائے گا۔ انگارے ہگیگا۔ ہم نے تجھے وصیت کر دی۔ اب تو جا ہے سو کر۔ خیر بائیسکوپ ختم ہوا اور ہم گھر پہنچے۔ وہ تو خدا بھلا جوزہ کو سلامت رکھے کہ وس نے ہمارے واسطے کھانا بھجوا دیا۔ ورنہ دشواری ہوتی۔ کھانا کھا کر ہم لیٹا ہی چاہتے تھے کہ اتنے میں دروزہ پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ ہم نے کواڑ کھولے لالٹین ہاتھ میں لی اور اب جو دیکھا تو وہی بیٹے صاحب جن کی جوتیاں ہم ایک روز کے لئے مانگ کر لے گئے تھے سامنے کھڑے ورے تھے ٭

(از اخبار بائیسکوپ دہلی)

صلائے عام ۔ باہر کے لوگ مجھسے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ دلّی کی زبان کی بڑی تعریف سنی جاتی ہے؟ اس کے جواب میں مجھے یہہ کہنا پڑتا ہے کہ اہل علم کی زبان تو جیسی ہر شہر کے شرفا کی زبان ہے اس سے بجز چند تذکیر و تانیث میں اختلاف کے اور بہت فرق نہیں: فرق کا معیار صرف علم و فضل میں کمال کا ہے ٭ مستورات کی زبان کی طرح اصلی زبان بلا تصنّع عوام کی ہوتی ہے۔ ڈی کوائینسی[سلہ] نے لکھا ہے کہ ڈاکخانہ کے تھیلے میں سے بیگمات کی چٹھیاں چرالو ان میں اصلی زبانِ انگریزی کے نمونے ملیں گے۔ اردو میں بھی خالص اردو کا پتہ عورتوں کی زبان سے مل جاتا ہے۔ سو بھی آجکل کی تعلیم یافتہ عورتوں کی زبان سے نہیں۔ بلکہ اگلی بڑی بوڑھیوں کی زبان سے جو الف کے نام بے نہیں جانتیں ؎

دلا یہہ مکتبِ الفت ہے دیکھ چپ رہنا ٭ بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا ٭

[سلہ] De Quincey.

الفاظ

اتفاق سے مجھے دلی کے عوام کی زبان کا یہہ نمونہ مل گیا. مضمون گو ظریفانہ ہے
سکے عوام کی زبان کا اچھا نمونہ ہے : اِسے "اچھا" میں اس لئے کہتا ہوں کہ دلی میں
نمل کے رواج سے دُکان داری ۔ کارخانہ داری اور پیشہ و حرفت کا رواج زیادہ ہے +
شیہ والوں کی معاش کارخانہ کے کاریگروں پر ہے ۔ کم و بیش یہہ نمونہ کاریگروں کی
یال کا ہے جو اکثر جاہل ہوتے ہیں + یہہ نمونہ دلی کے عوام پیشہ وروں کا ہے ۔
ر دلی میں حرفت و دکانداری پر معاش کا مدار زیادہ ہے اس سے دلی کے عوام کی
کا خاص نمونہ قیاس کیا گیا + یہہ اخبار بائیسکوپ دہلی سے نقل کیا گیا ہے جس کی سُرخی
ــــ کی سیر" تھی +

پوسٹ کارڈ میں گھر کا حال

× × × × "جنوری کا صلائے عام میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا ۔ اس کی زبان کی خوبی د
ت اور مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی واقعی لاجواب ہے میرے زبان نہیں ہے کہ جو اس کی تعریف لکھ سکوں"

× × × × × × "آپ نے جو مضمون صفحہ ۴۲ پر (جنوری سنہ رواں کے صلائے عام میں) شائع کیا
کی میں بدل و جان تائید کرتا ہوں ۔ اُس مضمون میں لکھا ہے کہ پوسٹ کارڈ کی نسبت "آپ ڈاکخانہ کے
ے پوچھ لیجئے" ۔ تو ہر شخص ڈاکخانہ میں پوچھنے کہاں جاوے گا اور اس کو یہہ معلومات کیسے ہوگی اس لئے
۳۶ سال کا تجربہ بیان کرتا ہوں اس عرصۂ دراز میں بندہ مختلف صوبجات میں پوسٹ ماسٹر رہا. واقعی آپکا
لکل دُرست ہے کہ انگریزی پوسٹ کارڈ پر مضمون لکھنے میں بالکل کام میں نہیں لاتے ہیں جہانتک میرا خیال ہے ایک سیکڑا
سٹ کارڈ کسی انگریز کا لکھا ہوا نہیں نکلتا البتہ پوسٹ کارڈ زیادہ تر مہاجن یا کاروباری لوگ استعمال کرتے ہیں یا دیگر
نانی جب سے محصول لفافہ کا بجائے آدھ آنے کے ایک آنہ ہوگیا ہے تب سے پوسٹ کارڈ کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے" × ×
× × × × × × × × × × (نیاز مند ــ ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر)

فہرستِ کتبِ تواریخِ ہند

یہہ میں کئی دفعہ عرض کرچکا کہ تواریخ کے معاملہ میں فارسی زبان میں جتنی تاریخیں ہیں اتنی اور کسی زبان میں شاید ہی نکلیں۔ خاصکر اُس زمانہ کی جب سے کہ مسلمان ہندوستان میں آئے ۔ یہہ ملک ہی ایسا ہے جس کی تاریخیں جتنی لکھی جائیں تھوری ہیں ہندوستان میں سلطنتوں کے انقلاب اتنے ہوئے کہ تمام دُنیا کے انقلاب ایک طرف اور ہندوستان کے انقلاب ایک طرف سے شبِ ہجراں کی آہ ایک طرف ۔ لاکھ ابرِ سیاہ ایک طرف

مسلمانوں سے پہلے کے انقلابوں کا حال تو مفصل معلوم ہونا مشکل ہے کہ قدیم اہلِ ہند نے تاریخ کی طرف بہت توجہہ نہیں کی مسلمانوں نے البتہ تواریخ لکھنے میں کمال کردیا ۔

تواریخ لکھنے کا موقع زیادہ تر انقلابوں میں ہوتا ہے ۔ جب ہندوستان سا ملک ہو جو انقلابوں کا گھر ہے اور مسلمان جیسے مورّخ ہوں اور مورّخ بھی بہ کثرت تو یہاں کی تاریخوں کے بے مثل ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے ؟

ہندوستان پر باہر سے حملہ کرنے والوں کی وجہہ سے جو انقلاب وقوع میں آئے اُن میں سے ایک ایک کئی کئی تاریخوں کا محتاج ہے ۔ سبکتگیں محمود غزنوی ۔ تیمور ۔ بابر ۔ نادر ۔ ابدالی وغیرہم کا ہندوستان پر حملہ کرنا بڑے انقلاب ووقایع کا

ہے۔ان کو جانے دیجئے تو ہر خاندان شاہی اور خاندان شاہی میں ہر بادشاہ
نتقال پر بڑے بڑے معرکہ کی لڑائیاں وقوع میں آیا کیں۔ کوئی بادشاہ اپنے
نا حریفوں بھائی بیٹوں سے لڑے بغیر تخت پر قدم نہ رکھ سکا۔ اس ضرورت سے
ہی بادشاہ بچ سکے + سبب یہہ کہ سلطنت کے معاملہ میں بڑے چھوٹے
بوڑھے عالم فاضل کی پابندی ضرور نہ تھی۔ سلطنت کے دعویداروں کا عقیدہ
ے عروسِ فتح کسے درکنار گیرو تنگ + کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آبدار زند +
جہاں ہر وقت انقلاب پیش نظر ہو وہاں مورخ کو مسالہ کی کیا کمی ہے؟ تاریخ
ان گویا پانی پت کے میدان سے زیادہ وسیع سمجھئے جس کا چپہ چپہ خدا جانے کتنے
پ دیکھ چکا ہے +
پہلے میں کُتبِ تواریخ کے نام گنوا دوں جس سے میری گزارش کی تائید
+ یہہ فہرست جناب ایلیٹ صاحب بہادر کی کتاب سے لی گئی ہے جو ہندوستان
نامور مورّخ ہوئے ہیں

فہرستِ کُتبِ تواریخ ہند

امع التواریخ رشیدی۔ (فارسی)
تاریخ بناکتی۔ (فارسی)
۔ تاریخ گزیدہ (فارسی)

(۴)۔ تاریخ حافظ ابرو۔ (فارسی)
(۵)۔ تاریخ عجائب و غرائب ہندوستان۔ یہہ تاریخ ہند کے نام سے مشہور ہے (فارسی) از محمد یوسف

(۶)۔ روضۃ الصفا۔ (فارسی) یہ بہت مفصل تاریخ ہے۔
(۷)۔ خلاصۃ الاخبار۔ (فارسی)
(۸)۔ دستورالوزرا۔ (فارسی)
(۹) حبیب السیر۔ (فارسی)
(۱۰)۔ تاریخ ابراہیمی۔ (فارسی)
(۱۱) لُبّ التواریخ۔ (فارسی)
(۱۲) تاریخ بادشاہان ہند۔ (فارسی)
(۱۳) تاریخ بادشاہان ہمایوں۔ (فارسی)
(۱۴) نسخ جہاں آرا۔ (فارسی)
(۱۵) تاریخ حاجی محمد قندھاری۔ (فارسی)
(۱۶)۔ تاریخ الفی۔ (فارسی)
(۱۷) فتوح السلاطین۔ (فارسی)
(۱۸) خزائن الفتوح (از حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ) فارسی۔
(۱۹)۔ طبقات اکبری۔ (فارسی)
(۲۰)۔ تاریخ بدایونی (از مُلّا عبدالقادر بدایونی) فارسی۔
(۲۱)۔ تاریخ حقی۔ (فارسی)
(۲۲)۔ زبدۃ التواریخ (از نورالحق) فارسی۔
(۲۳)۔ روضۃ الطاہرین (فارسی)
(۲۴)۔ منتخب التواریخ۔ تصنیف حسن بن محمد خاکی شیرازی۔ (فارسی)
(۲۵) تاریخ فرشتہ (فارسی) بہت معتبر و مشہور تاریخ ہے۔

(۲۶)۔ تاریخ حاکمان ہند (فارسی)
(۲۷) مآثر رحیمی (فارسی)
(۲۸) انفع الاخبار (فارسی)
(۲۹) صُبح صادق (فارسی)
(۳۰) مُجمل مُفصّل (فارسی)
(۳۱) لُبّ التواریخ ہند۔ (فارسی)
(۳۲) مرأت عالم (فارسی)
(۳۳)۔ مرأت جہاں نما۔ (فارسی)
(۳۴) ہفت گلشن (فارسی)
(۳۵) خلاصۃ التواریخ (فارسی)
(۳۶) مفتاح التواریخ (فارسی)
(۳۷) تاریخ قبچاق خانی (فارسی)
(۳۸)۔ تاریخ نادرالزمانی (فارسی)
(۳۹) تاریخ منور خاں (فارسی)
(۴۰)۔ حدیقۃ الصفا (فارسی)
(۴۱) سعادت جاوید (فارسی)
(۴۲) تاریخ رستم علی (فارسی)
(۴۳)۔ تاریخ ہندی (فارسی)
(۴۴) چہار گلشن (فارسی)
(۴۵) مجمع الملوک (فارسی)
(۴۶) سیر المتاخرین (فارسی)

۴)۔ مجمع الاخبار ۔ (فارسی)
۴)۔ چہار گلزار شجاعی ۔ (فارسی)
۴)۔ لُبّ السیر ۔ (فارسی)
۴) صحیح الاخبار ۔ (فارسی)
۴) تاریخ مظفری (فارسی)
۵) جامع التواریخ ۔ (فارسی)
۵) مختصر التواریخ (فارسی)
۵) زبدۃ الاخبار ۔ (فارسی)
۵) جنان الفردوس (فارسی)
۵) زبدۃ الغرائب ۔ (فارسی)
۵) اشرف التواریخ ۔ (فارسی)
۵)۔ جام جم ۔ (فارسی)
۵) خلاصۃ الاخبار ۔ (فارسی)

(۶۰) مجمل التواریخ ۔ (فارسی)
(۶۱) مرأت آفتاب نما (فارسی)
(۶۲)۔ تاریخ علائی ۔ (فارسی)
(۶۳) اشکال البلاد (عربی)
(۶۴) اخبار الدّول ۔ (عربی)
(۶۵) تاریخ الہند (از الوری خاں محمد بن احمد البیرونی) عربی ؛
(۶۶) زین الاخبار ۔
(۶۷) تاریخ حبابی ۔
(۶۸) تاریخ حیدر رازی ۔
(۶۹) تاریخ مفصلی ۔
(۷۰) منتخبات التواریخ (از منشی سدا سکھ) فارسی ؛
(۷۱) عجائب المقدور ۔ (عربی)

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہہ فہرست مکمل ہے ۔ اوّل تو ایک ایک نام کی دو دو
تین تاریخیں موجود ہیں ۔
دوسرے ایک ایک معرکہ کی علیحدہ علیحدہ : چنانچہ عربوں نے جب سندھ فتح کیا
س کی تاریخیں متعدد ہیں :۔

(۱) فتوح البلدان ۔ (۲)۔ تاریخ سندھ ۔ (۳)۔ خلاصۃ الحکایات
) تحفۃ الکرام ۔ (۵) تاریخ طاہری ۔ (۶) چارج نامہ ۔ (۷) چتّار نامہ ۔ (۸) بیلار نامہ

(۹) ارغون نامہ (۱۰) تاریخ ہند و سندھ۔ اسی طرح تیمور۔ نادر۔ محمود غزنوی۔ ابدالی کے حملوں کی تاریخیں ۔

تیسرے خاندان سلاطین کی علیحدہ۔ خاندان غزنوی کی فہرست ملاحظہ ہو۔

خاندان غزنوی کی تاریخیں

(۱) تاریخ یمنی۔ (۲) وصایا نظام الملک (۳) شرح یمنی (۴) ترجمہ یمنی۔ (۵) نگارستان (۶) جامع الحکایات (۷) بہمن نامہ (۸) تاریخ سبکتگین (۹) ماثر الملک (۱۰) فتوح البلاد (۱۱) ماثر الوالنصر مشکی (۱۲) ماثر ابو الفضل (۱۳) نظام التواریخ (۱۴) زین المآثر (۱۵) مطلع الانوار (۱۶) تاریخ ابن اثیر جزری (۱۷) ریاض المحبت (۱۸) زینت التواریخ (۱۹) تاریخ حافظ خاں (۲۰) تاریخ ابن قصیر (۲۱) تاریخ ابن شحنہ ۔

اسی طرح غوریوں کے خاندان کی علیحدہ۔ خاندان غلامان کی علیحدہ۔ خلجیوں کی علیحدہ خضر خانی علیحدہ۔ افغانوں کی علیحدہ۔ خاندان تیموریہ کے تو ہر بادشاہ کی بہت مفصل کر اکثر سلاطین مغلیہ کی پانچ پانچ چھہ چھہ۔ اکبر و شاہجہاں اور عالمگیر وغیرہ کی دس دس پندرہ پندرہ ۔

مسلمانوں نے جو تاریخیں لکھیں ان کا حق تھا۔ اہل ہنود نے بھی فارسی میں مسلمانوں کے زمانہ میں مسلمانوں کی تاریخیں اچھی اچھی لکھیں اور نہایت معتبر۔ مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر ہندو مورخوں کی شکایت کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے کیوں مسلمان بادشاہوں کے

عدل وانتظام کی تعریف کی؟ صاحب بہادر کو معلوم نہیں کہ اہل قلم حفظ ادب کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ مذہبی اور فرقہ دارانہ تعصب سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بادشاہوں کا ادب ہر شخص پر فرض ہے۔ بڑوں کا ادب لحاظ ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں ہندو ہوں یا مسلمان کوئی ہو؛ یہہ بحث علیحدہ ہے۔ یہہ علیحدہ مضمون کی محتاج ہے؛

میری تمنا ہے کہ اُمراء ہندوستان خاصکر مسلمان رئیس یہہ اور جتنی تاریخیں نہیں چھپی ہیں سب چھپوا کر ایک جگہ مثلاً دلّی میں جمع کرکے تاریخی کُتب خانہ قائم کردیں۔ یہہ بڑا مُلکی و قومی کام ہے؛

افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان کی اکثر تاریخیں ہندوستان ہی میں نایاب ہوں۔ نایاب درکنار اُن کے ناموں سے بھی بہت کم لوگ واقف ہوں۔ اور یورپ کے اکثر کُتب خانوں میں پہونچ جائیں اور وہاں ملیں؛

Note

کُتب تواریخ کی فہرست جناب ایلیٹ صاحب بہادر کی تصنیف سے جو

کتاب فہرست مورّخانِ ہند سے لی گئی؛

(صلائے عام)

صلائے عام: جنوری ۱۹۲۹ء

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

"صلائے عام" کا جنوری نمبر آپ نے خوب نکالا ہے۔ عنوانات کے بلاک نہایت دلکش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہہ گلدستے کسی زہرہ جبیں کی میز پر سجانے لئے تیار کرائے گئے ہیں ؎

ہے لطفِ سیرِ شبِ ماہ اُن حسینوں میں
جنہوں کے رہتی ہے افشاں چُنی جبینوں میں
(مصحفی)

آپ کے مضامین کی داد دینے کے لئے اعلےٰ قابلیت اور سخن شناسی کی ضرورت ہے اور میں ان خوبیوں سے قطعاً مرحوم ہوں۔ بہر حال آپ کے جو جملے میرے دل و جگر میں نشتر کی چُبھ گئے ہیں وہ یہہ ہیں :-

(۱) "مرنے کا ڈر نہ ہو تو انسان کو کسی بدراہ سے روکنا مشکل ہے: مرنے کا خوف خدا کے خوف سے کم نہیں"۔ × × × × × × × × × × ×

(۲) "تمناؤں کو بس میں رکھنا غایتِ عبادت ہے۔ جو ایڑیوں کے بل اونچا ہو کر چلنے کا ارادہ کرے دیر تک نہیں چل سکیگا"۔ × × × × × × × × ×

(۳) "مزاجِ یار سے تو اُمید بھی ہے کہ آج نہیں تو کل راہ پہ آجائے مگر زمانہ مڑ کر نہیں دیکھتا"۔ × × × × × × × × × ×

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

Among others received in English and Urdu the following Critique on the " SALA-I-AM ". Delhi was Published by the Pioneer. In its issue of the 3rd November 1909.

— ooo —

"The Sala-i-Am, published at Delhi" keeps up its high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature

Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom years and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine

His style is marked by refinement and culture and his readers should increase in number as the merit of his work become disclosed The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading"

Extract from letter a from Colonel D. C. PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 1910

— ooo —

"I have obtained the opinion of some of the Board on the 'Sala-i-Am' We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents

I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour In fact I have been doing so"

From Lieutenant Colonel D. C. PHILLOTT. M., A. Ph. D, F. A S B, late Secretary, Board of Examiners, Calcutta.

— ooo —

The printing paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu

Cambridge
1923.

D. C PHILLOT, (Lieut. Colonel)
Late Secretary Board of examiners Calcutta.

Extract from a letter from R. P. Dewhurst, Esquire, I. C. S. Session Judge, dated 11th 1911.

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end," * * *

-- ooo

Extract from a letter from the Honourable Mr. W MERK, L L D, I. C S, Late Chief Commissioner N W Frontier Province, Dated 6th August 1911

—ooo —

"I thought it (Sala-i-Am) a Periodical that might be encouraged with advantage, for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen calling on Deputy Commissioners.

ooo —

Extract from a letter from A L GORDON WALKER, Esqr., I C S Punjab Commission, dated 11th October 1911

- ooo

I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the waiting rooms of all Deputy Commissioners Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it

-- oo

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab, Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board"

I like your Paper personally It is always written in chaste and pure and if I may say so, in classical style"

(NOTE—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division Punjab)

L WHITE KING Esqr, L L D C S I F R S, Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number"

Dated 5th October 1908

Extract from a letter of L WHITE. Esqr L L D, C S I, Indian Civil Service Retired,

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent. My friend Colonel Story takes great interest in it"

NOTE—(The gentleman has since been knighted, Sir Lucas King)

Extract from the Gazette of India, June 6th 1914, Examinations.

— ooo —

XVI. In addition to the Grammer and Magazines recommended for the Proficiency Examination in Urdu:—Magazine, Sala-i-Am, Delhi.

Presentation of Mir Nasir Ali, Khan Bahadur, of Delhi to his Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

Extract from a letter from J. P THOMPSON Esqr., I. C. S.
Dated 12th December 1911.

(NOTE —The gentleman has been Knighted, Sir John Thompson K. C I. E., now Chief Commisoner Delhi)

Dear Mir Sahib

"I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour" "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty"

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE. K C. I E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab
Dated 25th Feb 1912

Dear Mir Nasir Ali

"My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty-the King Emperor"

I am,

Yours Sincerely,

Extract from a letter from Major (Now Lt Colonel) J C. C ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar.

صلائے عام

جو دل دکھاؤ تو آہیں بھی ہم کو کرنے دو + ستم کرو تو اجازت بھی دو فغاں کیلئے

میں خوش ہوں کہ صلائے عام کے پڑھنے والوں کو صلائے عام کی اکثر باتیں پسند آتی ہیں۔ اوپر کا اقتباس میرے کرم فرماؤں میں سے ایک صاحب کے خط کا جن سے مجھے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا شاہد حال ہے +

ہر زبان کی لٹریچر سے نظم ہو یا نثر بڑی غرض یہی ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر اثر کرے ؎ فلک پر کون کہتا ہے گزر آہِ سحر کرنا + جہاں جا ہے وہاں جا پر کسی دل میں اثر کرنا + (میر درد)

دُنیا افکار و آلام کا گھر ہے۔ اس میں لٹریچر کے سوا کوئی چیز غم غلط کرنیوالی نہیں + پورا غم غلط ہو سکے۔ یہہ ناممکن ہے: مگر جس قدر اور جس طرح ہو سکے غنیمت ہے ؎

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں + میری آواز گر نہیں آتی +

غالب نے یہہ شعر ہزار پند و نصایح سے اچھا کہا کہ وہ خدا جس کو حضرت موسٰے سا برگزیدہ پیغمبر نہ دیکھ سکے بندوں کے چیخنے کی آواز (دعا) پر کان لگائے رہتا ہے ؎

زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو + کہ جب کی آہ گھر میں برق چمکی آ کے زنداں پر

وقت آخر مری آواز سُنی رحم آیا

اُس کی قدرت پر ان آہوں کا رسا ہو جانا

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چند روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی بلسانِ ع عروسِ جمیل و لباسِ حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:۔

زبانِ اُردو میں	ایک صفحہ	ایکسال کیواسطے	[illegible]
"	"	چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
"	"	تین ماہ کیواسطے	[illegible]
"	نصف صفحہ	ایکسال کیواسطے	[illegible]
"	چوتھائی صفحہ یا اس سے کم	ایکسال کیواسطے	[illegible]
"	"	چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
"	"	تین ماہ کیواسطے	[illegible]
"	ایک صفحہ	ایکدفعہ کے واسطے	[illegible]
"	نصف صفحہ	"	[illegible]
"	چوتھائی صفحہ	"	[illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

(مینجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:۔

دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر۔ مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام سید احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana Delhi.

SALA-I-AM, DELHI. Regd. No. L. 1462





A [illegible] Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of [illegible] Indian especially Mahammadan culture and [illegible] and the [illegible] of the best [illegible] of the new [illegible]

دہلی
حسب الارشاد ناصر علی خاں مدیر دہلی کا دار المطبع واقعہ [illegible] ناظری فراشخانہ اور چھاپا گیا

فہرستِ مضامین

بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

حمد

(از مولانا کوثر: مرسلہ حکیم محمود حسن صاحب مہری گنگا نگر۔ بیکانیر)

بنام گل فروش آرزو ہا
چراغ افروز بزم گفتگو ہا

از وہر برگ گل آئینہ دید
تجلّی کرد از ہر ذرّہ خورشید

تصوّر در ثنائش سینہ ریش است
قلم چوں بید مجنوں سر بہ پیش است

فلک سرمست صاف فیض عامش
مہ و خور بادہ سرجوش جامش

فروغش جابجا شد پرتو انداز
بمہرش ذرّہ ذرّہ گرم پرواز

ز بلبل چہ چہ از قمری است کوکو
کبوتر میزند گلبانگ یاہو

بچشم راز کیفیت شناساں
گل رعنا پریزاد است وانساں

بہ بیں ماہی بدریا عین راز است
بہم پیچیدہ طومار دراز است

تماشا کرد گل ابوقت ایما
ید بیضا است ہر برگ گل اینجا

نگار رنجپوت آں سرو قامت
تفنگ اندازی و دیگرا قامت

برہمن زادہائے بید از بہ
زدہ از قشقہ بردل زخم خنجر

ہمہ افغاں پسر آشفتہ اطوار
ز شوخی ہا لبسہ کج بستہ دستار

بت چابک سوار آں گرم مہمیز
ز مژگاں نیزہ بر کف چشم خونریز

بتِ مطرب بشخون است تر دست　مسی مالیدہ و پاں خوردہ سرمست
دل پُرخوں بتارِ چنگ بستہ　صدائے دل فریبش رنگ بستہ
خوشا لاہور حسن اورا بنا ہے　لب راوی وفیضِ صبح گا ہے
بیا ساقی شرب فیضِ جاوید　کہ سرخوش برطرازم نقشِ تمہید
توی عشقِ سخن را پیرِ توفیق　تو عرفاں پیشۂ اے عین تحقیق

صلائے عام - یہ حمد مولانا کوثر کی مثنوی سے لیکر حکیم محمود حسن صاحب نے مجھے صلائے عام میں شائع کرنے کے لئے بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ " دراصل اس وقت سوائے چند بڑے لوگوں کے سچ پوچھئے تو اس کے قدر کرنے والے بھی نہ ہوں گے ۔ اس لئے خدمتِ اقدس میں اس کی حمد ارسال ہے ۔ اور سوائے صلائے عام کے دوسرے رسالے اس کی پوری قدر نہیں کر سکتے " × × × × × × × × × × × ×

جناب مولانا کوثر کا کلام واقعی لاجواب ہے - یہ طرزِ کلام ایک خاص اسکول کا ہے جس میں جلال ۔ اسیر ۔ غنیمت ۔ ناصر علی سرہندی اور دو ایک شاعر کمال کر گئے : یہ حمد واقعی بہت خوب لکھی ہے + مثنوی کا زیادہ کلام بھی آنے والا ہے اُس وقت پوری رائے دینے کی گنجایش ہوگی +

اس میں شک نہیں کہ فارسی کی شاعری کے سمجھنے والے بہت کم ہیں ۔ خود ایران میں بھی اگلی پاکیزہ فارسی نہیں رہی ؛ ہندوستان میں اگر اس کی بے قدری ہے تو

کیا تعجب ہے؟ رسالے والے اس طرف کس طرح توجہ کر سکتے ہیں کہ جس چیز کی قدر نہ ہو اُس کی خریداری مشکل ہے؟

میں خوش ہوں کہ حکیم صاحب نے اس مثنوی کی اشاعت کے لئے صلائے عام کو منتخب فرمایا۔ جناب کوثر کا کلام جسقدر رہتا رہے گا صلائے عام میں شائع ہوتا رہے گا ؂

ع "قلم چوں بید مجنوں سر بہ پیش است"۔ میر حسن کے "قلم" سے بل گیا کہ ع جھکا جس کے سجدہ میں اوّل قلم سے ع چلوں سجدہ کرتا تجھے سر کے بل ؂ جناب کوثر نے خوب فرمایا ع "ید بیضا ست ہر برگ گل اینجا" ؂ ؎

برہمن زاد ہائے بید از بر ؂ زدہ از قشقہ بر دل زخم خنجر

بُتِ مُطرب بہ شبخون است تردست ؂ مسی مالیدہ و پاں خوردہ سرمست

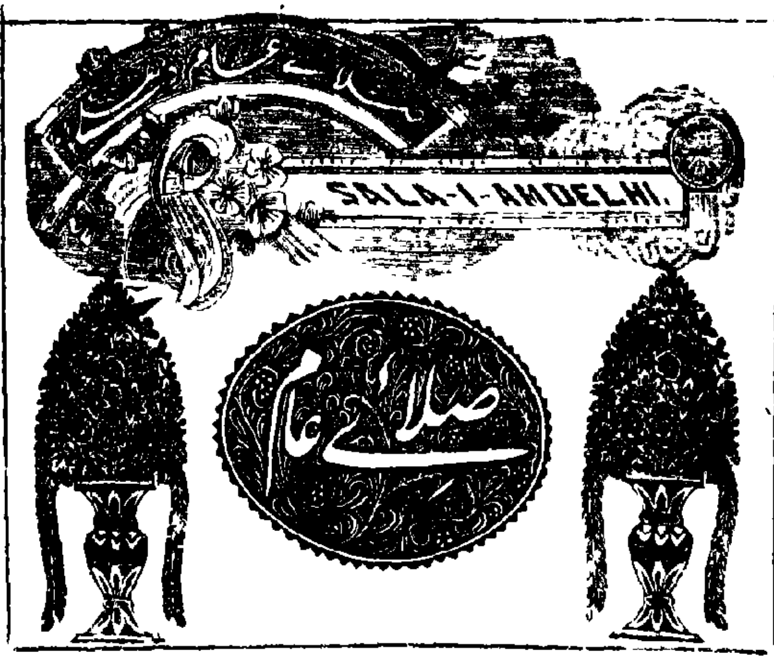
دلِ خونیں بتارِ چنگ بستہ ؂ صدائے دلفریبش رنگ بستہ

مُلّا غنیمت کی حمد کا پہلا شعر لاجواب سمجھا جاتا ہے کہ ؎

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں ؂ عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

اسمامیں "شاہد" "عزیز" کی اچھی سوجھی کہ غنیمت کی مثنوی کے یہی ھیرو ہیں۔ پروردگار کی تعریف میں ان سے مناسبت ذرا مبتذل سی بات ہے۔ مگر ظہوری نے ساقی نامہ میں ساری حمد شراب و ساقی کی رعایت میں ختم کر دی ؎ ثنا باہمہ یزدِ پاک را ؂ تر یا دہ طارم تاک را ؂ ان دونوں سے بچ کر جناب کوثر نے حمد کا پہلا شعر خوب کہا کہ ؎

بنامِ گل فروشِ آرزو ہا ؂ چراغ افروزِ بزمِ گفتگو ہا



ع در بزم عاشقاں سخن مدعا کہ کرد ؟

میرے پاس اکثر اصحاب اپنی اور پرائی تصانیف اس غرض سے بھیجدیتے ہیں کہ انکا ریویو لکھ دیا جائے۔ ریویو سے اُن کا یہہ مطلب ہوتا ہے جو دُکانداری میں اشتہار سے غرض ہے کہ بکری زیادہ ہو: اگر محض یہی مقصد ہے تو ریویو نگاری نہ ہوئی دلالی ٹھیری۔ جس طرح بڑے شہروں میں دلال بازار میں خریدار کی جان کو آجاتے ہیں کہ اس دُکان سے سودا لیجئے فلانی دُکان پر چلئے۔ یہہ دُکان مشہور ہے۔ یہاں چیز اچھی ملتی ہے۔ یہاں تک کہ خریدار و دُکاندار دونوں تنگ ہوجاتے ہیں: دلالوں کی کش مکش میں سودا اگڑ جاتا ہے جس طرح تالاب کے پانی میں گو صاف ہو برسات میں کائی آجاتی ہے ؎

ارباب صفا زنگ کدورت سے بری ہیں ۔ خورشید کے چشمے میں تو کالی نہیں ہوتی

میں ریویونگاری سے دلالی کا کام نہیں نکالا چاہتا کہ ۔ ۔ ہ جملہ مدحیں زیادہ بک جائیں

یہہ اس فن شریف کے وقار کے خلاف ہے ۔ ریویو سے ریویونگار کی معلومات علمی اور اظہار

کمال کا پتہ لگنا چاہئے نہ کہ دکانداری اور کمائی کا ذریعہ ہو ۔ جس طرح محبت میں عشق و ہوس

کا حال ہے کہ دونوں میں امتیاز شرط ہے ۔

کچھ ہو رہیگا عشق و ہوس میں بھی امتیاز ۔ آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

حضرت امیر خسرو رح کی مثنوی مطلع الانوار کے ریویو کی نسبت جو جنوری سنہ رواں کے

صلائے عام میں شائع ہوا اس بات کی شکایت ہے کہ مثنوی کی قیمت اور ملنے کا پتہ رہ گیا ۔

حضرت رح کی یہہ مثنوی اس قدر اہل سخن کی زبان پر ہے کہ اس کا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں ۔

پوچھ اے مرے وعدہ کے بھولنے والے ۔ اس کو یاد ترے اعتبار پہ نہ کیا

کلیات خسرو کے اشتہار میں درج ہے کہ "اس سلسلہ سے صرف علمی خدمت

مدنظر ہے" اگر یہہ صحیح ہے تو پھر کمی بیشی کی اتنی فکر کیوں ہے ؟ مشک آنست کہ

خود ببوید نہ کہ عطار گوید ۔

اس کے سوا اس سلسلہ کا **انتساب** بندگان عالی متعالی ہز اکزالٹڈ ہائینس

عالی جناب اعلیٰ حضرت نواب حیدرآباد جیسے رئیس والا ہم و خداوند دولت و حشم کے نام نامی

واسم سامی کے ساتھ معنون ہے تو اس صورت میں دو چار جلدوں کی بکری میں کمی بیشی

کا لحاظ بیکار ہے ۔ اگر ایک بھی نہ بکے تو سرکار دولت مدار میں کیا کمی ہو سکتی ہے ؟ ۔

بقیہ دوم

کہدو یہہ خریداروں سے مول ارکا نہ پوچھیں + جو دے نہ سکے کوئی یہہ بیعانہ ہے اس کا

لیکن اس سلسلۂ مثنویات کی نسبت میں ایک چھوٹی سی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ شعر و شاعری سے تو ساری فارسی زبان بھری پڑی ہے۔ ایران میں ہر تیسرا شخص شعر و شاعری میں کم و بیش اچھا ملکہ رکھتا ہے کہ خدا نے یہہ زبان ہی شاعری کے لئے موزوں بنائی ہے؛ لیکن اہل تحقیق کے لئے تواریخ کی زیادہ ضرورت ہے —— ہندوستان کی فارسی تاریخیں تمام دنیا کے محققوں کی نگاہ میں لاجواب مانی گئی ہیں۔ یہہ تاریخیں ہمارے ہاں سے نکل کر یورپ و امریکا کے کتب خانوں میں منتشر ہو گئیں؛ ان تاریخوں کی ایک نامکمل فہرست فروری سنہ رواں کے صلائے عام میں شائع ہوئی ہے + کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کے حالات سے غیر ملک والے ہم سے زیادہ واقف ہوں۔ واقف کیا؟ ہم اُن کے سامنے جاہل محض سمجھے جائیں؛ یہہ تاریخیں جس قدر مل سکیں چھپوا کر ایک جگہہ تاریخی کتب خانہ کی طرح جمع ہو جائیں تو ہمارے ملک اور زبان کا اچھا یادگار رہے۔ تاکہ کہنے کو ہو جائے کہ؎

اِک یادگار چھوڑ گئے بعدِ مرگ ہم
تھوڑا سا درد بازوئے قاتل میں رہ گیا

صلائے عام دہلی

نئی دہلی اور پرانی

نئی دہلی تو یہہ ہے جو حسب فرمان واجب الاذعان بندگانِ عالی متعالی اعلےٰ حضرت ملک معظم **شہنشاہ اعظم** خلّد اللہ ملکہم کی تاج پوشی کی مبارک تقریب میں ۱۹۱۱ء میں تعمیر ہونی شروع ہوئی اور تعمیر ہو رہی ہے ۔ جب نئی دہلی کی بنیاد پڑتی ہے تو باقی پہلے کی آس پاس کی دلیاں پرانی کہلاتی ہیں۔ اس وقت **شاہجہاں آباد** کو بھی پرانی دلی سمجھنا چاہیئے : اور پرانی دلیوں سے اس میں فرق اتنا ہے کہ اور مدت ہوئی کہ کبکی ویران ہوگئیں شاجہاں آباد آباد ہے۔

سعادت یار خان رنگین کا شعر ہے ؎

کہا مجھہ سے اک آگاہِ جہاں نے ۔ کہ بسوایا ہے یہہ شاہجہاں نے

گو یہہ بستی آباد ہے مگر **نئی دہلی** کے سامنے پرانی ہے ۔ اس پر "پرانی دلی" کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔ شاہ جہاں آج کل کے بادشاہوں میں نہیں ۔ وہ خاندان ہی از روے بادشاہی کب کا مٹ گیا ۔ اب شاہجہاں آباد بھی "پرانی دلی" ہوگیا ۔

ان دونوں دلیوں یعنی **نئی دہلی** اور شاہجہاں آباد میں جسے بمقابلہ **نئی دہلی** کے پرانی

دلی سمجھنا چاہئے ایک نہایت پاکیزہ رشتہ "**ماں بیٹی**" کا جناب صاحب چیف کمشنر بہادر دہلی نے بڑی خوبصورتی سے قایم کر دیا۔ کونسل آف اسٹیٹ میں بجٹ کی منظوریوں پر جب بحث ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ ابتک **نئی دہلی** پر بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کیا گیا جس سے یہہ مقصد ہے کہ **نئی دہلی** ہر طرح کی خوبیوں میں تمام شہروں کے لیئے نمونہ سمجھی جائے۔ حق بجانب ہے کہ "پرانی دلی (شاہجہاں آباد) جو گویا نئی دہلی کی ماں ہے تو "ماں" بھی "بیٹی" کے لایق سمجھی جائے +

یہہ تشبیہہ نہایت پاکیزہ ہے کہ جب ماں کے خط و خال درست ہیں تو بیٹی از روئے فطرت ضرور حسین ہوگی نیچر میں حسن لازوال ہے۔ ایک سے دوسرے کو پہونچتا ہے۔ ماں کی خوبصورتی بیٹی میں جب بیٹی کا شباب ہوگا منتقل ہو جائے گی : بیٹی کا خود شباب اور ماں کی خوبصورتی جو گویا ورثہ میں آئی کیا کچھ کر دکھائے گی +

اب تک جو شہر والوں کو کھٹکا تھا کہ شاید سرکار اس شہر کو بھول گئی جناب سر جان طامسن صاحب بہادر نے اس شہر کی حمایت کر کے یہہ شبہہ رفع کر دیا۔ حضور کو جو اس شہر سے محبت ہے اس کا تقاضہ یہی تھا کہ حضور اس کی ترقی کریں یہہ آپ نے کر کے دکھا دیا : بقول غالب دہلوی ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تہذیب قدیم و جدید

تہذیب ایسا حاوی لفظ ہے کہ دنیا و دین، شخصی و قومی، سلطنت و رعایا، ظاہر و باطن۔ روزمرہ اور گاہ گاہ ہر موقع و محل میں کم و بیش سب سے اس کا تعلق ہے۔ ان تعلقوں میں بڑا تعلق اس کا زبان سے ہے۔ تمثیلاً اس کی ایک مثال عرض کی جاتی ہے۔

انگریزی میں ہندوستان کے مورخوں میں جناب ایلیٹ صاحب بہادر کو اس ملک کی تاریخ دانی کا بڑا دعوے ہے۔ صاحب ماوح لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی فارسی تاریخوں میں مورخوں نے پوست کندہ اپنے خیالات کا اظہار بھولے سے بھی کبھی نہیں کیا: سلماں ہوں یا ہندو سلطنت کے ہر کام کی بُرا ہو یا بھلا تعریف ہی لکھی ہے۔ مسلمان مورخ تو مسلمانوں کی سلطنت کی تعریف جتنی کریں حق بجانب سہی۔ مگر تعجب ہے کہ ہندو مورخوں نے بھی مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے۔ ہر ہندو انشا پرداز نے مسلمانوں کی طرح پہلے حمد و نعت اور بادشاہ وقت کی ثنا گستری میں قلم توڑ دیئے۔ گو یہ بات ظاہر اہلِ ہنود کے عقائد کے خلاف ہو تو ہوا کرے۔ لڑائی میں مسلمان بادشاہ کی فتح کا حال گو اہلِ ہنود کی شکست ہو۔ مسلمان مارے جائیں تو شہادت کے مرتبہ کو پہونچیں۔ برخلاف اس کے ہندو اس مرتبہ سے محروم رہیں۔ کسی مسلمان بادشاہ کی شکایت میں ایک حرف کسی ہندو مورخ نے بھولے سے بھی نہ لکھا۔ ہمیشہ واہ واہ ہی کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مورخ جھوٹے

تھے بلکہ

تھے بلکہ بڑا سبب یہہ ہے کہ فارسی تعلیم میں حفظِ مراتب کی شرط ہے اور جس زبان کا جو طرزِ بیاں رائج ہو جائے اس کے خلاف لکھ نہیں سکتے تھے۔ یہہ اثر تہذیبِ قدیم کا تھا ٭

تہذیب جدید میں چھوٹے بڑے کا امتیاز بہت کم ہے۔ طالب علم اُستاد پہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں اور رعایا میں حاکم کے خلاف جو جی میں آئے زبان سے کہہ اُٹھتے ہیں ٭

یہہ تہذیبِ قدیم کا اثر تھا کہ پہلے لفظ سیڈیشن سے ہماری زبان بیگانہ تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ نہ ایک دوسرے سے نفرت پر زور دیا گیا ٭ ہماری تعلیم و تربیت میں بڑوں کا ادب و لحاظ سب سے پہلے مقدم سمجھا جاتا تھا ٭ اس خیال کے جم جانے سے سلطنت کو بڑا اطمینان رہتا تھا اور رعایا کے آرام کا باعث تھا ٭ اس عقیدے میں ہندو مسلمان دونوں متفق تھے کہ بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد پھر کسی طرح کی چوں و چرا منافیٔ اطاعت ہے ٭ ایک چینی فلاسفر کا قول ہے کہ رعایا جب حاکم کی برابری کا دعوےٰ کرے تو انتظام مشکل ہے۔ مچھلیاں پانی سے باہر نہ نکالی جائیں۔ نہ رموزِ مملکت ہر کس و ناکس سے کہے جائیں ٭ چلنے میں جو شخص دونوں ٹانگیں معمول سے زیادہ پھیلائے یعنی اس سے زیادہ جتنی کہ پھیل سکتی ہیں تو چلنا مشکل ہے ٭

ع رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ نہ کہ ہر کس و ناکس ٭

تہذیب قدیم ہندوستان کے لئے بڑے کام آئی کہ ہزاروں برس اس نے کام نکال دیا۔ نئی ابھی سے دانت نکالنے لگی کہ بقول شیخ سعدیؒ ؎ کہن خرقۂ خویش پیراستن ٭ بہ از جامۂ عاریت خواستن

ہندی مثل ہے کہ نیا نو دن اور پرانا سو دن۔ کہتے ہیں کہ بوڑھے باپ اور پرانے کپڑے سے شرمانا نہیں چاہئے ٭ ہماری پرانی وضع سے پشتیں آرام سے گزر گئیں۔ نئی وضع ابھی سے اُلجھن کا سبب ہو رہی ہے۔ اور ابتک بن نہیں

مورّخانہ عید

رسالہ انکشاف کا عید نمبر بغرض ریویو میرے پاس پہونچا۔ انصاف سے پوچھیے تو اس میں شک نہیں کہ اس نمبر نے عید کا حق ادا کر دیا: ہر طرح کی عیدوں پر اچھے اچھے مضمون ہیں: خاص کر "آٹھویں صدی ہجری کی عید" بہت پاکیزہ ہے جو جناب مشیر احمد صاحب علوی نے لکھی۔ اسے میں **مورّخانہ عید** کے عنوان سے صلائے عام میں نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ شاہانِ اسلام کی عید کا اچھا نمونہ اور مورّخانہ یادگار ہے۔ گو اس کا ذکر باسی کیا باسی تو اسی عید سے بھی زیادہ بیکار ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کی عید

از قلم جناب کے۔ ایم مشیر احمد صاحب علوی بی اے (علیگ)

"سرِ شام ہی سے سانڈنی سوار بیس بیس کوس چلے جاتے اور دہلی کے گرد و نواح سے خبر لاتے قلعہ سے سلامی سر ہوتی اعلان ہوتا جس سے معلوم ہو جاتا کہ چاند ہو گیا۔ دربار شاہی میں مخصوص اُمراء وزرا کو مخصوص حیثیت سے شرف باریابی عطا کیا جاتا اور اسی مخصوص صحبت میں ملوک و خواص کو ارباب دولت و اہل عزت دکتاب حجاب نقبا و غلاموں اور اہل الاخبار کو سلطان محمد تغلق خلعت ہفت پارچہ عطا کرتا۔ علی الصباح ہاتھی سجائے جاتے۔ جن پر زردوزی کی جھولیں پڑی ہوئی ہوتیں۔ سولہ ہاتھی شاہی سواری کے لئے مخصوص ہوتے جن پر کوئی

دوسرا بیٹھ نہ سکتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو شاہی نشست کا شرف حاصل ہوتا اس ہاتھی کے مستک پر "ستارہ" لگا دیا جاتا۔ اس ہاتھی کے آگے آگے غلاموں کی صفیں ہوتیں جن کے سروں پر سونے کی کلغیاں ہوتیں۔ غلاموں کی صف کے آگے تیس نقیب ہوتے جن کے سروں پر طلائی کلغیاں و کلاہ کمر میں پٹکا اور ہاتھوں میں طلائی دستے کا مقرعہ (کوڑا) ہوتا۔ اُمرا، ہاتھیوں گھوڑوں پر سوار اور سپاہ جلو میں پا پیادہ ہوتی۔ ماہی مراتب ساتھ ہوتا۔ سلطان محمد تغلق عادل شاہ جس وقت شاہی جامع مسجد کے صدر دروازہ پر پہونچتا تو نقبا اور اُمرائے کبار کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دیتا۔ سب سے آخر میں خود سلطان اُترتا۔ امام نماز پڑھاتا خطبہ دیتا۔ اور سلطان اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اوسی ہاتھی پر بیٹھکر قصر شاہی میں واپس جاتا۔ قصر میں فرش بچھایا جاتا۔ بڑی آرایش و زیبائش ہوتی مخصوص طور سے عیدین کے ایام کے لئے ایک بارگاہ عالیشان تعمیر کی جاتی۔ جس کے ہر جانب خیمے تنے ہوتے جن میں حریر کے درخت بناکر زیبائش کے لئے لگائے جاتے۔ مصنوعی درختوں کی تین قطاریں ہوتیں۔ اور دو درختوں کے درمیان میں ایک طلائی سندلی ہوتی۔ اس پر گدا بچھایا جاتا۔ صدر میں سریر اعظم قائم کیا جاتا۔ جو خالص سونے کا تھا۔ اُس کا طول ۲۳ بالشت اور اس کا عرض ۲۲ بالشت تھا اس کے اجزا اس قسم کی کمانی سے بنے ہوئے تھے۔ کہ جب چاہتے تو اس کو قائم کرتے اور جب چاہتے تو اُس کو غائب کر دیتے۔ سب سے آخر میں سقف شاہی مرتب کی جاتی اور سلطان ظل اللہ کے فرق مبارک پر ایک بیش قیمت چتر شاہی ضیا افگنی کرتا۔ سلطان محمد تغلق جسوقت تخت شاہی پر قدم رکھتا تو نقبا بسم اللہ کہتے اور نقبا خطبا۔ علما۔ شرفا۔ مشائخ باری باری سے سلام کرتے اور نذر گزرانتے۔ پھر سلطان کے اعزہ خاص۔ خویش اقارب۔ اُمرا۔ وزرا غرض کہ ہر شخص اپنی اپنی باری سے نذر پیش کرتا۔ ایک طلائی طشت تخت شاہی کے قریب رکھا رہتا۔ ہر شخص جو نذر (بالعموم تھیلیوں میں ہوتی تھی) پیش کرتا تھا وہ اسی طلائی طشت میں ڈال دیتا تھا

جب سب لوگ نذر پیش کر چکتے تو عام دعوت ظل اللہ کی جانب سے ہوتی۔ طعام عام میں ظل اللہ ساتھ کھانا نہ کھاتا۔ خاصہ میں سلطان بھی شریک ہوتا۔ سلطان جس عزیز یا امیر کی عزت افزائی کرنا چاہتا تو وہ خاصہ پر مدعو کیا جاتا۔ اور سلطان خود ایک قاب پر روٹی رکھ کر اپنے مبارک ہاتھوں سے اسکو دیتا۔ وہ اس عطیہ شاہی کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر داہیں ہاتھ کو زمین سے لگا کر فرشی سلام کرتا۔ کھانے کے بعد ریشمی تاگے سے بندھی ہوئی گلوریاں پان کی اور چھالیاں تقسیم کی جاتیں۔ دعوت کے بعد مجمرۂ عظمیٰ (جس کی شکل برج کی سی ہوتی خالص طلائی ہوتا) باہر نکال کر رکھا جاتا۔ اس میں عود، اگر، عنبر وغیرہ بخورات جلائے جاتے جس سے تمام بارگاہ تیز خوشبو سے معطر ہو جاتی۔ نوابرسوں ہاتھوں میں طلائی و نقرئی ظروف و گلاب پاش میں گلاب و دیگر عرقیات لئے ہوئے اور حاضرین پر موقع موقع سے چھڑکتے رہتے۔ جب مروجہ مراسم عیدین کے ادا ہو جاتے تو دربار عام شروع ہوتا۔ سب سے پہلے اہل طرب آتے۔ اس کے بعد سلطان خوش وضع کنیزیں جو اس سال مال غنیمت میں آتیں امرا کو عید کی خوشی میں بخشتی۔ اس کے بعد مفتوح اقوام کی ذی مرتبت لڑکیاں آکر مدح سلطانی گاتیں۔ سلطان اُن کو امرائے کبار اور اعزہ خاص و اخوان کرام، اقارب عظام کو خاص شرائط کے ساتھ عطا کرتا۔ عصر کے بعد سلطان اپنے اعزہ سے بیاہ کرتا۔ غلاموں کو آزاد کرتا کنیزوں کو رہا کرتا۔ غلاموں اور کنیزوں کا نکاح کرتا۔ صدقات دیتا۔ اور سات دن کے بعد نہایت درجہ عیش و کامرانی کے بعد یہ سالانہ جلسۂ جشن ختم ہو جاتا۔ ان مراسم کے علاوہ مختلف النوع عیش نشاط کے جلسے ہوتے علما و فضلا و مشائخ کی صحبتیں گرم ہوتیں۔ شعرائے باکمال قصائد لکھتے اور دربار میں پڑھتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو جاتے۔ (سلطان محمد تغلق عادل شاہ)

(از رسالہ الکشاف)

بازگو از

بازگو از غالبِ معجز بیاں

تا بوجد آری روانِ عرشیاں

حضرت جنید بغدادی سید الطائفہ متصوفہ فرماتے ہیں۔ "صوفی آنست کہ صوفی نباشد اگر صوفی باشد صوفی نباشد"۔ یہ سوال کہ تصوف کیا ہے صوفی کس کو کہتے ہیں بجائے خود ایک مطول بیان ہے اور وسیع فرصت چاہتا ہے ۔ سر جان مالکم صاحب بہادر تاریخ ایران میں صوفی اُس کو کہتے ہیں جو صوف پہنتا ہے۔ جس طرح تاریخ ہند مصنفہ میکموبن صاحب میں پٹھان پٹنہ سے نکلے ہیں : واہ کس قدر مختصر لفظوں میں اظہار جہہ دانی فرما دیا ۔ اس بلاغت کی کیا ستائش ہو سکتی ہے اور اس تحقیق کی کیا تعریف کہ پٹھان پٹنہ سے مشتق ہے ۔ سبحان اللہ گر ہمیں مکتب است و ایں ملّا ۔ کارِ طفلاں تمام خواہد شد ۔

خاں بہادر صاحب ! بُرا نہ مانیں۔ مانا کہ خطاب یافتہ سرکار برطانیہ اور وظیفہ خوار پنشن یاب دولتِ انگلشیہ ہیں مگر یہاں حقِ نمک ادا کرنا نہیں پڑتا۔ تحقیق حق منظور ہے خواہ کڑوی لگے یا میٹھی : جناب کو حضرت غالب کے ولی ہونے میں کون کلام ہے ؟

طبقۂ متصوفہ میں ایک فرقہ اہلِ سلوک کا ہوتا ہے۔ دوسرا اہلِ جذب کا۔ جہاں حکومت شرعیہ ہوتی ہے اُس ملک کا قطب اور شہروں کا صاحب ولایت ۔ سالک متشرع پرہیزگار ہوتا ہے۔ جو ملک غیر اسلامی ہوتے ہیں ان کے محافظ خدمتی لظاہر رند اوباش ملامتی اور بہ باطن روشن ضمیر ہوتے ہیں۔ کوئی ملک اور کوئی حصہ بری اور بحری ایسا نہیں ہے جہاں اہل اللہ مصروف انتظام نہوں۔ ان کی خدمات ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی رہتی ہیں ۔

ہنگامۂ چیرہ دستی جاٹاں دہلی میں آدمی کو اپنی ٹوپی پگڑی کی خیر مانگنی پڑتی تھی اگر کوئی جاٹ مل گیا تو اُس نے بدن تک کے کپڑے اُتروا لیئے روز روشن میں گھر لٹ

رہے تھے کسی نے اس شہر آشوب کیفیت کو حضرت جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے عرض کیا: آپ نے فرمایا آجکل صاحب الخدمت ایسے ہی مزاج کے ہیں اُن کا اثر قلوب العباد پر پڑتا ہے۔ صاحبِ تذکرہ نے پوچھا صاحب الخدمت کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم ملنا چاہتے ہو؟ اُنہوں نے عرض کیا۔ اگر آپ رہنمائی فرمائیں تو اُن کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ جناب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شاہ بولا کے بڑ کے نیچے ایک صاحب خربزہ بیچ رہے ہیں آج کل وہ صاحب خدمت ہیں۔ مگر تم اُن سے کلام نہ کرنا۔ چنانچہ یہ صاحب گئے اور دیکھا ایک لنگوٹ بند کچیا ڈاڑھی کا بڈھا خربزے بیچ رہا ہے۔ کسی کو ٹکہ سیر کسی کو آنہ سیر۔ کوئی آنکھ بچا کر مُفت ہی لئے جاتا ہے کوئی پورے دام بھی نہیں دیتا۔ یہ صاحب دیر تک اُن کی بے پروائی اور بے انتظامی دیکھتے رہے اور سمجھ گئے کہ جو کچھ شہر میں لوٹ مار ہو رہی ہے حضرت ہی کا عکس طبیعت ہے۔ کچھ عرصہ بعد انگریزی انتظام ہوا شہر میں امن و امان ہو گیا۔ پھر وہ ہی صاحب حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کچھ کہنا چاہتے تھے جو جناب شاہ صاحب نے فرمایا وہ صاحب بدل گئے اب اُن کی جگہ نہایت منتظم جزورس صاحبِ خدمت مقرر ہوئے ہیں۔ اُنہوں کہا حضرت یہ صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں آپ نے فرمایا۔ یہ صاحب شام کو مسجد فتحپوری کے سامنے مشک لئے کھڑے رہتے ہیں کسی دن ان کی بھی زیارت کرنا: چنانچہ یہ صاحب پہونچے دیکھا کہ ایک صاحب گھاروے کا دوپٹہ باندھے کندھے پر مشک لئے راہ گیروں کو پانی پلا رہے ہیں اور پہلے پیسہ لے لیتے ہیں جب ایک کٹورہ پانی کا دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر تو یہ اُن کی طرزِ سقائی دیکھتے رہے پھر یہ سوچکر کہ ایسے بزرگ کے ہاتھ سے پانی پینا باعث صفائی قلب اور حصولِ صحت ہوگا۔ ان کی طرف بڑھکر پانی مانگا۔ وہ بولے پہلے پیسہ لاؤ۔ اتفاق سے ان کے پاس پیسہ نہ تھا عذر کیا کہ میرے پاس پیسہ نہیں ہے وہ بولے پیسہ نہیں ہے تو گھر جاکر پیو۔ مُفت پانی نہیں ملتا: یہ بھی کیا شاہ بولا والہ کنجڑا سمجھا ہے اُن کی اس چشم نمائی سے اِن صاحب پر ایسی ہیبت بیٹھی کہ چپ چاپ سیدھے گھر کو آئے۔ دوسرے

روز حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا آپ نے فرمایا وہ ایک بوند بھی پانی کی گرنے نہیں دیتے نہایت منتظم اور باخبر ہیں۔

دین کی طرح دنیا کا انتظام بھی اہلُ اللہ کے سپرد ہے۔ یہ لوگ بادبان کشتی سلطنت ہوئے ہیں۔ ظاہر حال سے بحث نہیں باطن میں یہ معاون سلطنت ہوتے ہیں۔ غُربا اور ستم رسیدہ مظلوموں کی مدد کرکے اُن کی آہِ فلک فرسا کو عرش تک نہیں پہونچنے دیتے اور وہ امور جو سلطنت کو تباہ اور برباد کرتے ہیں اپنی سعی رسا سے مٹاتے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ منجانب اللہ مویدِ حکومت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی دو خدمتیں ہوتی ہیں جو اصل میں ایک ہی ہیں۔ پہلی خدمت یہ ہے کہ جو جرائم خُفیہ مخلوق کرتی ہے اصلی مجرم کو وہ لوگ پولیس تک پہونچا دیتے ہیں

سید نہدی حسین صاحب انسپکٹر پولیس ہمیرپور نہایت سچّے بزرگ مسلمان تھے اور گورمنٹ سے اُن کو چالیس روپیہ ماہوار نیک چلنی کے بھی تاحیات ملتے رہے وہ مجھسے فرماتے تھے کہ ضلع ہمیرپور میں ڈکیتیاں اور سرقہ مویشی بہت کثرت سے ہوتا ہے مگر جب میں تعینات ہو تو اتفاق سے ایک صاحب خدمت سے ملاقات ہوگئی اُن کے ذریعہ سے تمام چوریاں برآمد ہوتی تھیں۔ ایک شخص نے اپنے گھر کی کوٹھری میں چوری کا بیل باندھ رکھا تھا اور وہ مجذوب اپنی بڑ میں کالا دھولا کرتے ہوئے ایک گانوں کے مکان کے نیچے بیٹھ گئے۔ میں نے مکان کی تلاشی لی تو اندر کوٹھری میں وہ ابلق بیل جس کے چوری جانے کی رپورٹ تھی بندھا ہوا پایا گیا۔ اور اُن صاحبِ جذب کی سید صاحب پر ایسی عنایت تھی کہ جس معاملہ کو اُن سے جاکر کہا وہ اپنی مجذوبانہ گفتگو میں کچھ نہ کچھ اس کا انکشاف فرما دیتے۔ ایک میرے عنایت فرما سید صاحب جواب ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ علیگڑہ کالج میں ہمیشہ ایسے کھیل کے شوقین رہے کہ اس وجہ سے برابر فیل ہوتے رہے۔ آخر ایک موقع آخری امتحان کا اُن کو اور دیا گیا کہ اگر اس مرتبہ پاس نہوں تو کالج سے نام خارج کر دیا جائے۔ سید صاحب کو پتہ لگا کہ الور میں فرید شاہ بابا کوئی مستجاب الدعوۃ مجذوب ہیں یہ اُن کی خدمت میں پہونچے۔ اُن کی عادت تھی پہلے رقم محنتانہ لے لیتے تھے۔ سید صاحب نے

اپنے پاس ہونے کے لئے دعا چاہی فریدشاہ صاحب نے فرمایا دس روپیہ لا دس روپیہ دلا انہوں دس روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر نذر کیا شاہ صاحب نے فرمایا جا بھاگ جا ہو گیا یہ سنکر خوش خرم گھر کو آئے وہاں سے کالج پہونچے۔ چونکہ کرکٹ کے شوقین تھے اور اعلےٰ درجہ کے بولر مانے جاتے تھے اُس سال بھی کھیل میں پڑھنا کچھ نہ ہوا۔ جب زمانہ امتحان کا قریب پہونچا تو ایک گیند ان کے سیدھے ہاتھ میں ایسی لگی کہ ہاتھ کلائی تک سوج گیا دوسرے روز ان کو امتحان میں شریک ہونا تھا پرنسپل صاحب کالج نے رجسٹرار کو تار دیا کہ ایک لڑکے کا ہاتھ چوٹ لگ جانے کی وجہ سے لکھنے سے معذور ہے۔ وہاں سے حکم آیا کہ اُسی لیاقت کا ایک لکھنے والا اُسے دے دیا جائے۔ یہاں جو رائٹر دیا گیا وہ قابل اور اوپر کے درجہ کا لڑکا تھا سید صاحب تو بیٹھے رہے اور رائٹر صاحب پرچہ امتحانات لکھتے رہے۔ نتیجہ کے نکلنے کے وقت یہ خبر تمام کالج میں حیرت سے سُنی گئی کہ بولر صاحب اوّل نمبر سے پاس ہو گئے۔ سبحان اللہ! اگرچہ اس طرح کے واقعات ہر شخص کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اور خود آپ کو فرخ نگر میں ایسے بزرگوں سے واسطہ رہا ہوگا جو ظاہر خراب اور باطن درست رکھتے تھے۔ اس لئے میں اس مضمون کو مطول کرنا نہیں چاہتا اور صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ جس طرح ظاہری حکومت کا انتظام ہو رہا ہے اسی طرح باطنی حکومت کا بھی انتظام ہے۔ اگر باطنی انتظام ساقط ہو جائے تو ظاہری انتظام والوں سے کوئی مقدمہ بھی برآمد نہ ہو ایسے ایسے خفیہ جرائم ہوتے ہیں جن کی کسی طرح کسی آدمی کو خبر نہیں لگ سکتی۔ مگر ان صاحب خدمات کے اشاروں سے پولیس کو پتہ لگ جاتا ہے۔ اور عدالت میں سزا پاتے ہیں۔ ہمارے زمانہ کے صاحب خدمات پولیس اسٹیشنوں کے پاس کسی درخت کے نیچے تحصیل کے دروازہ پر زیادہ بود و باش رکھتے ہیں اور اکثر لوگ ان کے اندرونی قوّت سے واقف ہوتے ہیں۔ خلاصہ سخن یہ کہ مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلی کے صاحبِ خدمت تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ میں کہ تمام دہلی اور اہلِ دہلی اُلٹ پلٹ ہو گئے اور ادنےٰ سے اعلےٰ تک شہر چھوڑ چھوڑ کر جان بچانے کو با

بھاگ گئے

بھاگ گئے۔ اس پُر آشوب طوفان میں بھی مرزا غالب ذرا نہ ڈگمگائے اور نہایت سکون اور اطمینان سے گھر میں بیٹھے ہوئے دستنبو لکھتے رہے۔ دوستوں کو اطلاع دیتے رہے اور اس لسان الغیبی کی داد دیتے رہے سے

گر یوں ہی رو تا رہا غالب تو اے اہل جہاں ✦ دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں۔

وہ بستیاں کون سی تھیں؟ خاص دہلی دہلی کے محلے خاص بازار۔ اردو بازار۔ فیض بازار۔ خانم کا بازار۔ دریبہ کا دروازہ۔ کشمیری کٹرہ۔ آغا باقر کا امام باڑہ۔ بلاقی بیگم کا کوچہ۔ راج گھاٹ دروازہ دھوبی دروازہ۔ راجی گنج۔ پنجابی کٹرہ۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ صاحبرام کا باغ۔ خان چند کا کوچہ۔ دار البقا کہ بجائے خود قصبہ ہے۔ قلعہ جھجھر۔ بہادر گڈہ۔ بلب گڈہ۔ فرخ نگر یہی دہلی کے محلے تھے اور ان بستیوں کے ویران ہونے کی فہرست تیار کرنی ہو تو کل ہندوستان کے شہر شمار کر لیجئے شاید ہی پانچ چھ شہر تباہی اور ویرانی سے بچے ہوں گے اور اب جو ہو رہے ہیں اور آئندہ ہوں ان کا ذکر کیا۔ مرزا غالب انگریزی سلطنت کے طرف دار تھے۔ شاہی سلطنت اول تو تھی کیا برائے نام بادشاہ شطرنج کا بادشاہ تھا۔ مگر وہ جو کچھ تھا یہ اس کے متعلق پہلے ہی طے فرما کر حکم ناسخ لگا چکے تھے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر ✦ کیوں نہ دلی میں ہر ایک ناچیز نوابی کرے

جو خزاد ایشہیدان نفس وز دیدہ ہو ✦ نوحہ ماتم بہ آوازِ پرِ عنقا کرے

یک در بر روے رحمت بستہ در شش جہت ✦ ناامیدی ہے خیال خانہ ویراں کیا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی اسد ✦ ہوں سراپا یک قلم تسلیم جو مولا کرے

زبس طوفان آب گل ہے غالب کیا تعجب ہے ✦ کہ ہر یک گردباد گلستاں گرداب ہو جائے

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی ✦ مری محفل میں غالب گردش افلاک باقی ہے

یہ غزل تو سرود غیبی تھی جو غدر سے پہلے دلی کے کوچوں میں لڑکے تک گاتے پھرتے تھے۔

قتلِ عشاق نہ غفلت کش تدبیر آئے ✦ یا رب آئینہ بہ طاقِ خم شمشیر آئے

بالِ طاؤس ہے رعنائی ضعفِ پرواز ٭ کون ہے داغ کہ شعلہ کا عناں گیر آئے
عرضِ حیرانیٔ بیمارِ محبت معلوم ٭ عیسیٰ آخر بہ کفِ آئینہ تصویر آئے
ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع ٭ پائے خوابیدہ بہ دلجوئیٔ شبگیر آئے
اُس بیاباں میں گرفتارِ جنوں ہوں کہ جہاں ٭ موجۂ ریگ سے دل پائے بہ زنجیر آئے
وہ گرفتارِ خرابی ہوں کہ فوارہ نمط ٭ سیلِ صیادِ کمیں خانہ تعمیر آئے
سرِ معنی بہ گریباں شقِ خامہ اسدؔ ٭ چاکِ دل شانہ کشِ طرۂ تحریر آئے

(حکیم احمد علی خاں صاحب آقا دہلوی)

ع بازگو از غالبؔ معجز بیاں

میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو رحمتہ اللہ علیہ سے یاد کرنا اور صوفی صاف طینت یا ولی صاحبِ معرفت سمجھنا منافیٔ عقیدہ اسلام نہیں ہے اور نہ اُس عنقائے عالمِ وحدت کو ہمارے سب و شتم سے عالمِ ارواح میں کچھ الزام اگر کوئی صاحب اُس عاشقِ ذات کو رند خرابات سمجھیں قابلِ عذاب تو خیر اگر وہ مغفور اور رحمتِ الٰہی سے مسرور ہیں تو اس سمجھنے سے اُن کو کچھ نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن ہم درخورِ جواب ہو سکتے ہیں اور یہ اخلاقی جرم اگر نظرِ غائر سے دیکھیں تو ہیں ہم کو موردِ سزا بناتا ہے۔ مانا کہ اہلِ سیر نے اُن کو طبقۂ شعرا میں شمار کیا ہے۔ مگر وہ صرف شاعر ہی نہ تھے۔ اُن کی شاعری وہ شاعری ہے جو اہل اللہ کو بارگاہِ مرتضوی سے عطا ہوتی ہے۔ جس کو کرامت کہتے ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ٭ زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں ٭ خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ٭ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وراے شاعری چیزے دگر کیا ہے؟ اس کو صوفیہ کرام ہی جانتے ہیں عوام کالانعام اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری تمام اوصاف انسانی کو چھپا لیتی ہے۔ بڑے بڑے محدث اور علما جو محدثین اور فقہا میں شمار کرنے چاہئیں۔ لیکن اس شاعری کے بدولت صرف تذکرۂ شعرا میں رونق تذاکرہ ہیں اسی طرح حکما۔ حکیم اوحدالدین۔ حکیم ابوالقاسم۔ حکیم ابونصر۔ انوری۔ فردوسی۔ ناصرخسرو کے نام سے پکارے جاتے ہیں مگر ہمارا ان کو شاعر سمجھنا ان کی توہین اور ہماری جہالت ہے۔ اسلام شریف سے پہلے بہت سے انبیا علیہم السلام جہلا کی زبانوں پر مورد لعن وطعن تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسے علیہ السلام کو بھی یوسف نجار کا بیٹا کہتے تھے۔ چونکہ اسلام کا فتہ الناس کو پاک انفاس لایق مدح وسپاس بناتا ہے قرآن پاک نے ان پاک بزرگوں کی عزت وعظمت کی گواہی دی اور سفہا کی غلط بیانی کی تردید فرماکر تمام عالم پر ان کے تقدس کو ظاہر فرما دیا۔ ورنہ نزول قرآن پاک سے پہلے کسی کتاب میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جس طرح نور اسلام نے زندوں کے دل منور فرمائے اسی طرح نام گزشتگان کو اُن کا ذکر خیر فرماکر روشن کر دیا۔ قرآن ہی نے سب سے پہلے اعلائے کلمہ حق فرمایا کہ ایدنا ہ بروح القدس جو آج عیسائی بھی حضرت عیسے کو روح القدس سمجھتے ہیں ورنہ اس سے پہلے یہود کے اتہام اور الزام کا اُن کے پاس کچھ جواب نہ تھا +

دوستو! بزرگوں کے نام کی عظمت کرنا۔ بزرگی حاصل کرنا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام نیک دنیا میں قایم رہے تو تم بزرگوں کے نام نیک اور ذکر خیر کو قایم رکھو جن مصنفین نے نام نیک بزرگاں مٹاکر اپنے اجتہاد کا جھنڈا نصب کیا تھا آج اُن کا نام گوشۂ خمول وبدنامی میں اپنے کئے کا صلہ پا رہا ہے واللہ در من قال نام نیک رفتگاں ضائع مکن ؛ تا بماند نام نیکت یادگار۔ یہ تو اسلامی تہذیب ہے کہ ہم ہر نبی پر علیہ السلام اور ہر ولی کے نام پر رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں لیکن موجودہ آلۂ سماع یہ سننا ہی نہیں چاہتا۔ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک پارسی۔ گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کر اُسے سنا کہ یوں ؛ ابوالفیض فیضی ؎ نوشدار وی محبت رامپرس اجزا کہ چیست ؛ سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

گفتۂ غالب ؎ نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا ؛ کہ جس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے +

(حکیم محمد علی خاں صاحب آقؔ دہلوی)

شعرائے عجم کا مشاعرہ

(آج سے سوا سو برس قبل)

ناظرین! میں آپ کو نہایت دلکش سبزہ زار میں لیئے چلتا ہوں جہاں لب جو یہ دلچسپ صحبت مشاعرہ منعقد ہے۔ اس صحبت کے میر مشاعرہ **صائب** ہیں۔ ان کے بعد **شوکت** بیٹھے ہیں اور پھر **ناصر علی**۔ ان کے پہلو بہ پہلو **طالب آملی**۔ اُس کے بعد بکری۔ بکری کے بعد **قاسم دیوانہ** پھر **فطرت** اُن کے بعد **بینش** اور **صامت** اور سب کے آخر میں **صفی** ہیں۔ مشاعرہ مقررہ طرح میں ہے۔ سامعین میں علاوہ آپ حضرات کے بڑے بڑے ادبائے عجم جمع ہیں اور دیگر صاحب ذوق حضرات بھی۔ چونکہ اس بزم ادب میں **صائب** میر مشاعرہ ہیں اس وجہ سے پہلے ان کی طرف دست قدرت کنول بڑھاتا ہے اور مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔

خسرو کشور معنی صائب

بکن بے بہرہ یا رب از قبول اہل ہنر مرا
بزیر چشم خوباں آب دہ تیغ زبانم را

شعرائے لیکر سامعین تک پر ایک عالم وجد طاری ہو گیا۔ ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوئی مطلع کے مزے نے آنکھوں میں سرور اور دلوں میں ایک خاص قسم کا کیف پیدا کر دیا کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ صفائی۔ بندش چستی۔ مضمون آفرینی۔ اسی طرح دوسرے مصرع کا رنگ تغزل حد تعریف سے باہر ہے۔ ایک تو زہر اور پھر وہ بھی زہر لب چشم معشوق سے تیغ زبان کے لئے آرزوئے آب ہے۔ جس نے شعر کو علاوہ رنگین کرنے کے باعتبار تخئیل کے بھی بلند کر دیا ہے۔ ان کی غزل ختم ہونے کے بعد جس کے اشعار آئندہ پیش ہوں گے شوکت کی باری آئی کنول گھوما

مشاطۂ شاہد معانی شوکت

کچھ اس انداز سے مطلع پڑھا گیا کہ تمام مشاعرہ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا ؎

خدایا رنگ تاثیر کرامت کن فغانم را
بموج اشک بلبل آب دہ تیغ زبانم را

ے سبحان اللہ۔ یہ مطلع بھی صائب سے کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ سخن فہموں میں سرگوشیاں ہونے لگیں بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ مصرع صائب سے زائد رنگین لگایا ہے صائب کے مصرع میں نہایت سادگی کے ساتھ درگاہِ صمدیت میں مقبولیتِ بیان کی التجا ہے اور شوکت نے اپنے اظہار تمنا میں زائد ترقی کی ہے۔ چنانچہ جہاں صائب بیان سے کام لینا چاہتا ہے وہاں شوکت فغاں سے اثر ڈالنا چاہتا ہے اور فغاں بھی کیسی جو تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہو۔ لیکن دوسرا مصرع شوکت کا اس منزلت کا نہیں ہے۔ جیسی دلچسپ بنوٹ صائب کے مصرع میں ہے۔ اس لئے کہ صائب تیغ زبان کو آب دینے کے واسطے زہر اور زہر چشم خوباں چاہتا ہے اور شوکت صرف موجِ اشکِ بلبل۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ لیکن پھر آبِ تیغ زبان ممکن تھی۔ لیکن نہیں موجِ اشکِ بلبل سے جو شاعرانہ نزاکت پیدا کر دی اس کی تعریف نہیں ہو سکتی شوکت کے بعد ناصر علی کی طرف کنول بڑھا اور سامعین ہمہ تن گوش ہوئے۔

الٰہی شوخیِ حرفِ تجلی کن زبانم را
قبولِ خاطرِ موسیٰ نگاہاں کن بیانم را

مطلع میں جس قدر زورِ شاعری ہے وہ ظاہر ہے۔ اگرچہ مصرع ثانی ع قبولِ خاطرِ موسیٰ نگاہاں کن بیانم را۔ کچھ گہرا نہ تھا نہ کوئی غیر معمولی بات اس میں تھی۔ مگر مصرع لگا کر مصرع کو چرخِ چہارم پر پہونچا دیا۔ ع الٰہی شوخیِ حرفِ تجلی کن زبانم را۔ مصرع لگانے کی ہر شخص نے خوب داد دی واقعہ یہ ہے کہ حرفِ تجلی سے بھی وہ مطلب پورا ہو سکتا تھا۔ مگر شاعری اور کہنہ مشقی اس کا نام ہے۔ ایک لفظ شوخی سے کس بلا کی شوخی پیدا کر دی۔ میری رائے میں اس مطلع کی منزل شعرا اور سامعین نے اول الذکر مطلعوں سے بہت دور رکھی۔ خیال بہت پرانا تھا۔ لیکن ایک قادر الکلام شاعر نے ایک لفظ شوخی کے ساتھ اس کو نگاہوں پر چڑھنے کے قابل کر دیا۔ انہوں نے بھی غزل تمام کی۔ اور اب طالب آملی کا نمبر آیا۔ کنول بڑھا اور شمعِ نور کی لَو نے کچھ اور سر بلند کیا۔

سحر پردازِ طالب آملی

گداز نالہ روشن ساخت شمعِ تخوانم را
بروا نگند شبِ جون سجنیہ رازِ نہانم را

اس مطلع نے تمام مجمع میں ہل چل ڈال دی شعرا نے تڑپ تڑپ کے زانو بدلے۔ سامعین

کی زبانوں سے بیساختہ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے اور صائب کی ایسی جلیل القدر ہستی نے پہلے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا لیا پھر بھی ضبط نہ ہو سکا ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ دماغی قوتوں کو مجتمع کیا پھر دل کی بڑھتی ہوئی حرکت پر ایک معنی خیز نگاہ کی اور طالب آملی کو مخاطب کیا۔ واقعی جس زور بل میں آپ نے مطلع کہا ہے وہ تعریف کی حد سے باہر ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ کیا کہنا ہے اس مطلع کا جو لفظ ہے رنگ و تاثیر کی جان ہے۔ آمد ہے۔ زور ہے کہ تو بہ ایک رنگ میں مطلع ڈھل گیا ہے۔ قیامت کا تغزل ہے۔ کیا تیور ہیں۔

گداز نالہ نے میری شمع استخواں روشن کر

دی اور شیون نے بخیۂ راز نہاں اُدھیڑ دیا گویا دم بھر میں زندگی کا رازِ نہاں بھی بے نقاب تھا کو نظامِ ہستی بھی خاکِ سیاہ ہزار عنوانوں سے مطلب شعر ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن جو لطف نگاہ اس کے جانے میں ہے وہ دوسرے لباس میں کہاں۔ پانچویں نمبر پر کلیم کی باری آئی۔

خدایا مطلعِ انوارِ رحمت ساز جانم را

کلیدِ مخزنِ دل گرداں زبانم را

اوسط درجہ کا مطلع تھا چونکہ کوئی خاص بات نہ تھی مگر پھر بھی جیسی نظم و صفائی موجود ہے اور مرزا تو اس زبان کے لئے خدا نے خلق ہی کیا ہے معمولی تعریف کے بعد لوگ خاموش ہو کر بقیہ اشعارِ غزل سننے لگے۔

(مصرع ثانی میں کوئی لفظ اصل کتاب میں رہ گیا ہے چونکہ اپنی طرف سے تصرف کرنا منظور نہیں میں نے بجنسہ شعر اُسی حالت میں نقل کر دیا ہے۔ مصنف)

چھٹے نمبر پر قاسم دیوانہ تھے۔ کنول کے بڑھتے ہی لوگ بھی بہت شوق سے متوجہ ہو گئے۔

مستِ مے خمخانۂ عرفاں قاسم

چنیں کز شعلۂ حسنِ تو عشق افروخت جانم را

ہما شمع مزار خویش سازد استخوانم را

کس قدر رنگین مطلع ہے۔ اگرچہ مئوث ہے مگر نہایت حسین و خوبصورت مئوث۔ تخیل میں بلندی اور شوخی کے ساتھ ندرت اور اچھوتا پن ہے۔ شعلۂ حسن کی ترکیب کس قدر خوبصورت اور دل کش ہے۔ ہر شخص لطف اندوز ہوا۔ ہر ایک نے کافی داد دی۔ طالب و صائب نے بھی تعریف کی۔ قاسم نے نہایت معنی خیز و تفاخر آمیز نظروں سے مجمع کو اس سرے سے اُس سرے تک دیکھا اور ایک خاص اندازِ تبسم کے ساتھ باقی اشعار پڑھنا شروع کئے

محترم ناظرین! آپ نے بھی ملاحظہ کیا کہ قاسم دیوانؔ نے کس قدر مطلع میں مزا بھرا ہے۔ اہاہا سبحان اللہ۔ یعنی کچھ اس طرح شعلہ حسن سے عشق نے میری جان کو روشن کر لیا ہے کہ مانے اپنی شمع مزار میری استخوان بنالی ہیں۔ استخوان سوزاں کی تشبیہ شمع سے اور پھر شمع بھی شمع مزارِ سہاسونے میں سہاگا ہے۔ نہایت کامیابی کے ساتھ اشعار تمام ہوئے اور قاسم دیوانؔ کو ان کی مشکل پسند طبیعت کی کامیابی پر کافی سے زائد داد ملی۔

اُن کے بعد فطرتؔ کی باری آئی۔ کنول بڑھا اور غزل شروع ہوئی

جوشِ دریائے نکتہ سنجی فطرتؔ

مکن گویا بعرضِ مدعا یارب زبانم را
زخاموشی بزن شیرازۂ اوراقِ نغمم را

مطلع مشاعرہ میں پسند کیا گیا۔ مصرع ثانی کی جدت تخئیل کی کافی داد دی گئی۔ لیکن مصرع اولیٰ عام طور سے خصوصاً رنگین مزاج نوجوانوں کے بہت پسند نہیں آیا۔ تخئیل بلند ہے خودداری وضبط کے پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن مصرع اول میں شوخی جو نہیں ہے تو مطلع میں کچھ زور نہیں پیدا ہوا اس کے بعد بینشؔ کی طرف کنول بڑھایا گیا انہوں نے بھی ایک مطلع اور چند اشعار پر غزل تمام کی

رہنمائے خلوت ارباب دانش بینشؔ

ازیں گلشن بگردی سجدے بردہ نشانم را
کہ ہدہدمی نہد چوں تاج برسر آشیانم را

ان کو بھی مطلع کی خوبصورت بندش اور نزاکت تخئیل کی خوب خوب داد ملی۔ مصرع خوب نکھر گیا ہے روانی و بندش بھی خوب ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اصل شعر میں کچھ نہ تھا مفہوم کے اعتبار سے چونکہ کچھ وزن نہ تھا اس لئے سخن فہم و صاحب علم شعرا اور رنگ تصوف وجذبات صحیحہ سے لطف اندوز ہونے والے سامعین پہ کچھ زائد اثر نہ کیا۔ اُن کے بعد کنول صامتؔ کی طرف بڑھایا گیا۔

گویاست در اظہار حقیقت صامتؔ

انہوں نے پہلے تو نہایت بانکے تیوروں سے مجمع پر ایک تجسس آمیز نظر ڈالی۔ ایک خاص انداز سے مطلع پڑھا۔

زمیں ہر مکیدگر پیچیدہ زلفش داستانم را
دلش خوں میشود تا شانہ می فہمد زبانم را

مطلع نے تمام سامعین میں تلاطم برپا کر دیا تعریف کا ہر طرف سے ایک ہنگامہ تھا۔ قیامت کا رنگ غضب کا اثر۔ بلا کی رنگینی تھی۔ تاثیر خود بڑھ بڑھ کے

لائیں ہے رہی تھی تو بے سبب کچھ ہوا مگر لبقیہ شعراء میں کوئی خاص پسندیدگی کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ معمولی تعریف کے بعد شعرا خاموش ہو گئے۔ یہ تو ہماری نظر نہ تاڑ سکی کہ کس کس زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے مگر دور شعرا سے کسی کو اتنا کہتے ہوئے دبی زبان سے ہمنے ضرور سنا کہ "وش فون میتھو دا" پھر اس کے بعد تاشادمی فہمد زبانم را۔ اس میں تو ضعف تالیف کھلا ہوا ہے۔ بہرحال شعرا کے رمز کو شعرا جانیں ہم نے عمائب و طالب وغیرہ سے اُن کے مطلع کا رنگ کچھ کم نہیں دیکھا۔ مطلع اس قدر رنگ اور مزے میں ڈوبا ہوا تھا کہ ہر شخص بیخود نظر آتا تھا اس کے بعد مشاعرہ میں دیر ہو جانے کی وجہ سے ایک خاص صورت انتشار پیدا ہو گئی تھی اور لوگ بعض بعض شعرا کے کلام سے اثر پذیر بھی بہت کچھ ہو چکے تھے۔ لہذا جب آخر میں صفی کی باری آئی لوگ اخلاقاً بیٹھے تو رہے لیکن کچھ بد دل سے کنڈل بڑھا اور مطلع فوراً پڑھا گیا۔

نوبہار گلشن رنگین خیالی ہا صفی

آنچہ غنچہ ذکرِ خفی کردہ اس دہانم را
مکن گویا بعرضہ جز ثنائے خود زبانم را

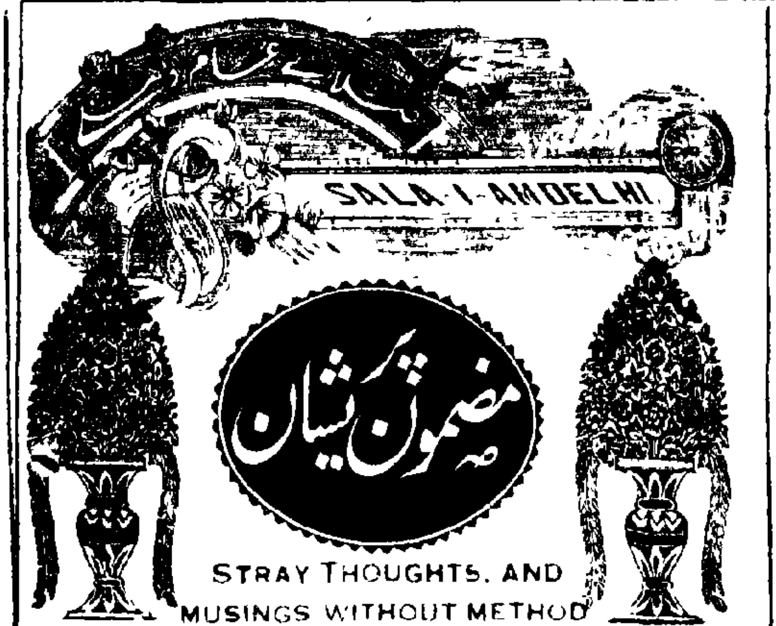
مطلع عرفان و حقیقت کی جان تھا جس سے مسلک تصوف پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ ذکر خفی کی صوفیانہ اصطلاح میں کبھی خاص حسن و لطف پیدا کئے اور پھر کبھی غنچہ کی ترکیب نے اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ مگر چونکہ شعر نہایت بلیغ اور مفہوم وزنی تھا اس وجہ سے عام طور سے لوگوں کے پسند کیونکر آسکتا تھا تعریف ہوئی مگر رسمی لیکن عمائب و طالب و قاسم نے صفی کو کافی داد دی اور دوبار مطلع پڑھوایا گیا۔ خصوصاً ذکرِ خفی کے مراعات پر بہت مدح و ثنا کی گئی اس کے بعد یہ پہلا دور خوانندگی ختم ہوا ہم بھی سامعین کے ساتھ واپس ہوئے۔

(آشفتہ)

(از رسالہ مبصر۔ لکھنؤ)

بادشاہ پسند چٹنی

مارہرہ ضلع ایٹہ کی مشہور چٹنی درحقیقت فوائد سے بھرپور کاالیک متبرک تحفہ ہے جسکو مختلف ناموں سے دوسرے تاجر بھی فروخت کرتے ہیں مگر صرف بادشاہ پسند چٹنی ہی وہ چٹنی ہے جو دو سو برس سے اپنے مرکز اصلی پر قائم ہے۔ ذائقہ۔ پائیداری۔ نفع بغیر چکھے نہیں معلوم ہو سکتا۔ قیمت قسم اول فی (عہ) قسم دوم فی سیر (۱۲) المشتہر سید بادشاہ حسین مالک کارخانہ بادشاہ پسند چٹنی۔ مارہرہ ضلع ایٹہ۔ بہترین کانغ۔ (یو پی)



حضرت بیخود بدایونی کا شعر ہے ؎

بیخود کہیں میرا دلِ وحشی تو نہیں ہے؟ ✦ کیا چیز گری زُلفِ پریشاں سے نکل کر؟

جناب تاسف فرماتے ہیں ؎

زُلفِ سنبل اور ہے گیسوئے جاناں اور ہے ✦ زُلفِ پیچاں اور ہے زُلفِ پریشاں اور ہے

اِس مضمون کے لئے زُلفِ پیچاں سے زُلفِ پریشاں زیادہ موزوں ہے کہ ایک وضع کے مسلسل خیال اگر حسینوں کے جُوڑے میں گندھی ہوئی چوٹی سے مشابہ ہیں تو شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کا جواب "مضمون پریشاں" ہے۔ جس کی تصویر غالب سے اچھی کوئی کھینچ نہیں سکتا ؎

ڈھونڈھے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ✦ زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

صلائے عام لبِ بام کے برابر ہے اور اس مضمون کے پریشان خیال حسینوں کے بکھرے ہوئے بالوں سے مشابہ سمجھئے ؎

ہوا سے اڑگئیں زلفیں جواں کے روئے روشن پہ * ہواستوں میں غل کالی گھٹا چھائی ہے گلشن پہ

یہہ محض شاعرانہ آغاز ہے۔ آگے چل کر وہی معمولی گزارش ہے *

بہشت کے عقیدہ کا کیا کہنا! خدا سب کو نصیب کرے: اگر یہاں نصیب ہو تو کیا بات ہے! مرنے کے بعد بھی اگر چاہنے والوں کی دعا قبول ہوئی جو کہتے ہیں کہ "مرنے والے کو خدا بہشت نصیب کرے" تو بھی بہشت میں یہاں کا سا لطف مشکل ہے۔ یہاں کی خوبیوں کا ذکر درکنار یہاں کے گلے شکوے بھی بلا کے دل کش ہیں۔ بقول حضرت اسماعیل منیر فرخ آبادی ؎

دیکھا تو خلد میں غمِ عشقِ بتاں نہ تھا * جو کھا کے ہم پلے تھے وہ کھانا یہاں نہ تھا

گو یہہ مضمون بے مثل ہے مگر اس مضمون کا بھی جواب نہیں ہے کہ ؎

کیا ہوتی زخمِ دل کو تسلی کہ چارہ گر * الماس کیا نمک بھی تو مرہم میں حل نہ تھا

جس جگہہ کی مصیبتیں بھی دوسری جگہہ کے عیش سے بہتر ہوں۔ آپ ہی فرمائیں کس کی قدر زیادہ چاہئے؟ متروک الفاظ کی طرح جن کا شعر میں باندھنا عیب سمجھا جائے انہیں سے شعر بھر دیا جائے تو شعر کی خوبی نہیں۔ جو باتیں ہم نے دنیا میں عیب سمجھ رکھی ہیں وہی مرنے کے بعد ناز کا باعث ہوں (آگے آپ سمجھ لیں) ؎

دستخط

دے اگر اللہ دل انساں کو رکھ دے اسمیں درد + عشق کا سودا عطا کر دے جو سر پیدا کرے

اوّل تو مرنے کے بعد جو بہشت نصیب ہو گی اُس میں دیر اتنی لگ رہی ہے۔ دیر لگ چکی ہے اور خدا جانے کتنی دیر لگے گی جس کی میعاد تمام دنیا کے حساب دانوں کی سمجھ سے باہر ہے ؎

ضعف کا بعد فنا بھی ہے اثر ہے باقی + مرے مرنے کی جو برسوں میں خبر آتی ہے

(ہمارے مرنے کی خبر عاقبت کے کارکنوں کو میونسپل کمیٹی کے اندراج کی طرح جلد ہوا کرے تو شاید حشر کسی قریب تاریخ پر تجویز ہو سکے۔)

دوسرے جس طرح مرغانِ حرم اور اسیرانِ قفس میں آسمان و زمین کا فرق ہے اسی طرح ہم کہاں اور ہمارے بعد کے خواب و خیال کہاں کہ مرنے بھی نہیں پاتے اور قیامت کا سامنا رہتا ہے۔ مرغانِ آسماں پرواز میں اور پر و بال نُچے ہوئے مُرغ کی حرکت مذبوحی میں فرق ہے کہ ع صفیرِ بلبلِ بے بال پر نہیں جچتی ؎

خسخانہ کی راحت کو لحد والوں سے پوچھو + اُس گھر میں ہیں جس گھر میں ہوا بھی نہیں آتی

سمجھے تھے مسیحا اسے بیمارِ تپِ ہجر

واں فضلِ الٰہی سے دوا بھی نہیں آتی

جس طرح یار کا وعدۂ فردا کہ سرے سے فردا ہی ندارد ہے ؎

کرے کیوں نہ بے چین وعدہ کسی کا ٭ قیامت ہے امروز فردا کسی کا

یا جس طرح بعض دکان داروں نے جو قرض دیتے دیتے تھک گئے تختی پر لکھ کر لگا رکھا ہے کہ "آج نقد کل اُدھار" - یعنی جس دن آپ قرض مانگیں گے اس دن نہ ملیگا - اسی طرح فردائے قیامت کے وعدہ وعید ہیں ٭ وعدے اور ایفاء وعدے میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ اس زندگی میں یہاں وعدہ اور وعدا جائے کب آسمان پر ایفاء وعدہ ؎

ہم نے مانا کہ یہہ وعدہ نہیں جھوٹا لیکن ٭ اتنے پہلے اگر آجائے اجل کیا ہوگا؟

آج تو خاتمہ ہے کیوں مجھے دم دیتے ہو

ہوچکا حشر تو پھر وعدہ فردا کیسا؟

لیکن وعدوں وعید سے بڑا فائدہ یہہ ہے کہ انتظار کا لطف رہتا ہے - خاصکر جب کہ دنیا میں کوئی آرزو پوری نہ ہوئی - اور پھر پوری ہو یا نہ ہو انتظار کا مزہ آتا رہے: یہہ بھی لطف سے خالی نہیں ٭ میں نے دیکھا ہے کہ یار کے آنے کے انتظار میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے - انتظار میں ؎ آہٹ پہ کان در پہ نظر تھی کہ ناگہاں ٭ آئی صدا کہ پاؤں میں مہندی لگی یہاں

یاں خون ٹپک پڑا نگہ انتظار سے ٭

دُنیا میں بعض نعمتیں ایسی ہیں جو بغیر آرزو کئے آجاتی ہیں اور جب تک چلی نہ جائیں ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ آئی تھیں - جوانی کا حال بعینہ یہی ہے کہ جوانی میں ہمیں اس کی قدر نہیں

ہوتی: یہاں تک کہ بڑھاپا آجاتا ہے + اب بڑھاپے کی اگر قدر نہ کی جائے تو پھر اللہ ہی اللہ ہے ؛
زندگی میں بڑھاپے ہی کا سہارا ہے کہ یہہ بیکار نہ جانے پائے ؎

ہم تھے قریب مرگ کہ وہ مہرباں ہوا + پیری جوانی بخت ہمارا جواں ہوا

کہتے ہیں وہ نظر مری تجھ پر رہا تو کی
لایق اگر وفا کے نہ تھا تو جفا تو کی

یہہ تمثیل دنیا کے رنج و راحت کی ہے کہ راحت ہو یا نہ ہو زندگی مقدم ہے :

جس طرح بن پڑا زندگی کے دن کاٹ دیئے ؎

ایک منزل ہے عدم کی ایک دم کا راستہ + آگے جانے والے ہم سے آگے بڑھ جائینگے کیا ؟

فلاسفی کا مسئلہ ہے کہ امید ناامیدی کی جڑ ہے - نہ آپ کسی سے امید رکھیں گے نہ مایوس ہوں گے . اس میں یہہ خیال رکھنا چاہئے کہ کسی سے بھلائی کی اُمید میں تو مایوسی کا اندیشہ ضرور ہے . مگر برائی کے انتظار میں اپنی نیند خراب کرنی غلطی ہے کہ دیکھئے کل کیا ہوتا ہے ؟ اس سے بہتر یہہ سمجھ لینا چاہئے ع کل جو آنی ہے بلا آج ہی آئی ہوتی ؛ جب بھلائی کا یہہ حال ہے تو برائی کا اندیشہ اپنی جان پر ظلم ہے - میاں کی مرضی پر چھوڑ دیئے ع خوش نویس ہست و نخواہد بہ نوشت +

مجھے تعجب ہے کہ شعرا نے فصل بہار کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے

ملا دیئے۔ خزاں کے حق میں کوئی اچھی بات نہ سوجھی: بہار کا انجام گل و لالہ کا مرجھانا۔ باغ کا اُجڑنا۔ چڑیوں کے گھونسلے بگڑنا۔ درختوں کے پتوں کا جھڑنا۔ یعنی ہر طرح باغ کی بربادی بہار کا انجام تو یہ ہے۔ برخلاف اس کے خزاں کا انجام پھر باغ کی تر و تازگی۔ ہر طرح کی شادابی انجام میں خزاں کا انجام بُرا نہیں۔ جس چیز کا انجام اچھا ہو وہ بُری نہیں ہو سکتی۔

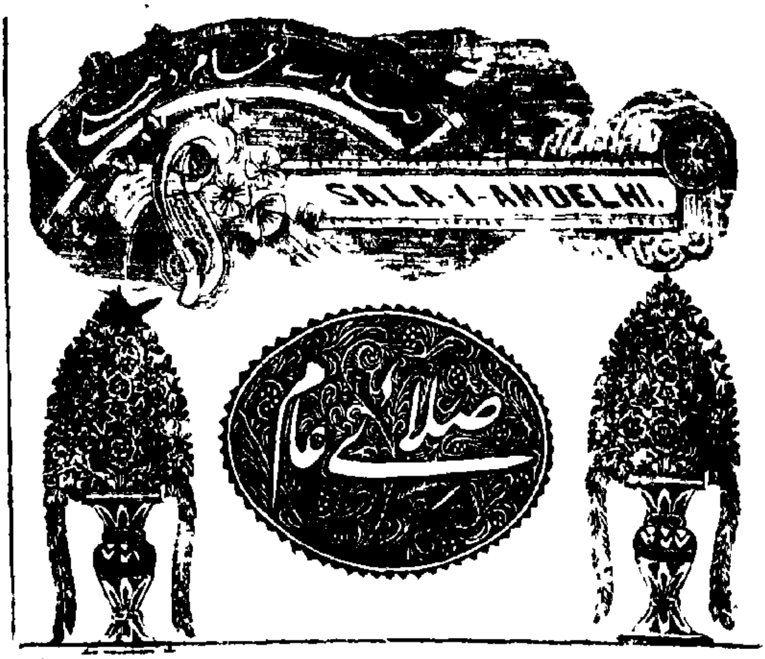


انسان کی ... بھی ... زندگی خزاں ... ہو گر انجام ... ور ... تنگی ... دل کی ہے تیر ... میں چھوٹے ... نہیں جب تک خزاں نہ آئے بہار ناممکن ہے۔ درخت جب تک پتے جھڑ کر عریاں نہ ہو جائیں نیچر نئے کپڑے نہیں دیتی۔ ہم مریں نہیں تو زندگی مشکل ہے: اگر میری نہیں تو عالم اسباب کی زندگی مشکل ہے ؎

سمجھو بنا رہا ہے خطا کار کو دلیر ۔ راضی جو درگزر پہ ہو التجا کے بعد

توبہ کی سزا دیتے ہیں یارانِ قدح نوش ۔ بے مانگے ہمیں دور میں ساغر نہیں ملتا

کون کہتا ہے کہ تم گھر سے نہ نکلو باہر
ہم تو کہتے ہیں کہیں جاؤ مگر یاں ہو کر



(اب کی دفعہ دو ایک باتیں جو "مضمون پریشاں" میں لکھنے کے لائق تھیں اس میں لکھنے سے رہ گئیں اندیشہ ہے کہ پھر شاید مجھے یاد رہیں یا نہ رہیں: یاد رکھنے کی اچھی ترکیب یہہ ہے کہ نوٹ کے طور پر انہیں یہاں ٹانک رکھوں کہ فرصت میں ان پر مضمون لکھے جائیں (۱)

کاہ سے دب مریں اور کوہ سے نہ دبیں ٭ اس قدر نرم و سخت جاں ہیں ہم

ع ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق - اس میں شک نہیں کہ مارنے سے محبت نہیں مرتی: خاصکر عورت کی ٭ محبت میں عورت جان دینا کھیل جانتی ہے - لیکن جس قدر یہہ محبت میں جان دینے کو تیار رہے یار کی چھوٹی چھوٹی بے اعتنائیوں پر اسی طرح بیزار

ہو جاتی ہے کہ پھر تمام عمر شکل دیکھنے کی روادار نہیں ۔ عورت کو مرد کی طرف سے ہزار مصیبتیں ہوں اُس کی پرواہ نہیں ۔ چاہنے والے کی نگاہ میں ذرا فرق آیا نہیں اور یہہ بیزار ہوئی نہیں ۔ کاری زخم میں اُف نہیں کرے گی ۔ سوئی چُبھ جانے سے مرجائے گی ۔ دُنیا بھر کی بدنامیاں برداشت کرے گی مگر چاہنے والے کی خفیف شکایت پر زندگی سے بیزار ہونے کو آمادہ ۔

سنان و تیر کا مقابلہ کرنے کو تیار مگر سوتیا ڈاہ کی برداشت نہیں ہو سکتی ۔ لاشریک اللہ کی طرح اس کو دوسرے کی شکل سے ضد ہے ۔ آپ دوسری طرف بُری یا بھلی کسی نظر سے دیکھیں اور یہاں قیامت ہو جائے گی ۔ عورت کو مرد کی ذرا ذرا سی باتوں کا زیادہ خیال ہوتا ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کا پان کیوں کھایا ؟ کان میں عطر کا پھویا کہاں سے آیا ؟ رات کو دیر کہاں ہوئی ؟ حالانکہ آپ کی کسی بزرگ کے عُرس میں رات بھر فاتحہ خوانی میں بسر ہوئی ۔

آپکی بے روزگاری میں فاقہ پر فاقہ ہوں ہوتے دیکھئے ۔ مگر آپ دوسری طرف نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھیں ۔ کسی کی طرف نظر نہ کریں ۔ کسی دوسری عورت کے خط و خال کی تعریف کر دیں پھر آپ کی شکل سے نفرت ۔ نفرت زبان سے نہیں دل سے ۔ گھر میں آپ خالص نیک نیتی سے یا بے خیالی میں مستورات میں سے کسی کے لئے مہندی ۔ عطر ۔ چوڑیاں لا کر دیں پھر دیکھئے کیسی قیامت مچتی ہے ۔ آپ رشتہ کی محلّہ کی عورتوں میں از روے تہذیب انگریزی خاطر مُدارات کر دیکھیں پھر دیکھئے کیسے کیسے شگوفے اُٹھتے ہیں ۔

بھیڑ میں ڈولی کا نکلنا مشکل ہو۔ کندھے سے کندھے رگڑیں۔ مگر مجال نہیں کہ آپ کسی ڈولی کے پردہ سے لگ کر نکل جائیں تو گھر میں طوفان مچ جاے ۔ ماں سے اگر آپ ہنس کر بات کریں تو بیگم صاحب کو ناراضگی کا خاصہ بہانہ ہاتھ لگ جائیگا۔ ڈولی منگادوئیں اماں کے پاس جاتی ہوں۔

بیگم صاحب کی آنمازشت وی ہیں جس نگاہ سے آپ دیکھتے تھے اُسی نگاہ اُس سے زیادہ شوق سے بیگم صاحب کے زیادہ عمر ہو جانے پر پیش آئیے۔ محبت میں دولت کچھ چیز نہیں اقبال کی ضرورت نہیں۔ اختیار و حکومت بھی بے کار ہے: ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کو کسی دوسرے کا خیال بھی نہ ہو۔ گو یہ خیال پارسائی کے منافی نہ ہو۔ شروع میں از روئے جوانی دونوں کو جو محبت تھی عورت اپنی زندگی کیا مرنے کے بعد بھی اُس سے زیادہ کی آرزومند رہتی ہے۔ مرنے کے بعد بھی آپ دوسری شادی کا نام نہ لیں۔ ورنہ "قیامت کے دن میرا (بیگم صاحب کا) ہاتھ ہوگا اور تمہارا (آپکا) دامن"۔

دل میں آپ بیگم صاحب کو کتنا ہی کیوں نہ چاہیں مگر ظاہر میں بھی ایسی وضع ضرور رہے کہ ساری عورتیں یہ جانیں کہ سارا اختیار بیگم صاحب کو ہے۔ میاں تو کٹ پتلی سے زیادہ نہیں۔ حجامت کے لئے بھی گھر سے پیسے مانگ کر لے جاتے ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ دراصل یہ جرح صحیح ہے یا غلط ہے۔ محض خیالی ہے یا ممکن الوقوع

مگر اس کی تردید یا تائید میں گھٹانے بڑھانے کی گنجائش ہے۔ خاصکر بڑھانے کے لئے زیادہ میدان ہے ٭

اسی طرح قدیم و جدید کے ترقی و تنزل کا جھگڑا کر دل و دماغ کے لئے قدامت تعریف کی مستحق ہے یا آج کل کا زمانہ: یہہ بحث بہت وسیع ہے ٭ اس معاملہ میں سب سے اچھی صلاح یہہ ہے جو عالمگیر بادشاہ نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھی کہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔ حالانکہ عالمگیر کے بعد بیٹوں سے رہی سہی سلطنت بھی نکل وگئی ٭ اس زمانہ میں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حالت موجودہ سے ہم نہ گریں ٭ قدیم علوم و فنون میں اگر ترقی نہ ہو سکے تو سلف کے علوم و فنون جو ہمارے حصہ میں آئے ہیں یہہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائیں ٭

اس میں شک نہیں کہ قدامت کو نئی اُمت پر تحکمانہ دباؤ ڈالنے کا خبط ہوتا ہے۔ اور جس قدر قدیم خیال والے اپنے پُرانے خیالوں کی پچ کرتے ہیں اسی قدر اس زمانہ کے نئے خیال والے سرتابی کی کوشش کرتے ہیں ٭ نئے خیال والے تو اس دُھن میں ہیں کہ کُل جدیدٌ لذیذٌ۔ اور دیڑھ دانینٹ کی نئی مسجد پُرانی مرمت طلب سے اچھی ہے کہ گندہ بروزہ باخشکہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ ٭

لیکن آپ دیکھ لیں کہ نیچر (عالم اسباب) ازل سے قدامت پرست ہے۔ آفتاب

جدھر سے نکلتا ہے اسی طرف سے نکلتا چلا آتا ہے۔ جس طرف کو ڈوبتا ہے اسی طرف غروب ہوتا ہے: آسمان ہمیشہ اوپر اور زمین ہمیشہ نیچے ہے۔ چاند کا عروج و زوال چودہ دن کا ہے۔ نہ عروج دو چار مہینہ کا ہے نہ زوال پانچ چھہ مہینہ کا: تارے دن کو چوروں کی طرح چھپے رہتے ہیں۔ مگر رات کو افشانِ جبیں یار کی طرح چمکتے ہیں + دریا کبھی اُلٹے نہیں بہتے۔ نہ درخت چلتے دیکھے۔ پہاڑ اپنی جگہہ سے ہلتے نہیں اور پروانے بے بلائے شمع کی طرف دوڑتے ہیں: عالمِ اسباب میں کہیں انقلاب نظر نہیں آتا۔ بلکہ جس قدر جو چیز پرانی ہوا سی قدر لا زوال ہو جاتی ہے + نیچر سے ہماری سرتابی گو تھوڑی مدت اگر چل گئی تو آخر کو پھر وہی مثل کہ چوبے جی پچتائیں گے۔ ڈھاک کے ۳ ہی پات: نیچر کو آپ کتنا ہی روکیں پھر وہیں آ کر ٹھیرے گی جہاں سے چلی تھی + مرغِ قطب نما کو آپ کتنا ہی اِدھر اُدھر پھرائیں شمال ہی کی طرف رُخ کرے گا:

لیکن حق بجانب خیالاتِ جدید ہے کہ درخت کے پتّے خزاں میں اگر نہ جھڑیں تو بہار میں نئے پتّے نکل نہیں سکتے۔ اگر یہہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو درخت خشک ہو جائے + اس خیال سے قدیم و جدید کا فیصلہ کسی کے بس کا نہیں۔ آپ کے بس کا ہو تو کیجئے: میری سمجھ سے باہر ہے:

انتخاب مشاعرۂ معراج الادب لکھنؤ

اردو لٹریچر میں نظم کے اچھے نمونے اکثر مشاعروں میں مل جاتے ہیں۔ اساتذہ کے کلام کے بعد میں مشاعروں کا قیام اردو کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہوں: تازہ کلام کے لئے مشاعروں کے منتخب اشعار جامع میں نقل کر لینا اچھا ہے کہ آگے کو انہیں کے ذریعہ سے بہت پاکیزہ تذکرہ شعراء متاخرین کا تیار ہو سکے گا :

یہ شعر میں نے اپنی پسند کے معراج الادب کے مشاعرہ سے نقل کئے ہیں :—

[illegible]

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی پانچ روپئے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ نخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکے اس کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس کرنیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین لکھے ہوئے شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے؛ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی لسانِ عجم عروسِ جمیل و لباسِ حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیاں لاجواب چاہئے۔

اکثر احباب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو؛ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

شرح اجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:—

زبانِ اردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے۔ عـ۵۲
" " چھ ماہ کیواسطے عـ۳۵
" " تین ماہ کیواسطے عـ۲۰
" نصف صفحہ ایکسال کیواسطے عـ۳۵
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے عـ۲۰
" " " چھہ ماہ کیواسطے عـ۱۲
" " " تین ماہ کیواسطے للعہ
" ایک صفحہ ایک ماہ کیواسطے سـ۱۲
" نصف صفحہ " " عـ۷
" چوتھائی صفحہ " " عـ۴

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دگنی اجرت ہوگی۔ اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

(مہتمم صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:—

دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر۔ مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana Delhi.

SALA-I-AM, DELHI. REGD. No. L. 1462

صلاے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement and the assimilation of the best features of the new civilization

حسب الارشاد میر ناصر علی صاحب [illegible] دار المطبع واقعہ [illegible] فراشخانہ [illegible] اور چھپا [illegible] دہلی

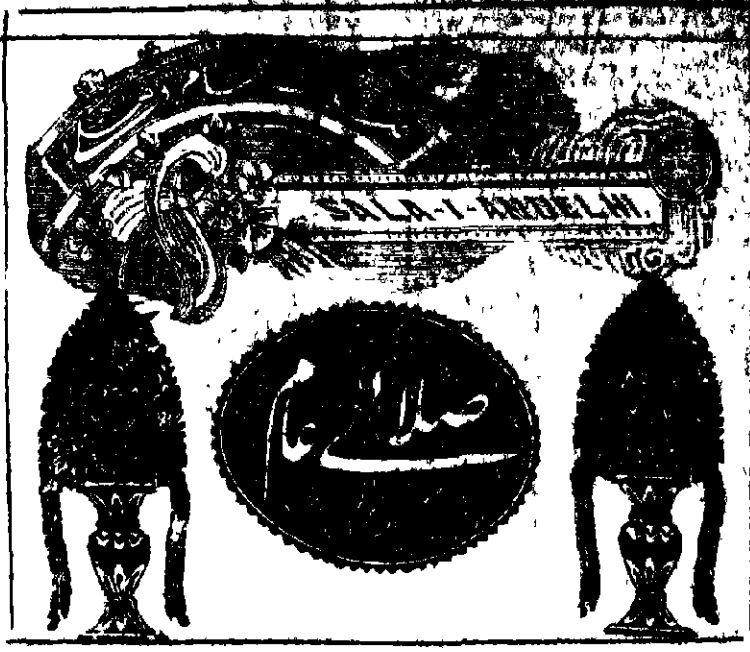
صلائے عام

فہرستِ مضامین

(جو بقول اصغر علی نسیم دہلوی)

ع پوچھتی ہے کون دیکھے گا مرا حسنِ بیاں؟

جلد ۲۱ — بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر ۴



میں دیکھتا ہوں کہ اکثر رسالے، اخبار میرے پاس بغرض ریویو و تبادلہ آجاتے ہیں: تبادلہ کے لئے صلائے عام ہر پرچہ کے ساتھ ہر وقت حاضر ہے۔ مگر ریویو سے میں ذرا بھی چُراتا ہوں کہ صلائے عام نکالنے سے میری غرض یہہ نہیں کہ میں بھی پانچویں سواروں میں گنا جاؤں۔ مجھے خبط ہے کہ ملکی و قومی ترقی کے لئے اپنی زبان کی ترقی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میری آرزو ہے کہ سب سے پہلے اپنی زبان پر توجہ کی جائے: اس غرض سے میں نے صلائے عام اچھے اُردو لکھنے والوں کی نذر کر رکھا ہے۔ اور بہت خوش ہوتا ہوں جب اُردو کے نظم و نثر کے اچھے مضمون مل جاتے ہیں۔ ریویو کا میں نے یہہ طرز رکھا ہے کہ جس رسالہ کا ریویو لکھا جائے اس کی دو ایک چیزیں صلائے عام میں نقل کر دی جائیں

جسطرح رکابدار دیگ سے دو ایک چانولوں سے ساری دیگ کا حال سمجھ لیتے ہیں یا مشتے نمونہ از خروارے۔ اس سے میری مراد یہہ ہوتی ہے کہ جس طرح جس بات سے میں خوش ہوا اور اصحاب بھی خوش ہوں گے۔

اس مہینہ میں **جام جہاں نما** (لکھنؤ) کا ایک پرچہ مجھے ملا جس میں شعر و سخن کے مضمون بہت اچھے دیکھنے میں آئے۔ "اردوئے معلّٰے" کے عنوان سے بعض شعرائے مستند کا کلام بہت اکثر لکھا ہے۔ لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کے کلام کا کیا کہنا:-

اسیر پنجۂ جوشِ جنونِ فتنہ ساماں ہوں ۔ اگر دامن ہوں یوسف کا زلیخا کا گریباں ہوں

وہ آہ سرد ہوں نکلے جو اک ٹوٹے ہوئے دل سے ۔ سراپا درد ہوں اور درد کا خود اپنے درماں ہوں

نہیں از روئے قانونِ محبت خوں بہا میرا ۔ دل افسردہ چراغ کشتۂ گورِ غریباں ہوں

چراغِ دیر و کعبہ کی تجلّی کا ہوں پروانہ ۔ خبر یہہ بھی نہیں کافر ہوں ابتک یا مسلماں ہوں

جناب مولانا بیخود موہانی

اسیری کو مری سب قید ہی سمجھیں مگر میں تو ۔ جو پیار آتا ہے بوسے لینے لگتا ہوں سلاسل کے

ابھی محمل ابھی تصویر ابھی جلوہ ابھی لیلےٰ ۔ بہارِ چشم مجنوں ہیں بگولے میری منزل کے

جناب سخا شاہجہاں پوری

پروانہ کہیں شمع کہیں نور کہیں ہے ۔ اب تک وہ کسی وضع کا پابند نہیں ہے

یہہ بُعد و تقرب ہے ذرا غور کے قابل ۔ آنکھوں سے تو وہ دور ہے پر دل کے قریں ہے

جناب حکیم ضبط لسوانی

جلوہ دیر و حرم شام و سحر دیکھا کئے ✦ وہ کدھر تھے جلوہ فرما ہم کدھر دیکھا کئے

(یہ مضمون مومن خاں نے بھی باندھا ہے ؎ سو تمن سوئے شرق اُس بت کا فرکا تو گھر ہے، تم سجدہ کدھر کرتے ہو اور کعبہ کدھر ہے ؟) پھر جناب ضبط ؎

توڑ کر قید تیقن چلدئے سارے اسیر ✦ پاسباں سب جنبش زنجیر در دیکھا کئے

آنسوؤں میں بہہ گئی سب ضبط دل کی کائنات ✦ آپ جذب شوق کا اب تک اثر دیکھا کئے

جناب بسمل الہ آبادی۔ شاگرد جناب نوح

محبت میں بہت مشکل ہے جینا ✦ مگر مرنے میں آسانی بہت ہے

جناب صدق جائسی

محبت میں موافق میرے دور آسماں کیوں ہو؟ ✦ تمہیں نامہرباں جب ہو تو کوئی مہرباں کیوں ہو؟

اسے بیٹھے بٹھائے مفت میں اک چوٹ کھائی تھی

لڑیں نظریں یہاں باہم وہاں دل درمیاں کیوں ہو؟

جناب سید علی مرزا قیصر لکھنوی

نکالے سے نہ نکلے گا ترا تیر نظر لیکن ✦ اور ایسے تو سبھی مہمان ناوک ہیں مرے دل کے

یہاں آنیکا اک دن دوسرا دن یاں سے جانے کا

مرے نزدیک دنیا میں یہی دو دن ہیں مشکل کے

جناب نصیب علی خاں عاجز لکھنوی

قفس میں کہہ کے اتنا جان دیدی مرغ نو گرفتار نے ✦ بنا دینا لحد صیاد زیر آشیاں میری

پس مردن بھی ہے اتنا تعلق قید الفت سے

درِ زنداں پہ لٹکائی گئی ہیں بیڑیاں میری

غنیمت ہے اجل سے اس کا ہم آغوش ہو جانا ✤ نہ دکھلائے خدا ہشیار کو بیہوش ہو جانا

جناب نواب باقر علی خاں رازؔ لکھنوی

بجھ گئے کیونکے بھڑکتے ہوئے بالیں کے چراغ ✤ جب سنبھل جاتا ہے بیمار تو مر جاتا ہے

یاد جاناں بھی ہو دل میں خلشِ تیر بھی ہو ✤ ایسا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جاتا ہے ✤

خنجرِ ظلم ہو۔ دامن ہو۔ کہ قاتل کی نگاہ

خون وہ شے ہے کہ ہر ایک نکھر جاتا ہے

جناب اخترؔ قدوائی

ہر نفس کی آمد و شد سے یہ آتی ہے صدا ✤ موت کے قبضہ میں رہ کر زندگی کس کام کی؟

رسالہ جامِ جہاں نما کا دوسرا مضمون یعنی "تذکرۂ تنقیدات شعراء" بھی از روئے خوبیٔ کلام داد کے قابل ہے۔ شاعروں کے حال کے ساتھ نمونۂ کلام بہت اچھا منتخب کیا گیا: جناب نظم لکھنوی کے شعر ہیں کہ:-

آپ پہلو سے اٹھے یاں حالتِ دل اور ہے ✤ حکمِ ضبطِ آہ و نالہ ہے یہ مشکل اور ہے

اُس سے اُلفت ترک ہو سکتی نہیں تیری طرح ✤ نظم کا دل اور ہے ظالم ترا دل اور ہے

جناب نیرؔ لکھنوی

میری ہمدردی نہ کرائے ہمنوا ایسا نہ ہو ✤ دل تڑپے صیاد کا رنگِ گلستاں دیکھ کر

جامۂ ہستی کا اب [illegible] ہے ✦ دل تو ٹکڑے ہو چکا چاکِ گریباں دیکھ کر

گل کئے دیتا ہے دیوانہ چراغِ زندگی [illegible]

بڑھ گیا سوز اغضب تاریکیٔ ہجراں دیکھ کر

[illegible]: پست ہمت نہ کہیں دیدۂ گریاں ہوتا ✦ اب بہت دور نہیں گھر سے بیاباں ہونا

آدمیت نہ سکھا غیر کو نادان نہ بن ✦ اُس کی تقدیر میں لکھا نہیں انساں ہونا

تُو تو جاسوسِ غم ہو کر دلِ زار نہ کر

میرے اللہ کو آتا ہے نگہباں ہونا

[illegible] لکھنوی: عداوت رکھتے ہیں صیاد و برق و باغباں ہم سے ✦ زمانہ چھین لیتا ہے ہمارا آشیاں ہم سے

حکایت کہہ چکے تم اپنے اپنے آشیانوں کی ✦ سنو اے ہم صفیرو اب قفس کی داستاں ہم سے

پہونچ جاتے ہیں جب نزدیک چبھ جاتا ہے کانٹا ✦ ہمیشہ دور رہتا ہے ہمارا کارواں ہم سے

رواں ہیں آہ کے اجزا نفس ہیں کیا نگہ میں بھی ✦ فراہم دل میں اب کیونکر ہو سامانِ فغاں ہم سے

[illegible]: کبھی نہ آئے وہ پہلو میں دو گھڑی کے لئے ✦ رہی اثر سے الگ ہی الگ دعا میری

ہزار کچھ ہو مگر یہ اثر کسی میں نہیں ✦ نظر نظر ہے تمہاری دعا دعا میری

[illegible]: آپ غصہ میں کہاں پھینکیں گے ٹکڑے تیر کے ✦ مجھکو دیدیجئے کہ میں رکھ لوں کلیجہ چیر کے

کہہ رہے ہیں سب مجھ سے فقرے یار کی تحریر کے ✦ بس یہی الفاظ ہیں ترے خطِ تقدیر کے



صلائے عام میں "مضمون پریشان" کے سلسلہ نے زلفِ خوباں کی طرح پریشانیوں کے مٹانے میں لگاتار زور لگا رکھا ہے کہ ناظرینِ صلائے عام کے لئے غم غلط کرنے کی صورت نکلے۔ بقول میر حسن ؎

وہ زلفیں کہ دل جس میں اُلجھا رہے ٭ اُلجھنے سے جی جن کے سُلجھا رہے

حضرت اسماعیل منیر فرخ آبادی کا شعر ہے ؎

پریشانیوں پر ہے جوبن نیا ٭ مگر زلف اُس نے سنواری ابھی

لیکن سچ پوچھئے تو پریشانی کے حق میں اس سے بہتر کہنا مشکل ہے کہ ع

پریشانی اگر عیب است زلفِ یار ہم دارد جس طرح محبت میں یار کی کوئی بات عیب

نہیں سمجھی جاتی اسی طرح عالم اسباب میں خلاقِ دو عالم نے کوئی چیز حسن و خوبی سے خالی نہیں بنائی : یہی بالوں کی تمثیل لیجیئے کہ گندھی چوٹی اگر چاہنے والوں کے لئے آفتِ روزگار ہے کہ بقول میر حسن ؎

کشاکش میں تھا ورنہ جینا تو ہیچ　٭　بھلے کو رکھا اُس نے ڈھیلا ہی پیچ

لڑکیوں کو کڑی گندھی چوٹی سے ڈھیلی چوٹی میں زیادہ آرام ملتا ہے۔ بلکہ چوٹی کھول کر کندھے پر بال سکھانے میں جو بال شانوں سے اتر کر کمر تک اور کمر سے نیچے پہونچیں تو خوبصورتی میں اُن کا جواب مشکل ہے : جواب ہے تو ملا غنیمت کا شعر ہے کہ ؎

شنیدستم کہ صیادِ ہوس جوش　٭　برنگِ زلفِ لیلے دام بردوش

لمبے بال والیاں جب گردن و سر کی جنبش سے بیچ پیچھے کے بال سامنے کندھوں پر ڈال لیتی ہیں تو اس کا نقشہ کھینچنا مانی و بہزاد کے بس کا نہیں۔ میر حسن نے اِس شعر میں اس کا نقشہ کھینچنے کا ارادہ کیا مگر رہ گیا ؎

غرض وہ مُڑی جب دکھا اپنے بال　٭　تو گویا کہ مارا محبت کا جال

اس میں "مضمونِ پریشان" کی تشبیہ خاصی نکل آئی۔ مگر یورپ و امریکا کے مسینوں نے لمبے بالوں کے جال کو جنجال سمجھ کر یہ جھگڑا ہی مٹا دیا کہ کانوں تک بال رہنے دیئے : کھلے بالوں میں جو آرام ہے وہ بندھے اور گندھے بالوں میں نہیں ؎

غرض حسن کا اُسکے ہے سب یہ بھید　٭　جو چاہے کرے وہ سیاہ و سپید

یہاں سیاہ و سپید سے مراد گو اختیاراتِ جزو کل ہے۔ مگر حسن و خوبی میں رنگ

کو بہت دخل ہے : بال جس قدر سیاہ ہوں اچھے۔ پھول جس قدر رنگین ہوں بھلے لگتے ہیں۔ پتے ہرے اچھے۔ حسنِ عارضِ رنگین کو کوئی نہیں پہونچتا کہ سب سے زیادہ دل کش سُرخ رنگ ہے ٭ حسینوں کے ہونٹ پان کی سرخی سے کیسے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ بیادشادی کا لباس آگے سُرخ ہی ہوتا تھا۔ بچّوں کی نگاہ سُرخ رنگ پر زیادہ جاتی ہے۔ سُرخ رنگ دُور سے نظر آتا ہے : شعروسخن میں مضامینِ رنگیں خونِ جگر سے پیدا ہوتے ہیں۔ شعراء باکمال سے پوچھئے کہ ایک ایک شعر میں کتنا خونِ جگر پینا پڑتا ہے تب کہیں رنگِ سخن جمتا ہے ٭ میں نے اکثر شاعروں سے سُنا ہے کہ مشکل مضمون بے خونِ جگر پئے سوجھتے ہی نہیں ٭

یہی حال ہر فن میں کمال پیدا کرنے کا ہے۔ لیڈی آلیو شرائنیر[1] لکھتی ہیں کہ کسی زمانہ اور کسی شہر میں (ناموں کی ضرورت نہیں نہ سنہ و تاریخ ضرور ہے) ایک مصوّر صرف سُرخ رنگ کی تصویر کھینچا کرتا تھا۔ اور سب مصوّر رنگ برنگ کی تصویریں کھینچتے تھے۔ مگر سُرخ رنگ میں کوئی اُس کو نہیں پہونچتا تمام شہر میں سب کو تعجب تھا کہ یہ سُرخ رنگ اتنا شوخ کہاں سے لاتا ہے اور کس طرح بناتا ہے ؟ سُرخ رنگ والا مصوّر چپ رہتا اور اپنا کام کئے جاتا ٭ کوئی چین سے رنگ لاتا۔ کوئی جاپان سے کہ ان ملکوں کی رنگین تصویریں مشہور تھیں۔ مگر سُرخی میں کوئی اُس کو پہونچ نہ سکا۔ تمام کتابیں چھان ڈالیں کہ کہیں ایسی سُرخی کا نسخہ ملے۔ کہیں نہ ملا ٭

ہمارا مصوّر "ہمارا" میں نے اس لئے کہا کہ آگے چل کر آپ کو اس سے میری محبت کا

[1] Olive Schreiner, author of IREAMS	ملب

سبب معلوم ہو جائے گا) تصویر میں سُرخ رنگ بھرتا رہا۔ جس کی سُرخی روز بروز رنگ لانے لگی کہ تصویر کی سُرخی تو بڑھتی گئی مگر مصوّر کا رنگ زرد ہونے لگا + آخر کار مصوّر نے جان بحق تسلیم کر دی +

مصوّر کے مرنے کی خبر سنکر شہر کے لوگ دفن کرنے کو جمع ہوئے۔ دیکھا کہ تصویر کے آگے مصور کا دم نکل چکا ہے۔ مصوروں نے مصوّر کے مکان کی ہر چیز میں سُرخ رنگ کی تلاش کی لیکن سُرخ رنگ کا پتہ نہ ملا + غسلِ میّت کے لئے مصوّر کے کپڑے اتارے۔ تاکہ کفن پہنائیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ سینہ میں بائیں طرف بہت پُرانا زخم ہے۔ یہہ زخم کہن اس کی تمام عُمر کا رفیق معلوم ہوا کہ گھر بن گیا تھا۔ اور موت نے جو ہر عیب و ہنر کو چھپا دیتی ہے داغ کی شکل میں زخم پر مُہر لگا دی کہ ع بغیر مُہر سند مُعتبر نہیں ہوتی ؎

خونابہ راز فاش کند ورنہ عاشقاں + تارے جگر شدہ گریباں رفو کنند

مصوّر کو تو دفن کر دیا اور بیدرد آپسمیں پوچھتے رہے کہ اس کو سُرخی کہاں سے ہاتھ آئی ؟

چند روز بعد مصوّر کو تو سب بھول بھال گئے مگر وہ تصویر رہ گئی ؎

خنجر کی ادائیں نہ ہوئیں ختم گلو پر + کچھ دیر تو اسے حضرتِ خوں تھم گئے ہوتے

دُنیا میں سب رنگ ایک سے نہیں اور اگر ہوں بھی تو سب سے بڑھ کر خونِ جگر کی سرخی ہے جو کمالِ فن کی جان ہے + یہہ حکایت میں نے لیڈی صاحبہ کے مضمون سے جن کا نام پہلے عرض کر چکا ہوں اپنی وضع پر بیان کر دی ؎

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے ٭ جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

ناسخ کا شعر "داغِ آتشیں" کی تعلّی میں اپنا جواب نہیں رکھتا ؏

اگر ہو جا پر سمندر یقین ہو خاک دم میں جل کر ٭ سنا جو ہو آفتاب محشر کھڑنڈے داغ آتشیں کا

اس میں "سنا جو ہو" بہت خوب کہا کہ آفتاب محشر کسی نے دیکھا تو ہے نہیں مگر سنا بہت ہے ٭

اس میں شک نہیں کہ ناسخ نے "داغ آتشیں" کی تعریف میں تعلّی ختم کر دی کہ اس سے زیادہ حرارت مشکل ہے۔ مگر حضرت کو خبر نہیں کہ دنیا میں اور بہت حرارتیں ہیں: آہ مظلوم کی حرارت۔ عشّاق کے دلوں کی حرارت: آہ مظلوم کی حرارت سے تو بقول مہاراج تلسی داس جی فولاد بھسم ہو جاتا ہے: دل کی حرارت کا قصہ سنئے کہ:۔

حسب بیان جناب سمرن صاحب دریا کے کنارے ایک کم سن حسین دل گرفتہ اپنی دُھن میں بین بجا رہی تھی کہ اکبارگی کسی کی یاد میں اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے جن کے پوچھنے میں رومال تر ہو گیا ؏

لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت ٭ ٹوٹنا ہے یہہ تار مشکل سے

راوی نے کہا کہ لاؤ میں رومال دھوپ میں سکھا دوں۔ اِس پر اُس اسیرِ غم نے جواب دیا کہ یہہ دھوپ میں سکھانے کی چیز نہیں۔ میں اس کو دل کی حرارت سے سکھا لوں گی اور یہہ کہہ کر آنسوؤں سے تر رومال اپنے سینہ سے لگا لیا ؏

گاہ دستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل ٭ یہہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے

اب حضرت ناسخ سے پوچھے کہ "داغِ آتشیں" میں زیادہ حرارت ہے یا دل میں؟ پھر نہ کہیگا کہ ع مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا۔ آپ کے "آفتابِ داغِ ہجراں" سے زیادہ تو اس چھوکری کے سینہ میں حرارت نکلی؛ یہہ حرارت بلاکشانِ محبت کے سینوں کے سوا اور کہیں نہیں۔ حضرت مولانا راسخ دہلوی کا شعر ہے ؎

راسخ تفتہ جگر بوئے کباب آنے لگی
خوش بیاں تجھسے بہت آتش بیاں گنتی کے ہیں

اِشتہار



شاعری - اقبال کی نشانی ہے یا ادبار کی ؟

اس بحث میں قولِ فیصل ذرا مشکل ہے - جناب کلب علی خاں بہادر کا شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے ✤ شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا -

مگر مشہور تو یوں ہے کہ شاعری اقبالمندی میں داخل نہیں - یہانتک کہ بعض نظم کی لاجواب تصانیف بھی اگلے زمانہ میں منحوس سمجھی جاتی تھیں : مثلاً مثنوی میر حسن جو "بہ تائیدِ فضلِ خدائے ذوالمنن"[1] لاجواب ہے مگر اگلے لوگ اسکو کم پڑھتے تھے - ایک دفعہ میں نے حضرت غوث گوالیری رح کی ہندی کی بد مادت ایک پنڈت سے پڑھنے کا ارادہ کیا اُس نے بد ماوت کی نسبت ایسی ہی رائے دی - دیوان حافظ رح کی نسبت یہہ زبان زدِ عام ہے کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ میں خلل ہو جاتا ہے ✤ بہرحال زیادہ تر تو مرضِ عشق کی طرح شاعری میں توغل اقبالمندی میں داخل نہیں ✤ مگر یہہ خیال قابلِ اعتبار نہیں کہ عوام کا مشہور کیا ہوا ہے : اور مجموعی حالت میں اس کا اطلاق قوم و ملک پر نہیں ہو سکتا - یہ خیال معمولی توہمات میں داخل ہیں ✤

شخصی حالت میں یہہ ضرور ہے کہ جس کو فکرِ شعر میں اور کچھ نہ سوجھے تو اُسے واقعی اور دنیوی جھگڑوں کی فرصت نہیں ملتی - علاوہ اس کے اور مشغلوں کے مقابلہ میں اکثر ذی کمال شاعر دُنیا کے عروج کو نہیں پہونچتے ✤ زمانۂ قدیم و حال میں مشغلۂ شعر و سخن بہت کم کسی کو از روے اقبال راس آیا ہو ✤ میر تقی میر بہت خوشحال نہ تھے - خواجہ حیدر علی آتش کی ایک کمبل میں گزر گئی - شیخ امام بخش ناسخ لکھنؤ سے جلاوطن ہو کر کانپور و الہ آباد میں پریشان پھرتے رہے

[1] یہہ جملہ ایک پرانے چھاپے کی مثنوی میرحسن کے ساتھ دیکھا گیا ✤

الہ آباد میں

الہ آباد میں کہا کہ ؎

تیں تو بیتی دو آنکھیں مری ✦ اب الہ آباد بھی پنجاب ہے ✦

غالب کو اپنا گھر نصیب نہ ہوا۔ بلّی ماروں کے نکڑ پر ایک معمولی مکان میں رہتے تھے اور مرزا ہرگوپال تفتہ و منشی جواہر لال اور اہل ہنود خدمت کرتے رہے : متاخرین میں حضرت داغ کے سوا کوئی خوش حال نہیں دیکھا کہ حیدرآباد (دکن) سے اچھا وظیفہ تھا ✦ اور یوں تو فارسی کے تذکرہ خزانہ عامرہ میں ہزاروں سے بھی زیادہ انعام اکرام کا ذکر ہے۔ یہ صرف قصیدوں کے صلے تھے۔ نہ کہ اقبال مندی و عروج کے ثبوت ✦

اب رہی مجموعی حالت : تاریخ سے ثابت ہے کہ سوائے چند شاعروں کے جو اپنے زمانہ میں لاجواب سمجھے گئے زیادہ تر اس گروہ کو اقبال نصیب نہ ہوا۔ بلکہ اُس قوم میں یہہ فن زوال کا سبب ہوا ✦ حضرت شیخ سعدی رح کا زمانہ خلفائے عباسیہ کی بربادی کا زمانہ تھا ؎

دراں مدت کہ ما را وقت خوش بود ✦ ز ہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

یہہ سنہ سلاطین عباسیہ سے تخت و تاج کے چھننے کا ہے ✦ عرب میں شاعروں کی یہہ کثرت ہوئی کہ محض شاعری شرافت کی نشانی رہ گئی تھی جس کے جواب میں قرآن شریف نثر کا معجزہ پیش ہوا ✦

عالمگیر کے مقولہ کی طرح کہ "شکار کار بیکاراں است" شاعری بھی بے کاری کا شغلہ ہے۔ بہادر شاہ بادشاہ کو جب امورِ سلطنت کا جھگڑا نہ رہا تو شاعری کی طرف متوجہ

ہوئے اور اس میں کمال پیدا کیا۔ واجد علی شاہ بادشاہ نے انتظام سلطنت سے چشم پوشی کرکے شاعری اور شاعری کے ساتھ موسیقی کی طرف توجہہ کی کہ دونوں جُزو لاینفک ہیں +

شاعری دراصل عیش میں داخل ہے اور عیش آخر کو زوال کا سبب ہوتا ہے۔ یہہ شغلہ جوانی کا ہے گانے بجانے اور حُسن و عشق سے اس کا تعلق زیادہ ہے۔ واقعات اور حالات روزمرہ سے اس کا تعلق بہت کم ہے؛ نکہ شعر میں جو ذہن میں آیا کہہ ڈالا گو وہ قرین قیاس ہو یا نہ ہو۔ بہت کم کسی شاعر کا حال اس کے کلام سے معلوم ہوسکتا ہے۔ شعر سے تو یہہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمیں کے قلّابے ملا دیے مگر معمولی ضروریات زندگی کا بھی ٹوٹا رہتا ہے ہر شاعر نے پہلے شراب و ساقی کو یاد کیا پیچھے اور کچھ زبان سے نکالا۔ حضرت جامی۔ نظامی۔ صہبائی کو کبھی شراب نصیب نہ ہوئی ہوگی مگر ساقی و شراب کی تعریف میں پُل باندہ دئے۔ مولانا صہبائی کی نسبت مرزا نوشہ فرمایا کرتے تھے کہ پینے کو تھوڑا نصیب نہوا مگر تخلص صہبائی؛ کسی شاعر نے اگر مورخانہ مضمون باندھا تو مبالغہ کی وجہہ سے اعتبار سے ساقط کردیا +

شاعری سے کسی مُلک کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ فلاطون نے اپنے تصنیف ریپبلک میں شاعروں کو جمہوری سلطنت سے خارج رکھا +

میں یہہ نہیں کہتا کہ شاعری قومی ادبار کا باعث ہے مگر اس میں زیادہ توغل انسان کو اور کاموں کا نہیں رکھتا۔ اس میں جتنا کمال زیادہ ہوگا اُتنا ہی اور کاموں سے

بے توجہی کا سبب سمجھئے + یہہ فن اس قدر مشکل ہے کہ آدمی اور کسی کام کا رہ نہیں سکتا + سیدھی بات کہنی اس میں عیب ہے۔ جب تک مبالغہ نہ ہو لطف نہیں +

اصل بات یہہ ہے کہ شاعری کو بالذات قومی اقبال و ادبار سے تعلق نہیں۔ قوم و ملک کے لیئے شاعری عیش کی چیز ہے کہ پیٹ بھرے پر سوجھتی ہے اور سر عیش آخر کو ادبار کا سبب ہوتا ہے + محض زُلف و سنبل اور وصل و ہجر کے قصے اقبال کے اسباب نہیں نہ مثنوی گلزار نسیم اور اصغر علی خاں نسیم کی الف لیلہ ادبار کا سبب ہو سکتے۔ شاعری محض تفننِ طبع کا مشغلہ ہے جاں فشانی و محنت شاقہ کے بعد جب آرام نصیب ہوتا ہے اس وقت اور اسباب عیش کے ساتھ شاعری میں جی لگتا ہے اور جب اس میں جی لگ گیا تو پھر اور باتوں کی فرصت کہاں؟ مگر اس بحث کے متعلق رسالۂ جام جہاں نما میں ایک مضمون اچھا نکلا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے +

میرے مضمون سے میری یہہ غرض نہیں کہ شعر و سخن کی مجھے قدر نہیں یا شعرا کو میں اہلِ کمال میں نہیں سمجھتا۔ شعرا و شعر و سخن کی قدر میرا ایمان ہے: مگر قوم و ملک کے اقبال و ادبار سے اسے تعلق نہیں۔ جی بہلانے کے لئے اس سے اچھا کوئی مشغلہ میرے ذہن میں نہیں + میرا وقت سب سے زیادہ شعرا کے کلام دیکھنے میں کٹتا ہے۔ بلکہ سب سے اچھا وقت اساتذہ کے کلام سے کٹا اور کٹ رہا ہے ع اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی +

شاعر کا اقبال شاعر کی دنیا میں

(از شاہ نذیر ہاشمی غازیپوری)

دنیائے ادب کا تازہ شگوفہ خیال یہ ہے کہ کسی قوم کی بہتر سے بہتر شاعری دراصل اسکے زوال اور ادبار کی ایک تاریخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں کہیں کوئی مقتدر شاعر پیدا ہوتا ہے وہاں وہ اُس قوم اور ملک کے لیئے انتہائی جہالت اور پستی کا زمانہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنے رسالہ خریطہ میں اس مبحث پر اسی قسم کے خیالات کا بار بار اظہار کیا ہے۔ ایک موقعہ پر وہ لکھتے ہیں: "سعدی۔ حافظ۔ ہومر۔ شکسپیر۔ غالب۔ عمرؤ القیس سب ازمنۂ انحطاط یا جاہلیت کے شاعر تھے۔ سب کے سب یا اس وقت پیدا ہوئے تھے جب قوم۔ علم و عمل کے مرحلوں سے گذر کر قول و نظر کے جمود میں غرق تھی یا اُس وقت ظاہر ہوئے تھے کہ جہالت کی بدلیاں سب طرف سے گھر گھر کر نسیان کی ظلمتیں پیدا کر رہی تھیں۔ سعدی وعظ گو تھا مگر قوم کی عام انحطاط کی تاریخ اس کے ہر وعظ سے نمایاں ہے۔ غالب کی تمام شاعری نظری ہے مگر اس کا نظری ہونا ہی اس امر کی شہادت ہے کہ قوم کے اندر کوئی مستقل ہیجان کوئی ہاتھ پاؤں کا عمل موجود نہ رہا تھا۔" اسی سلسلہ میں یہ چند سوالات بھی بطور ضمیمے کے پیدا ہوتے ہیں کہ کیا جس قوم میں زیادہ شاعر ہوتے ہیں وہ قوم پستی اور بربادی کی طرف جاتی ہے؟ کیا اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ کا شاعر دنیا کی سب سے بدتر اور گری ہوئی قوم میں پیدا ہوتا ہے؟ کیا شاعری دراصل کوئی قومی بیماری ہے؟ کیا شاعر قوم کے لیئے کسی طور پر بھی مفید نہیں ہے؟ کیا شاعری جہاں ادب کا ایک جزو نہیں ہے؟ اور کیا ادب کی ترقی کسی آنیوالے دورِ انقلاب کا مقدمہ نہیں ہے؟

ہمارے خیال میں جناب مشرقی صاحب امرتسری کو یہ توہمات شاعرانہ اس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کہ اُن پر یورپ اور امریکہ کی اقوام متمدنہ کا بے انتہا اثر ہے اور وہ اسی اثر کے ماتحت ایک قسم کی مایوسانہ

روشنی میں ایشیا کی تمام اقوام اور اُن کے کارنامجات ادب کو دیکھتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یورپ آئے دن عمر خیام۔ ٹیگور اور اقبال کا دم بھر رہا ہے جسطرح وہ لوگ مشرقی ممالک کے آثار قدیمہ کو کھود کر زمین سے باہر نکال رہے ہیں اور ان سے اپنی حیرت اور محویت کا ثبوت دے رہے ہیں اسی طرح علوم مشرقی کے آثار قدیمہ کو وہ فرط استعجاب اور کمال عقیدت کے ساتھ آنکھوں سے لگا رہے ہیں۔ علامہ مشرقی امرتسری نے جس غلط نظریہ کا حوالہ دیا ہے وہ تاریخ اقوام و ملل کے مطالعۂ دقیق سے بالکل بدلجاتا ہے شاعری ہمیشہ ان اقوام اور ممالک میں ملند پایہ پر رہی ہے جو جہالت کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور ترقّی اور اصلاح کے میدان میں آگئے۔ مسلمانوں کی شاعری اپنی ندرت خیال اور اپنی بلندئ فکر کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے۔ مسلمانوں کی شاعری جب تک ان میں فتوحات اور اقدامی میلانات زور پر رہے ترقّی کرتی رہی اور جب مسلمان دنیا میں سیاسی لحاظ سے گر گئے تو ان کی شاعری بھی گرتی چلی گئی ہندوؤں کی شاعری بھی ان کے عہد ترقی اور اقبال کے ساتھ ساتھ رہی گویا شاعری بیداری کی پہلی چونک اور انقلاب کی پہلی کروٹ ہے شاعر ہمیشہ کسی آنے والے دَور اور کسی پیدا ہونے والی قوّتِ انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری از اوّل تا آخر اسلامی سلطنت کے زوال کا دردناک مرثیہ ہے مگر غالب کی شہرت سے اردو زبان کی ترقی اور تعلیم عامہ کی شروعات ہوتی ہے۔ اسی طرح عرب کے سبع مُعلقہ اور بازار عکاش کے چرچوں سے ایک نئے دور کے شور جرس کی صدائے بازگشت کانوں میں آتی ہے یعنی ظہور قدسی اور پیغام اسلام کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ زمانۂ حال میں بنگالی قوم ہندوستان کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اس قوم میں رابندرناتھ ٹیگور پیدا ہوتا ہے۔ ٹیگور کی شاعری دراصل ایشا کے دور بیداری کی اولے شروعات ہے۔ اقبال کی شاعری تمام عالم اسلام کے لئے صور اسرافیل کی گونج سے زیادہ عالمگیر ہے۔ اسکے جادو نما اثرات امان اللہ خاں کی تازہ ساحت سے ملتے ہیں۔ یہ وہی امان اللہ خاں ہیں۔ جن کے نام پر اقبال نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" کو معنون کیا تھا۔ لہذا شاعر قومی اور مُلکی انقلاب کا پیشرو ہوتا ہے اور اس بات کو ہمارے علامہ مشرقی نے بھی اس طرح ایک جگہ تسلیم کیا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ شاعر اور عالم کا عہد ظہور اکثر اوقات توام رہا ہے جب جب کوئی قوم ظلمت کے قعر عمیق تک پہونچ چکی تو کوئی نیکو

صاحبِ علم بھی ممبرِ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ کوئی نبی نبوت سے مشرف ہوا۔ کسی حقیقت شناس نے رہنمائی کر دی۔ شاعر کے شعر کے ساتھ ساتھ عالم کا عمل بھی ہویدا ہوا۔ اور ظلمتِ شب کو پردے کے مانند اُٹھا لے گیا۔

اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ زمانۂ حال میں جس قدر یورپ اور امریکہ نے ترقیاں کی ہیں ان کے تناسب کے لحاظ سے ان بر اعظموں میں شاعری کا مذاق کم ہوتا گیا ہے۔ چنانچہ آج ان ممالک میں اوڈیارڈ کپلنگ اور اسی طرح کے اور چند شاعروں کے کلام کہیں کہیں پڑھے جاتے ہیں جو ذہنیت مضامین آفرینی اور قافیہ پیمائی کے لئے وقف ہو سکتی تھی وہ آج آسمانی جہازوں تحت البحروں اور وائرلیس (لاسلکی) کی انتہائی رفتار اور پرواز کی زور آزمائیوں میں صرف ہو رہی ہے۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی دریافت کا جنون ہے ہمالیہ کی برف پوش بلند ترین چوٹیوں پر پہونچنے کی دھن ہے۔ چاند اور مریخ تک جا پہونچنے کا خیال ہے۔ اور یہ سب بجائے خود ایک قسم کی مادی شاعری ہے اور یورپ اور امریکہ کے اقبال کا زمانہ عروج پر ہے۔ زمانہ حال کا سب سے تازہ ترین انقلاب روس کا انقلاب ہے اس کے حالات کی روداد پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے روس میں ادبی ذوق میں ایک انتشار اور انقلاب کی سی صورت پیدا ہوئی جس سے ایک نئے دور کی کتابوں کی سیلابی کا سلسلہ پیدا ہو گیا۔ انہیں شاعروں اور ادیبوں نے قدامت کی ملاومت کو توڑا اور روس کو جمہوری حکومت بخشی۔ ہندوستان میں اس وقت ایک نیا دور ادبی مذاق کا نظر آرہا ہے۔ ہندوستان میں جتنی زبانیں رائج ہیں ان پر یورپ کا ایک بہت بڑا اثر ہے۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی اور ہندی زبانوں میں سالانہ کتابوں اور رسالوں کی تعداد اُردو کے رسالوں اور کتابوں سے بالمقابل زیادہ ہے۔ ہندی اور بنگلہ زبان میں بعض اخبار اور رسائل ہزارہا کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اُردو رسالے اور اخبارات ہمیشہ اپنی قسمت کو جھینکتے رہتے ہیں۔ منشی پریم چند صاحب کے افسانے اُردو میں سب سے پہلے مقبول عام ہوئے۔ لیکن ان کے ہندی مجموعہ کو جس قدر بازارِ عالم میں قبولیت حاصل ہوئی اتنی اُردو میں نہیں۔ ان حالات کے لحاظ سے اُردو زبان کی ترقی ایک حد تک رُک گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لیتھو کے چھاپے پر پندرہ سو یا زیادہ سے زیادہ دو ہزار سے زیادہ نہیں چھپ سکتا اور ٹائپ میں دس ہزار بیس ہزار تک چھاپ سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے

یہہ ہے کہ یہاں سوال لیتھو اور ٹائپ کا نہیں ہے بلکہ سوال اُس طلب اور تقاضہ کا ہے جو پبلک کی طرف سے کسی چیز کے لئے کیا جا سکتا ہے۔ اگر اُردو کے رسالوں اور اخباروں کی مانگ زیادہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حامیانِ اُردو ٹائپ سے مدد نہ لیتے۔ ہمارا ادبی ذوق بہت گرا ہوا ہے۔ ہماری روزمرہ کی شاعری میں زیادہ تر ناکامی۔ محرومی۔ اور پریشانی کا حصّہ ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ عالمِ نزع کا منظر آنکھوں میں پھر جائے اور گورِ غریباں کے حسرت ناک مناظر ایک ایک کرکے لفظوں میں جھلکنے لگیں۔ شاعر اور اس کی شاعری اس قوم اور مُلک کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ہماری موجودہ شاعری میں زیادہ تر مایوسی اور ناکامی کے مضامین اسوجہ سے ہوتے ہیں کہ ہم خود اسی عالم میں ہیں۔ جب ہم ہندوستان کی اور زبانوں کے شاعرانہ تخیلات کو دیکھتے ہیں تو ان میں جوش۔ جذبہ اور وسعت نظر پاتے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اُردو کی شاعری کا میدان قوم کی تنگی نظر سے بہت تنگ ہوگیا ہے ہر مشاعری میں ہر شاعر کی غزل میں زیادہ تر اشعار اسی مایوسی اور بے کسی کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نوجوان شاعر جب شعر کہنے بیٹھتا ہے تو وہ بجائے اسکے کہ شجاعت اُولوالعزمی۔ کے تخیلات نظم کرے وہ عالمِ نزع کی کیفیت اور موت اور بے کسی کا رونا روتا ہے گویا تمام قوم کی قوم میدان فنا میں گھر گئی ہے۔ اور رونے اور پیٹنے کو اپنے لئے آخری چارہ کار سمجھتی ہے ہم کو یہ آثار کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ شاعر کا وجود قوم اور ملک کے لئے ضروری ہے۔ وہ مقیاس القوم ہے اور اسکی آواز میں ایک قوم کی قوم کا دل اور دماغ پوشیدہ ہے۔

از رسالہ جامِ جہاں نما

(ساقی کوثر نمبر)

"ادبی دنیا"

"ادبی دُنیا" ایجاد بندہ نہیں ہے: اس نام کا ایک دھوم کا تازہ رسالہ لاہور سے شائع ہوا ہے ٭ دلّی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے زیادہ لاہور میں زبانِ اُردو کی ترقّی کے اسباب مُہیّا ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ دلّی و لکھنؤ والے اس بے کار جھگڑے میں مُبتلا رہتے ہیں کہ اُردو کے مرکز ہم ہیں۔ دوسرا نہیں ٭ مرکز کے اقرار و انکار سے بحث نہیں۔ حق بجانب پنجاب ہے کہ زبان کی خدمت لاہور میں زیادہ ہو رہی ہے ٭

اُردو رسالوں کی اشاعت میری خوشی کا باعث ہے۔ چاہے جہاں سے نکلیں: مگر ریویو میری چڑ ہے اور جتنا میں ریویو سے جھجکتا ہوں ہندی مثل کے مطابق "کلوُ دے بھیت" اکثر نئے رسالے ریویو ہی کے لئے آجاتے ہیں۔ حالاں کہ "صلائے عام" نکالنے سے میری غرض یہہ نہیں کہ میں "ایڈیٹر" سمجھا جاؤں نہ ایڈیٹری میرے لئے نام و نمود کا ذریعہ ہے ٭

بہر حال۔ "ادبی دنیا" کا اہتمام دیکھ کر یہہ امر واقعی ہے کہ چیف اڈیٹر اور ایڈیٹر اور صاحبِ نگراں کی خدمتیں ایسی نہیں کہ اس رسالہ کی خوبیوں میں کوئی کسر رہنے پائے گی ٭ اس رسالہ کی اشاعت کے مقصد بہت مفصّل بتائے گئے اور قیمت اس کے خرچ اخراجات کے مقابلہ میں بہت کم رکھی گئی ہے۔ یعنی سالانہ چندہ تین روپیہ ٭

اور رسالوں سے اس میں کئی باتیں زیادہ ہیں کہ (۱) زبانِ اُردو کے مضامین کے سوا ہندوستان کی اور زبانوں کے پاکیزہ مضامین براہِ راست اور بوساطتِ انگریزی ترجمہ ہوکر شایع ہوا کریں گے ٭ (۲) **اعلان** میں ایک سخن گسترانہ تجویز ہے کہ "اُردو ادب کے اہلِ طرز" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون شروع ہوگا جس میں اُردو زبان کے اُن انشا پردازاور شعرا کے ادبی کارناموں پر بحث کی جائے گی جو نظم و نثر میں مخصوص طرز کے مالک ہیں"۔ اور اس کے علاوہ شعراءِ اُردو کے عنوان سے شاعری کے منتخب آنجہانی اور این جہانی تیس شعرا کا تذکرہ شروع کیا جائے گا" ٭ (معلوم نہیں کہ تیس کی شرط کیوں ہے؟) (۳) آخر میں "فرہنگِ الفاظ" لکھی گئی۔ یعنی مشکل الفاظ کے معنی جو مضامین میں آ گئے ٭

مجھے زیادہ تر تجویز مندرجۂ "**اعلان**" کے دیکھنے کا اشتیاق ہے کہ یہ تجویز شعر و سخن کی جان ہے اور اس میں اہلِ سخن کے لیے لکھنے کی بہت گنجایش ہے ٭

ہندی و اردو

ہندوستان کی زبانوں میں یہی دو زبانیں زیادہ مروج ہیں۔ ان میں ہندی میں نے پہلے رکھی کہ ہندی قدیم ہے اور ایک نہایت قدیم زبان یعنی سنسکرت سے پیدا ہوئی ۔ عمارت کی طرح زبان کی خوبی کا مدار زیادہ تر اُس کی بنیاد پر منحصر ہوتا ہے جس پر نیو رکھی جائے یا جس طرح حسب نسب کا اعتبار خاندان پر ہے کہ ماں باپ نیک نام و معزز و معتبر ہوں۔ ہندی کی بنیاد سنسکرت جیسی معتبر و معزز زبان پر ہے۔ اس سے زیادہ معتبر بنیاد اور کیا ہو سکتی ہے؟ صرف یہہ نصیبوں کی بات ہے کہ سنسکرت مُردہ زبانوں میں داخل ہو گئی اور اتنا زمانہ اس کی رحلت کو گزرا کہ دنیا میں بہت کم اس خاندان سے واقف رہ گئے ہیں کہ کبھی اس کا کیسا عروج تھا ۔

اُردو کی نیو فارسی زبان پر ہے جس کے عروج کے جاننے والے ابھی دنیا میں ہیں۔ فارسی ابھی مُردہ زبانوں میں نہیں۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے دُنیا میں بہت نہیں تو جو کچھ ہیں غنیمت ہیں: بقولِ عوام " ماہم غنیمت ایم و شما ہم غنیمت اید "

لیکن یہاں مجھے زبانوں کی قدامت سے بحث نہیں۔ میری غرض یہہ ہے کہ ضد کی تو اور بات ہے مگر ہندی زبان کی خوبیاں کسی زبان سے کم نہیں۔ اُردو ابھی گھٹنوں کے بل بھی چلنے کے لایق نہ ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ نے ہندی کو اپنے زمانہ کی زبانوں میں کسی زبان سے کم نہیں سمجھا ۔ حضرت غوث گوالیری نے ہندی میں

پدماوت ایسی لکھی جس کا جواب ممکن نہیں۔ یہہ زمانہ سلاطینِ مغلیہ سے پہلے کا حال تھا۔ سلاطینِ مغلیہ باوجود اس کے کہ ان کی زبان فارسی تھی ہندی زبان کی ترقی کی طرف بہت متوجہ ہوئے۔ خاصکر اکبر کے زمانے میں تو جب راجپوتانہ کے راجاؤں سے بیاہ شادی کی رسم ہوئی تو باہر دربار میں گو فارسی زبان تھی مگر گھروں میں خانگی زبان آدھی ہندی ہو گئی۔ نعوذ باللہ کا تکیہ کلام عورتوں میں "نوج" ہو گیا۔ اور شادی بیاہ میں ہندی کے گیت اور شادیانے دھوم سے رائج ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہندی کے حسن و عشق کے افسانے بادشاہ کے حکم سے فارسی میں میں لکھے گئے۔ فیضی نے مثنوی **نل دمن** ایسی لکھی کہ ایران والے دنگ رہ گئے۔ عبدالرحیم (خان خاناں) کو ہندی میں کمال تھا۔ جہاں شعراء فارسی کو ملک الشعرائی کے خطاب ملتے تھے وہاں شعرائے ہندی یعنی کبیشروں کو بھی شاہی خطاب عطا ہوتے تھے۔ یہانتک کہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اصولِ سلطنت کے مطابق جہاں اور اہلِ کمال دربار میں پیش ہوتے تھے شعراء ہندی بھی حاضر ہوتے تھے۔ اور سرکاری قدر و منزلت سے محروم نہیں رہتے تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کے زمانہ میں یہی حال رہا۔ یہہ ذکر میں اس لئے کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندی زبان سے کم توجہی نظر نہیں آتی۔ جس طرح اہلِ ہنود کی طرف سے فارسی زبان کی کبھی بے قدری نہیں ہوئی۔

کیا ڈُہائے ہندی شاعر کے چند اشعار کا ترجمہ میری ٹوٹی پھوٹی اردو میں سن لیجئے کہ میں ہندی نہیں جانتا اور شاعری میں مجھے دخل نہیں۔ گو دونوں مجھے عزیز ہیں: زبان ہندی اور ہندی کی شاعری۔

بڑھاپے میں سپید بالوں کی نسبت کیا خوب کہتا ہے کہ سر کے سپید بالوں نے میرے ساتھ وہ سلوک بد کیا جو میرے دشمنِ جانی نہ کر سکتے۔ لڑکے اور لڑکیاں چاند سے چہرہ والیاں اور ہرن سے اچھی آنکھ والیاں مجھے "بابا" (بڑے میاں) کہہ کر پکارتی ہیں۔ بقول میر سہ

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے ۔ آ بے آ بے ادھر او چاک گریباں والے × ×

× × × × × "جب میں تیز نگاہ والیاں دیکھتا ہوں جن کا خدنگِ نظر کلیجہ کے پار اتر جاتا ہے اس وقت مجھے کسی کا کیا اپنا برا بھلا بھی نہیں سوجھتا۔ میرے کان بہرے ہو جاتے ہیں کہ کسی کی پند و نصیحت سنائی نہیں دیتی۔ پارسائی و تقوے کی گاڑی میں روڑے اٹک جاتے ہیں جس طرح دریا بہتے بہتے رک جائے"۔ × × × × × × × × × ×

"آوارہ لوگوں کی صحبت سے۔ عاشق مزاج عورت سے۔ بدنام بیٹے سے دور بھاگ۔ دوسرے کے دروازہ سے روٹی مانگنی۔ برسات میں سفر۔ کتوں کے ڈربے میں زندگی بسر کرنی۔ بڑی آفتیں ہیں"۔ × × × × × × × × × × × ×

موسمِ بسنت کی تعریف

"بسنت میں درخت پھولتے پھلتے ہیں۔ ان کو پھولتے پھلتے دیکھ کر میرا نخلِ عمر بھی رنگ لاتا ہے۔ سرخ پھولوں کی رنگت کی شوخی ولولۂ عشق و محبت کی نشانی ہے اور لالہ کے جگر کی داغ نما سیاہی شبِ ہجر کی یاد دلاتی ہے"۔ × × × × × × × × × × ×

لیکن سب سے اچھا نمونہ ہندی میں موسمِ بہار کا رسالہ "ادبی دنیا" (لاہور) سے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جو ڈاکٹر بنارسی داس صاحب ایم اے۔ لکچرار پنجاب یونیورسٹی نے

"ہندی شاعری" کے عنوان سے رسالۂ ادبی دنیا میں شایع فرمایا ٭

"موسم بہار"

"موسم بہار میں کوئی نوشادی شدہ مرد سفر پر جانا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی کو پیارے شوہر کے ارادہ سفر کا علم ہوتا ہے۔ تو اُس کے جذبات محبت مچلنے لگتے ہیں۔ اور بے اختیارانہ طور پر موسم بہار کو مخاطب کرکے کہتی ہے"۔

'اے بہار میں تجھے ابھی برسات[1] بنائے دیتی ہوں۔ اس طرح میرا پتی سفر پر نہ جا سکے گا ٭ میں اپنے نیلے رنگ کے کپڑے پہن لوں گی۔ جس سے پانی بھرے نیلے بادلوں جیسی دکھائی دوں گی میرے دانتوں کی چمک اب بجلی کی طرح چمکے گی۔ میرے زیوروں میں جڑے ہوئے ہیرے جگنو کیطرح جگمگائیں گے میری رسیلی آواز پر پپیہے کی آواز کا دھوکا ہونے لگے گا۔ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہا دوں گی جس سے راستوں میں کیچڑ ہو جائیگا۔ میری ناک کا بلاق قوس قزح بن جائیگا"۔

"اے بہار دیکھ میں تجھے ابھی برسات کئے دیتی ہوں اور اپنے بالم (خاوند) کو پردیس جانے سے روکتی ہوں۔

مصنفہ دیو۔ کونا کونڈی حصہ اول صفحہ ۸۰، ۳ مطبوعہ سمت ۱۹۸۰

نوٹ۔ اس شعر میں خوبی یہ ہے۔ کہ برسات کی علامات بادل وغیرہ کو اپنے جسم کے کپڑوں اور زیور سے پیدا کر دیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں موسم برسات کا ذکر ہے۔ مگر اس میں اور ہی استعارات استعمال کئے ہیں۔ گھنے بادلوں سے چھایا ہوا آسمان اس روز سے گرج رہا ہے کہ اپنی معشوقہ کے فراق میں دلکا درد نکلا۔

(از رسالۂ ادبی دنیا۔ لاہور)

میں نے اس مضمون کا کچھ مورخانہ مسالہ مسٹر ایف ای کئے صاحب[2] بہادر ایم۔ اے کی تصنیف "تاریخ ہندی لٹریچر" سے کم و بیش اخذ کیا ہے ٭ رہا اُردو زبان کی خوبیوں کا حال۔ اس کا حال اُردو کے رسالوں اور شعراء اُردو کے قدیم و جدید کلام میں بھرا پڑا ہے ٭

[1] پرانے زمانہ میں برسات میں سفر کرنا بہت دشوار تھا۔
[2] F. E. Keay Esquire M.A.

غزل جناب

غزل۔ جناب مائلؔ دہلوی

روزِ ازل سے میں تو ندامت شعار ہوں ٭ میں وہ نہیں کہ کر کے گنہ شرمسار ہوں
کہتی پھرے اجل کہ ہمارا شکار ہے ٭ فتراک میں ہوں جن کے انہیں کا شکار ہوں
ویران زندہ دل کی بھی صحبت عجیب ہے ٭ فصلِ خزاں بھی کہتی ہے فصلِ بہار ہوں
عاشق کی خاکِ پاک کو کینہ سے واسطہ ٭ دشمن کا بعدِ مرگ چراغِ مزار ہوں
مارا ہے کس فریب سے مجھکو اجل نے ہائے ٭ کہتی ہوئی یہہ آئی کہ پیغامِ یار ہوں
ساقی یہہ کہہ رہا ہے پلا کر رہوں گا آج ٭ توبہ یہہ کہہ رہی ہے کہ چلتی بہار ہوں
واعظ کرم تو دیکھ کہ ہنگامِ مے کشی ٭ جائے نزولِ رحمتِ پروردگار ہوں
عاشق کو جان دینے میں لگتی نہیں ہے دیر ٭ دامن نہ جھٹکو تم تو ابھی میں غبار ہوں
آجائے کاش موت کہ مے خانہ پاک ہو ٭ کس کام کا یہاں ہوں اگر ہوشیار ہوں
ساقی کی چشمِ مست یہہ کہتی ہے مے کشو ٭ میں ہی بنائے گردشِ لیل و نہار ہوں
تیرِ نظر سے دل کو بچایا تو کیا ہوا ٭ غمزہ یہہ کہہ رہا ہے کہ خنجر گزار ہوں
ہنستا چلوں نہ دل کے جنازہ کے ساتھ ساتھ ٭ کیوں ایک بیوفا کے لیئے سوگوار ہوں
آئینہ دیکھ دیکھ کے کہتے ہیں دل میں شیخ ٭ جاؤں جو میکدہ میں فرشتہ شمار ہوں
عبرت کدہ کو اپنے سجا کر کر دل بھی کیا ٭ جب سے خوشی کو عار کہ میں سوگوار ہوں
مسجد میں یار کرتے ہیں منہ پھیر کر سلام ٭ جاتا ہوں میکدہ میں تو یاروں کا یار ہوں
ان کے گلے کا ہار جو ڈالے ہوئے ہوں میں ٭ ہر سانس کہہ رہا ہے نسیمِ بہار ہوں
کیا ہوں جو عشقِ غیر میں بیزار مجھسے ہو ٭ روزِ فراق ہوں کہ شبِ انتظار ہوں
کھلتا نہیں یہہ رازِ محبت ہے چیز کیا ٭ آتا نہیں سمجھ میں کہ کیوں بے قرار ہوں

کیا میرے دل میں کنج شہیداں ہیں بیشمار ❊ ہر داغ کہہ رہا ہے چراغِ مزار ہوں
ساقی کی چشمِ مست پہ صہبا ہے جامِ بہ ❊ اس سوچ میں ہے توبہ کہ کس پر نثار ہوں
مائل سخنوری میں تو دعویٰ نہیں مجھے
اگلے اساتذہ کا مگر یادگار ہوں کو

صلائے عام۔ بکتی پھرے اجل کہ ہمارا شکار ہے ❊ فتراک میں ہوں جن کے انہیں کا شکار ہوں
مارا ہے کس فریب سے مجھکو اجل نے ہائے ❊ کہتی ہوئی یہہ آئی کہ پیغام یار ہوں
ساقی یہہ کہہ رہا ہے پلا کر رہوں گا آج ❊ توبہ یہہ کہہ رہی ہے کہ میں تو بہار ہوں
آجائے کاش موت کہ میخانہ پاک ہو ❊ کس کام کا یہاں ہوں اگر ہوشیار ہوں
کیا ہوں جو عشقِ غیر میں بیزار مجھسے ہو ❊ روزِ فراق ہوں کہ شبِ انتظار ہوں
(یوں تو اور شعر بھی صاد کے لائق ہیں مگر زیادہ صاد کرنا انتخاب میں داخل نہیں تھا۔ ان شعروں میں جو اوپر لکھے گئے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات نئی ہے۔ اور مقطع تو بالکل سچ ہے کہ ع "اگلے اساتذہ کا مگر یادگار ہوں"۔ اساتذۂ دہلی سے آپکا کلام واقعی بہت ملتا ہے۔ یہہ امتیاز دلّی والوں کے لئے باعثِ فخر ہے۔)

مثنوی جناب مولینا کوثر

حسن افروزی تحریر بہ تمہید تصنیف البذیر

شیوۂ صحبت یارانِ صادق ❊ ہم چوں رنگ بوئے گل موافق ❊ ازمولانا کوثر ❊ پئے صراف نقدِ آشنائی ❊ عیار افروز سیم دل ربائی

پیکا محمود

یکے مجموعۂ شرح بیانی ÷ تمام اجزائے علم نکتہ دانی ÷ یکے دیوان طراز محشر عشق ÷ یکے فرمان روائے کشور عشق
یکے گلدستۂ باغ صداقت ÷ چمن پیرائے گلزار محبت ÷ ہم دلشگوئے خرم و شاد ÷ دل ہر یک زبند فکر آزاد
سخن گل کردہ زہر سو بہ رنگے ÷ جنون نوشیدہ زد مینا بہ سنگے ÷ یکے میکرد از شاہ و گدا یاد ÷ لبے شیرین بذکر عشق فرہاد
کہن رندی بجرم عشق مشہور ÷ سخن سرکردی از لیلےٰ و مجنوں ÷ عزیزی قصۂ شاہد بیاں کرد ÷ حدیث بیوفائی ترجماں کرد
دریں اثنا جوانے سخت مدہوش ÷ چنیں برسنگ زد پیمانہ ہوش ÷ کہ تا کے زیں جگر پاراں خروشید ÷ شرابے کہنہ دارم بنوشید
بس آنگہ اخگرے پنہاں تہ دود ÷ نہ اخگر شعلہ زار عنبر آلود ÷ جہاں سوز آتش بتخانۂ عشق ÷ کہن برقے ز آتش خانۂ عشق
نمک آلودہ مینائے شرابے ÷ بزیر ابر پنہاں آفتابے ÷ لباس کہنۂ بر دوش زمانے ÷ بفرق جائیگی ہا گلستانے
سخن سست موزوں داستانے ÷ بیک کامل نہفتہ در کتانے ÷ برآوردہ ازاں خونابہ مدہوش ÷ قیامت ماجرائے فتنہ درجوش
حدیث جانگداز یہا جیاں کرد ÷ زمیں با آسماں حشر فغاں کرد ÷ اثر او کرد در آئینۂ دل ÷ شد از حیرت نگاہ چشم بسمل
ز سوز برق آن آہ بلاکش ÷ ہویدا شد سپند زیر آتش ÷ حدیث عشق چوں یکسر ادا کرد ÷ نقاب از چہرۂ مقصود وا کرد
کہ ایں مہوش اگرچہ بے نظیر است ÷ دریں پیرایہ کم و بس پذیر است ÷ گل خرم نما ... بیت است ÷ مے سرجوش درد آلود حیف است
چنیں گوہر بہ سلک نظم باید ÷ کہ از فیض معانی فال رباید ÷ گر ایں ... لباس نظم پوشد ÷ دل از فرہاد و شیریں کم خروشد
اگر ایں مہر تاباں جلوہ سنجد ÷ دگر مجنوں بلیلےٰ دل نہ بندد ÷ گر ایں مخمور نوشد ساغر گل ÷ ز روئے او رہا بستاں کند گل
چو ایں لخت جگر شد حلقہ گوش ÷ ... اہل انجمن جوش ÷ ہمہ زلف سخن را تاب دادند ÷ بپائے من عجب دامی تہادند
کہ ایں لعل بدخشاں ... ÷ بود تا چند ہم سنگ شرر ہا ÷ چنیں گل رو بدیں کسوت نباید ÷ تن رعنا بخارستاں نشاید
سزد گر برقع از رویش کشائی ÷ ز خون دل کنی دستش حنائی ÷ ز سوز دل برآور نالۂ زار ÷ نمایاں کن بنخل نار گلنار
زباں را رخصت سوز بیاں دہ ÷ نفس را جلوۂ جوش فغاں دہ ÷ نظیم او طرح مثنوی کن ÷ ز پاک سینہ طرح مثنوی کن
بگلزار جہاں غفلت نہ دائی است ÷ کہ سرو عمر چنداں دلربائی است ÷ خوشا رندی کہ ماند یادگاری ÷ ز داغ دل بہار لالہ زاری
اگر طبع تو ہم دل بستہ گردد ÷ بنظم ایں داستاں گلدستہ گردد ÷ شود منظوم ایں نثر پریشاں ÷ زباں گردد بتحسینش گلستاں
اگر از دل بجوشی نالہ مانند ÷ بعشق و حسن سوگند است سوگند ÷ الہی ہم کن بر حال زارم ÷ ز تکلیف عزیزاں دلفگارم
بکوشم طرفہ افسونے دمیدند ÷ ز شوقم پیرہن چوں گل دریدند ÷ بچشم من چو مجنوں حسن لیلیٰ ÷ تجلی کن تجلی کن ۔ تجلی

بیا ساقی گزر ہم نوبہار است ٭ زمیں تا آسمان جوش شرار است ٭ شرابے دہ چو خضرم آب حیواں ٭ کر گویا تو عالی آں صنعواں
شہ اعظم بے بندہ گیں است ٭ پے فرزند تنہائی گزیں است ٭ تماشی کن رکارش از ال جہاں ٭ کر گرد غنچۂ امید خنداں

صلائے عام ۔ یہہ مثنوی حکیم محمود حسن صاحب ریاست بیکانیر سے باتساط بھیج رہے ہیں۔ اس کی حمد پچھلے پرچہ میں شائع ہو چکی ہے ٭ مثنوی کی زبان بہت پاکیزہ ہے۔ مولانا کوثر موجودہ زمانہ کے شعرا میں سے ہیں اور فارسی میں واقعی نہایت قابل۔ ذی کمال شاعر ہیں ٭ مثنوی کے ختم ہونے پر اس کا مفصل ریویو لکھا جائیگا ٭

ع بازگو از غالبِ معجز بیاں

میرزا غالب کو صوفی ماننا یا نہ ماننا ہم کو اس سے بحث نہیں اور باوجود مضمونِ پریشاں کے اس بحثِ پریشان کا افسانہ صلائے عام جیسے قلِ ما دل ادبی رسالہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن یہہ کہنا کہ ع تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔ اس کا جواب باصواب مشتمل بر انتباہ و عتاب اُسی لسان الغیب کے دیوان میں موجود ہے ؎

دیکھنا غالب سے گر الجھا کوئی ٭ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا۔

قلندری اور رندشربی مانع معرفت و ولایت نہیں ؎

اے ترا با ہر دلے رازے دگر ٭ ہر گدا را بر درت نازے دگر ٭

یہاں عشق چاہئے علم کی ضرورت نہیں۔ ع کفر گیرد کاملے ملت شود ٭

اہلِ سیر نے ان کو طبقۂ شعرا میں شمار کیا ہے۔ اور وہ ہی نہیں ہمارے زمانہ میں اگر مولانائے رومی خواجہ حافظ ۔ حضرت شیخ جام فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بھی حیات ہوتے تو موجودہ مذاق کے موافق

یہ ذیل بشاعری اُن کا نام نامی داخل تذکرہ ہوتا ہے چونکہ سالہا سال سے ایک ہم غفیر ان کو صاحب دلی کامل یقین کرتے اور لکھتے چلے آئے ہیں۔ اس کثرت آراء سے مجبور ہیں کہ خلاف جمہور قلم کیسے چلائیں ☆ خورشید عالم تاب ایک ہی خط مستقیم پر جس کا نقطہ ابتدائی مشرق اور انتہائی مغرب ہے سرگرم رفتار ہے (بحسب عقائد بطلیموس) لیکن خدا جانے مغرب کو مشرق سے کیا جانی دشمنی اور دلی عداوت ہے کہ تمام انوار جو مشرق سے طلوع ہوتے ہیں مغرب ان کو مٹا کر عالم تاریک کر دیتا ہے۔ یہی حال مشرقی علوم و فنون کا ہے کہ سب طوفان مغربی میں ناپید اور نابود ہو گئے ☆ ایک مذہب اور اُس کا پاک خیال اور سچا ڈر کسی کسی دل میں باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی مغربی علوم مغربی تہذیب۔ مغربی معاشرت رفتہ رفتہ مٹا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی عارف باللہ فانی فی اللہ کا نام نیک بھی عزت اور عقیدت سے لینا نہیں چاہتے ☆ موجودہ تہذیب اس شرافت ادبی اور کریم النفسی کو معیوب سمجھتی ہے۔ ان کا کوس لمن الملک جب ہی بجے گا جب یہ متقدمین کو مٹا دیں گے۔ قدما کو پایہ اعتبار سے گرا دیں گے۔ پچاس ساٹھ برس سے ہر مصنف کا معیار کمال یہی پایا جاتا ہے کہ مسلم الثبوت بزرگوں کی تنقید اور تنقیص سے اپنا علم ناموری بلند کر رہے ہیں ☆ یہ سچ ہے آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے اور اس غلط رفتار سے وہ منزل مقصود تک نہیں پہونچتے۔ جو قومیں مذہب سے بیگانہ ہیں وہ فضلنا بعضکم علےٰ بعض کے مسئلہ کو تسلیم نہیں کرتیں۔ بلکہ انا ربکم الاعلےٰ کے نعرہ لگاتی ہیں۔ خیر یہہ مضمون جداگانہ بحث چاہتا ہے: کجا بود منزل کجا تا ختم ☆ لیکن میرے دوستو! تمہارے ہی خیال کے موافق وہ غالب نوع انسان کا مایۂ ناز فخر روزگار ممتاز شاعر ہی سہی ☆ اور یہ بھی مانا کہ ایک فلسفی اپنے ذہن رسا سے تحقیق کا امام بن سکتا ہے مگر وہ شخص جس کو تربیت استاد۔ ترغیب احباب قدردانی اہل عصر نصیب نہوا اور بجائے ان اسباب ترقیات تعریض و تنقید معاندین و حاسدین سے برابر واسطہ رہا ہو وہ حکیمانہ کشف حقایق فرمائے۔ اس کا دیوان الہامی کتاب اس کا کلام فلسفہ حیات کا لب لباب سمجھا جائے لطیفہ غیبی اور عطیہ وہبی نہیں تو کیا ہے؟ یہہ اور بات ہے کہ موجودہ ایجادات کے حیرت ناک کرشمہ دیکھکر یا سنکر ہم اُس واہب بے منت اور فاعل حقیقت کو نظر انداز کرکے مجازی صناع کے

معتقد ہو جائیں۔ لیکن فی الحقیقت یہ سائنیس جو قابل انسانوں کی دماغی خوبی سے پیدا ہے ہمکو ایک احسن
الخالقین احکم الحاکمین کے ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ جس نے انسان خلیفۂ رحمان کو لقد کرمنا کی عزت بخشی
جس میں تمام مادیات اور روحانیات کے جوہر موجود ہیں اور ہر زمانہ میں طرح طرح کی دل فریبیوں سے
ظاہر ہوتے رہے ہیں وہ ہی قوت اب مادی ایجادات میں صرف ہو رہی ہے اور جس قدر اس میں انہماک
ہے ہم نہیں کہتے کہ قابل اعتراض ہے مگر دونوں آنکھوں سے کام لینا چاہئے انسان میں ایک جزو روحانی
بھی ہے لہذا روحانی ترقی بھی ہونی چاہئے اور جس تعلیم سے روحانی ترقی ہوتی ہے اس کا نام مذہب ہے
جس سے فی زماننا اہل مغرب کی طرح اہل مشرق بھی بیگانہ ہو رہے ہیں۔ اور جس طرح عقل کے بندے
مذہب پر معترض ہوتے ہوتے اور مذہبی حکموں پر یہہ کیا ہے اور کیوں ہے کہتے کہتے چھوٹے بڑے سب
ایک ہی دہریت کے رنگ میں شور بور ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس وقت کوئی پیمبر ہادی نہیں ملتا جو روحانی
قوت دکھا کر دفع فتنہ ارتداد کرے اس لئے مذہب کو ایک بے وقوفی کی صورت میں جھٹلاتے رہتے ہیں
حالانکہ بانی مذہب حقیقی رہنما اور سچا پیمبر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسے، حضرت عیسے علیہم
السلام صاحب صحف اور صاحب کتاب جلیل القدر پیمبر تھے اور جس طرح اس وقت دہریہ پرستی
ہے ان کے وقت میں بھی اسی طرح کے مخالف مذہب قومیں تھیں مگر ان پیمبروں نے اپنی روحانی
قوت سے معجزات کی طاقت سے ان مخالفین کو مغلوب کیا اور نفس پرستی سے بچا کر حق پرست بنا دیا
جو کچھ حضرت مریم کی عصمت حضرت عیسٰے کی عظمت دنیا میں پھیلی وہ قرآن پاک کی آواز ہے نزول قرآن
سے پہلے یہودی حضرت عیسٰے کو یوسف نجار کا بیٹا سمجھتے تھے۔ جب اسلام نے اس اتہام کی تردید
کی تو اپنی ترقی چاہنے والوں کے ہاتھ ایک مضمون آ گیا اور انہوں نے عہد عتیق اور بعدہٗ عہد جدید لکھ ڈالا
چونکہ یہہ کتابیں انجیل کی پوری ترجمانی نہیں کر سکتی تھیں اور زیادہ حصہ اختراعی تھا اس لئے ان ہدایات
کا روح انسانی پر پورا اثر نہ پڑا اور ہر شخص اس کو تار عنکبوت سمجھکر ان قیودات سے جلدی رہا ہو گیا
اب یہی حال اہل اسلام کا ہے اور عنقریب یہ بھی مذہبی پابندیوں سے آزاد ہونے والے ہیں۔ مگر
یہ ان کو واضح رہے کہ یہہ مذہب مٹ نہیں سکتا اِنَّا لَهُ لَحَافِظُون تیرہ سو برس سے اس کے

مٹانے اور بگاڑنے کی مسلسل کوششیں ہوتی چلی آتی ہیں لیکن ع بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی یہ سچا مذہب اپنی نورانی طاقت سے بڑہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں بھی ایسے ایسے گریجویٹ اور نامور اصحاب اسلام کے غلامی میں داخل ہوئے ہیں کہ سو برس گزشتہ میں اُن کا نظیر نہ ملے گا: اور اگر ان جدید حلقہ بگوشوں کی پوری تعداد ظاہر کی جائے تو کمال حیرت ہو گی ماشاءاللہ لاقوۃ الا باللہ۔ یہ معجزہ اسلام ہے جو ہر زمانہ میں مخالفین کے تنبیہ اور ہدایت کے لئے ظہور پاتا رہا۔ الفنسٹن صاحب کا یہ تعجب کرنا حق بجانب ہے کہ ایران جیسی سلطنت فارسیوں کی صرف تین لڑائیوں میں مٹ مٹا گئی اس کی اصلی وجہہ تو وہی گستاخی ہے جو یزدجرد نے نامہ نامی نبی آخرالزماں چاک چاک کر دیا تھا خدا نے اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ کہ کرد نیافت ؟ اسی کے ساتھ تبلیغ اسلام سے اُن اصحاب باصفا اور یاران حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ نور نبوت سے جس طرح ان کے دل نورانی ہو گئے تھے اُن نورانیوں نے اپنے دین کے نور کو کیانیوں اور تورانیوں کے دل میں بھر دیا اور ہزاروں برس کے مشرکانہ خیال کو بلا مباحثہ مٹا دیا؛

اللہ اکبر کیا تطہیر القلب عن ماسوے اللہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عالم جہاں بعرض بساط وجود تھا ✦ جوں صبح چاک جیب مجھے تار و پود تھا
گردش محیط ظلم رہا جس قدر فلک ✦ میں پائمال گردشِ چشم کبود تھا
مقطع۔ خورشبنم آشنا نہوا ورنہ میں اسد ✦ سرتاقدم گزارش ذوق سجود تھا

فی الحقیقت مرزا غالب علوم ظاہری وکمال شاعری کے ساتھ علم باطنی بھی رکھتے تھے وہ خاندان چشتیہ بہشتیہ میں حضرت مولانا فخر جہاں خورشید دوجہانی کے خلیفہ تھے۔ کبھی کبھی اپنے درجۂ ولایت کو بطریق استہزا کہہ بھی دیتے تھے ؎

دیکھنا غالب سے گر اُلجھا کوئی ✦ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

یہاں کمالِ باطنی یہہ دکھایا ہے کہ اپنی زبان سے کافر بصیغہ اسم فاعل نہیں بلکہ کافر بفتح فا بمعنی معشوق ادا کیا ہے ؎ اکافرِ عشقیم خدا کافر ما ؛ ما در بر عشقیم خدا در بر ما ؛

اسی طرح ؎

یہہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب ٭ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

کس قدر صادق البیانی ہے۔ مرزا علیہ الرحمۃ کی کرامت اُن کا سہل ممتنع عدیم النظیر کلام ہے اور جس قدر غور کیا جاسے گا اُن کی معرفت تصوف کو بڑھاتا جائے گا۔ ہر چند ہوئے مشاہدۂ حق کی گفتگو از کتمان اسرار جو تصوّف کا فرض اولیں ہے حضرت غالب کا کیش و آئین ہے وہ باطن میں منور اور بظاہر مکدر رہنا پسند کرتے تھے جو اکثر متصوفہ نے ریا و نمود سے بچنے کو مجبوراً اختیار کیا ہے۔ احباب سے بہ تواضع و خندہ پیشانی پیش آنا دنیا کے مصائب اور معاندین کی ایذا رسانی کو منجانب اللہ سمجھکر مردانہ وار برداشت کرنا ہنگامہ غدر ۵۷ء میں صبر کئے ہوئے بیٹھے رہنا گرم و سرد زمانہ سے نہ لڑکھڑانا اپنے مقصد اور عقیدہ پر قائم اور ثابت قدم رہنا۔ ہر وارد و صادر کی خدمت اپنی مقدرت سے زیادہ کرنا۔ اسی درویش سیرت پاک طینت عاشق ذات کا کام تھا

ولہ عاشق جلوۂ ذاتم تنا نا ہا یا ہو ٭ فارغ از مرگ و حیاتم تنا نا ہا یا ہو

یہ بھی ان کی کرامت اور ولایت پر دلیل ہے کہ اہل دہلی میں وہ شیعہ یا تفضیلی مشہور تھے۔ مگر انتقال کے بعد حضرت سلطان الاولیا نظام الدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے جوار میں مدفون ہوئے یہ مقدس مقام سوائے خاصانِ خدا بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ؎ ع یا اولیا ست حشر محبانِ اولیا۔ ان کی حیات میں جس قدر ناواقف ظاہر بین ان کے ملّت و مشرب پر معترض تھے اس حسن خاتمہ اور بخیر انجامی پر سب کے مُنہ بند ہو گئے ؛ مسلمانوں میں متبرک جگہہ دفن ہونا بھی دلیل نجات سمجھی جاتی ہے۔ جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے سامنے کسی نے حضرت غالب کا یہہ شعر پڑھا ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے ٭ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے:

آپ نے یہہ شعر سُنکر مراقبہ فرمایا۔ بعدہٗ فرمایا کہ غالب مغفور کا کیا کہنا۔ رحمت الٰہی نے بخش دیا؛ دہلی میں ایک بزرگ نے مرزا علیہ الرحمۃ کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ مرزا کیسے گزری؟

فرمایا۔ مجھے میرا دیوان دیا گیا اور حکم ہوا پڑھ۔ میں نے دیوان کھول کر یہ شعر پڑھا ؎

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است میخورد ؛ سوگند کردگار بجانِ محمد است

دریائے رحمت جوش میں آیا اور اس گنہگار کو بخش دیا سبحان اللہ وبحمدہ +

میرے اس تطویل کلام پر اکثر اصحاب بد دماغ ہو کر فرمائیں گے کہ مرزا کی شاعری کے متعلق تبصرہ لکھ رہا ہے یا ان کی کرامتیں گنوا رہا ہے۔ لہذا باادب ان کی خدمت میں التماس ہے کہ ہم بحمداللہ مسلمان ہیں۔ ہمارے لئے دین اور دنیا دونوں ہیں۔ ہماری دنیا ہماری دینداری پر مشروط اور منحصر ہے اگر ہماری حق پرستی کامل ہے تو دنیا ہماری خاک کفش پا ہے اور اگر خدانخواستہ دولت دین سے محروم ہیں تو دنیا کی ٹھوکروں میں ہماری قضا ہے + اگر ہم درستی اسلام کے ساتھ فقیر خاک نشین بھی ہوں تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم کچھ مال نہیں۔ اور اگر دین بیچ کر ملک و مال دنیا اول تو حاصل ہی نہیں ہو سکتا اور بالفرض محال حاصل بھی کر لیا تو کے دن کا۔ باقی کو چھوڑ کر فانی کی محبت نے ہم کو تباہ و برباد۔ ڈانواڈول خستہ و خوار کر رکھا ہے۔ جس دن ہم اس صراط مستقیم پر ثابت قدم ہو گئے اسی دن دنیا ہمارے آگے دست بستہ کھڑی ہے + اسلام ایک دنیا ہی کی زندگی نہیں سکھاتا بلکہ ایک دوسرے عالم کے لئے مستعد بناتا ہے جہاں ضرور جانا ہوگا اور وہاں جس چیز کی ضرورت ہے اس دار العمل سے لے جانی ہے۔ ورنہ سوائے افسوس اور حیرانی کچھ بن نہ پڑیگا۔ آپ کو اہل اللہ کے مزاروں پر بار ہا جانے کا اتفاق ہوا ہوگا یہہ مانا کہ آپ سیر ہی دیکھنے گئے مگر کبھی یہہ بھی سوچا کہ الٰہی یہ کیسی ان مٹ ہستیاں ہیں کہ سینکڑوں برس سے اپنے ظہور کو مٹنے اور بدلنے نہیں دیتے۔ یہہ کیسے مردے ہیں کہ ہم زندوں سے ہر حالت میں یہاں تک کہ دنیوی وجاہت میں بھی افضل ہیں۔ ایسے مردے جو مر کر بھی زندوں سے بہتر ہیں۔ اس کی کیا وجہہ؟ اس کی وجہہ وہی تصوف اور معرفت الٰہی اور لا الہ الا اللہ کی تعلیم ہے اور بس جب تک روح کو منور نہ کرو گے حیوان سے انسان نہیں ہو گے جسم کی درستی بھی روح کی تندرستی پر منحصر ہے ؎ گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو ؛ از شما یک تن نشد اسرار جو + دہلی بائیس خواجہ

کی ہوکر

کی چوکھٹ مانی جاتی ہے لیکن تیئیسواں خواجہ سننے میں نہیں آتا۔ کیا بابِ ولایت اب بند ہوگیا۔ یا کوئی خواجہ بننا ہی نہیں چاہتا۔ نام کے خواجہ تو ماشاء اللہ لاکھوں مگر کام کا خواجہ نہیں ملتا۔

کیا جناب خان بہادر صاحب لفظ خواجہ کے متعلق فرمائیں گے کہ لفظ لقب ہے یا ذات اگر مرد خواجہ صاحب کہلاتے ہیں تو ان کی بیوی کس نام سے پکاری جائیں گی جیسے شیخ صاحب کی شیخانی۔ سید صاحب کی سیدانی۔ مرزا صاحب کی مغلانی پکاری جاتی ہیں۔ لہذا اہلیہ محترمہ خواجہ صاحب کو کیا کہہ کر پکارنا چاہیئے۔ غالباً خواجہ حسن نظامی صاحب اپنی وسیع معلومات سے ضرور ممنون فرمائیں گے کہ لفظ خواجہ سب سے پہلے کس پر اطلاق ہوا۔ اور باوجود شیخ۔ سید۔ مغل پٹھان۔ یہ خواجہ صاحب کوئی پانچویں قوم ہے یا صرف لقب۔ اگر لقب ہے تو اس کی وجہ تلقیب ارشاد فرمائی جائے سہ

دریں تعلیم شد عمرو ہنوز ابجد ہمی خوانم ؛ خدایا کے سبق آموز خواہم شد بدیوانش

موازنۂ کلام

مولانا سعدی رح۔ دلے از سنگ بباید بسرِ راہ وداع ؛ تا تحمل کند آں وقت کہ محمل بردد

مولانا غالب رح۔ نازم آن فتنہ کہ در دشت بغمخواری قیس ؛ لیلےٰ از ناقہ فرود آید و محمل بردد

طاعونی رح۔ کشادم دام بر عصفور و شادم یاد آں ہمت ؛ کہ گر سیمرغ می آمد بدام آزاد می کردم

جناب قبلہ حکیم جمشید علیخاں صاحب اختر دہلوی۔

بہ برگِ خضر شادم یاد آں روزیکہ در وادی ؛ لب خشکے نمی دیدم کہ چشم تر نمی کردم

(حکیم احمد علیخاں صاحب لقا دہلوی)

صلائے عام۔ حضرت غالب کے کمالات علمی خاصکر شاعری کے تمام ذی کمال معتقد ہیں۔ صاحب مضمون کو حضرت کی ولایت کا بھی اعتقاد ہے۔ مجھے بھی پیر بھائیوں میں سمجھ لیں کہ مضمون ختم کرنے کے لیے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ موازنۂ کلام میں مولانا غالب رح کا شعر لاجواب ہے۔ یہ میں نے انہیں کی زبان سے سنا تھا "نازم آن فتنہ" یہ کسی کے بس کا نہیں کہ "غمخواری قیس" میں ناقہ عین اسوقت چلدے جب کہ لیلےٰ محمل سے اتر چکے ؛ شیخ سعدی رح نے بھی اپنی وضع کے موافق محمل کا مضمون بہت خوب نکالا۔ لیکن غالب کے مضمون کو نہیں پہونچتا ؛ یہ شاعری نہیں الہام ہے ؛

لیلیٰ ؛ ناقہ

"عید کے پیچھے ٹر"

مندرجۂ بالا جملہ آجکل اکثر در میانِ گفتگو بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یا مفہوم کیا ہے سمجھنے والے حضرات کم ہیں اس لئے اس مرتبہ میں نے سوچا کہ ناظرینِ انکشاف کے سامنے اس کی بابت ایک مضمون پیش کروں۔ میرا خیال ہے کہ یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شہر لکھنؤ میں زمانہ قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ عید کے بعد "ٹر" منائی جاتی ہے۔ اس کے لفظی معنی کیا ہیں اس کا تو مجھے بھی علم نہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک حد تک اسے "افیونیوں" سے بڑا تعلق ہے۔ میدان "ٹر" کی شان و شوکت کے لئے بڑے بڑے خرانٹ افیونیوں کا جمع ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس لئے کہ انہیں کے کارناموں کے اظہار کا مجموعی نام "ٹر" ہے۔

میں اپنی عمر کے بیس سال لکھنؤ کی سرزمین میں گزار چکا ہوں مگر واقعہ تو یہ ہے کہ اس سے قبل میں بھی "ٹر" کی کیفیات سے ناواقف تھا اور شاید ہمیشہ رہتا مگر محض اس لئے کہ ناظرینِ انکشاف کو بھی اس کی ماہیت سے آگاہ کر سکوں۔ میں اس مرتبہ عید کے دوسرے روز پھر عیدگاہ گیا۔ جہاں پر "ٹر ٹر" کا شور ہو رہا تھا۔

حالانکہ وقت کی غلط فہمی اور دو ایک احباب کے انتظار کی وجہ سے مجھے کافی دیر ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میں اس سے کافی طور پر لطف اندوز نہ ہو سکا۔ دیکھنے کو تو میں نے بھی میدانِ "ٹر" میں قدم رکھ دیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اس کے شرکا کی تعداد میں ۹۰ فیصدی سے کم اوباش حضرات نہ تھے مجھے کچھ تو شرم اور کچھ افسوس ہوا مگر خیر اپنا مطلب حاصل کرنا تھا۔ شریفوں کی نظر سے چھپتا ہوا (جو معدودے چند تھے) میں ایک شامیانہ کے قریب پہونچا جس کے اندر ایک کثیف فرش پر ایک صاحب گنا چھیل رہے تھے اور دوسرے صاحب چلم بھرنے میں محو تھے۔ اکثر حضرات مٹی کی پیالیوں میں منہ جھکائے افیون گھول

رہے تھے اور اکثر حقہ کے کش لگانے میں مصروف تھے۔ مکھیاں کثرت کے ساتھ بھنک رہی تھیں۔ ان میں صدر جلسہ کی طرح ایک صاحب کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ سب سے سنوارے ایک کامدار دوپلی ٹوپی جو کسی وثیقہ دار نواب کے مرنے پر کسی فقیر کو بطور خیرات دیدی گئی تھی اور اس کے ہاتھ نہایت ہی زیب سر تھی۔ سچے تار گردشِ زمانہ کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے۔ ریشم کا رنگ تیل کی چکناہٹ اور تمازت آفتاب کی کثرت سے بوا ہو گیا تھا۔ چوہوں اور دیمکوں نے بھی اس میں کچھ کچھ حصہ لگا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ عجب وضع سے کمان ابرو یا نگاہِ معشوق کی مانند ترچھی جمی ہوئی تھی۔ ادھی کا کرتہ جس پر لکھنو کا نمایشی کام بنا ہوا تھا اور جس کی ایک آستین شاید کسی روز حقہ بھرتے وقت یا ایام سرما میں دامن سینکتے وقت نذر آتش ہو چکی تھی زیب بدن تھا۔ عرصے سے دھوبی کے گھر نہ جانے کے باعث اکثر جگہ بڑے بڑے دھبے پڑ گئے تھے اور رنگ بھی تقریباً خاکی ہو چکا تھا۔ پائجامہ چوڑی دار تھا جسکے گھٹنے اکثر بوسیدہ ہونے کے باعث مسک گئے تھے۔ لیکن کرتے کا دامن قریب قریب اس ... پردہ پوشی کر رہا تھا۔

اس محفل میں جو بھی تھا اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ میں حیرت میں تھا کہ آخر حاضرین کی نگاہیں انہیں پر کیوں جمی ہیں ایک دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ صاحب موصوف نے حقے کی نے کو منہ سے نکالا اور گویا ہوئے کہ "سنئے جناب جاتے جاتے جاتے جاتے ایک دریا ملا۔ جس کی موجیں ایک طوفانِ عظیم برپا کر رہی تھیں اور ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر نامراد واپس جاتی تھیں۔ شاہزادہ بہت گھبرایا اور لگا سوچنے کہ خدایا نہ کشتی ہے نہ ناخدا آخر اس امواج دریا سے پار ہوں تو کیوں کر۔ اسی سوچ میں تھا کہ داہنے جانب سے کراہنے کی آواز آئی منہ پھیر کے دیکھتا کیا ہے کہ ایک حسین ماہ جبیں برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کا عالم مرادوں کے دن۔ کڑے سے چھڑا وہ بجاتی چلی اور جوانی کے عالم دکھاتی چلی۔ چھن من کرتی ناز و انداز کے ساتھ سیاہ زلفیں مارِ سیاہ کے مانند شانوں پر بکھرائے چلی آتی ہے۔ یہ حال دیکھنا تھا کہ شاہزادے کے حواس اڑ گئے باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی جینے کی آس ٹوٹ گئی دل اکھڑ گیا۔ قدم جو لڑکھڑائے تو گھوڑا بگڑ گیا دھم سے زمین پر آ رہا ہوش اڑے اور حواس گم ہو گئے۔

اُدھر پریچہرہ نے جو یہ عالم دیکھا سمجھ گئی کہ شاہزادے کی جان پر آ بنی قدم تیزی سے اٹھاتی آگ پانی

میں لگاتی۔ اس کے قریب آپہونچی۔ کچھ عجب عالم تھا۔ یہ ماہتاب تو شاہزادہ آفتاب تھا۔ اس کا دل بھی بیتاب تھا فوراً سینہ پر دست رنگین رکھدیا سانس کی آمد و رفت معلوم ہوئی تو خدا کا شکر ادا کیا۔ دریا کے ساحل پر گئی اپنا رومال پانی سے ترکیا پانی کے چھینٹوں سے دماغ کی گرمی دور ہوئی تو شاہزادے نے آنکھیں کھولیں دیکھا دن میں چاند نکلا ہے۔ جو رُخ پر سیاہ بادلوں کی نقاب ڈالے ہے۔ خواب سمجھا لیکن اطمینان کے لئے یہ پوچھنا چاہا کہ اے ماہ لقا تو از قسم انسان ہے یا پری مگر رعب حسن ایسا طاری تھا کہ زبان وا نہ ہو سکی۔ شاہزادی نے بھی شرما کر مُنہ کو آنچل سے چھپا لیا اور دونوں پر سکتے کا عالم ہوا - - - - - - - - -

مجھے معلوم ہو گیا کہ داستان اُڑ رہی ہے۔ اگر وقت زیادہ ہوتا تو کچھ اور سنتا مگر مسلہ قریب اختتام تھا میں دوسرے شامیانے کے قریب گیا۔ وہاں بھی یہی دھج تھی۔ ایک صاحب طلسم ہوشربا کا خاکہ اُڑا رہے تھے۔ تیسرے مجمع میں چار کا دور چل رہا تھا۔ چوتھی جگہ خالی ہو چکی تھی۔ اس لئے کہ افیونیوں کے قبلہ گاہ اپنا طوطی زبان بند فرما چکے تھے اس کے علاوہ بھی چند جتھے نظر آئے۔ میں ان میں سے ایک کے قریب گیا خیر یہ جگہ افیون کی نسبت سے بری نہ تھی۔ مگر شہر کے بڑے بڑے آوارہ گرد حضرات یہاں پر جمع تھے اور ایک نئی قسم کی بزم مشاعرہ منعقد تھی۔ ہر شخص اپنی یادداشت کی ڈلری میں سے پھڑکتا ہوا ایک شعر پڑھتا تھا جس پر تحسین و آفرین کا شور بلند ہو رہا تھا اور ایسا کہ پانچ منٹ تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ دو شعر میں نے بھی سُنے تھے۔ ملاحظہ ہوں۔ ایک صاحب نے پڑھا

بلبل کی انتڑیوں میں رگ گُل کی پھانس ہے ؎ مصرع تو کچھ بھی نہیں ٹھونس ٹھانس ہے

دوسرے نے کہا ؎ جی میں آتا ہے کہ تیرے کھونس دوں ؎ کان میں پھاہا بنا کر عطر کا

میرے کان ان اشعار کے سُننے کے زیادہ متحمل نہ ہو سکے اس لئے میں اور آگے بڑھا جہاں شہر کے سیکڑوں مسلمان سبزی فروش ارکبڑیے ایک نئی طرز کی نظم پڑھ رہے تھے جسے "لکھنڈ" یا اپنی اصطلاح میں کچھ اور کہتے ہوں ۔ اس کے بعد آخری منظر یہ نظر آیا کہ ایک میدان میں اکثر ماہران فن سائکل اپنے کرتب کھا رہے تھے۔ کوئی چار چار آدمیوں کو لیکر دوڑتا تھا اور کوئی بے تیلی کسی سرکس کا ایکٹر ثابت کر رہا تھا ۔ انہیں باتوں کا نام ڑ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ حضرات جنہوں نے کبھی "جلسہ ڑ" میں شرکت نہیں فرمائی میرے مضمون سے معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں ۔ (از رسالہ الکشاف لکھنؤ)

صلائے عام ۔ "عید کے پیچھے ڑ" کا زور دلی میں بہت ہے اور ممکن ہے کہ یہاں سے لکھنو پہونچا ہو جس طرح

یہاں کی زبان اور اکثر کمالاتِ علم و فن جب دلّی بار بار برباد ہوئی لکھنؤ چلے گئے ✦ میر تقی میرؔ دلّی سے لکھنؤ پہونچے۔ حضرت انیسؔ فرمایا کرتے تھے کہ دلّی میں چاندنی چوک کے کمپنی باغ کے متصل ایک مکان تھا ✦ غرض اکثر مشغلے یہاں سے دُور دُور پہونچے۔ باہر نکل کر "دہلوی" کہلانا امتیاز میں داخل تھا۔ اب تک جب کوئی معمولی لکھا پڑھا کہیں پہونچتا ہے تو حکیم جی اور حافظ جی کے لقب سے پکارا جاتا ہے

ممکن ہے کہ "عید کے پیچھے ٹڑ" کی یادگار دلّی کی ہو۔ یہاں یہ تقریب زیادہ تر عوام میں رائج ہے مگر رائج بڑی دھوم سے ہے کہ دکاندار اور تمام پیشے والے کارخانہ دار اور کارخانوں میں کام کرنیوالے عید کے دوسرے دن عید سے زیادہ ذوق و شوق میں محلدار خاں کے باغ میں پہونچتے ہیں ✦ یہ جگہ شہر سے باہر سبزی منڈی کی آبادی سے کوئی میل ڈیڑھ میل فاصلہ پر ہے ✦ مگر بہت دُور نہیں ہے۔ عید کے دوسرے دن صبح سے عوام میں ہر شخص شہر سے "ٹڑ" میں جاتا نظر آتا ہے۔ عموماً جوان جوان سب پہونچتے ہیں۔ اس کے لئے ہر پیشہ کے لوگوں میں چندہ جمع ہو جاتا ہے۔ جو شریک نہ ہو وہ نکّو سمجھا جاتا ہے۔ گویا برادری کا مجرم ہے ✦

مگر لکھنؤ کیطرح افیونیوں کی شرط نہیں۔ ہر طرح کے نشہ باز زیادہ ہوتے ہیں۔ شام تک جی بہلانے کے ہر طرح کے عامیانہ مشغلے رہتے ہیں۔ "ٹڑ" میں جانیوالوں کی موچی۔ درزی وغیرہ کاریگروں سے ہر شخص کی تاکید ہوتی ہے کہ عید کو چیز تیار نہ ہوئی تو اتنا ہرج نہیں مگر ٹڑ میں چیز نہ ملی تو جھگڑا ہو جائے گا ✦ عید سے کہیں زیادہ ٹڑ کا شوق ہوتا ہے ✦ وہ جگہ جہاں ٹڑ میں لوگ جمع ہوتے ہیں نواب ناظر محلدار خاں کا باغ ہے۔ باغ کے دروازہ پر کتبہ لگا ہوا ہے جس میں یہ مصرعۂ تاریخ کندہ ہے "بنا کرد ناظر محلدار خاں"۔ اور اس کے سامنے تِرپولیہ اُسی زمانہ کے تعمیر شدہ ہیں اسی جگہ "ٹڑ" کا میلہ بھرتا ہے۔ اسکے قریب ہی اہلِ ہنود کا "بُدھو ماتا" کا میلہ چیت کے مہینہ میں بہت بھاری ہوتا ہے ✦

ٹڑ کے روز تمام پیشہ والوں میں تعطیل ہوتی ہے ✦ دلّی کی پھول والوں کی سیر قطب صاحب دہلی آپ نے دیکھی نہیں تو سُنی ضرور ہوگی ٹڑ گویا اسکا جواب ہے۔ پھول والوں کی سیر خاص تقریب ہے جس میں بادشاہ تک شریک ہوتے تھے۔ ٹڑ میں عوام کے سوا کوئی خاص صحبت نہیں ✦ اُس کا تعلق برسات سے ہے کہ بارش میں وہاں کی سبزی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ٹڑ میں سوا معمولی کھانے پینے کے یاروں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کاٹ دینے کے اور کوئی بات نہیں ✦ عید تو خاص و عام سبکے لئے خوشی کا دن ہے کہ بقول عرفی ؎ گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم۔ ٹڑ میں صرف عوام سے واسطہ ہے ✦

مہتمم کی طرف سے

اِطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپے، الا نہ جو قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے، مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں انکے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصول ڈاک آنا چاہیئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو۔ یعنی لسانِ عج عروسِ جمیل و لباسِ حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایکروپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائیگی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبانِ اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے - [illegible]
" " " چھہ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" " نصف صفحہ ایکسال کیواسطے [illegible]
" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے [illegible]
" " " " چھہ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے [illegible]
" نصف صفحہ " " [illegible]
" چوتھائی صفحہ " " " [illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دُگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہیئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہیئے۔

(مینجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:-

دہلی فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ۔ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شایع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana Delhi.

SALA-I-AM, DELHI. REGD. NO. L [illegible]

صلاے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best feature of the new civilization.

حسب الارشاد ناصر علی صاحب رئیس دہلی مدیر رسالہ کارپرداز دار المطبع ناصری واقعہ فراشخانہ دہلی چھاپا گیا

فہرستِ مضامین

جون سنہ ۱۹۲۹ء

زبانِ اساتذہ

ہر زبان میں لب و لہجہ کی رعایت سے امتیاز کی ضرورت ہے۔ عوام کی زبان اور ہوتی ہے اور خاص کی اور۔ شرفا کی زبان اور بازار کی زبان اور۔ عالموں کی زبان اور اور جاہلوں کی اور: یہاں تک کہ اردو میں مردوں کی زبان اور اور عورتوں کی زبان اور ہے ✤

مجھے اس سے غرض نہیں کہ اردو دکن سے نکلی یا پنجاب سے۔ لاہور اس کا گھر ہے یا حیدرآباد؟ دلی اس کا مرکز ہے یا لکھنؤ؟ سرکاری عدالتوں کی زبان کیسی ہے اور اخباروں کی کیسی؟ یہاں **زبانِ اساتذہ**" سے گفتگو ہے کہ یہہ کیا چیز ہے؟ "زبانِ اساتذہ" کی تعریف (تعریف سے مراد توصیف نہیں ہے) بلکہ اصطلاحی معنوں میں "زبانِ اساتذہ" سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح ذرا مشکل ہے کہ اس کے سمجھنے اور سمجھنے سے زیادہ سمجھانے کے لئے متکلم اور مخاطب میں غایت درجہ کے کمالاتِ علمی کی ضرورت ہے اور سب سے پہلے خدا کی طرف سے طبیعت کو بھی لگاؤ ہو یہہ وہبی ہوتا ہے کہ ع "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ انسان کے بس کا نہیں ✤

انگریزی میں "زبانِ اساتذہ" کے معنی لفظ *Classies* سے کچھ کچھ ادا ہو سکتے ہیں لیکن پورا مطلب اس سے بھی نہیں ادا ہوتا۔ کلاسکل سے روزمرہ میں زیادہ تر قدامت سے غرض ہے۔ [illegible] زبانِ اساتذہ" سے مراد مستند استادوں کی منجھی ہوئی زبان ہے جیسا

بیگانگی کی بو نہ ہو اور نہ "ایجاد بندہ" سمجھی جائے +

زبانِ اساتذہ کے سمجھنے اور سمجھانے سے یہہ بہتر ہے کہ اس کے دو ایک نمونے مثال کے طور پر نقل کر دیئے جائیں۔ حضرت اسماعیل منیرؔ نے ایک قطعہ میں جو بمدح جناب نواب احمد حسین خاں بہادر سالک لکھا اس مصرع کے ثبوت میں کہ

ع ازل کے دن سے نہیں بے علاقہ کوئی شے

عالمِ اسباب میں ہر چیز کا تعلق کس خوبصورتی سے دکھایا ہے: یہہ زبانِ اساتذہ کا بہت پاکیزہ نمونہ ہے +

قطعہ

ازل کے دن سے نہیں بے علاقہ کوئی شے + چمک ہے بہرِ قمر چاکِ دل کتاں کے لئے
اثر ملا سخنِ تلخ کو بلا ہل کا + بنی حلاوتِ جاں لذّتِ بیاں کے لئے
نصیبِ فصلِ بہاری گوشہ خروئی ہے + بنی ہے زردئیِ رُخ موسمِ خزاں کے لئے
ہجومِ غم کہیں کُشتوں کے کھیت کا حاصل + کہیں شگفتہ دلی کشتِ زعفراں کے لئے
برائے تیغِ سخن جوہرِ فصاحت ہیں + سخن کا ہے خم و چم خنجرِ زباں کے لئے
شرابِ آبِ بقا بہرِ ساغرِ ظلمات + مسیح و خضر بنے عمرِ جاوداں کے لئے
پئے طوافِ حرم اہلِ قبلہ ساعی ہیں + برہمنوں کی جبیں سجدۂ بتاں کے لئے
نزول جانبِ پستی برائے صیدِ زبوں + عروج طائرِ فردوس آشیاں کے لئے
نظر کے واسطے آنکھیں ہوا سس بہرِ دماغ + لہو رگوں کے لئے مغز استخواں کے لئے

بتوں کے واسطے انداز و دل بری و ادا ٭ نیاز و عجز و قناعت عاشقاں کے لئے
خلش ہوئی مژۂ تیر کے لئے پیدا ٭ بنی ہے چین و شکن ابروئے کماں کے لئے
دہن کا وصف ہے حصّہ میں نکتہ سنجوں کے
صفات موئے کمر طبع غیب داں کے لئے

اس قطعہ میں قریب پچاس شعر ہیں اور کسی میں ابتذال کی ہوا بھی نہیں لگی اور سب میں کمالِ شاعری دکھایا ہے۔ کیونکہ ممدوح جن کے نام یہہ قطعہ ہے بہت نامور سخن سنج و سخن فہم تھے ٭

مناظرۂ ہستی و مرگ

ہماری زبان کی شاعری میں خیالی مناظرہ کا طرز بھی اساتذہ کی ایجاد ہے۔ چنانچہ اسماعیل منیر کے ایک قصیدہ کی تشبیب جو نعت میں ہے اسی وضع پر ہے ٭

قصیدہ مطلع الانوار در نعت جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

شب گزشتہ ہجوم بلا سے تھا میں دوچار ٭ نصیب سوتے تھے فتنے ہزاروں تھے بیدار
مہیب رات تھی ایسی کہ بس خدا کی پناہ ٭ زبانِ ہر سرِ مو پر تھی الاماں کی پکار
مکان گورِ کہن فرش خاک بالشِ سنگ ٭ کھڑے تھے بھاگنے کے واسطے در و دیوار
وفورِ کرب سے یوں کروٹیں بدلتا تھا ٭ کہ جیسے دغدغہ میں رنگ چہرۂ بیمار

نصیری رات کی تعریف

نہ لکھ سکے جو اندھیرے میں میری کیفیت — فرشتے کاندھوں سے گھبرا کے اڑ گئے ناچار

عجب نہیں ہے جو آنکھوں کی راہ بھولے نیند — اندھیرے گھر میں غش آ آ کے پھر گیا کئی بار

نمود کاہکشاں اس طرح تھی گردوں پر ہو — کہ جیسے سنگ سیہ پر ہو چیونٹیوں کی قطار

سلائی تنگی کاجل کی شمع جلتے ہی ہو — عیاں چراغوں سے شعلہ کے بدلے کفچۂ مار

جگر سے آہ دکھاتی چلی اسے مشعل ہو — کبھی جو دم نے کیا کوچۂ گلو میں گزار

سیاہیٔ شب غم دیکھ کر پھرا الٹا — نہ پائی راہ عدم دل میں جا چھپا ناچار

اندھیری میں نہ ملا نیند کو مقام پناہ — لرز کے مردوں کی آنکھوں میں جا چھپی کئی بار

ہر اک شرارہ بنا خال چہرۂ زنگی ہو ہو — چھڑائے آہ نے ہر چند انار آتش بار

ہوا نے رکھے تھے جگنو کلاہ گردوں میں — ستارے خوف شب غم سے کر گئے تھے فرار

نہاں فلک میں ہوئی کہکشاں صبح مہتاب — نکل کے اژدہے من جا کے چھپ گئے تہ غار

اندھیروں کو دکھا رہی لعل شب چراغ کی قدر — ہوئی تھی آتش خاموش کی طرح بیکار

[illegible] آفتاب سے [illegible] — [illegible] سے پروانہ شمع سے [illegible]

چراغ [illegible] [illegible]

[illegible] تھے [illegible]

اندھیری گور [illegible] آتش تر تھی — [illegible] سے تھا [illegible]

چراغ خانۂ مفلس کی طرح ماہ فلک — [illegible] نگار [illegible]

[illegible] شب بیدار

[illegible] تک نہ [illegible]

وفورِ اشک نے روکی تھی روشنی کی راہ　　اُتار دے گئے تھے صبحِ حشر صد بار
تو زمیں بھی نہ تھی آفتاب کی تنویر　　چراغ طالعِ تاروں کی طرح تھا بیکار
کلیم نے یدِ بیضا سے بند کیں آنکھیں　　گئے جو وادیٔ ایمن میں ظلمتِ شبِ تار
فضا سے کعبہ ہوا طالبِ لباسِ سفید　　سیاہ رخت سے عباسیہ ہوئی بیزار
کفن میں مُردوں کے کافور بن کے صبح چھپی　　نکال آئی زمانہ سے ظلمتِ شبِ تار
اندھیری رات میں یوں تھا ہجومِ ابرِ سیاہ　　کہ جیسے اژدہے پر ہو سیاہ دیو سوار
ستارے رات کو جیسے تو اپنے کوئی　　ڈرانے کے لئے دندانِ زنگیٔ خوں خوار
زمانہ بیتِ حزن سے مرے کشیدہ تھا　　یہ خوف تھا کہ نہ ہو پائمال جبرِ جوار
بلا رفیق و قلق ہمنشین و غم مہماں　　ہزاروں آفتیں دربان فتنہ چوکیدار
سرہانے بیٹھی ہوئی بیکسی لئے رومال　　کھڑی تھی پائنتی کو یاس جائے خدمتگار
کہیں بلند شبِ خونِ فوجِ غم کا غل　　کسی مقام میں سینہ بہ اشک کی تھی پکار
کہیں سے چاک گریباں کی آتی تھی آواز　　شکستِ شیشۂ دل کی کسی طرف جھنکار
کہیں بلند تھی پتھر برسنے کی فریاد　　کہیں سے آتی تھی بارانِ تیر کی بوچھار
شہید ہوتی تھیں اک سمت حسرتیں لاکھوں　　جگر کے ٹکڑے کہیں لوٹتے تھے بسمل وار
کہیں بچھی تھی دلِ کشتہ کی صفِ ماتم　　کہیں نکلتے تھے تابوت ہائے صبر و قرار
کہیں گلے سے بغل گیر خنجرِ بیداد　　ہزاروں تیر کسی سمت اک جگر کے پار
کہیں کلیجہ میں تھی چھیڑ ناخنِ غم کی　　بڑھاتے تھے کہیں الماس ریزہ دل سے پیار

کہیں لپٹتے تھے سینہ سے نیزۂ سرکش — کسی طرف کو رگِ جاں بنی تھی نشتر زار
نیا محلہ نئی صحبتیں نئے رنگ — عجیب طرح کے ہمسایہ طرفہ قربِ جوار
زمانہ بھر کی بلاؤں میں مبتلا تھا میں — قضا میں جان سے تھا جان مجھ سے تھی بیزار
اِدھر تو کھینچتی تھیں سخت جانیاں دامن — اُدھر قضا مرے لے جانے کے لئے تیار
میں طرفہ رد و بدل تازہ کشمکش میں تھا — مرے لئے ہوئی ہستی و مرگ میں تکرار
ہر اک کو دونوں میں دعوئ افضلت تھا — ہر ایک کرتے تھے اپنی فضیلتیں اظہار

دعوئے ہستی

بیانِ دعوئے ہستی یہ تھا کہ سُن اے مرگ — میں تجھ سے بڑھ کے ہوں آگاہ میں صغار و کبار
مرے طفیل سے قائم ہیں آسمان و زمیں — مجھی سے ہیں مہ و خورشید مطلع الانوار
مرے سبب سے خضرؑ رہنمائے عالم ہے — مرے سبب سے ہے الیاس صاحبِ آثار
مرے سبب سے ہے فردوس آشیاں ادریس — مرے سبب سے مسیحا ہے آسماں سیار
محیطِ دہر میں میں ہوں بہ رنگِ کشتیِ نوح — ترے وجود میں طوفانِ قہر کے آثار
مرے پیالہ میں آبِ حیات ہے لبریز — تری شراب میں مخلوط زہرِ عقرب و مار
خراب ٹوٹے ہوئے مقبرے تری جاگیر — مرے نصیب میں سونے کے قصر مینا کار
ترے دماغ کو ماتس عفونت اموات — مرے مشام میں عطرِ نفیس مُشکِ تتار
جہان بھر میں تباہی تری نحوست سے — زمانہ میرے قدم کے طفیل باغ و بہار
ترے نصیب میں ہیں استخوان فرسودہ — مرے کنار میں خوبش قطع نشاہدان تتار
ترا ہے نام زمانہ میں ہادم اللذات کہ — جہان جاں کے بنا کے لئے ہوں میں معمار
خطاب مجکو دیا سب نے جانِ شیریں کا — ہر ایک تلخیِ بے نفع سے ترے بیزار
مرا جلوس سواری ہے صحت و طاقت — ترا غبارِ قدم رنگِ چہرۂ بیمار

مرے ہی دم سے ہیں ایوان زرنگار آباد — ترے قدم سے خرابی کے ہر طرف آثار
ترے نصیب میں ہے بوریا عصا ماتم — مجھے خدا نے دیا بادشاہوں کا دربار
مرے نصیب میں بانگ نشاط نغمۂ عیش — ترے بساط میں ہے نوحہ اور نالۂ زار

جواب مرگ

کہا یہ مرگ نے بس بس خموش اے ہستی — کچھ اس میں راست ہے کچھ لاف تیری گفتار
میں وہ ہوں جس سے لرزتے ہیں سرکشان جہاں — میں وہ ہوں جس سے ہیں عاجز ستمگر و اشرار
جو میں نہ ہوتی تو کرتا نہ کوئی طاعت حق — جو میں نہ ہوتی تو ہو جاتے سب عزیز آزار
مرے سبب سے شہیدوں کو ہے حیات ابد — مرے سبب سے ہیں پیوند خاک بدکردار
مرے وسیلے سے ابرار زینت فردوس — مرے طفیل سے اشرار ہیں وقود النار
پسند آتی ہے تو کس کو ضعف پیری میں — کہ اپنی جان سے ہو جاتے ہیں بشر بیزار
ترے سبب سے ہیں مخلوق میں جو دولتمند — ہزاروں رنج سے ہیں نالہ کش پس دیوار
تری شراب نہیں ہے خمار سے خالی — نہفتہ نوش میں تیرے ہیں نیش زہر ہزار
ہزاروں ہیں مرض مفلسی سے جاں برلب — بتا تو کس کو پلاتی ہے شربت دینار
ہزاروں قید میں روتے ہیں جان کو تیری — پٹکے جاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ کر ہر بار
زمانہ بھر میں ہے شکوہ ترے تلون کا — کسی کے ساتھ نہیں تیری ایک سی رفتار
کسی کو کھینچ کے مسند سے خاک پر پھینکا — کسی کو ڈال دیا چاہِ غم میں یوسف وار
امیر تھے جو سلیمانِ عہدِ دنیا میں — برنگ مور وہ پھرتے ہیں دانہ کو ناچار
غضب ہے تخت سے جمشید کو اتار دے تو — ستم یہ ہے ضحاک کو کرے مختار
بتا جو نزع کی مشکل نہ میں کروں آساں — تو تا بہ حشر پڑا تڑپے نیم کشتہ شکار
اگر کروں نہ سبکدوش میں دم سکرات — تو بار خاطر اہل و عیال ہو بیمار
غرض کہ رکھتی ہوں میں ہر عیب کا پردہ — تجھے بھی چاہیے جو دل سے میرے منت دار

غرور کر کے ہوئے مدعی خدائی کے | ترے سبب سے سلاطین ظالم و جبار
خوشی میں تو نے شہانِ عنید کو رکھا | ملول تجھ سے رہے انبیائے عرش وقار
خدا نے حکم دیا قبل اَنْتَ مُوتُوْ کا | جہاں میں مرے مشتاق رہتے ہیں ابرار
گزشتہ را صلوٰۃ اب بغور حال کو دیکھ | کہ تیرے پاس بہت بد ہیں کم ہیں نیکوکار
پیمبرانِ خدا میرے شہر میں سب ہیں | کہ جن کے نقشِ کفِ پا سے خلد ہے گلزار
یہاں سے نعت میں گریز ہے ؛

(از کلام حضرت اسماعیل منیر)

ریویو نگاری

جناب پروفیسر موہن سنگھ صاحب متخلّص بہ دیوانہ ایم۔ اے اورینٹل کالج لاہور نے اپنے نوازش نامہ کے ساتھ مجھے **سسّی پنّوں** (اسرارِ محبت نامے مثنوی) کا ریویو اس غرض سے بھیجا کہ میں اسے دیکھ جاؤں اور جناب پروفیسر صاحب کے ریویو کے متعلق اپنی رائے بھی لکھ دوں ؛ یہ ریویو آپ نے رسالہ دلچسپ کے لئے لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ سچ پوچھئے تو ریویو نگاری کا حق ادا کر دیا ؛

صاحبِ ریویو کی سخن فہمی کا بڑا ثبوت یہہ ہے کہ جو سین (مقام) اس مثنوی سے چھانٹے وہ از روے شاعری چوٹی کے ہیں۔ خاصکر یہہ مصرع تو اس بلا کا ہے کہ اگر میر حسن زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے ؏ مری قسمت میں کیا مرنا نہیں ہے ؟

پورا شعر اس طرح ہے کہ ؎

نپٹ جینے سے دل اندوہ گیں ہے ◆ مری قسمت میں کیا مرنا نہیں ہے

یہہ شعر اُس مقام کا ہے جبکہ ستی کے ماں باپ اُس کو سمجھانے آئے اور کچھ اثر نہوا بلکہ بے قراری بڑھ گئی :—

فلک پر دیکھ کر تارے چمکتے ◆ جگر پر اُس کے انگارے دہکتے ◆ نظر کرتی اگر تک جانب ماہ تو داغ اک دل پہ پڑجاتا وہیں آہ ◆ خیال اپنے کبھی دل میں یہہ کرکے ◆ جو لیٹی تھی وہ سر بالیں پہ دھر کے کہ تک آجائے آنکھوں میں اگر خواب ◆ تو دیکھوں خواب میں اُسکو میں بے تاب ◆ نہ لگتی آنکھ تو کہتی یہہ رو رو کر جو خواب آوے تو آئے خواب میں وہ ◆ گذرتی تھی جو بیتابی سے ہر شب ◆ تو گھبرا کر وہ کہتی تھی کہ یارب ؎

نپٹ جینے سے دل اندوہ گیں ہے
مری قسمت میں کیا مرنا نہیں ہے

بیقراری کی تصویر

میر حسن کی مثنوی خوب ہے۔ کیا زبان ہے اور کیا بیان۔ ذرا مرزا صاحب اسرار محبت کے مصنف کے ہاتھ کی بے قراریٔ محبت کی تصویر ملاحظہ فرمائیے :—

رہے تھی گھر میں لپٹی یوں وہ بیتاب ◆ کسی گلخن میں جیوں شعلہ ہو بیتاب ◆ ذلیل غم تھا سبھوں کے دل پر اُس کا ہوا تھا خانۂ ماتم گھر اُس کا ◆ اُسے آئے تھا سمجھانے کوئی گھر ◆ تو رہ جاتا تھا مُنہ اپنا سا لے کر جنونِ عشق جب ہوتا تھا زیادہ ◆ نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ ◆ کبھی کھڑے پہ کر زلفیں پریشاں گریباں چاک کرتی تھی بہ داماں ◆ کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں یکبار ◆ زمیں پہ بیٹھ جاتی ہوکے ناچار کبھی گھبرا کے اٹھ کر واں سے چلتی ◆ اُٹھا کر خاک اپنے مُونہہ سے ملتی ◆ غرض دشوار تھا آرام پانا ◆ کبھی اُٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا ◆ کبھی وہ دوپہر آوارہ پھرنا ◆ کبھی اُٹھنا کبھی غش کھاکے گرنا

ہیلی بس

[illegible]

یہی بس پانچ چھ تھے اُس کے ہمدرد ٭ ہم محنت قلق اندوہ غم درد ٭ کبھی سر پیٹ لیناگاہ رونا
کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا ٭ کبھی حیران ہو اک سمت تکنا ٭ کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
پری کو اک دیوانہ سا بنایا ٭ محبت نے عجب عالم دکھایا ٭ کبھی جاتے جو دیکھے تھی کسی کو
تو اس کو گھیر کر کہتی یہہ رو رو ٭ وہ بلوچوں کا جو ایک کارواں ہے ٭ کہ جس میں ایک پنوں نوجواں ہے
جگر پہ داغ میرے دے گیا وہ ٭ متاع صبر و طاقت لے گیا وہ ٭ کبھی دیکھا تو مجھ کو بھی بتا دو
٭ پہنچ جاؤں میں کچھ ایسا پتہ دو ٭

سسی کا سراپا اس طرح لکھا ہے کہ :-

سراپا چلبلاہٹ میں تھی یوں غرق ٭ نہ رہوے ایک دم بجلی وہ جوں برق
اور اُس کی نتھ کا یہ پیارا ہے حلقہ ٭ کہ گویا حسن نے مارا ہے حلقہ ٭ وہ موتی اور وہ چُنی دیکھئے جب
تو گویا ہیں وہ یک جان و دو قالب ٭ چھنک خلخال کی ہے کیا قیامت ٭ کہ ہر سُو جس سے ہے برپا قیامت
دوپٹہ چاند تاروں کا زری بافت ٭ جو اوڑھے سے گرامی شان ہو صاف ٭ سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر
شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر ٭ گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے ٭ کہ جیوں مار سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اُس میں مسکن ٭ اچنبھا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

جناب پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ نتھ اور دوپٹے اور خلخال اور چوٹی کا لطف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کسی فتنہ قامت کو راوی کے اس پار جہلم اور سندھ اور چناب کے کنارے کے کسی دیہات میں خراماں دیکھا ہو ٭

ناظرین کو شاید یہہ معلوم نہ ہو۔ کہ لفظ سسی دراصل سنسکرت لفظ ششی ہے۔ جس کے معنی ہیں چاند اور یہ ہندوانہ نام ہے۔ کہ حقیقت میں یہ سارے کا سارا قصہ ایک ہندو عورت کے پریم کا تھا۔ جسے بعد میں اسلامی رنگ میں رنگا گیا۔ یہ نام خدا جانے ہندو دھوبی نے تجویز کیا تھا جس کے ہاں وہ پیدا ہوئی۔ یا اُس دھوبی نے جس کے ہاں یہ آکر پلی جب اس کے والدین نجومی برہمن وزیر راجہ دلو نے اسے صندوق میں بند کرکے سپرد دریا بمقام پنج ندیا ترموہنی کیا تھا الخ ٭

اس میں شک نہیں کہ حسن میں پنجاب کی جسقدر تعریف کیجائے تھوڑی ہے۔ اس [illegible] عظمت

[illegible]

دادِ سخن

× × × × × × × × × × × × ×

"مجھے افسوس یہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے سخن فہم اکثر ہوں کہ ناظم شعر فہمی تو شعر فہمی اُن کو طریقہ داد دینے کا بھی نہیں آتا۔ حضرت کیا عرض کروں؟ داغ مرحوم جس زمانہ میں جاتے ہی نوکر ہوئے ہیں تو جے پور میں بھی دو ایک روز قیام کر گئے تھے۔ میں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا: اُس وقت اُن کو دردِ سر تھا مجھ سے فرمایا کہ تو کچھ پڑھ میں نے عرض کیا کہ آپ کو دردِ سر ہو رہا ہے کہا کہ اس کا علاج یہی ہے ÷ میں نے پڑھنا شروع کیا تو پندرہ غزلیں میری ایک جلسہ میں ایک حالت میں سُنیں اور ہر شعر کو آنکھیں بند کر کے نہایت غور و خوض سے سُنا۔ اور معمولی داد جیسے لوگ دیا کرتے ہیں "واہ واہ" یہ کسی شعر کی نہیں دی۔ ہر شعر کے عیوب و خوبی بیان کرتے چلے گئے ÷ اگرچہ اس نیاز مند نے حالی۔ سالک۔ انور۔ ظہیر تسنیم و رونق۔ مجروح وغیرہ کو بھی کلام سنایا اور داد جیسی چاہیے پائی۔ مگر وہ مزہ داغ کا سا نہ آیا اور آیا تو اب آیا کہ آپ نے میرے اشعار کی نسبت فقرات تحریر فرمانے شروع کئے۔ سخن فہمی اسی کو کہتے ہیں کہ جو بات شعر میں ہو اُس کو ظاہر کر دے وہ آپ میں ہے۔ اور میں جواب اندازہ کرتا ہوں تو داغ سے بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ تعالےٰ آپ کو زندہ سلامت رکھے" × × × × × × ×

(مرزا محمد تقی بیگ مائل)

غزل جناب مائل دہلوی

ہم عرشِ معلےٰ سے اُدھر دیکھ رہے ہیں ✤ تمتی ہے کہاں جا کے نظر دیکھ رہے ہیں

پانی دو نہیں تاب کمر دیکھ رہے ہیں ✤ ہمت تری اے دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں

جن کا کہ ترے سجدہ میں سر دیکھ رہے ہیں ٭ ڈالے ہوئے تسبیح گہر دیکھ رہے ہیں
موناں سے ہیں اٹھتے کبھی گو ہر ہیں برستے تیرے بھی ہنر دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں ٭
عشاق کے پر کیا ترے کوچہ کی ہوا میں اڑتے ہوئے جبریل کے پر دیکھ رہے ہیں
جو تجھپہ نظر پڑتی ہے آگے نہیں بڑھتی ہو ہم بزم میں ایک ایک نظر دیکھ رہے ہیں
کعبہ میں کھڑے شیخ کتابوں میں ریا کی کس ڈھب سے یہاں ہوگی گذر دیکھ رہے ہیں
آتے میں نظر ارض و سما نور کے طبقے ہو اک شانِ خدا وقتِ سحر دیکھ رہے ہیں
کہنے کی نہیں بات تصور میں تمہارے اک یہہ بھی ہے جدت کہ کمر دیکھ رہے ہیں
ڈرتا ہوں وہ خورشیدِ قیامت نہ بنا دیں ٭ بے پردہ مرا داغِ جگر دیکھ رہے ہیں
بینی ہے اگر شیخ تو سر سے اسے پٹکو دستار کو میخانے کے در دیکھ رہے ہیں
زندہ رہے یارب دلِ دیوانہ ہمارا ہم سر میں بہارِ گلِ تر دیکھ رہے ہیں
ہم کوثر و تسنیم سے اس جام کی تک ساقی کی نگاہوں کے اثر دیکھ رہے ہیں
کچھ بات تو ایسی ہے کہ جھک جھک کے ملایک گردوں سے تری راہ گزر دیکھ رہے ہیں
بیٹھے میں الگ ہم سرِ تسلیم جھکائے کیا جانے وہ محفل میں کدھر دیکھ رہے ہیں
صورت بھی تری دل میں ہے اور داغ بھی گویا اک برج میں ہم شمس و قمر دیکھ رہے ہیں
ہشیار ہو ہشیار کہ وہ نیچی نظر سے اے حشر ترے فتنہ و شر دیکھ رہے ہیں
کیا ہو شبِ مہتاب میں تو کام میں پاس صہبا میں ملا نورِ قمر دیکھ رہے ہیں
جن کو کہ ملا غش وہ اسے دیکھتے کیوں کر جنکو کہ ملی تابِ نظر دیکھ رہے ہیں
یا منزلِ مقصود ہمیں لینے ہے آئی ہو یا شکل تری وقتِ سفر دیکھ رہے ہیں
شیشے کو چھپائے جو پھرتے ہیں حرم میں موقعہ کی جگہ شیخ مگر دیکھ رہے ہیں
دل ہے تو ہمارا ہے جگر ہے تو ہمارا کرتے ہوئے یاروں کو سفر دیکھ رہے ہیں
اول ہے پڑا حسن نظر سوز کا پردہ ہو پھر کیونکہ اسے اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں

کیا کام کیا نقش کفِ پائے کسی کے ٭ بتخانے کو اللہ کا گھر دیکھ رہے ہیں
عشاق کی ہوتی ہیں نمازیں بھی مزے کی ٭ بیٹھے ہیں جدھر آپ اُدھر دیکھ رہے ہیں
بخشائے عجب کیا کفِ دریائے کرم تو ٭ آپ آپ سمجھے دامنِ تر دیکھ رہے ہیں
اک وہ ہی نہیں ملتا ہے ملتا ہے خدا بھی ٭ یہ اُن کی محبت میں اثر دیکھ رہے ہیں
یہ ہے سبب گریہ ہم انبارِ خدا ہیں ٭ اللہ کے بندوں کی خبر دیکھ رہے ہیں

ہم اپنی دُعائے سحری میں نہیں پاتے
مائلؔ کے سخن میں جو اثر دیکھ رہے ہیں

صلائے عام۔ اس غزل میں ان اشعار کا کیا کہنا!

ڈرتا ہوں وہ خورشید قیامت نہ بنا دیں ٭ بے پردہ مرا داغِ جگر دیکھ رہے ہیں ٭ (ناسخ کے "داغ ہجراں" سے کہ ع مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا۔ حضرت مائلؔ کا داغ قیامت کا ہے جس میں از روئے شاعری زیادہ تابناکی ہے ٭)

شیشہ کو چھپائے ہوئے پھرتے ہیں حرم میں ٭ موقع کی جگہ شیخ مگر دیکھ رہے ہیں ٭ ("موقع کی جگہ" نہایت پاکیزہ اردو ہے۔ غزل میں شراب کے مضمون جب تک اچھے اچھے نہ ہوں غزل ناقص سمجھی جاتی ہے ٭ اس بحر و شعر اس وضع کے اور ہیں

پینی ہے اگر شیخ تو سر سے یہ پٹکو ٭ دستار کو میخانہ کے در دیکھ رہے ہیں
ہم کو خود نسیم سے اس جام گلی تک ٭ ساقی کی نگاہوں کے اثر دیکھ رہے ہیں ٭)

عشاق کی ہوتی ہیں نمازیں بھی مزے کی ٭ بیٹھے ہیں جدھر آپ اُدھر دیکھ رہے ہیں
("مزے کی نمازیں" بہت خوب کہا)

ہم اپنی دعائے سحری میں نہیں پاتے
مائلؔ کے سخن میں جو اثر دیکھ رہے ہیں

(بالکل سچ فرمایا)
[illegible] اس وقت جناب سائلؔ اور جناب مائلؔ ہی ہیں ٭

مضمونِ پریشاں

ع مری قسمت میں کیا مرنا نہیں ہے ؟

"یہہ کیا" سوالیہ نہیں ہے - بطرزِ استعجاب ہے * اس مصرع کی شانِ نزول اس طرح ہے کہ نواب محبّت خاں متخلّص بہ محبّت نے سسّی پنّوں کا قصہ اردو میں اسرارِ محبّت کے نام سے نظم کیا - اور جیسا کہ حسن و عشق کے قصّوں کا دستور ہے مثنوی کی هیروآئن سسّی کے صدمۂ فراق کے سین میں سسّی کی زبان سے یہہ غایت ناامیدی کا مصرع نکل گیا * سین یہہ ہے کہ سسّی کے ماں باپ اس آوارۂ دشتِ محبّت کو سمجھانے آئے کہ ؎ یہاں سے اٹھ کے چل اپنے مکاں میں * تجھے پنّوں سے بہتر میں جہاں میں نہ ہوتی اس کی گر الفت زبانی * تو کیوں وہ چھوڑ جاتا اے دِوانی * سسّی کا جواب لاجواب ہے ؎ اور اپنی ماں سے رو رو کر کہا پھر * نہ کہیو مجھ سے یہہ بہرِ خدا پھر * مرا مت دھیان اُدھر سے ہٹاؤ * خدا کے واسطے تم یاں سے جاؤ *

صدمۂ فراق تو مشہور ہے۔ خاصکر عورت کا اور عورت بھی ہندوستاں کی اور کمسن اور محبت پہلے پہل کی۔ زندگی سے تو سب ہی محبت میں تنگ آجاتے ہیں۔ لیکن اس محبت کی ماری ہوئی نے غضب کی بات کہی کہ موت کا بھی سہارا نہیں کہ مرنا بھی نصیب میں نہیں۔ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت مرنا ہے اور یہہ عام ہے ع

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی لیکن۔ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہہ معمولی بات یعنی مرنا میر قسمت میں نہیں۔ اس مصرع کی داد جس قدر دیجائے تھوڑی

ریویو نگاری والے مضمون میں (صفحہ ۱۲) جناب پروفیسر صاحب ایم۔ اے اورنیٹل کالج لاہور نے اپنے ریویو میں اس کی داد بہت پاکیزہ دی۔ یہاں مجھے یہہ عرض کرنا ہے کہ محبت کے سامنے زندگی کچھ چیز نہیں۔ محبت کے سامنے اگر زندگی کچھ چیز ہوتی تو زندگی بے کار ہوجاتی۔ دنیا میں اگر محبت نہ ہوئی تو زندگی عزیز نہ ہوتی۔ محبت بغیر جینا زندگی کی ہتک عزت سمجھنی چاہئے۔ ع

زندہ رہنا وجہ رسوائی ہے اب میرے لئے۔ اور یوں تو آپ جو کہئے مجھے منظور ہے

فلسفی کچھ کہا کریں۔ محبت ہے لطف زندگی ہے۔ ورنہ جینا نہ جینا یکساں ہے۔

دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ کسی کو کسی سے کیوں محبت ہوتی ہے۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہاں محبت ضرور ہے۔ مگر اس کے اسباب انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ دل کے معاملہ میں وہ دماغ جس کو عقل کا ہیڈ کوارٹر سمجھنا چاہئے معطل ہوجاتا ہے۔ پروانہ شمع کو دیکھ کر جان دینے پر تیار ہوجاتا ہے اور آفتاب سے منہ چھپا لیتا ہے۔ حالانکہ آفتاب شمع سے

زیادہ دلکش ہے + گرگٹ دھوپ میں رنگ بدلتا ہے اور لالہ و گل اور ہزار گلہائے رنگین کا کچھ اثر نہیں ہوتا + پپیہے کی پیاس بارش کی ایک بوند سے بجھ جاتی ہے۔ یوں دریا، نہریں و سیلاب پڑے بہا کریں +

محبت میں مرنے کے بعد بھی لطف آنا چاہئے کہ جسم جو مرجع تکالیف تھا جب یہاں رہ گیا تو جزو لطیف کو محبت کے مزے یاد آئیں گے۔ جس طرح مدت کے خانماں آوارہ کو جب وطن دیکھنا نصیب ہو تو وہ جگہیں دیکھ کر زیادہ خوشی ہوتی ہے جن میں پہلے سے جی لگا ہوا تھا ؎

ہم بھی اپنے دلِ خوش گشتہ کا افسانۂ غم + کہہ سنائیں گے اگر ذکرِ عنادل آیا

مجھے بڑھاپے میں جوانی اور جوانی سے پہلے لڑکپن کی باتیں جب یاد آجاتی ہیں کہ کیسی بےفکری اور شباب کے ولولوں میں دن بسر ہوئے۔ ہم کسی کو چاہتے تھے کوئی ہمیں چاہتا تھا۔ بڑھاپے اور موت سے وہ صورتیں مٹ گئیں: جب یہ موانع نہ رہے تو ہمیں اُن کی یاد سے کون روک سکتا ہے؟ مجھسے عدالت کے ایک حاکم اعلےٰ نے بیان کیا کہ مجرم جو سنگین جرموں میں اپنے شہر یا گاؤں سے بھاگ جاتے ہیں آخر کو کبھی نہ کبھی وہاں پھر آتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ہاتھی کو کہیں لے جائیے ہندوستان یاد آتا ہے بقول نسیم ع اُس فیل کو یاد ہند آئی: اور اونٹ جب بھاگتا ہے پچھاں کو بھاگتا ہے +

وفورِ محبت میں مرنے والے کو موت کا خوف نہیں ہوتا۔ بلکہ مرنے کا یقین بھی نہیں ہوتا۔ جس طرح شادی مرگ میں مرگ معلوم نہیں ہوتی اور گو رونے میں آنسو

کے نکلنے کا دستور ہے مگر زیادہ ہنسی میں بھی آنسو نکل پڑتے ہیں ÷ اگر یہی حال رہے تو انسان کو قیامت تک مرنے کا خیال بھی نہ آئے ÷ موت سے اور نہیں تو زندگی کے جھگڑوں سے رہائی کی صورت ذہن میں آتی ہے اور جب رہائی ممکن ہے تو آرام میں کیا شک ہے ؟ ؏

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر دریں عالم ÷ دویدن. رفتن. ایستادن. نشستن خفتن مُردن

مرنے کے بعد اگر اور کچھ فائدہ نہ ہوا تو یہہ فائدہ کیا کم ہے کہ انسان اپنے تئیں تو ضرور بھول جائے گا۔ زندگی میں تو ہمیں رات دن اپنا ہی خیال رہا۔ اور نہیں تو یہ خیال تو مٹ جائے گا ؏

عیادت کس کی ہوگی مر گیا بیمارِ غم شب کو ÷ نہ آئیں آپ اب اس قصد سے یوں آئیے گا گھر سے

انگریزی میں خدا کو خداوندِ محبت کہتے ہیں۔ مگر اس کا تجربہ ہمیں خدا کی محبت سے نہیں ہوتا: خدا سے محبت عالمِ اسباب میں ذرا مشکل ہے۔ قیس سے پوچھئے۔ فرہاد سے دریافت کیجئے جب اُس نے اپنے سر میں تیشہ مارا: یہہ نہ ملیں تو ہندوستان میں نل دمن۔ رانجھے ہیر۔ سسی پنوں اور اسی طرح کشتگانِ محبت سے جو اب تک زندہ ہیں ان سے پوچھئے ؏

رگِ گلو کٹے سوا جو پھڑک اُٹھی قاتل ÷ سمجھ سکا نہ کوئی بھی زبان خنجر کی

قیس سے کسی نے پوچھا ؏ خدا را می شناسی گفت لیلےٰ ÷ کزو ہر ذرہ اش بینم تجلےٰ ÷

کسی دیوانہ کا (جسکو شاعر نے کافرِ حق شناس حق بجانب کہا ہے) قول ہے کہ :-

برائے پرستیدن آں صنم ÷ بہ ملکِ وجود آمدم از عدم

دگر نہ مرا میلِ ہستی نہ بود کے

سر و برگ یزداں پرستی نہ بود

خدا سے محبّت میں ضرور نہیں کہ ہم خدا کے بندوں سے محبّت نہ کریں۔ اچھی شکلوں

مہوشوں پریرویوں پر جان نہ دیں ؎

محفل ہے حسینوں کی حیران ہے آئینہ ✣ ہر فتنہ قدِ آدم اونچا نظر آتا ہے

کو ستی تھی اک خوابِ پریشاں نیند کچھ ایسی بھاری تھی

چونک اُٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھُلتی تھی

جمع ہوں کس طرح اب میرے حواسِ منتشر

آپ نے پھر اپنی زُلفوں کو پریشاں کر دیا

غزل جنابِ ذاکر دہلوی

دلِ خانہ خراب سے بیٹھے ✣ زندگی کو جواب دے بیٹھے ✣ پھیر کر مُنہ شراب سے بیٹھے ✣ وہ ثبوتِ حجاب سے بیٹھے

زلفِ مشکیں کی یاد ٹھہر ہوی ✣ دن کا سکھ شب کا خواب دے بیٹھے ✣ خط میں بھیجا ہے سادہ اک کاغذ ✣ لو وہ کورا جواب دے بیٹھے

ہم تو سمجھے تھے عشق کو نعمت ✣ اور وہ اُلٹا عذاب دے بیٹھے ✣ زُہد ہم عمر بھر کا آج تجھے ✣ اے شبِ ماہتاب دے بیٹھے

منزلِ عشق کسطرح طے ہو ✣ ہاتھ پاؤں جواب دے بیٹھے ✣ جب چلی انقلاب کی آندھی ✣ میرے ٹوپی حباب سے بیٹھے

ہوئے بے سمجھے آپ پر عاشق ۰ نظر انتخاب دے بیٹھے ۰ دفن ہم ہو چکے نہ آئے مگر ۰ ہاتھ سے وہ ثواب دے بیٹھے

شیخ کیوں ہیں فغاں بلب کیا لی ۰ یہہ مشیخت تاب دے بیٹھے؟ ۰ قبل از مرگ ہو گئے بیباک ۰ ہر نفس کا حساب دے بیٹھے

قاسمانِ ازل کو کیا سوجھی ۰ کس کو حسن و شباب دے بیٹھے ۰ جب قدم راہِ عشق میں رکھا ۰ ہوش پہلے جواب دے بیٹھے

دل لگا کر خود اپنے دل کو ہم ۰ دعوتِ اضطراب دے بیٹھے ۰ ان کی جھوٹی تسلیاں معلوم ۰ جانِ ناکامیاب دے بیٹھے

مست ہی بزم کو ئی کیا سمجھے ۰ کس کو جامِ شراب دے بیٹھے ۰ حسن سے یہ توں میں آئی غونگا ۰ کہ خدا کو جواب دے بیٹھے

خیر ہو اب تری جوانی کی ۰ ہم تو اپنا شباب دے بیٹھے

ابھی ذاکر میں سانس باقی ہے
کیوں مسیحا جواب دے بیٹھے

اس غزل کے ساتھ یہہ خط تھا :۔

مصدر لطف و کرم دام عنایتکم۔

صلائے عام بابت ماہ مئی میں جناب مائل صاحب کی ایک غزل "معرکہ کی غزل" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ غزل بیشک اچھی ہے چھوٹی بحر میں گنے چنے قافیوں کو اس خوبی سے نظم کرنا مائل صاحب کا ہی حصہ ہے اس نیازمند نے بھی کچھ اشعار اسی طرح پر لکھہ کر ہرزہ سرائی کی ہے اگر پسند خاطر ہوں تو اپنے قابل قدر پرچہ کے گوشہ میں جگہہ دیکر ممنون فرمائیں۔ راقم ذاکر دہلوی (پھاٹک حبش خاں دہلی)

بل منزلی

سیلِ زندگی

(از جناب امجد حیدر آبادی)

سالِ ومہ و روز و شب و شام و سحر میگزرد خیر و شر۔ عیش و تعب۔ نفع و ضرر میگزرد
کاروانِ ہمہ عالم ز نظر مے گزرد باش رنجیدہ کہ خوش حال مگر میگزرد

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

صفتِ بحر رواں۔ دم یزدانی گزرد توسنِ عمر چو کشتی و دخانی گزرد
موسمِ طفلی و پیری و جوانی گزرد در جہاں گزراں چون گزرانی گزرد

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گر امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

خاک میں کاخ نشیں خاک نشیں یکساں ہے بند کی آنکھ تو پھر زشت و حسیں یکساں ہے
پیٹ میں لقمۂ تر نانِ جویں یکساں ہے آگئی نیند تو پھر فرش و زمیں یکساں ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

جی نہیں چاہتا۔ افسوس مگر مرنا ہے گر نہیں خوفِ خدا موت سے تو ڈرنا ہے
مٹی پتھر سے غرض قعرِ شکم بھرنا ہے جھونپڑی ہو کہ محل ہم کو بسر کرنا ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

جبرِ سانسوں کو شب و روز بسر کرتا ہے شامِ غم ہو کہ شبِ تار سحر کرنا ہے
ہر سوار اور پیادے کو سفر کرنا ہے کوئی ہو۔ گور میں اک دن اسے گھر کرنا ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

(معارف)
(منقول از مشرق)

صلائے عام

دہلی کا مشہور قدیم اور غیر معمولی ادبی و اخلاقی رسالہ ہے۔ جو عرصہ ۲۲ سال سے نہایت آب و تاب اور حسن انتظام سے ۲۲×۲۰/۱۶ کی تقطیع کے چالیس صفحوں پر زیر اہتمام میر ناصر علیخاں بہادر۔ مالک ناصری پریس فراشخانہ شائع ہوتا ہے۔ عام چندہ سالانہ چھ روپیہ پیشگی ہے۔ لکھائی چھپائی درجہ اول کی ہے۔ رسالہ کی ہر مستقل سُرخی پر نہایت خوشنما نقاشی بنی ہوتی ہے۔ ٹائٹل پیج کئی قسم کے خطوں اور رنگوں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اور کاغذ بھی دبیز چکنا اور سفید ہوتا ہے علاوہ ان تمام ظاہری آراستگیوں کے مضامین نہایت بلند پایہ کے مفید اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ منقولات کا حصہ گو زائد ہوتا ہے مگر بہترین اور کارآمد انتخاب کے ساتھ۔ اسیطرح خاص مضامین اپنی اہمیت میں بے نظیر ہوتے ہیں۔ اپریل ۲۹ء کے رسالہ میں "مضمونِ پریشاں" کا مُستقل سلسلہ اور ع "بازگو از غالبِ معجز بیاں" کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے تعریف سے مستغنی ہے ❖ مُلک کے طول و عرض میں اگر دو چار اس طرح کے صحیح ادبی رسالے اور شائع ہونے لگیں تو زبان اُردو اور ادبِ لطیف کی بڑی حد تک اصلاح و تکمیل ہو جائے۔

نمونہ کا پرچہ بحساب ایک روپیہ فی نمبر۔ پتہ: دفتر صلائے عام۔ فراشخانہ۔ دہلی ❖

(از رسالۂ جامِ جہاں نما۔ لکھنؤ)

صلائے عام۔ صاحبِ رسالہ **جامِ جہاں نما** نے صلائے عام کا یہہ تبصرہ اور اس پر رائے مضمون "تبصرات و رائیوں" کے عنوان سے خوب لکھا۔ خوب میں اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں گو طرفداری کا شبہہ ہے مگر امر واقعی زیادہ ہے ❖ صلائے عام میں یہہ بات امتیازی ہے کہ اس کی شہرت کے لئے اس کا اشتہار اخبار و رسالوں میں چھپوانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ البتہ ایسے تبصرے اشتہار وغیرہ سے زیادہ بکار آمد ہیں کہ اہلِ علم کی رائے عوام سے زیادہ اعتبار کے قابل ہوتی ہے ❖

اُبان

گریباں

گریباں نام کو تو ایک ذرا سا کپڑا ہے مگر اس کی حقیقت کو کچھ شاعر ہی خوب سمجھتا ہے اور گریباں کے کیسے کیسے پاکیزہ مضمون نکالتا ہے۔ اور کیسی کیسی نازک خیالی و پاکیزہ بیانی سے لفظ گریباں کا نظم میں استعمال کرتا ہے۔ اور ہر موقع پر نئے نئے مضامین کے ساتھ گریباں باندھتا ہے؎

رہے دستِ جنوں کی آمد و شد حشر تک اس میں ✤ نہ ہو ویران کوچہ اے خدا چاک گریباں کا

کبھی کبھی روزمرہ میں بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وصیت کرنے والا اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ اگر میرے بعد تم نے ایسا نہ کیا تو حشر میں تمہارا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ۔ یا کوئی شخص کسی دوسرے کی غیبت کرے اور خود بھی ویسا ہی ہو تو سننے والا اسے جواب دیتا ہے کہ پہلے تم اپنے گریباں میں منہ ڈال کر تو دیکھو بعد میں دوسرے کے نقص کھولنا۔ اور عورتوں نے ایسے جواب کے لئے ایک مثل بھی بنا رکھی ہے جسکا اس موقع پر لکھنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہتی ہیں کہ: "چھاج بولے تو بولے۔ چھلنی کیا بولے گی جس میں نوسو بہتر چھید"! ایک موقع پر دوسرے مطلب کے واسطے گریباں کا لفظ بولتے ہیں۔ یعنی کسی قسم کا معاملہ کسی سے کرنے کے واسطے مشورہ لیا جائے اور صاحبِ معاملہ کا فریق ثانی ہم مرتبہ نہ ہو تو مشورہ دینے والا کہتا ہے کہ ایسے سے معاملہ کرنا چاہئے کہ جس کے گریباں تک تمہارا ہاتھ پہونچ سکے۔ جب دو شخص آپس میں جھگڑیں اور ہاتھا پائی تک نوبت آجائے تو دونوں کا آپس میں دست و گریباں ہونا بھی کہتے ہیں۔ غرض کہ روزمرّہ میں بھی گریباں کا لفظ کئی جگہ بول چال میں آتا ہے؎

ساماں ہوا جو وصلِ جنوں کا شبِ فراق ✤ لپٹے رہے ہیں دست و گریباں تمام رات

(باقی)

اسی طرح شعرائے قدیم و جدید نے بھی ہر ایک موقع پر اس لفظِ گریباں کو بڑی نزاکت اور پاکیزہ
ے سے نظم کیا ہے ✦

مرزا نوشہ غالب نے لفظِ گریباں کو اکثر موقع پر نظم کیا ہے۔ ایک موقع پر اس طرح
ہا ہے کہ ؎

آہ و کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں ✦ ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

جو گریباں چاک ہوتے ہوتے دامن تک نہ پہونچ جائے وہ ننگِ پیراہن ہے۔ اور مصرع اولے
رماتے ہیں کہ دامن پر جو اشکِ خونیں ٹپک ٹپک کر دھبے پڑ گئے ہیں اُسے گلشن سمجھئے اور گریباں جو چاک
تے ہوتے دامن پر آ پڑا ہے اُسے گل سے مشابہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب تک ایسا گریباں دامن
وہ ننگِ پیراہن سمجھنا چاہیئے۔ (میرے خیال سے جس آنکھ میں آنسو نہ ہو وہ ننگِ چہرہ ہے اور
شک خونیں ہوں تو کیا کہنا) ✦

دوسرے شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

ہوئی یہہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی ✦ کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

تے ہیں کہ مجھ غم زدہ کو صبحِ عید کی خوشی بھی چاکِ گریباں سے بدتر ہے۔ اس میں آپ نے یہہ کمال دکھا
ہے کہ چاکِ گریبان غم زدوں کی نشانی ہے۔ مگر یہاں آپ نے عید کے بہانے سے عید کی صبح
چاکِ گریبان۔ خوشی کی بدولت کر دکھایا جو کبھی کسی کو سوجھی ہی نہیں ✦)

؎ پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم ✦ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

شعر کے مضمون میں نہایت پاکیزگی اور نازک خیالی کا اظہار کیا ہے۔ یعنی دراصل کسی سے محبت
اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اخفائے محبت کہ جس سے یار کی رسوائی نہ ہو۔ جس طرح احسان کرنا کچھ
بڑا کام نہیں بلکہ اُس کا خفا ضروری ہے اور خاص کر جس پر احسان کیا جائے۔ اسی طرح جس سے
ت کی جاے اس پر بھی اظہارِ محبت سُبکی میں داخل ہے۔ نہ کہ محبت میں چاک گریباں کرنا۔ کتنا وضع
اط کو نباہا ہے کہ برسوں ہو گئے وضع کی پابندی اور احتیاط کرتے کرتے۔ یہاں تک کہ دم رکنے لگا مگر

گریباں کو نہیں چھوا کہ رسوائی کا باعث ہے بقول خواجہ میر درد ؎ ہر چند نہیں صبر تجھے درد ولیکن ✦
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہوئم

ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ ؎

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ✦ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

(اگلے زمانہ میں دستور تھا اور اب بھی دیہات اور قصبات میں رواج ہے کہ کُرتے کے گریبان کا چاک بائیں جانب رکھتے ہیں اور گریبان بہ شکلِ ہلال ہوتا ہے۔ اور جس قدر کُھلا ہوا ہوتا ہے وہ چاکِ گریباں کہلاتا ہے۔ جیسے دامن کا چاک جو دو دامنوں کو جُدا کرتا ہے۔ تو جناب مرزا صاحب کا اس شعر میں یہہ مطلب ہے کہ میں گریباں کو مُصقلہ (صیقل کرنے کا آلہ جو بہ شکلِ ہلال ہوتا ہے) سمجھے ہوئے تھا اُس سے اپنے آئینۂ دل کی صیقل کر رہا تھا مگر سوائے ایک الف جیسی لکیر کے اور اب تک صیقل نہ ہوئی اور وہ لکیر گریبان کا چاک ہے جو ٹھیک دل تک کُھلا ہوا ہے۔ جب صیقل نہوئی تب میں سمجھا کہ یہہ مُصقلہ نہیں گریباں ہے۔ جب سے گریبان سمجھا ہوں چاک کر ڈالتا ہوں کہ یہہ میرے لئے بے کار ہے ✦)

؎ خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ✦ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

(یہاں خدا سے التجا ہے کہ ان ہاتھوں کو شرم دے کہ اس عادت کو چھوڑ دیں کہ فراق میں میرے گریبان کو اور صبحِ شبِ وصل رخصت کے وقت یار کے دامن کو کھینچتے ہیں جو رسوائی کا باعث ہے۔ شرمائے کا لفظ اظہارِ عشق سے پرہیز کا اشارہ دیتا ہے ✦)

؎ ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع ✦ چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

(چونکہ میں اس دارِ فانی سے جاتا ہوں اور جنونِ عشق بھی میرے ساتھ چلا۔ اس میں یہہ نکتہ ہے کہ جب چاک گریبان سے جُدا ہوا تو صرف گریبان رہ گیا اور گریبان بہ شکلِ آغوشِ کشودہ وداعی سمجھئے۔ چاک کا گریبان سے جدا ہونا۔ جنوں کا اہلِ جنوں سے آغوش وا کر کے وداع ہونا خیال میں آتا ہے۔ لُبِ لُباب اِس شعر کا یہہ ہے کہ میرے بعد جنونِ عشق ہی نہ رہے گا اور کسی کو مجنوں اور گریباں دریدہ نہ دیکھئے گا ✦)

؎ حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ✦ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(یعنی

(یعنی افسوس ہے اُس چاگرہ کپڑے کے مقدر پہ جو عاشق کے گریبان کے لئے قسمت کیا گیا ہو ٭)

شعرا نے سپیدیٔ صبح کو گریبان سے تشبیہہ دی ہے کیوں کہ وہ ایک سپید لکیر ہوتی ہے اور اُس کو چاکِ گریبانِ صبح کہتے ہیں۔ ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی فرماتے ہیں ؎

ہوس یا چاکِ گریباں ہے جو صبحِ شبِ وصل ٭ چھٹ گیا ہاتھ سے مشتاق کے داماں کس کا

(صبح شبِ وصل کو بھی میری طرح چاکِ گریباں کی ہوس اس لئے ہوئی کہ مشتاق کے ہاتھ سے یار کا داماں چھیٹ گیا یعنی یار رخصت ہو گیا ٭)

جناب ناسخ کا مشہور مطلع ہے فرماتے ہیں ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا ٭ طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

(یعنی میرا سینہ بجائے مشرق ہے جس سے ہجر کا داغ آفتاب بنکر چمکا۔ اور طلوعِ صبح محشر ہو گیا اور یہہ صبح محشر کا چاکِ گریبان نہیں بلکہ میرا چاکِ گریباں ہے۔ ایک میرے داغ ہجر کے سبب اتنا سامان مہیا ہو گیا ٭) ؎

جنوں نے ہجر کی شب ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا ٭ کیا ہے چاک تا جیبِ سحر اپنے گریباں کا

(یعنی ہجر کی شب جوشِ جنوں کا جو زور ہوا تو گریباں کی طرف ہاتھ دوڑا اور ایسا دوڑا کہ اپنا تو اپنا صبح کا گریباں بھی چاک کر ڈالا۔ یعنی صبح ہو گئی)

دو ایک شعر خواجہ میر دردؔ کے سن لیجئے جنہیں انہوں نے گریباں باندھا ہے ٭

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں ٭ گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

(یعنی فصلِ بہار میں جوشِ جنوں کے ہاتھ سے عشاق کا تو گریباں چاک ہوتا ہی تھا۔ لیکن گل کا بھی گریبان جوشِ جنوں کے ہاتھ سے نہ بچ سکا۔ فصلِ بہار میں پھول کھلنے کی اچھی مثال ہے ٭)

پھر فرماتے ہیں کہ ؎ جوں غنچہ بجز اک دلِ صد چاک نہ پایا ٭ منہ ڈال کے جب اپنے گریبان میں دیکھا ٭

(جب اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھا تو سوائے غنچہ کے مانند دلِ صد چاک کے اور کچھ نہ تھا۔ جس صورت میں اپنا یہ حال ہو تو دوسرے کو کیا کہہ سکتے ہیں ٭)

انہی کا شعر ہے کہ ؎ بظاہر کہیں غنچۂ دل سے ملا تھا ٭ گل اُسکا گریبان و دست صبا تھا ٭
(دل اور غنچہ کی گو بظاہر ایک شکل ہے۔ مگر غنچۂ دل نہیں بن سکتا۔ لیکن گل جو غنچہ کا گریبان اور صبا کا ہاتھ تھا یعنی ہوا سے پھول کھل رہا تھا۔ پھول کھلتے ہی میرے دل چاک کی مانند ہو گیا ٭

گو یہہ مضمون چاکِ گریبان کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مگر چلتے چلاتے دو چار شعر میر تقی میر کے اور سن لیجیے بقول خواجہ میر درد ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ٭ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

جناب میر تقی صاحب میر فرماتے ہیں:۔

میں گریباں پھاڑتا ہوں وہ سلا دیتا ہے میر ٭ خوش نہیں آتی نصیحت گو کی غمخواری مجھے

(یہہ بھی کوئی غم کساری ہے کہ میں نے گریباں پھاڑا اور ناصح نے سلوا دیا وہ تدبیر کرنا چاہیے جس سے یہہ جنوں ہی نہ رہے اور چاکِ گریباں کی نوبت ہی نہ آئے بقول مرزا نوشہ غالب ؎

یہہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ٭ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

وصف اُسکا باغ میں کرنا نہ تھا ٭ گل ہمارا اب گریباں گیر ہے۔

محتاجِ گل نہیں ہے گریبانِ غم کشاں ٭ گلزار اشکِ خونیں سے جیب و کنار دیکھ

(گریباں سے مراد یہاں گردن ہے کہ غم کشوں کے گلے میں پھولوں کا ہار زیب نہیں دیتا۔ بلکہ ان کا گریباں اور پہلو اشکِ خونیں سے پہلے ہی گلزار بنا ہوا ہے۔ پھولوں کی بدلے انکی بہار دیکھنی چاہیے ٭)

؎ گریباں کو گل چاک کرنے لگے ہیں ٭ کھلے رکھ گلستاں میں بندِ قبا مت

(یار سے مخاطب ہیں کہ تیرے کھلے ہوئے بند قبا کو دیکھ کر گل بھی گریبان کو چاک کرنے لگے یعنی پھول کھلنے لگے ہیں تو اپنے بندِ قبا باندلے) ؎

بھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جس کے گریباں میں ٭ وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں
(جس کے گلے میں کئی کئی ہار پھولوں کے پڑے ہوئے ہوں اسے میری کیا فکر... ہو سکتی ہے کہ داماں میں میں اپنے جگر کے ٹکڑے لئے پھرتا ہوں۔ اُسکے گلے میں پھولوں کے ہار دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے

ہوئے جاتے ہیں اور اسکو خبر بھی نہیں ہوتی) ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ✤ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(اب کے جوشِ جنوں کا زور ہوا تو دیکھ لینا کہ دامن اور گریباں کا چاک ایک ہو جائے گا) ؎

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے ✤ اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اُٹھایا ہم نے

(گریباں ہی سے ہاتھ اُٹھالیا خوب کہا!)

؎ ہے یہ بازارِ جنوں منڈی ہے دیوانوں کی ✤ یاں دُکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی

(جنوں کے بازار کی منڈی میں چاک گریبانوں کی دُکانیں خوب فرمایا)

؎ کیا میں نے رو کر فشارِ گریباں ✤ رگِ ابر تھا تار تارِ گریباں

(میرے رونے سے جو گریباں تر ہوگیا تھا تو اس کے نچوڑنے سے گویا مینہ برسا۔ گریباں کو ابر قرار دیا اور چونکہ گریباں تار تار تھا۔ اس لئے گریباں کے تار کی رگ ابر سے بہت اچھی مثال ہے)

؎ جنوں تیری منّت ہے مجھ پر کہ تو نے ✤ نہ رکھا مرے سر پہ بارِ گریباں

("سر پہ بارِ گریباں" سے یہ خیال میں آتا ہے کہ عشق کو دماغ کا خلل کہتے ہیں۔ اور جنونِ عشق کو دماغ ہی سے تعلق زیادہ ہے۔ جب جنوں کا جوش ہوتا ہے تو گریبان کی طرف ہاتھ دوڑتا ہے۔ جب گریباں ہی نہ رہا تو ہاتھ کس کے لئے اُٹھیں گے۔ اے جنوں یہ تیرا احسان مجھ پر ہے کہ گریبان پھاڑ کے دردِ سر سے بچا دیا۔) ؎

کیا تجھکو بھی جنوں تھا کہ جامہ تیرے میرؔ ✤ سب کچھ بچا ہے ایک گریباں ہی نہیں ؎

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا ✤ بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

(قاصد جو یار کے پاس نامہ لیکر گیا تھا یار نے اُس کی بُری طرح خبر لی جس کے سبب مجھے شرمندہ ہونا پڑا) ؎

گریباں سے رہا کو تو تو پھر بھی ✤ ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا

(میر احمد دہلوی)

صلائے عام۔ گریباں کے شعر جمع کئے جائیں تو دس بیس جلدیں اکھٹا ہو سکتی ہیں۔ یہہ لفظ ہماری زبان میں سب سے زیادہ موزوں ہے کہ ہمارے ملک کے لباس میں گریبان ضروری جزو ہے ؎

مرے در پر گدایانہ صدا دیتا ہے یوں مجنوں ✦ کوئی ٹکڑا ملے مجھکو بھی دامان و گریباں کا
خدا رکھے سلامت چاکِ پیراہن کو دنیا میں ✦ یہی ہے ایک باقی صحبت دست و گریباں کا
لگا رکھا ہو کوئی تار بھی ہر کفن جس نے ✦ وہی خمیازہ کھینچے اے جنوں چاکِ گریباں کا

حضرت اسماعیل منیر شکوہ آبادی کا کس بلا کا شعر ہے ؎

گیا تھا اے خزاں فصلِ بہاری کے بلانے کو
نہ آیا پھر کر آوازہ مرے چاکِ گریباں کا

اسی طرح یہہ شعر ہیں :-

شبِ تیرہ میں کیا وحشت کو بھی رستہ نہیں ملتا ✦ ہوئی صبح اور دروازہ کھلا چاکِ گریباں کا
توقع ہو کسے ایسے مسافر کے پھر آنے کی ✦ سفر محشر کے دامن تک ہے اب چاکِ گریباں کا
چلن سینہ شگافی کا بتایا سوگواروں کو ✦ لحد نے اختراع اول کیا چاکِ گریباں کا
کفن ہی روک لے اے اشکباری تو رکے شاید ✦ جواب کے پاؤں پھیلا چاکِ داماں و گریباں کا

دوپٹہ دیکھکر مسکا ہوا جب مجھکو شک گزرا
تو بولے کیا اجارہ ہے ترے چاکِ گریباں کا

یہہ چند شعر منیر کی ایک غزل سے نقل ہوئے ہیں جس میں گریباں کے ساتھ پابندئے عطف و اضافت سے بہت گنجائش نہ تھی پھر بھی یہہ غزل ۴۷-۵۰ شعر کی ہے اور سب لاجواب ✦

صلائے عام

یونانیوں کے ذکر الاصنام میں ایک دیبی نیمی سس نامے تھی جس کے ذمہ خلاق دو عالم نے یہہ خدمت لگا رکھی ہے کہ انسان کے ارادوں میں رخنہ ڈالا کرے۔ واجب الوجود کے ثبوت میں از روئے عقائد بڑی دلیل یہی ہے کہ ہم کتنا ہی مضبوط ارادہ کریں وہ فسخ عزائم پر قادر ہے: قادر مطلق کو ہم نے صرف اسی طاقت سے پہچانا کہ عرفت ربی بہ فسخ العزائم* اس کا ثبوت تو دنیا کے ہر چھوٹے بڑے کام میں پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اخبار و رسالوں پر بھی اس کا اثر کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اب کی دفعہ صلائے عام ذرا تکلف سے وقت پر نکلے مگر ناسازئ طبیعت سے یہہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ یعنی جس طرح میں یہہ پرچہ نکالا چاہتا تھا نکل نہ سکا۔ بقول میر حسن ؎

نہ کچھ عقل نے اور نہ تدبیر نے ۔ رکھا مجکو معذور تقدیر نے

لیکن جہاں انسان نے خدا کو فسخ عزائم سے پہچانا۔ ارادوں کے پورا ہونے سے بھی وہی بات ثابت ہوتی ہے: خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی علالت سے اچھا ہو چلا ہوں اور انشاءاللہ بہت جلد حالت اصلی پر آجاؤں گا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ صلائے عام جس طرح میرا ارادہ ہے نکل نہ سکے ؎

وہ دم بھر کو سہی لیکن تسلی ہو تو جائے گی ۔ وہ جھوٹی ہی سہی لیکن کرے تو مجھسے اک کوئی

اُن کی یہہ خوبئ اخلاق کہ وعدہ تو کیا ۔ اپنی یہہ شومئ تقدیر کہ پورا نہ ہوا

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی پیشگی قیمت چھ روپے سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر رعایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اعتبار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کو اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و ناکھیائی ضرور ہو۔ یعنی لسانِ ع عروس جمیل و لباس حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر احباب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصے سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائیگی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبان اُردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے [illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" " نصف صفحہ ایکسال کیواسطے [illegible]
" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے [illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے ..... [illegible]
" نصف صفحہ " " ..... [illegible]
" چوتھائی صفحہ " " ..... [illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

(مہتمم صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:-
دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا۔
Printed and Published by Mr. Nasir Ali Khan Bahadur ([illegible]) [illegible] Press, Farrash Khana Delhi.

SALA-I-AM, DELHI, Regd. No. L. 1462.

صلائے عام



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best feature of the new civilization.

حسب الارشاد ... دار المطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی ... اور چھپا

فہرست مضامین

بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء

صلائے عام

اس وقت ہر زبان کی شائستہ لٹریچر کے دو حصے ہیں۔ نظم و نثر: یہہ صورت قدیم سے چلی آتی ہے + اس صورت سے یہہ غرض نہیں کہ نظم کو نثر سے ضد ہے یا نثر کو نظم سے تکرار ہے۔ بلکہ جس طرح نیچر نے چہرہ پر دو آنکھیں ـــ حسینوں کو دو رخسارہ تاباں۔ ناک میں دو نتھنے۔ دو ہاتھ۔ دو پاؤں کچھ نہ کچھ سمجھ کر دیئے ہیں کہ ایک دوسرے کی زینت و آرام کا باعث ہیں بقول حضرت شیخ سعدی رح:

"در ہر نفسے دو نعمت موجود است۔ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است وچوں برمی آید مفرح ذات":

اور انہیں کے ارشاد کے موافق ہر نعمت کے لئے شکر واجب ہے +

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہماری زبان میں بھی نظم و نثر دونوں نعمتیں موجود ہیں نظم تو ہماری زبان کی اس مرتبہ کی ہے کہ قدیم و جدید زبانوں میں کسی سے کم نہیں۔ ہاں مگر نثر کیطرف زیادہ توجہہ نہ ہوئی +

وجہہ یہہ ہے کہ اکثر قدیم زبانوں میں (خاصکر ایشیا۔ ان میں ہندوستان میں خاصکر)

نازک خیالی وپاکیزہ بیانی کے لئے نظم کو ترجیح دی گئی۔ یہاں تک کہ سنسکرت اور ہندی میں ریاضی اور طبی مسائل بھی نظم میں ہیں: سبب یہہ کہ نظم میں نثر سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ نظم میں تھوڑے لفظ زیادہ دل کش ہونے کی وجہہ سے جلدی یاد ہو جاتے ہیں اور نثر کے مقابلہ میں دیر تک یاد رہتے ہیں + علاوہ اسکے نظم کو کانوں کے سہارے سے موسیقی سے بہت مدد ملتی ہے + نثر کو زیادہ تر معمولی اور روزمرہ کی باتوں سے تعلق رہتا ہے۔ اور دستور ہے کہ جس چیز سے رات دن سابقہ رہے اس کا اثر کم ہو جاتا ہے +

ہندی میں رامائن کی قدر شاعری کی وجہہ سے زیادہ ہے حالانکہ نثر میں کوئی چیز بھی نہیں + فارسی میں شاہ نامہ اور حضرت مولانا روم رح کی مثنوی دینی اور دنیوی پاکیزہ بیانی اور نازک خیالی کے لاجواب نمونے ہیں جو نثر کی کسی کتاب کو آج تک میسر نہوئے + قدیم یونانی زبان میں گو نظم و نثر دونوں میں بڑے مرتبہ کی تصانیف موجود ہیں مگر شاعری میں ھومر کو ترجیح ہے گو ھروڈ ٹیس بھی تاریخ میں مشہور ہے۔ مگر قدامت میں ہومر بڑھا ہوا ہے کہ ہروڈٹس سے کئی سو برس پہلے گزرا ہے + عربی میں کتابیں بہت لکھی گئیں مگر ایام جاہلیت کی شاعری کو کوئی نہیں پہونچا۔ لٹریچر میں سبعہ معلقہ کی نظم کو **مقامات حریری** نہیں پہونچتی +

مگر یہہ تمثیلیں بہت عالمانہ بحث کی محتاج ہیں۔ یہاں مجھے یہہ عرض کرنا ہے کہ انسان کو جہاں نظم کے اکثر شعر از روئے خوبی مضمون اکثر یاد رہ جاتے ہیں نثر کی ایک سطر بھی مشکل سے ذہن میں آتی ہے۔ یہہ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں +

ہماری زبان میں شعرا کے ہزاروں نازک و پاکیزہ خیال ہر شخص کے ذہن میں موجود ملتے ہیں مگر نثر کی کوئی نازک خیالی مشکل سے یاد آتی ہے۔ نظم کی اکثر مثالیں زبان زد خلایق ہیں مگر نثر کی پاکیزہ بیانی بہت کم (وعظ و لکچر میں بھی) سننے میں آتی ہے +

نظم کے تو اصول اور قاعدے۔ ردیف و قافیہ و اوزان کے اس قدر لکھے گئے جن کی حد نہیں۔ نثر میں سوائے ایک مختصر صرف و نحو کے بہت نہیں لکھا گیا۔ نثر کی غایت یہہ سمجھ لی گئی ہے کہ ماضی و حال اور استقبال کے صیغے حفظ کر لئے جائیں۔ واحد و جمع کی غلطی نہ ہو۔ املا درست ہو: باقی دل و دماغ کی خوبیوں سے جو شعر میں پیدا ہوتی ہیں واسطہ نہیں +

صلائے عام کا یہہ دعوے نہیں کہ نثر میں نظم کی سی خوبیاں پیدا کر سکتا ہے لیکن جی چاہتا ہے کہ ہماری زبان کی شاعری کی طرح نثر کی طرف بھی توجہہ کی جائے۔ ہماری زبان کی نثر نظم سے زیادہ توجہہ کی محتاج ہے + اس طرف توجہہ دلانے کے خیال سے صلائے عام نکالا گیا ہے۔ اس سے یہہ غرض نہیں کہ صلائے عام کی طرز کی تقلید کی جائے بلکہ ہر طرز پہ لکھنے میں کمال پیدا ہو: خدا کا شکر ہے کہ آج کل ہماری زبان کے رسالے ہر طرح کے مضمون بہت بے مثل لکھ رہے ہیں جو پہلے نامور مصنفوں کی کتابوں میں بھی نہیں ملتے + رسالے نکالنے والوں کا یہہ احسان جس قدر مانا جائے تھوڑا ہے کہ ان کے باعث سے ہماری زبان نہ صرف زندہ ہے بلکہ بہت ترقی کر رہی ہے +

ایڈیٹر

× × × × × × × × × × × ×

"آپ سے بہتر نثر دہلی کی ٹکسالی زبان میں ہندوستان میں کوئی نہیں لکھ سکتا ہے۔ آپکی نثر میں نظم کا لطف ہے: اشعار آپ ایسے لکھدیتے ہیں کہ نثر و نظم میں مطلق فرق نہیں رہتا + آپ کو نثر لکھنے میں کمال حاصل ہے + کاش آپ کی تقلید اور اڈیٹر بھی کریں تو اردو زبان معراجِ کمال کو پہونچ جاوے" +

(اقتباس از نوازشنامہ جناب سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر)

اس رائے میں گو طرفداری زیادہ ہے مگر جس طرح شعر کی غایت خوبی یہہ ہے کہ نثر سے مل جائے اسی طرح نثر بھی بغیر ردیف و قافیہ کے شعر سے لگا کھائے ؎

اپنی ایجاد سے کب سادگی آسکتی ہے + وہی بے ساختہ پن ہے جو خداساز نہو +

صلائے عام میں گو زبان کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اساتذہ کی ٹکسالی زبان کی یادگار رہے مگر معلومات علمی و تاریخی خاصکر سلاطین مغلیہ کے عہد کے مضمون زیادہ ہوتے ہیں اور شعرائے دہلی و لکھنؤ کے کلام کی داد دینے میں زیادہ جی لگتا ہے ؎

اے آتشِ مے یوں تو ترے ہم نہیں قائل + رنگِ گلِ رخسار اُبل جائے تو جانیں

خوب شُہرت ہے دہان و کمرِ جاناں کی
بے نشانوں کی بڑی ناموری ہوتی ہے

مضمونِ پریشاں

اس پرچہ میں ایک مضمون بڑھاپے کے ذکر میں ہے کہ "ضعف یک فراغ منجاہد" (صفحہ) جس میں بیان کیا گیا ہے کہ بڑھاپا اسقدر بے کار نہیں جس قدر بوڑھوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ؎

باعثِ بر ہمیٔ عیش ہے پیرانہ سری ✣ صبحدم بھی کہیں سیر گذری ہوتی ہے

اس کا جواب بقول ناسخ یہہ ہے کہ ع دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گذری کا ✣ ہوا کھانے کا وقت اگر صبح کا ہے تو سیر تماشہ کا وقت شام کا سمجھئے ؎

تیرے آتے ہی جوانی آگئی اے جان جاں ✣ ڈھونڈھتا ھوں میں مرا جامہ پرانا کیا ہوا؟

ہندوستان میں شام سے بہتر کوئی وقت نہیں کہ صبح کو تو اُٹھتے ہی معاش کے لئے کام کاج اور دَوڑ دھوپ کی سوجھتی ہے شام کو ان جھگڑوں سے فراغت پاکر دل بہلانے کو جی چاہتا ہے۔ طائران ہوا جو صبح سے رزق کی تلاش میں پھرتے رہے

ن۔ م

شام کو آشیانوں کی طرف رُخ کیا۔ دھوپ سے جس سے باہر نکلنا ناگوار تھا منہ چھپایا۔ اُب آرام کے سوا کوئی خیال نہیں: پیری آرام کا زمانہ ہے +

اور گو شغلۂ محبت کے لئے پیری کو ناموزوں کہتے ہیں مگر یہہ بھی زبان زدِ خلائق ہے ع پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است۔ جوانی کی محبت کیسی ہی کیوں نہو شائبۂ ہوائے نفس سے خالی نہیں ہوتی۔ جوانی کے بعد جو محبت ہو ہوائے نفس سے خالی سمجھئے اس عمر میں جو چیز محبت سے دیکھئے زیادہ دل کش معلوم ہوتی ہے۔ طالبعلی کے زمانہ میں **گلستان** میں نے محض اِس مجبوری سے پڑھی کہ نصاب میں تھی۔ اب ڈھونڈ کر دیکھتا ہوں: مکتب میں جسقدر پڑھی تھی کبھی کی بھول گیا۔ اب جہاں گلستان نظر پڑ جاتی ہے کہتا ہوں کہ یہہ بھولنے کی چیز نہیں + ایک جگہہ حضرت رح فرماتے ہیں" یاد دارم کہ در عنفوانِ جوانی چنانکہ اُفتد دانی"۔ اس مختصر جملہ میں جوانی کے تمام کارنامے نچوڑ کر رکھدئے۔ چنانکہ اُفتد دانی" میں ختم ہوگئے +

دنیا میں سب سے اچھی زندگی میں اسے سمجھتا ہوں کہ ہم کسی کو چاہیں اور کوئی ہمیں چاہے۔ بڑھاپے میں جسے یہہ بات مُیسّر ہو اس سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں + محبت میں ہر چیز کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو پیار کی نگاہ سے دیکھنے میں اور ہی کچھ ہو جاتی ہے کوئے یار جہاں سے ہم پہلے کبھی نکلے نہیں محبت میں پڑے رہنے کو جی چاہتا ہے ؎

آں کس کہ پا نہاد بہ کوئے تو سر نداشت + واں کس کہ سر نہاد بہ پائے تو بر نداشت

اپنے مکان کے کوٹھے پر تکان کے خیال سے چڑھنے میں دل ہچکچاتا ہے مگر یار کے لبِ بام

سے اُترنے کو جی نہیں چاہتا - ہر چیز میں گو بیجان ہو جان پڑجاتی ہے ؛ انسان کو جینے کا لطف تب ہی آتا ہے جب کسی پر مرے ؛ محبت میں کوئی مصیبت کوئی تکلیف اکھرتی نہیں - زلیخا کو یوسف کے ساتھ زندان زیادہ عزیز تھا ؎

درچمن بود زلیخا و بحسرت سیگفت ؛ باتو زنداں کہ درو انجمن آراست

عمر گو کتنی ہی ہو محبت میں جوانی عود کر آتی ہے - نہ صرف جوانی بلکہ کم سنی کہ "بوڑھا اور بالا" ایک سمجھا جاتا ہے ؛

یہ جو بوڑے اور بالے کی تمثیل عرض کی گئی اس کی تشریح یوں سمجھئے کہ جس طرح بچے بغیر دلیل و حجت اپنی ماں پر بھروسہ رکھتے ہیں - اسی طرح بوڑھوں کو خدا کے سوا کسی کا سہارا نہیں - جس طرح بچے چھوٹی چھوٹی باتوں پر مچل جاتے ہیں اور جلدی بھول جاتے ہیں - اسی طرح بوڑھے زمانہ کی خفیف خفیف بدسلوکیوں پر رنج کرتے ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے - نظیری نیشاپوری نے خوب کہا ہے ؎

عمر اگر باقی است رنجش ہا کہن خواہد شدن ؛ آں دہانِ تلخ کو شیریں دہن خواہد شدن

بچوں کی زندگی کا مدار عقل و دماغ پر نہیں محض اعتقاد پر ہے - اسی طرح بوڑھوں کا سہارا صرف ایمان ہے ؎

پس از عمرے کہ بامن گفت از راہِ وفا حرفے ؛ چناں گشتم ز خوشحالی کہ از ہم نہ فہمیدم

سایۂ دامنِ عفوِ تو بہ محشر جو یند

از درِ چاکِ کفن آمدہ عریانے چند

بڑھاپے

بڑھاپے میں وہ داددہش کی طاقت نہ رہے نہ سہی۔ اس عمر میں ضعف بُرا نہیں

سد راہِ معصیت باشد پریشانی مرا ✤ داشت عُریانی نگہ ناآلودہ دامانی مرا

(عُریانی میں تردامنی کا خوف کہاں ؟)

عاشقان نامے بہ عجز و بالنوابی داشتند

کوہ کن آخر بزور ایں قوم را بدنام کرد

آتی نہیں جو زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں ✤ سودائیو لپیٹ لو زنجیر ہاتھ میں

شبِ فرقت کو ہمسر جانتے ہیں بکھرے بالوں سے ✤ تمہارے سامنے اس کو بندہا جوڑا سمجھتے ہیں

بہت سمجھا کے سرکھایا ہے تُو نے دے قیامت کو

تجھی سے پہلے ہم اے خواہشِ دنیا سمجھتے ہیں

بوڑھے مرنے میں جلدی کیوں نہیں کرتے ؟ اس لئے کہ

کریں کیونکر فدائے یار عمرِ مُستعار اے دل ✤ پرائی چیز کا دے ڈالنا بےجا سمجھتے ہیں

("عمرِ مُستعار" کے لئے ع "پرائی چیز کا دے ڈالنا بےجا سمجھتے ہیں"۔ بہت خوب کہا)

نالے نہیں زیبا ہیں مزاروں کے برابر ✤ چُپ بیٹھئے سوتے ہوئے یاروں کے برابر

آشفتہ دل سے زُلف ہے زُلف دوتا سے ہم

آسیب سے زیادہ بلا ہے بلا سے ہم

دو دن میں کنگھیوں کے جگر چاک ہو گئے ✤ راس آئے کس کو زلفِ پریشاں سے اتفاق

زلفیں وہ دیکھنے نہیں دیتے تو غم نہیں ✤ آنکھیں کریں گی خوابِ پریشاں سے اتفاق

"مضمون پریشان" کی رعایت سے یہ شعر لکھے گئے۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں ؎

نہ سہی گیسوؤں کا عشق تو سودا ہی سہی + سلسلہ کچھ تو رہے طولِ امل ہو کہ نہ ہو

جادۂ عشق میں اے خضر عبث مرتا ہے
تیری قسمت میں خدا جانے اجل ہو کہ نہ ہو

بوڑھوں کے مرنے میں جو کم و بیش دیر ہو جاتی ہے اُس کی تمثیل یوں سمجھئے کہ ناقۂ لیلیٰ تو ابھی دُور ہے۔ مگر ع وہ اُٹھی گرد وہ آوازِ درا بھی آئی ؎

خوشبو تو ہے پر بادِ بہاری نہیں آتی + گرد اُٹھتی ہے تہ رہ کے سواری نہیں آتی

مغتنم تھوڑی سی فرصت بھی سمجھ پیری میں
دم کی مہمان نمازِ سحری ہوتی ہے

اس مضمون میں آپ کہاں تک بوڑھاپے کی رام کہانی سُنے جائیں گے؟ جوانی اور جوانوں کا بھی کچھ ذکر ہو ؎

صفتِ حور کہاں تک میں سنوں واعظ سے + ذکر کرتا ہے صُراحی کا نہ پیمانوں کا +

ضُعفِ پیری کو کہاں جوشِ جوانی کی خبر + گرمیاں شمع کی کافور سحر کیا جانے

قرض دو تو پھر بھی ہم عیشِ گزشتہ دیکھ لیں
نوجوانو ایک دم بھر کو جوانی چاہئے

صُبحِ پیری میں کہاں شامِ جوانی کا لُطف + رخصتِ بوئے عروسی ہے سحر سے پہلے

عشق کا بوجھ جو تقدیر نے رکھا سر پر
جُھک گئی گردنِ تسلیم کرے سے پہلے

سلطنت کی

سلطنت کیطرف سے فارسی خط کتابت میں القاب و آداب

میرے کتب خانہ میں ایک جلد قلمی سلطنت کی طرف سے خط کتابت کے متعلق فارسی میں ہے۔ اُس میں سے میں چند امور یہاں نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہو کہ سلطنت کی طرف سے سرکاری تحریر میں حفظ مراتب کا کیا طریقہ تھا؟ یہہ کتاب شاید بہادر شاہ بادشاہ کے زمانہ کی ہے۔ اس میں غدر سے پہلے کے مشہور اُمرا کے نام ہیں پتا لیا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہل کار شاہی یا سرکاری یاد داشت کے طور پر ضابطہ کی خط کتابت میں سے مختلف القاب و آداب جمع کرتا رہا +

(بادشاہ کے نام عرضی[۱])   **حضرت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی**

(آغاز عرضی) . . خدیو زمین و زماں قبلۂ عالم و عالمیاں کعبۂ جہاں و جہانیاں مالک دوراں خداوند گیتی ستاں. خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ۔

بعرضِ مقدس باریابان آستان و سادہ لفافہ. . . . .   میرساند

(کاغذ کشمیری و لفافہ سادہ۔ کمربند ٹکر بیدار :   بر لفافہ صرف عرضی و تاریخ و مہر بر کمربند۔ و دستخط آخیر عرضی)

[۱] یہہ بات سب کو معلوم ہے کہ غدر سے پہلے حکام انگریزی کی طرف سے بادشاہ کو عرضی لکھی جاتی تھی +

(عرضی ولیعہد بہادر کے نام)

بحضور پُر نور حضرت مرشد زادۂ آفاق صاحب عالم و عالمیاں مرزا محمد ابوظفر ولیعہد بہادر مدظلہٗ و نوالہ

بگذرد

(عرضی مد کے ساتھ - برخاتمہ زیادہ حدِ ادب ۔ کاغذ کشمیری و لفافہ سادہ۔ کمر بند کٹر یدار۔ مُہر برکمر بند۔ تاریخ برلفافہ ۔ دستخط در آخر عرضی)

شاہزادوں کے نام کی عرضی: بنام مرزا بہرام شاہ و مرزا جمشید بخت و مرزا جہانگیر و مرزا محمد بابر و مرزا محمد سلیم و مرزا سکندر شکوہ وغیرہ شاہزادگانِ اعلےٰ حضرت و حضور والا بہ یک شرح

ولیعہد سے لیکر سب شاہزادوں تک قریب قریب اسی طرح لکھا جائے:-

(آغاز) حضور پر نور حضرت مُرشد زادۂ آفاق مدظلہ و نوالہ

بعرض مُقدّس و مُعلےٰ بازیاباں میرساند

(خاتمہ زیادہ حدِ ادب ۔ برلفافہ کمر بند سادہ و دستخط در آخر عرضی)

القاب صاحب ایجنٹ بہادر دارالخلافہ شاہجہان آباد

از جانب نواب گورنر جنرل بہادر ہند۔

شہامت و عوالی مرتبت اُبہت و معالے منزلت

بخط محمود شاہ

بحضور محمود شاہ و شجاع الملک

عرضداشت کمترین بندگان اخلاص نشان

خاک پائے مبارک را سرمۂ چشم امیدواری ساختہ بوقف عرض باریافتگان بندگان ثریا مکان اشرف ہمایوں اعلےٰ رساند۔ رقم مطاع آفتاب شعاع

(برخامہ) مانی امرہ العالی مطاع

(کاغذ بادشاہی لفافہ کاغذ کشمیری۔ کمر بند نگر بدار۔ مہر بر کمر بند۔ و دستخط در آخر عرضی بہ لفافہ صرف عرضی۔ خریطہ تمامی طلائی)

عرضی برائے ممتاز محل بیگم صاحبہ

جناب عالیہ متعالیہ زبدۂ خواتین زماں قدوہ ملکات دوراں دام ظلہا

بعرض حجابان آستان ملایک پاسبان میرساند

(برلفافہ۔ عرضی بجناب عالیہ متعالیہ زبدۂ خواتین زماں قدوہ ملکات دوراں دام ظلہا... بگذرد)

(برخاتمہ۔ زیادہ حد ادب۔ کاغذ کشمیری سادہ۔ و لفافہ سادہ۔ نام بر لفافہ مرقوم نمی شود)

(بہ دیگر بیگمات قلعہ مبارک)

جناب عالیہ متعالیہ مدظلہا

بعرض مقدس میرساند

بجناب

بجناب شاہزادۂ ایوب

عرضداشت کمترین اخلاص کیشاں

بموقف عرض باریابانِ حضورِ عالی میرساند

(بر خاتمہ۔ باقی امر والعالی مطالع)

بحضور کرامت گنجور شاہزادہ والا تبار صاحبِ عالم و عالمیاں شاہزادہ ایوب شاہ دام دولتہ

(کاغذ کشمیری سادہ ولفافہ کشمیری۔ بگیرند) (کمر بند و خریطہ ندارد)

بہ شاہزادہ اکبر خلف زماں شاہ۔ حروف عرضداشت؛ کمترین اخلاص کیشاں و باقی امرہ عالی مطاع۔ کم کردہ نوشتہ شود۔

بہ رانی صاحبہ اسکنور پٹیالہ والی

رانی صاحبہ شفقہ محترمہ سلمہا اللہ تعالے۔ بمطالعہ مبا ہجہ موصول باد (کاغذ سادہ کشمیری)

اقبال الدولہ نظارت خاں بہادر (از رو ے خط الگزنڈر راس صاحب بہادر)

نواب صاحب مشفق مہربان مخلصان سلمہ اللہ تعالے۔ بمطالعہ مبا ہجہ (مرقوم ۲۵ نومبر ۱۸۳۲ء)

بنام مرزا اسداللہ خاں صاحب عرف مرزا نوشہ۔ خاں صاحب مہربان سلامت۔ بعد شوق ملاقات واضح باد (بعد میں "بسیار مہربان" "دوستاں" اضافہ ہوا)

بنام مرزا

بنام امراؤ بیگم اہلیہ مرزا اسد اللہ خاں: بیگم صاحبہ مہربان سلمہ اللہ تعالے +

بنام حکیم احسن اللہ خاں صاحب ۔ حکیم صاحب مہربان سلمہ اللہ تعالے ۔ بر لفافہ بمطالعہ مباہجہ موصول باد +

عمدۃ الاراکین نواب زیب النسا بیگم ۔ معروف بہ بیگم سمرو

بیگم صاحبہ مشفقہ مکرمہ معظمہ زاد اشفاقہا ۔ بعد ادجب علیہا مشہود خاطر شفقت ذخائر میگرداند ۔ (خاتمہ) زیادہ بہجت استدام باد ۔ بسامی مطالعہ مسرور باد +

(شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے بھی ہمشیرہ عزیز لکھا جاتا تھا) کاغذ نکر بیدار :

بنام مبارک النسا بیگم زوجۂ جرنیل اختر لونی صاحب بہادر[1]

بیگم صاحبہ حجلہ نشین سرادق عفت سلمہ اللہ تعالے ۔ بر لفافہ : بمطالعہ مباہجہ :

بنام ۔ زبدہ العارفین قدوۃ المحققین حضرت علام نصیر الدین عرف کالے صاحب نبیرہ حضرت مولانا فخر الدین قدس سرہ

بنام بانو خانم ۔ زوجۂ ثانیہ نواب محمد مظفر خاں بہادر رئیس فرخ نگر :-

خانم صاحبہ عفت گزیں عصمت قرین بانو خانم حفظہا ۔

متفرقات میں ۔ بنام جملہ سلاطین قدیم :

والا شان عالی دودمان مدظلہ

عنایت نامہ میرساند

---

[1] مبارک النسا بیگم زوجۂ جرنیل اختر لونی صاحب بہادر کی حویلی رودگروں کے محلہ میں تھی ۔ ان کی بنائی ہوئی خوبصورت سنگ سرخ کی مسجد قاضی کے حوض پر تھانہ سے ملی ہوئی ہے ۔ پہلے اس مسجد میں نہیں ہوتی تھی مگر اب کچھ بازار کے دکاندار نماز پڑھتے ہیں مسجد عمدہ مضبوط اب بھی حالت میں ہے +

نقل[1] خط از مولوی رجب علیخاں اسمی حکیم احسن اللہ خاں مورخہ سیوم جولائی ۱۸۵۷ء در ایام غدر بایمائے سرکار انگریزی

بیت

نصیحتے کنمت بشنو و بہانہ مگیر ✤ ہر انچہ ناصح دلسوز گویدت بپذیر

حکیم صاحب فلاطوں فطنت ارسطو حکمت یکتائے زماں دانائے دوراں سلامت۔ رسوم عرفیہ برطرف۔ حرفِ مطلب ایں کہ از عرصہ دو ماہ کم وبیش کہ سپاہ نمکخوار سرکار گردوں وقار انگریزی از ناعاقبت اندیشی بمقام دہلی رسیدہ گرد فتنہ و فساد بلند کردہ نام حضرت جہاں پناہ بادشاہ را بدنام ساختہ قدم از اندازۂ خود بیروں نہادہ خود را بمقابل دولت دوراں مدت نگشیہ قرار می دہند بعینہ مطابقِ شعر عارف رُوم است۔ شعر

آں مگس بر برگِ کاہ دبولِ خر ✤ ہمچو کشتیباں ہمی افراشت سر

بر ضمیر منیر شاہی حال شفوق و عقلائے ہفت کشور عظمت و اقتدار سرکار انگلشیہ معلوم و حال معرکہ روس چوں آفتاب نیمروز ظاہر است کہ از پیشگاہ ملکہ انگلستان خلد اللہ ملکہا و سلطنتہا۔ اعانت سلطان عبدالمجید خاں بادشاہ روم وصرفِ زر خطیر از ابیض و احمر و ماموری افواج ظفر امواج در بحر و بر و محفوظ داشتن سلطنت اسلامیہ و پسند کردن نقصان خود در حفظ حقوق رومیہ باوجود اتحاد و ملت باروسیاں چہ قدر سعی جزیل و کوشش جلیل بظہور آمدہ۔ گاہے از ابتدائے تسلط بر کشور ہند تعلیم و تلقین صلائے از اہل اسلام و ہنود بالاجبار رائے اختیار مذہب مسیحی نبودہ بلکہ خلایق ہر روشیکہ در امورات دنیا و آخرت خواستہ آزادانہ زیست کردہ می کنند باقی تفاصیل محول رائے صائب کہ تطویل غیر

[1] از روئے تاریخ مفسدہ یعنی غدر یہ خط کام کا ہے۔ کاتب و مکتوب دونوں بہت نامور ہیں اور اس زمانہ کے معاملات میں دونوں کو بہت دخل تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ کی طرف سے حکیم صاحب کو اور سرکار انگریزی کی طرف سے مولوی صاحب کو۔

معفور لہ

مقصود است۔ حال ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کہ بہ از وقبائے شاہ کشور ہند برقد کسے
راست نیامدہ۔ از تاریخ فرشتہ واضح است کہ در عہد قوت وشوکت بادشاہ ممدوح در
ہندوستان جہازات شاہی کہ از ہند روانہ حجاز براہ دریا شدہ بود دست خوش دولت انگریزی
شدہ بان بیدخلی کہ سرکار انگریزی را در ہند بود استرداد واحمال وانتقال جہازات شاہ حجاہ
کردن نتوانست حالانکہ عرصہ ہند از دریائے شور تا پشور پامال ملاحان دولت انگلشیت چگونہ
کسے باین حکمائے عصر وشجاعان دہر مقابل کردن میتواند اگر تراخی وتاخیر بایصال کیفر کردار نا آگاہان
عاقبت کار بوقوع آمد حمل بر زعم عوام نمی تواند شد بلکہ امتحان دوست ودشمن وتفرقہ دانا ونادان
وغیرہ مصالح ملکی پیش نظر است وتاوقتیکہ گروہ مفسد قدم انداز دہلی نشستہ بود از جانب ملازمان شاہی
ہیچ امرے خلاف رضائے اہالیان سلطنت انگریزی بظہور نرسیدہ حالاچہ انقلاب بروے
کار آمد وکدام امید علت وکدامیں سوے اعتبار بودہ خانہ زادان راسخ الاعتقاد باوجود تمامی انخلیہ
عقل ودانش بنا التفاتے چرا در پئے اطفائے نور این سراج نہاشدند وچہ سبب در نفع عاجل
اجل این فروغ دودمان چغتائی صرف اوقات نمے نمایند این چہ خیال محال بدماغ اہالیان سرکار
شاہی پیچیدہ واگر این امر نیست تا امروز چرا شدہ دربیان نرسیدہ وکوششے در رفع
این مفسدہ نشدہ صلاح صواب اگر در آرائے ارباب دربار شاہی مستحسن متصور شود است کہ
محظورات مکنونات خاطر را اصالتاً یا وکالتاً تحریراً وتقریراً بخدمت صاحبان والا دربان گزارش
فرمایند۔ کہ بعد برہمی اساس این فتنہ این وقت بدست نخواہد آمد وبجز تاسف یادگارے
برصفحہ روزگار نخواہد ماند الکنایۃ ابلغ من التصریح دوست را وقف انتظار جواب لقصور فرمایندہ ہرگاہ

ارقام خواہد فرمود حرف بحرف بملاحظہ صاحبان عالیشان خواہد گزشت فقط قلم شکستم و مضمون مختصر کردم. کہ نیست طرز من ایں گفتگوئے طولانی پد ۱؎

۱؎ پھر خط کی نہ ہو امید واری ＊ الغط ہے قلم کی دوست داری

صلائے عام۔ اس خط کو میں نے فارسی میں اس لئے رہنے دیا کہ اس کی صحت میں شبہ نہ رہے۔ فارسی بہت صاف و ستھری ہے ＊ اس خط سے ثابت ہے کہ سرکار انگریزی نے اخیر تک بہادر شاہ بادشاہ کو از روئے اخلاص و احتیاط سمجھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا ＊

تعجب ہے اور افسوس ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب سا ئد بہادر بہادر شاہ بادشاہ کے مشیر مولوی رجب علی خاں صاحب کی رائے پر نہ چلے ＊ حکیم صاحب سے دلی پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان واقف ہے۔ مولوی صاحب غدر میں سرکار انگریزی میں بڑے مرتبہ کے میر منشی تھے۔ ان کا مکان سنا ہے کہ دلی میں میر عاشق کے کوچہ میں تھا۔ مولوی صاحب کو فارسی و عربی میں بڑی لیاقت تھی اور مفسدہ میں سرکار کی خیر خواہی میں بہت کارہائے نمایاں ان سے وقوع میں آئے ＊

مولوی صاحب کا یہ خط مفسدہ کی تاریخ میں نایاب اور مستند ہے ＊

خالی پاک

خاک پاک دہلی

جناب حکیم جمشید علی خاں صاحب دہلوی کے قصیدہ کی تشبیب گویا دلی کی تاریخ ہے اور صلائے عام چونکہ اس شہر سے نکلتا ہے۔ اس کے چند اشعار جسقدر کہ دلی کے متعلق ہیں یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

اے خاک پاک دہلی کیا پوچھنا ہے تیرا ✤ طوبےٰ لمن مقاما بشریٰ لمن قبا یا
مانند مہر رخشاں خاور سے باختر تک ✤ روشن رہے جہاں میں تیرا ہر ایک ذرا
چشم فلک بھی تجھ پر ہے ادبدا کے پڑتی ✤ اُن رہے تری جوانی بلیے عروج تیرا
سا تؤں ولایتوں سے آیا ہے باج تجھ کو ✤ شاہنشہوں کا تجھ پر زیبا ہے فخر کرنا
ست جگ سے تو ہی تو ہے راجوں کی راجدہانی ✤ شاہوں کا تخت گہ ہے تیرا تمام صحرا
جرجودھن اور جدہشٹر دونوں ترے کھلاڑی ✤ ارجن ترا سپاہی بھیکم بتامہ اُستا
محمود تیرا عاشق تیمور تیرا مفتون ✤ بابر ترا فدائی نادر ترا شناسا
ہو غزنوی کہ غوری ترکی ہو یا کہ خلجی ✤ تو سب کا خوان نعما تو سب کا من و سلویٰ
یزدانیوں کی برکت کلدانیوں کی دولت ✤ ساسانیوں کی حکمت ابتک ہے تجھ میں پیدا
ہر ایک سنگ ریزہ تیرا ہے لعل و گوہر ✤ ہر ایک تیرا گوہر ہے جان کوہ دریا
موتی تری صدف کے ہیں زیب تاج شاہی ✤ ٹھیرے نہ جن کے آگے سلک در مصفا
جو گل کھلائے تو نے مہکا دیا زمانہ ✤ خوشبو پہ تیرے غش ہے روح ملا اعلیٰ
تیرے ہی مکتبوں میں تیرے ہی مدرسوں میں ✤ جو آکے پڑھنے بیٹھا علامہ بن کے نکلا
خسرو حسن جمالی بیدل رضی مبارک ✤ مظہر ولی سعادت سودا و میر وانشا

احسان۔ ذوقؔ و غالبؔ صہبائی سوزؔ مومنؔ ؛ مجروحؔ و داغؔ و شیفتہؔ انورؔ ذکیؔ شکیبا

سالکؔ ظہیرؔ نیرؔ نواب مصطفےٰ خاں ؛ تیرے مشاعروں کے ہیں سارے نام لیوا

سرمایہ فصاحت کہتے ہیں جس کو اُردو ؛ ہے خاص تیری بولی پاکیزہ روز مرّا

تو علم کا خزینہ تو فضل کا دفینہ ؛ حکمت کا ہے خزینہ سب پر آشکارا

وہ حاذقِ زمانہ نواب خاں علوی ؛ وہ احترام دولت وہ عمدۃ الاطبا

وہ قطب دولہ حامد اکمل مسیح اشرف ؛ اسحاق خا بقا خاں ارشد اسد مسیحا

جب دیکھی عقل و حکمت ان کاملوں کی تیری ؛ یونانیوں نے دفتر دعووں کا پھاڑ ڈالا

سُن سن کے کارنامے تیرے بہادروں کے ؛ رستم کفن کے اندر تھر تھر ہے کپکپایا

دریا دلوں کی تیرے داد و دہش جو دیکھی ؛ خجلت سے ابرنیساں ہے پانی سارا

شاہوں کی تیرے شوکت کیا پوچھنا کہ اب تک ؛ ہے بادشاہ تیرا شاہوں میں سب سے اعلیٰ

حاکم ہے بحر و بر کا مالک ہے خشک و تر کا ؛ مغرب سے تا بہ مشرق بجتا ہے اُس کا ڈنکا

وہ بادشاہ جس کا ہر یک مشیر دولت ؛ علم و ہنر کا مخزن عقل و خرد کا پُتلا

وہ بادشاہ جس کا چھینے ہر اک سپاہی ؛ نادر سے تخت دہلی طغرل سے تاجِ کسریٰ

وہ بادشاہ جس کا قانونِ عدل منحوں ؛ کمزور کا عصا ہے ظالم کے حق میں بھالا

وہ بادشاہ جس کا ہے چار دانگ عالم

منقاد اور مسخر محکوم اور رعایا

صلائے عام۔ یہ نظم میرے پاس جناب آغا صاحب دہلوی عنایت سے پہونچی۔ میں آنکا ممنون ہوں [illegible]

[illegible]

"پیرومرشد" عنایت خاں صوفی

یہہ شخص بڑودہ میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں فن موسیقی میں بہت شہرت حاصل کی۔ یورپ و امریکہ میں اس کو "پیرومرشد" کا لقب ملا جہاں اس نے تصوف کی تعلیم کا مشن کھولا۔ راقم سے تعارف کی وجہ یہہ ہوئی کہ صاحب کمشنر بہادر انبالہ[2] نے جن کو عربی و فارسی میں کمال تھا میرے نام تعارف کی چٹھی لکھی جس میں ان کے کمالات فن موسیقی کا ذکر کیا۔ اُس وقت تک عنایت خاں کے صوفی ہونے کی شہرت نہ تھی۔ باکمال گویوں میں اُستاد مانے جاتے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ایک درویش کی دعا سے انہیں اس فن میں کمال حاصل ہوگیا۔ اور تمام ہندوستان میں ان کے اس فن کی شہرت ہوئی۔

عقاید صوفیہ میں سماع یعنی موسیقی کا اثر مُسلّم مانا جاتا ہے۔ حیدرآباد (دکن) میں عنایت خاں کو حضرت سیّد ابو محمد مدنی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن کے ہاتھ پر انہیں شرف بعیت حاصل ہوا اور تصوف کی برکتوں سے مُشرّف ہوئے۔ اب یہاں سے میں ان کے صوفیانہ مشن کا ذکر کرتا ہوں۔

ہندوستان اور نیپال کی سیاحت کے بعد ۱۹۱۰ء میں عنایت خاں امریکہ پہونچے امریکہ عجیب آزاد خیال کا مُلک ہے جہاں ہر طرح کے خیالات کی نشوونما نظر آتی ہے۔

عنایت خاں نے امریکہ میں اپنے صوفیانہ خیالات کا مشن جاری کیا جس میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ ولایت سے انگریزی میں ایک رسالہ **صوفی** نامے جاری ہوا۔ اس نام کے رسالے مارچ ۱۹۲۷ء[1] میں ایک مضمون انگریزی میں اس عنوان سے بڑی دھوم کا میری نظر سے گزرا۔ میرے اس مضمون کی سُرخی اسی کی تقلید ہے۔

ان کے فن موسیقی میں کمال کی شہرت سے زیادہ ان کے صوفی ہونے کی شہرت

[1] See The "Sufi Quarterly" March 1927.- [2] جناب دیوان ٹیک چند صاحب آنجہانی۔

ہوئی۔ حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ علم تصوف میں جو مشکل علم ہے ان کو تبحر کس طرح حاصل ہوا؟ مجھے معلوم نہیں کہ عربی اور فارسی میں ان کی لیاقت کا کیا حال تھا؟ مگر تصوف کے معمولی عقیدے انسان کے دلوں پر زیادہ اور جلد اثر کر جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں نئی بات سمجھکر لوگ بہت متوجہ ہوئے۔ یہہ ضرور ہے کہ انگریزی میں ان کے لکچر و وعظ کا بڑا اثر ہوا اور تصوف کی اصطلاح میں یہہ پیر و مرشد مشہور ہوئے ہندوستان کی بول چال میں انہیں "شاہ صاحب" کہنا چاہیئے ✦

شاہ صاحب ولایت سے پھر پھرا کر ہندوستان آگئے۔ اور بیمار ہو کر دلّی میں انتقال فرمایا✦ ولایت میں شاہ صاحب کے عقائد صوفیہ کے جتنے معتقد ہیں یہاں اتنے نہیں ہیں ✦ ولایت میں شاہ صاحب کو پہونچے ہوئے درویش سے کم نہیں سمجھتے ✦ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہہ گویّوں میں باکمال ہونے کے سوا ان کے ولی ہونے کی بہت شہرت نہیں۔ سُنا ہے کہ بہت نیک طبیعت بزرگ تھے ✦

جب مجھ سے ملے تھے اُس وقت اُنہوں نے اپنے سرٹیفکیٹ فنِ موسیقی میں کمال کے مجھے دکھائے۔ سرٹیفکیٹ اکثر اعلیٰ حکام انگریزی اور رئیسوں کے دیئے ہوئے تھے: اس وقت تک ان کی درویشی کا شہرہ نہیں ہوا تھا۔ پھر مجھے ان کی زیارت کا اتفاق نہ ہوا کیونکہ پھر ان کا وقت زیادہ یورپ و امریکہ کی سیاحی میں گزرا اور وہیں آپ کے مشن تصوف کے زیادہ معتقد ہو گئے ✦ گو سُنا ہے کہ ہندوستان ہی میں کسی بزرگ اولیا اللہ کی صحبت سے انہیں تصوف: کے بہترین اسرار کا علم حاصل ہوا تھا ✦

عالمِ مسافرت

مجھکو وطن چھوڑے تھوڑا زمانہ ہوا ہے۔ جس کام کے لئے اعزا و احباب کی مفارقت گوارا کرنا پڑی اُسی کی دُھن میں آج یہاں کل وہاں صعوباتِ سفر اُٹھاتا ہوا مارا مارا پھر رہا ہوں اور جب نتیجہ پر غور کرتا ہوں ہنوز روزِ اول۔ ہائے افسوس عالمِ غربت بھی کیا چیز ہے۔ سُنتا ہوں جو لوگ اس کے خوگر ہو جاتے ہیں اُن کو گھر اور سفر دونوں یکساں۔ مجھے تو پہلا اتفاق ہے۔ تکلیف کے بعد راحت لازمی ہے مگر اس میں تکلیف ہی تکلیف ہے راحت کا نام بھی نہیں۔

اگر کسی قریہ میں گزر ہوا اور کسی نے اتنا کہہ دیا کہ میاں مسافر اس پیال پر لیٹ کر رات بسر کر لو تو گویا اُس نے پھولوں کی سیج پر لٹا دیا۔ اگر کہیں پلنگ مُیسر آ گیا اور ساتھ اس کے میزبان نے بچھونا بھی عنایت کر دیا تو پھر رات بھر اعزا اور اقربا کی یاد دوسری طرف یارانِ وطن کے قہقہے نیند نہیں آنے دیتے۔ ایک روز میں زیادہ تھکا ہوا تھا بغیر کچھ کھائے پیئے شام ہی سے پڑ کر سو رہا۔ بہت سویرے آنکھ کھُل گئی وہ وقت تھا جب پنجۂ خورشید گریبانِ سحر تک پہونچ چکا تھا کچھ کچھ سُرخی نمودار ہو چلی تھی۔ میں نے سُرخی کو بہت غور سے دیکھا اور ٹہلتا ہوا ایک پائیں باغ میں جا نکلا۔ لیکن بجائے اس کے کچھ تفریح حاصل کرتا میری نظروں میں اُس وقت وہ سارا باغ ماتم کدہ نظر آتا تھا کونے کونے آداسی اور پریشانی برس رہی تھی جس گُل کو دیکھا گریبان چاک مُنہ بند کلیاں سرنگوں۔ چشمِ نرگس پر آب۔ سوسن خاموش سرو و شمشاد حیران و پریشان۔ لالہ داغِ دل دکھا رہا تھا۔ نہ سبزے میں لہک تھی اور نہ پھولوں میں مہک۔ عندلیبانِ چمن کی منقاروں سے بجائے زمزمہ سنجی الم و شیون کی صدا تھی۔ جس کو دیکھا غمگین پایا۔ ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس پُر درد منظر نے

میرے پیارے خیال کو جنبش دی میں لڑکھڑاتا ہوا ایک گلاب کے پھول کے پاس پہونچا جو وہ اچھی طرح شگفتہ ہو چکا تھا میں نے اپنی زبان میں کہا۔ آج کیا ہے جو دنیا میری نظروں میں سوگوار معلوم ہوتی ہے۔ وہ باغ یہی ہیں جن میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھائیں تھیں پھولوں کی خوشبو روح کو تازگی بخشتی تھی۔ بلبلوں کے نغموں سے دل باغ باغ ہو تا تھا۔ سبزے پر بیٹھتے تھے۔ لوٹتے تھے۔ غنچوں کا تبسم ہنساتا تھا۔ نرگس کو دیکھکر کسی کی چشم میگوں یاد آجاتی تھی۔ آج کیا ہے جس کو دیکھو غم کی تصویر ہے شاید یہ عالم غربت کا اثر ہے جو دماغ چھا یا ہوا ہے۔ انسان کو مصیبت میں ہر چیز غمگین نظر آتی ہے۔ اتنے میں میرے ہوائے کلام سے اس پھول میں جنبش پیدا ہوئی۔ اور پھر اس پر حسرت منظر نے مجھے اور بھی اس کی طرف مخاطب کر دیا۔ جب کہ چند قطرے شبنم کے مثل آنسو اس کے رخسار سے ڈھلک کر فرش چمن پر گر پڑے تھے۔ میں نے ایک آہ کی اور ساتھ ہی اس کے وہ زبان فطرت سے یوں گویا ہوا کہ اے شخص شاید تو آج یہاں مسافرانہ طور سے وارد ہوا ہے مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ تجھے آج کل کی فکر معیشت نے بالکل بے حس بنا دیا ہے کاش آج کے دن تو وطن میں ہوتا۔ جس چیز کی تلاش میں تو یہاں آیا وہ آج مفقود ہے بلکہ ہمیشہ سے نہ تھی صرف شاعرانہ تخیلات تھے جنہوں نے گل و بلبل سرو قمری کے افسانے تصنیف کر ڈالے اگر نگاہ حقیقت سے دیکھا جائے تو بالکل برعکس معاملہ نظر آئے گا۔ اے مسافر تو ہمہ تن گوش ہے۔ سن آج وہ صبح نہیں ہے جس کو تو روز دیکھا کرتا تھا اس کا نام بدل گیا۔ آج وہ صبح ہے جس کو صبح عاشورا کہتے ہیں۔ آج کے دن وہ باغ جس کو گلزار فاطمہ کہتے تھے جس میں بہت سی کلیاں تھیں۔ غنچے تھے۔ پھول تھے اور جن کو باغبان قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اپنی خاص رحمت سے سینچا تھا ظالموں کے دست تظلّم سے قلم ہو گیا۔ آج ہماری جنس ان غنچہ دہانوں اور سبزہ رویوں کے ماتم میں سبز پوش ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اے مسافر جب ایسے ایسے گل و غنچے جن کا نظیر باغ عالم میں نہ تھا بعد چالیس روز پیوند زمین ہوں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان بے گناہوں کا خون

ناحق جو ایک ظالم کے تیغ ستم سے عالم غربت و مسافرت میں تین روز کی بھوک اور پیاس میں ایک ارض پاک پر مثل پانی کے بہایا گیا ہو تو ہی انصاف کر کیا اس کا اثر ہم تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔ اس مصیبت پر آسمان نے گریہ کیا سورج کو گہن ہوا۔ حمرۂ شفق جزیرہ نمائے عرب کے افق میں اسی وقت سے ظاہر ہوئی۔ دیواریں سُرخ ہو گئی تھیں۔ جیسے کسم کی رنگی ہوئی چادریں۔ سیاہ آندھیاں آئیں۔ آج کے دن بعد عصر جہاں پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے تازہ خون نکلتا تھا۔ پھر جب زمین نے اس غم میں کلیجے سے خون تھوکا اسی زمین سے ہم بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے غور سے سن

چوں خوں ز حلقِ تشنۂ او بر زمیں رسید ✦ جوش از زمیں بذروۂ عرش بریں رسید
نخلِ بلند او چو خساں بر زمیں زدند ✦ طوفاں بر آسماں ز غبارِ زمیں رسید
باد آں غبار چوں بمزارِ نبی رساند ✦ گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید
یک بار جامہ در خُمِ گردوں بہ نیل زد ✦ چوں ایں خبر بہ عیسئ گردوں نشیں رسید
پُر شد فلک ز غلغلہ چوں نوبت خروش ✦ از انبیا بحضرت روح الامیں رسید
کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار ✦ تا دامنِ جلالِ جہاں آفریں رسید
ہست از ملال گرچہ بری ذاتِ ذوالجلال ✦ او در دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

اگر یہ فلسفہ قدرت شاید تیری سمجھ میں نہ آئے تو میں ایک دلیل اس زمانہ کی تیرے سامنے پیش کرتا ہوں جس طرح ریڈیو سٹ ایک ملک سے دوسرے ملک میں اپنی آواز میں کی کشش سے پہونچا دیتا ہے۔ یہی حالت اُس ارضِ پاک (کربلا) کی تھی جس نے ان بےگناہوں کے خونی اثرات کو تمام دنیا میں پہونچا دیا ہے۔ دیکھنے والا دیکھے اور سمجھنے والا سمجھے۔ تیرے چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجکو اُن پھولوں سے کچھ لگاؤ ہے۔ یہ تقریر سنکر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور میں نے کہا بیشک آج روز عاشورہ ہے۔

(احقر سید احمد حسن آخر صفی پوری)

دادِ صلائے عام

میں بھولا نہیں آپ کو مہرباں + مگر دو مہینے سے ہوں سرگراں

کریا مطالعا۔ آپ کا بیش قیمت وقت جس عمدہ کام میں صرف ہو رہا ہے اُس کا ایک میں ہی ستایش گر نہیں ہوں بلکہ مُلک کے دیدہ ور بڑی وقعت سے دیکھتے ہیں اور اس عظمت کی قدر کرتے ہیں ؎

عمرت دراز باد بایں خاص افتخار + اُردو صلائے عام تو آبے بروئے کار

بکیس اُردو جو پچاس برس پہلے اور دوئے معلّے کہلاتی تھی آج دست بردِ اغیار سے نچی کھسی پھر بازاری زبان بنے کو تیار ہے ؛ بیدادگروں نے اس کی شاہانہ کرو فر کے خلعت نو لُوٹ لئے اور لنگوٹی بندھوا دی ؛

جس قدر ہندی اخبار رسالے یا اشتہار ملاحظہ فرمایئے گا رسم الخط تو ہندی اور زبان بگڑی ہوئی اُردو صحیح الفاظ کو توڑ مروڑ کر شکل سے بے شکل کر رہے ہیں قطب الدین کو कुता बेदिन لکھکر "کتا بے دین" پڑھکر فخر کر رہے ہیں حالاں کہ یہ ہندی رسم الخط کا قابلِ اعتراض سوال ہے۔ درکھت दरख्त درخت बाग باگ باغ کی خرابی ہے: اسی طرح سیکڑوں الفاظ ہندی کشاکس سے زخمی تڑپ رہے ہیں اور انصاف کے خلاف حرکت مذبوحی پہ باغ باغ ہیں کہ یہ نادر جواہر پارے پھر ہمارے قبضہ میں آگئے: مگر یہ نہیں سوچتے کہ وہ پہلا سا جوبن اور رنگ روغن چمک دمک آب تاب کہاں سے لائینگے ؟ ایک ہندی رسالہ میں "چھینٹے کروں" चेगदे करूं لکھا تھا کئی صاحبوں نے پڑھا "چھیگندے کرو" + کس طرح رسم الخط صحیح مطلب کو بگاڑا ہے ؛ اگر مرزا اسد اللہ الغالب اپنے مجموعہ مکاتیب

کا نام اُردوئے معلّٰے نہ رکھتے تو کسے یقین آتا کہ اس زبان نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ اُردوئے معلّٰے سے مُلقب ہوتی تھی غالی اُردو کہنا جرم ازالۂ حیثیت عرفی سمجھا جاتا تھا ۵

زبانِ خاص اُردوئے معلّٰے ✦ نصیب ہرکس و ناکس کہاں تھی؟

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی مُلکی زبان یہی ہے جس کا سمجھنے والا اور بولنے والا شہر شہر اور گاؤں میں موجود ہے تو بجا نہیں تمام ہندوستان کے معاملات خط کتابت بیع بوپار خرید فروخت اشتہار اخبار خواہ وہ ہندی خط میں ہوں لیکن ہیں اُردو مگر اِس فراوانی سے ارزاں بھی بہت ہے۔ جو اُردو قلعہ معلّٰے کے شاہزادے اور بیگمات بولتے تھے اب اُس کا پتہ نہیں یہ پچھلی مردم شماری میں ہمارے ایک مہربان افسر نے شمار کنندوں کو حکم دیا تھا کہ جو لوگ شین غین قاف بولتے ہیں اُن کی زبان مادری اُردو لکھو اور جو سین گین کاف کہتے ہیں اُن کی ہندی زبان لکھو تاکہ گورنمنٹ کو یقین ہو اے کہ ہندی اُردو سے زیادہ بولی جاتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا ✦ ہزاروں اُردو بولنے والے مسلمانوں کی زبان مادری ہندی لکھدی گئی جس ہنڈیا میں پکاویں اُسی میں چھید! آج ہندوستان کے اخبار میگزین پمفلٹ رسالے جانچے جائیں تو بہت کم سنسکرت یا خالص بھاشا میں ملیں گے ورنہ اکثر اُردو ہر شخص خوب جانتا ہے کہ جو زبان اس وقت ہمارے مافی الضمیر ظاہر کرنے میں نہایت آسان اور عام ہے وہ اُردو ہی ہے ۵

ہزار آفریں اور لاکھ ستایش آپ پر سے قربان کہ آپ نے صلائے عام مفید انام سے اُردو ادب کی ترقی پر پوری توجہ فرما رکھی ہے اور بے تکلّف خالص اُردو لکھنے والوں کی داد بھی دیتے رہتے ہیں جس سے امید واثق ہے کہ صلائے عام کے خدمت گزار یعنی ایک دن آپ کو اپنی پسند کے مضمون نگار ملنے لگیں گے ✦

عریضہ نگار دو ماہ سے بعارضہ حمی میعادی بیمار تھا مگر اُس حالت میں بھی آپ کے صلائے عام کا انتظار تھا ۵

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ✦ لیکن صلائے عام سے غافل نہیں رہا ✦

حق یہ ہے کہ صلائے عام کچھ اس ادائے خاص سے دل و دماغ گھیرے رہتا ہے کہ مہینہ بھر پہلے سے اس کی اشاعت کا انتظار رہتا ہے اس کا مضمون پریشان جمعیت احباب کا ذریعہ اور درستی حواس کا مجرب نسخہ ہے ✤ بہت جی چاہتا ہے کہ اس رنگ کا تتبع کیا جائے مگر ع ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند ✤ آپ ہی جیسا ہمہ داں ہو تو یہ زور قلم سلاست زبان رنگینی بیان حیرت انگیز تسلسل نصیحت آمیز تعقل فلسفیانہ نکات بات میں بات پیدا کر سکتا ہے ✤ ع

شاد باشید و جاوداں مانید ✤

احقر خادم نادم آپکا۔ احمد علی آغا۔ دہلوی

صلائے عام۔ یہہ مضمون گو صلائے عام کی طرفداری میں ہے مگر اس قدر حق بجانب بھی ہے کہ اُردو کے الفاظ ناگری حروف میں کایا پلٹ کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ یہہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندی زبان فصاحت میں کسی زبان سے کم ہے؟ بلکہ اکثر مضمون ہندی کے اُردو سے زیادہ دلکش ہوتے ہیں کہ ہندی میں زیادہ نرمی ہے کہ محبت کے مضمون عورت کی طرف سے منسوب ہوتے ہیں۔ جب عربی زبان غیر ملکوں میں پہونچی تو عربی زبان کے شعرائے عجم کے میل جول سے اہل ہند کے مضمون بھی عربی میں ملائے۔ مگر یہہ بحث دوسری ہے: یہاں گفتگو یہہ ہے کہ فارسی اور عربی کے الفاظ ناگری حروف میں اپنی اصلی حالت سے دور نکل جاتے ہیں۔ جس زبان کا جو لفظ ہو اُسی زبان کے رسم الخط میں اچھا معلوم ہوتا ہے ✤ جس طرح عورت مردانہ لباس میں اور مرد زنانہ لباس میں ٹھیک نہیں۔ جو جس حال میں ہو اُسی میں رہے تو مناسب ہے ✤ اسی طرح اُردو رسم الخط میں ناگری یا کسی غیر زبان کے لفظ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے ✤

سایۂ شاخِ گل

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ✦ سایہ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

عام دستور ہے کہ انسان جب بہت مغموم اور اندوہگین ہوتا ہے تو دوست احباب عزیز و اقارب و دردمند غمخوار بن کر رفع غم کی تدبیریں کرتے ہیں اُن تدبیروں میں سے باغ کی سیر بھی ہے۔ باغ کی ٹھنڈی ہوا دماغ کی گرمی خشکی کو مفید ہے۔ سبزہ کی شادابی اور سرسبزی اُن آنکھوں کو جن سے گرم آنسو نکلتے رہتے ہیں ٹھنڈا رکھتی ہے۔ پھولوں کی رنگ برنگی اور ان کی شامہ نواز مہک سبز سبز پتے سُرخ زرد پھول لب بستہ کلیاں شاخوں میں کانٹوں کی کلغیاں وہ دل خوش سماں ہے کہ ہر افسردہ دل فسردہ طبیعت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ مگر ایک عاشق صادق کو جب اندوہ فرقت نے ستایا تو غمخواروں نے سیرِ باغ کی صلاح دی بقول حضرت غالبؔ:۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو ✦ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

جس کے جواب میں وہ مظلوم ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہتا ہے فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دع ع مجھے دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا۔ مگر بیداد گر کب مانتے ہیں کشاں کشاں باغ کی سیر کو لئے ہی جاتے ہیں جہاں بجائے تفریح اور تکلیف پہونچتی ہے جو چیزیں مایۂ شادمانی ہیں وہی باعث پریشانی بن جاتی ہیں۔ حق یہہ ہے کہ باغ کی سیر بھی اُنہیں کو فیض فرحت بخشتی ہے جو خود بھی خوش و خرّم ہوتے ہیں ورنہ جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ باغ اپنی تمام بہار نذرِ ناظرین کر رہا ہے مگر عاشق خیال یار میں محو اُس کو خبر نہیں کہ یہ کیا مقام ہے کیسا سماں ہے کسی کے تصوّر میں غرق ہے۔ ہاں جب کوئل کو کتی ہے یا پپیہہ کی پی کہاں پی کہاں سنتا ہے تو دل پر ایک چوٹ لگتی ہے اور اندوہ فراق تڑپا دیتا ہے کہ اس مخفی میری مصیبت سے جانور بھی خبردار ہیں وہ ہمدرد ہیں یا معاند ہیں

کہہ رہے ہیں کہ جس کو چاہتے ہو وہ کہاں ہے - میں بجز سوائے خونِ جگر پینے کے اس کا کیا جواب دوں - ناگاہ اس کی نظر سنبل پر جا پڑتی ہے جس کو لہراتا دیکھ کر کسی کے گیسوئے پیچاں سامنے آجاتے ہیں جو اُس پپیہہ کے صدا سے بھی زیادہ روح فرسا ہے ؎

خوشی میں نہ یاد آئے یارب کسی کو ✦ کسی مایہ شادمانی کی صورت

چونکہ باغ کی ہر چیز اس کے اندوہ و غم کو بڑھا رہی ہے لہذا وہ اس افزایش غم سے بچنے کو عہد کرتا ہے کہ اب کسی طرف نہ دیکھوں گا نیچی نظر کر لیتا ہے اور پھر اُدھر نگاہ نہیں ڈالتا۔ لیکن جوں ہی سایۂ شاخِ گل روش پر دیکھتا ہے وہ سایۂ شاخ کالی ناگن سمجھکر پھر اس کو کاکل افعی کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور جس ہجوم بلا سے بچنا چاہتا تھا اور بھی زیادہ پاتا ہے کہ سایۂ شاخِ گل بھی افعی بنکر کاٹنے کو دوڑتا ہے اور بے اختیار چلا کر کہہ اُٹھتا ہے ؎

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ✦ سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

سایۂ شاخِ گُل افعی کی کیسی نئی تشبیہ اور ڈرانے کا اچھا ثبوت ہے ✦

(آقا)

بندہ نواز ادھر تو جناب کی خدمت میں عریضہ ابلاغ کیا اُدھر چار بجے شام کو ایک گھنگھور گھٹا اُٹھی اور سیحائے اس کے کہ موسلا دھار مینہہ برستا خفیف سی ترشح ہونے لگی کئی مہینہ کی علالت نے صاحبِ فراش کر دیا تھا بے اختیار سیر سبزہ زار کو جی چاہا چند ہم عمر احباب ایک کار میں ہمراہ لے کر سردار نگر گھاٹ پر پہونچا گنگا جس جوش و خروش سے بہ رہی تھی اس کی تصویر فنونِ لطیفہ کا اعلےٰ سے اعلےٰ ماہر بھی نہیں بنا سکتا ایک حکیم اُس دریا کی طغیانی اور خود مختار روانی کو دیکھ کر عناصر کی غیر محدود طاقت کا تصور کر رہا تھا ایک صوفی صاف طینت پانی کی آب و تاب اور موجوں کے انتشار اور حبابوں کی بھرمار پر پیدا کرنے والے کی قدرت کاملہ کا دل سے معترف تھا ایک عارف اس تلاطم اور تموج مشاہدہ پر فنا و بقا اور کثرت و وحدت کا سماں دیکھ رہا تھا۔ زور یا موج گوناگوں برآمد ایک صاحب

تیراکی کے شوقین تھے جھٹ کپڑے اُتار لنگوٹ باندھ دھم سے کود پڑے۔ ایک شیخ صاحب جو کچھ فاصلے سے کھڑے اپنے خیال میں محو تھے ان صاحب کے کودنے پر بیساختہ چلّا اٹھے اے لو کوئی ڈوب گیا اور لوگ جو کچھ دور کھڑے سیر دریا میں محو تھے سمجھے کہ واقعی کوئی ڈوب گیا اور اس طرف لگے دوڑنے۔ جو لوگ واقف تھے وہ قہقہے لگانے لگے تھوڑی دیر یہہ لطیفہ سب کو ہنساتا رہا مگر شیخ صاحب کچھ ایسے شرمندہ اور نادم ہوئے کہ ساتھیوں کو چھوڑ کر گھاٹ کے کنارے خراماں خراماں روانہ ہوگئے پچاس ساٹھ قدم ہی گئے ہوں گے اور ہماری نظروں کے سامنے ہی تھے۔ ہم لوگوں کو یہہ خیال ہو کہ شاید کسی ضرورت کے سبب جاتے ہیں۔ مگر دریا کے کنارہ جو پایہ اور جھاؤ کے سرسبز درختوں کے قریب پہونچے تو شیخ صاحب نے بہت زور سے ایک چیخ ماری اور گر پڑے۔ ہم سب کو شبہ ہوا کہ شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا سب کے سب اُن کی طرف دوڑے پاس پہونچکر پوچھا شیخ صاحب! خیر ہے کیا ہوا؟ چہرہ پر ہوائیاں اڑی ہوئیں پیشانی پسینہ پسینہ۔ کانپتی آواز سے کہا کہ کیڑے نے کاٹ لیا ہے جلدی بند باندھ کے خوجی محلہ میاں صاحب کے ہاں لے چلو (یہاں ایک محلہ کا نام خواجہ قطب ہے عوام خوجی محلہ کہتے ہیں۔ اسی محلہ میں مولانا شاہ نیاز احمد صاحب؟ کا مزار ہے۔ مار گزیدہ آسیب زدہ وہیں جاتے ہیں اور سجادہ نشین صاحب جھاڑتے ہیں اکثر صحت یاب ہوتے ہیں) میں نے بھی شیخ صاحب کے پاس جاکر پوچھا کہ کہاں کاٹا ہے؟ اُن کو تو ایسا خوف طاری ہوا کہ آنکھ بھی نہ کھولی، میرے خیال سے وہ اگلی شرمندگی کے سبب آنکھ نہ ملا سکے۔ پیر میں بوٹ جس پر کاٹنے کا شبہہ بھی نہیں ہو سکتا۔ پاجامے کی مُہریاں ...... اُوپر چڑھا کر دونوں پنڈلیاں دیکھیں زخم کیا نشان تک نہیں۔ اوپر کا جسم کپڑوں سے محفوظ سانپ کے کاٹنے کا گماں ہو تو کیونکر۔ ہاتھ کی ہتیلیاں کلائیاں بالکل صاف۔ حیرت کہ الٰہی یہہ کیا معاملہ ہے کہ ناگاہ تھوڑی ہی فاصلہ پر ہوا کے جھونکے سے جو جھاؤ کی لمبی لمبی شاخیں ہلیں اور ان کا سایہ اس نم آلودہ زمین پر پڑا تو اُس سینہ پر سانپ کی شکل سایہ لہراتا نظر آیا میں نے اور دوستوں کو بھی اس طرف متوجہ کیا کہ سانپ نے نہیں کاٹا

بلکہ شیخ صاحب اس پرچھائیں سے ڈر گئے ہیں اور شیخ صاحب کو اٹھا کر کھڑا کیا اور ان کو اطمینان دلایا اور کہا دیکھئے یہہ سانپ نہیں یہہ اس ٹہنی کا سایہ ہے جب اُس ٹہنی کو ہاتھ سے جھکایا تو اُس کا عکس شیخ صاحب کے پیروں پر پڑا جس کو وہ سانپ کا حملہ سمجھتے تھے۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ✦ سایۂ شاخ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

آج ہی صبح کو وہ مضمون لکھ کر روانہ خدمت کیا شام کو تفریح میں یہ شعر مصداق حال ہوا۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ یہہ حضرت اسد اللہ الغالب کی کرامت ہے یا نہیں

دیکھنا غالب سے گر اُلجھا کوئی ✦ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

(آقا دہلوی)

اُردو کا نیا رسالہ

مسلمانوں کی عملی ایجادی اور اجتہادی قوتوں کو بیدار کرنے اولوالعزمی عالی حوصلگی جرأت و استقامت محنت وجفاکشی ایثار و قربانی کے اوصاف پیدا کرنے اور ان کو ترقی و کامیابی کے راستہ پر لگانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ نہایت ہی عمل آموز اور کارآمد رسالہ ہے۔ اور اسکا مطالعہ بچوں عورتوں اور نوجوانوں کے لئے بیحد ضروری ہے۔ نمونہ دیکھ کر آپ انشاء اللہ بہت پسند کریں گے۔ ابھی ایک کارڈ نمونہ منگانے کیلئے لکھ بھیجئے

منیجر کامیابی۔ دفتر حسن نظامی الیسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ۔ دہلی

اشتہار

اُردو کا سرمایۂ ناز

لغات کشوری۔ فارسی الفاظ۔ اُردو عبارت میں مبسوط لغت للعہ

لغات اُردو۔ مکمل سیٹ ۴ جلدوں میں اُردو الفاظ کے اُردو میں معنی ہیں ہر

شعرالعجم کا مکمل سیٹ ۵ جلدوں میں فارسی شعرا کا اُردو میں تذکرہ ہے

تذکرہ آب بقا۔ اردو شعرائے ماضی وحال کا اُردو میں تذکرہ اور کلام عہ

تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ شعرا اُمرا مشائخ علما کا اُردو میں مبسوط تذکرہ ہے ر

بحر الفصاحت۔ علم عروض علم قافیہ علم بیان علم معانی صنائع بدائع کی جامع کتاب ہے علم شاعری مکمل سیٹ ۴ جلدوں میں تقطیع بحر قافیہ شعر معائب محاسن۔ عہ

صنم خانۂ عشق۔ دیوان دوم امیر مینائی۔ . . . . . . عہ

گلزار داغ۔ نواب مرزا داغ کا پہلا دیوان۔ ۔ عہ

مضمون نویسی۔ اردو مضمون لکھنے کی کتاب آسان عبارت میں ۸ر

ترجمان پارس۔ اردو سے فارسی بنانے کا قاعدہ مثالیہ جملے ۶ر

تہجو کی شریف بی بیوں کی تعلیم کی کتاب چھوٹی چھوٹی کہانیاں مکمل سیٹ دو جلدوں میں . . . . عہ

زبان دانی ۶ر۔ قواعد میر ۶ر۔ ترجمان اردو ۶ر۔ اصول اردو ۶ر۔ فہرست مفت طلب کیجئے

المشتہر

منیجر عشرت بک ڈپو احاطہ خانساماں۔ لکھنؤ۔

کھنڈراتِ بابل

انقلابِ عالم کی حسرت نما تصویر دیکھنے سے انسان بے اختیار متاثر ہو جاتا ہے۔ اسلاف کے کارنامے گو ملیامیٹ ہو کر پیوندِ زمین ہو گئے۔ مگر اب بھی جہاں کہیں ان کے کھنڈرات نظر آجاتے ہیں تو قوتِ خیال میں ایک مقناطیسی اثر پیدا ہو جاتا ہے اور دل میں بیسیوں سوالات عجیب و غریب دماغی الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر میں انسان نے علمی ترقیات کو اوجِ کمال پر پہونچا دیا ہے اور طبیعات کی بدولت نئی نئی قوتیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ جن سے انسانی مفاد کو بے حد تقویت پہونچ رہی ہے۔ لیکن دورِ ماضی پر ایک گہری نظر ڈال کر کہنا پڑتا ہے کہ آج اس کا عشر عشیر بھی موجود نہیں ہے۔ دو متضاد چیزوں کا مقابلہ کرنے سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تاریخ کہن کے اوراق اگرچہ عجائبات سے بھرے پڑے ہیں لیکن کسی شہر کے کھنڈرات کو دیکھ کر ان پر فلسفیانہ نظر ڈالنا ایک نئی تاریخ کا دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔

آج جو شہرت پیرس، لندن، نیویارک اور پیکین کو حاصل ہے۔ اس سے بدرجہا زیادہ کبھی شہر بابل کو حاصل تھی۔ پیرس کی خوبصورتی اور لندن کی آبادی امصارِ عالم پر تفوق رکھتی ہے۔ مگر بابل خوبصورتی آبادی اور عجائبات کی جملہ خصوصیات کا مظہرِ اتم تھا۔ آسمان کے فرشتے اس کے والہ و شیدا تھے۔ بابل کے جن کھنڈرات کو محققین یورپ تہ و بالا کر رہے ہیں۔ دریائے فرات کے کنارے ۵-۶ میل کے محیط میں آباد تھا۔ اس کا بانی شاہ میرلیس تھا۔ جس نے سب سے پہلے ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ بخت نصر بادشاہ نے جس کا ذکر بائبل میں آیا ہے اس شہر کی رونق بڑھائی۔ اور بقول ہیروڈٹیس اس کی فصیل ۰ ۴ فٹ لمبی اور ۲ ۳ فٹ بلند کر دی گئی۔ اس پر چھ رتھ پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ شہر مربع تھا ہر ایک پہلو میں ٹھوس پیتل کے ۲۵ دروازے تھے۔

اس کی تین چیزیں یگانہ روزگار تسلیم کی گئی ہیں۔

ایک شاہی محل جو آٹھ میل کے دائرے میں بنا ہوا تھا اس کے چاروں طرف تین دیواریں۔ اندرونی دیوار پر خوشنما پچی کاری کا کام تھا۔

دوم عجیب چیز باغ سطح زمین سے معلق[1] تھا جو بنوکد نصر[2] بادشاہ نے اپنی بیگم کے لئے بنوایا تھا جہاں وہ اکثر سیر کے لئے آیا کرتی تھی۔ یہ بیگم میڈیا[3] کے خاندان سے تھی۔ جو اس زمانہ میں بہشت کا نمونہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ بیگم موصوف جب بابل کے سنسان میدانوں کو دیکھتی تھی تو وطن کی یاد اس کے دلکو بے قرار کر دیتی تھی اس پر بنوکد نصر بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر کے قریب ایک ایسا باغ تیار کیا جائے جو میڈیا کے دلکش مناظر کی یاد دلوں سے محو کر دے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بڑی بڑی محرابیں تعمیر کی گئیں اور ان پر سنگین چھتیں ڈال کر ایک ایسا باغ تعمیر کیا گیا جو سطح زمین سے ہی بلند نہ تھا بلکہ اس میں پھل۔ پھول۔ درخت۔ ندی۔ نالے اور پہاڑوں کے نظارے بھی موجود تھے۔ گویا یہ میڈیا کے پہاڑی مناظر کی نقل تھی۔

سوم بابل کے عجائبات میں ایک مشہور مینار تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد لوگ اس قدر خائف تھے کہ انہیں ہر لحظہ ایک ایسے ہی غارت گر طوفان کا اندیشہ دامنگیر رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایک ایسا مینار تعمیر کیا جائے کہ طوفان کی حالت میں ہم سب اس پر چڑھ کر مامون و مصئون رہیں اور غرق ہونے سے بچ جائیں مگر خدا نے ان کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور سوائے بابا کرنیکے کچھ نہ بول سکتے تھے۔ اس لئے یہ مینار نامکمل رہگیا۔ بابل کی وجہ تسمیہ بھی زبانوں کے اختلاف کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ یہ مینار مذکورہ بالا غرض سے نہیں بنایا گیا تھا۔ بلکہ یہ بعل نامی ایک بت کا بت خانہ تھا اور یہ بت اس میں موجود تھا۔ جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔

[1] معلق اسکو کہتے ہیں جو کسی چیز سے ملحق نہ ہو۔ (کاتب) [2] بنوکد نصر انگریزی ترجمہ شاید بخت نصر کا ہو جو شاہان بابل میں بہت ظالم گزرا ہے۔ یا بخت نصر کے بیٹے بل شازر کے باپ کا نام بنوکد نصر ہو۔ [3] میڈیا ایک مقام کا نام ہے میڈیا کے حکمران سیرس نامے نے بابل پر فوج کشی کی اور بابل کو تباہ اور بل شازر کو قتل کر کے کلدانیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (کاتب)

ہیروڈوٹس نے اس بت کی قیمت کا اندازہ دو کروڑ دس لاکھ اشرفی لگایا ہے۔ اس مینار کی بلندی کے متعلق مبالغہ آمیز روایات ہیں۔ یہودیوں کی روایت کے بموجب اس کی بلندی ۱۲ میل بیان کی گئی ہے۔ جیروم کے معاصرین ۴ میل بیان کرتے ہیں۔ مگر مسٹر ہیو کی شہادت زیادہ قابلِ اعتبار ہے اس کا بیان ہے کہ مینار کی بلندی ۶۶۰ فٹ تھی۔

اگرچہ بابل زمانہ کے زبردست ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ اسکی عجائبات ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئے۔ مگر پھر بھی عرصہ دراز تک یہ ایشیا میں اپنی طرز کا عجوبۂ روزگار شہر رہا ہے۔

جب شاہانِ اسیریا نے سلوشیا کو اپنا دارالحکومت بنایا تو بابل کی رہی سہی عظمت بھی جاتی رہی اور اکثر باشندے نئے دارالحکومت میں جاکر آباد ہو گئے۔ ساسانیوں کے عہد میں رہی سہی آبادی بغداد میں منتقل ہو گئی۔ اب بابل کھنڈرات کا ایک ڈھیر ہے۔

(ذاکر دہلوی)

صلائے عام۔ آپ نے اچھا کیا کہ "کھنڈرات بابل" کا مضمون چھیڑا۔ مگر اتنی دور جانے سے بہتر تھا کہ آپ دلی کے کھنڈرات یعنی پرانی دلی کے قدیم صنادید کی تحقیق میں کچھ لکھتے کہ اوّلاً خویش بعدہٗ درویش۔ یہ تحقیق زیادہ ضروری اور دل کش ہے۔ یہاں کی قدیم عمارتوں کا ذکر غیر زبانوں میں زیادہ ہے اور اردو میں مثلاً آثار الصنادید اور دو ایک اور کتابوں میں جس قدر ہے غنیمت ہے مگر پھر بھی اس میں بہت گنجایش ہے۔

اُردو دکن میں

(از جناب خواجہ محمد عبدالروف صاحب عشرت لکھنوی)

ہندوستان کے لوگ غلطی سے یہہ گمان کرتے ہیں کہ اُردو دہلی میں پیدا ہوئی اور اس نے اسی شہر میں پرورش پائی۔ دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ میں اس کی پرورش ہوئی اور اب دہلی اور لکھنؤ اُردو کے وہی مرکز ہیں۔ جو لوگ زبان اُردو سیکھتے ہیں وہ اسی مرکز کی تقلید کرتے ہیں۔

مگر حال کی تحقیق سے جو راز ظاہر ہوا وہ اس کے خلاف ہے۔ راویانِ صداقت نشان نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے کچھ پہلے اس بات کا پتہ لگانا شروع کیا تھا کہ اہلِ دہلی و اہلِ لکھنؤ جو دعوے کرتے ہیں کہ اُردو زبان ہماری ہے یہہ کہاں تک صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ ایک بڑی غلطی میں مبتلا تھے۔ اُردو تو دکن میں پیدا ہوئی اور ہمیشہ وہیں رہی۔ جو لوگ اُس سرزمین کا طواف کر آئے ہیں وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتے ہیں باقی سب غیر زبان والے ہیں اس کا اصل حال بھی بتا دینا ضرور ہوا۔ تاریخ عالم میں مذکور ہے کہ ولی گجراتی صوبہ دکن سے سرزمین دہلی پر تشریف لائے اور اُنہوں نے دہلی میں اپنے پیر شاہ گلشن کی فرمایش سے اُردو زبان میں ایک شعر کہا تو لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہہ اجنبی شخص کون سی زبان بول رہا ہے۔ ان کا شعر تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور تعجب سے پوچھا یا حضرت یہہ آپ کون سی زبان بول رہے ہیں مہربانی سے فرمایا تم لوگ نہیں جانتے یہہ زبان ہمارے صوبہ کی ہے۔ پوچھا آپ کا صوبہ کہاں ہے کہنے لگے دکن کی زبان ہے۔ سب نے ہاتھ باندھ کر کہا یا حضرت یہہ زبان ہمکو بھی سکھا دیجئے۔ اُنہوں نے ایک دیوان لکھ کر پھینک دیا کہ جا بابا اس دیوان سے اُردو سیکھ لے اور جس جس کو سیکھنا ہو وہ دکن چلا آیا کرے ہم اردو سکھا دیں گے۔ اس کے بعد وہ دکن چلے گئے اور انہیں کے ساتھ اُردو زبان بھی تشریف لے گئی۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ "میر تقی میر سب سے پہلے سرحد دکن میں پہونچے اور وہاں احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ غالباً ان کا سفر تحصیل زبان اُردو کے لئے ہوگا۔ دیکھو انتخاب کلام میر مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

ایک مرتبہ نواب مرزا خاں داغ دہلوی نے اپنا مقطع پڑھا ؎ اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ؛ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ حاضرین مشاعرہ نے بہت نفریں کی کہ آپ نے آج تک اُردو زبان کا مرکز تو دیکھا نہیں غیر زبان والے ہو کر ایسا دعوے کرتے ہو ایسا نہو دکن سے آپ پہ کوئی فرد قرار داد جرم لگا دی جائے۔ وہ مرحوم بہت نادم ہوئے اور سیدے دکن کو چلے گئے اور زندگی بھر وہیں پڑے رہے آخر عمر میں کچھ اُردو بولنا سیکھ گئے تھے

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں کہ اُردو زبان کا خاکہ عالم گیر کے زمانہ میں تیار ہوا لیکن اس زبان کی داغ بیل تیمور کے زمانہ تک دکن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے ایک مستقل زبان پیدا ہو کر ان تمام ملکوں میں پھیل چکی تھی جو مسلمانوں کے زیر اقتدار تھے"۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عالم گیر کے زمانے میں جو اُردو زبان کا خاکہ بنایا گیا وہ تحصیل حاصل کے مصداق تھا اور عہد عالم گیر کی ایک غلطی تھی کہ جو چیز پہلے سے تیار تھی اب اس کا خاکہ کیوں بنایا۔ مصنف نے اگرچہ کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا ہے تو بھی اس کو قبول کرنا چاہیے ان کے قول کے مستند ہونے کی ایک کافی دلیل یہہ ہے کہ وہ دار المصنّفین کا ایک رکن ہے اور دار المصنفین دکن کی نمک خوار ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ علیگڈہ کالج کو حضور نظام سے جو امداد ملتی ہے دکن کی اس ادنیٰ مناسبت سے وہاں کے طلبا بغیر تحصیل زبان کئے ہوئے زبان اُردو کے مالک بن جاتے ہیں حالانکہ وہ اُردو کا ایک رسالہ ایک اخبار تک دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں ان کے کتبخانے انگریزی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں اُردو کی ایک کتاب بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ اُردو تو اُردو ہندوستانیوں کی صورت بھی ان کو پسند نہیں ہے نہ ہندوستان کا لباس نہ ہندوستانی زبان بولتے ہیں۔

مولانا سید وحید الدین سلیم مغفور بھی وضع اصطلاحات میں تحریر فرماتے ہیں" حیدر آباد دکن ہی وہ قلمرو ہے جہاں اردو شاعری کے آدم شمس ولی اللہ نے جنم لیا تھا اور اس زبان کے ادب کا آغاز ہوا تھا اب یہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو زبان کی تکمیل اور ترقی کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے۔ اعلٰے حضرت فرماں روائے دکن نے جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کی بنیادیں اٹھا کر تمام دنیائے اردو پر وہ احسان کیا ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔"

ہندوستان کی نسلیں جب اردو زبان کی تکمیل اور اس میں ہر طرح ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی قابلیت پائیں گی تو زندہ باد عثماں علی خاں کا نعرہ بلند کریں گی"۔

نیرنگ خیال جون نمبر ۲۹ء میں سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے علیگ تحریر فرماتے ہیں" سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری کے آدم ولی نے ارض مقدس دکن پر پیدا ہو کر اردو پر ایک استحقاق پیدا کر دیا۔ مبالغہ نہ ہو تو میں بلا تامل کہنے کو تیار ہوں کہ اردو دکھنیوں کا پیدائشی حق ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی اردو سنوارنے والی سلطنتوں کے انتزاع کے بعد سے اردو دکن کی آغوش میں پہونچ گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ کیونکر مغرب کے علوم و فنون کی جدید تصانیف کو اردو کے قالب میں ڈھال ڈھال کر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہہ موتی ہمارے لئے بکھیر دئے گئے ہیں ان کی کیا قدر کر سکتے ہیں ایک مردہ زبان زندہ ہو گئی اردو میں تھائی کیا۔ قصص افسانے مثنوی دوادین۔ اے خاک دکن تجکو یہہ سہرا مبارک"۔

اس کے بعد مداح نے دکھایا ہے" کہ شعبہ تالیف و ترجمہ کی تعداد اس دس گیارہ برس میں ۲۹۵ تک پہنچ گئی ہے"۔ اردو کی یہ بیش بہا خدمت ہندوستان میں آجتک کسی سے نہ ہو سکی عثمانیہ یونیورسٹی کا یہ احسان تمام ہندوستان کی جان پہ قیامت تک رہے گا۔ منشی نول کشور نے اردو کے نام سے ہزاروں کتابیں تاریخ فلسفہ۔ جغرافیہ۔ سیاسیات اور معاشیات منطق۔ ادبیات کی چھاپ کر ہم کو دھوکا دیا ان میں سے ایک کتاب بھی اردو زبان میں نہ تھی بلکہ مرہٹی اور گجراتی زبان کا نام اردو رکھ دیا تھا جسے ہم دہلی اور لکھنؤ کے لوگ اردو کہتے ہیں +

انصاف کی بات تو یہہ ہے کہ بے انتہا ہم رنگ زمین دام بچھائے جاتے ہیں۔ چاہے

لوئی ۱ ر

کوئی اسے خوشامد کہے مگر میں تو غریب وہی سمجھتا ہوں اتنے بڑے ملک میں ایک خدا کا بندہ اتنا نہیں کہتا کہ حضور عثمانیہ یونیورسٹی کا اردو میں انعقاد فرماتے ہیں تو اس کو صحیح معیار پر قائم کیجئے دکن کی زبان میں گجراتی مرہٹی تلنگی شامل ہے یہاں کی اردو صحیح اور مستند نہیں ہے۔ اردو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ مگر اشتراک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شہر کو اختیار ہے جس طرح چاہے بولے اور اسکا امن قائم نہ رہے۔ اس کے لئے دو مرکز ہیں دہلی اور لکھنؤ۔ جو لوگ مرکز کے خلاف جملے استعمال کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ اگر مرکز کی تقلید میں زبان ترقی نہ کرے تو وہ ترقی ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے۔

بدقسمتی سے آج کل ناواقفان زبان نے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اپنی ارسوخیت جتلانے کی غرض سے اردو میں طرح طرح کی خرابیاں ڈالنا شروع کی ہیں اور بعض نے کھلے الفاظ میں کہدیا ہے کہ ہم اردو میں انقلاب عظیم کرنا چاہتے ہیں۔ خدا ایسے نازک وقت میں جبکہ لوگوں میں زبان کی اہمیت کا احساس باقی نہیں ہے اس غریب زبان کو دست بُرد زمانہ سے محفوظ رکھے ورنہ اردو کے حصے بخرے ہو جائیں گے اور ہر شہر کی زبان جداگانہ ہو جائے گی اور تمام ہندوستان جہالت کے دریا میں غرق ہو جائے گا۔

مُبصّر

انجمن معراج الادب لکھنؤ کا قابل قدر کارنامہ

جنوری ۱۹۲۹ء سے ابو العلا ناطق کی ادارت اور حکیم آشفتہ کی معاونت میں لکھنؤ سے ایک امتیازی شان کے ساتھ شایع ہو رہا ہے "مُبصّر" کے اجرا نے لکھنؤ کی زبان اور ادب کو پوری درخشانی کے ساتھ چمکا دیا۔ "مُبصّر" اپنی ہر اشاعت میں علمی۔ ادبی اور تنقیدی۔ بلند پایہ مضامین کا ایک نادر نمونہ اور قابل قدر مجموعہ ہوتا ہے "مُبصّر" کی اعانت اور توسیع اشاعت میں کوشش کرنا مریض اردو کو صحیح معنوں کی حیات تازہ بخشنے کے مترادف ہے۔ سالانہ قیمت للعہ ششماہی ۱۲ نمونہ کا پرچہ ۱۲ سائز ۲۰×۳۰ حجم ۴ جز۔ منیجر مُبصّر آفس کٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

ع ضعف پیری فراغ می خواہد

ضُعف سے مُراد یہاں ضعیفی یعنی بڑھاپا ہے۔ یہہ مقولہ جس قدر مشہور ہے اُس سے زیادہ بے بنیاد ہے۔ ہندوستان میں گو بوڑھا ہونا گویا نکما ہوجانا ہے۔ برخلاف اس کے یورپ و امریکا میں ضعیفی بے کاری میں داخل نہیں۔ میرے ایک عنایت فرما جو ولایت گئے تو سب سے پہلے خط میں اُنہوں نے انگلستان سے تعجب کے طور پر لکھا کہ یہاں ساٹھ ستّر برس کے آدمی کو کوئی بوڑھا نہیں سمجھتا۔ اور امریکا کے ایک رسالہ سے یہہ مضمون میرے ایک معزز کرمفرما نے ازراہ کرم مجھے بھیجا کہ دل و دماغ کے لئے سِن کی شرط بیکار ہے صاحب تحریر لکھتے ہیں کہ:۔

"امریکا کے ایک رسالہ میں جو عرصہ سے میرے پاس آتا ہے بُڑھاپے کے بارہ میں هنری فورڈ کا مقولہ لکھا ہے۔ مضمون تو بہت طویل ہے اُس میں سے کچھ عرض کرتا ہوں۔ فورڈ کی ہر بات آج کل بوجہہ اس کی لامتناہی کامیابی کے ٹکسالی مانی جاتی ہے۔ اُس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں خود یا دوسروں کے معاملات میں عمر کا خیال ہی نہیں کرتا۔ پچھلے پچیس برس میں لاکھوں آدمی میرے کارخانجات میں کام پر آئے اور گئے۔ کبھی اُن کی عمروں کا خیال بھی نہیں ہوا۔ صرف اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کو تجربہ کیا ہے اور کام سیکھنے کی کیا لیاقت ہے؟ جو شخص تحصیل علم کو ختم کر دیتا ہے

وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جو شخص کہ اپنا تحصیل علم جاری رکھتا ہے وہ ہمیشہ جوان ہی نہیں رہتا ہے بلکہ اُس کی قدر و منزلت بڑھتی جاتی ہے۔ چاہے اس کی جسمانی قوت اُس قدر ہو یا نہ ہو بڑھاپے کا خیال اس وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ انسان یا اکثر اُن میں کے آدھی عمر ہی سے تحصیل علم کو ختم کر دیتے ہیں اور اسی وجہ سے انکا دماغ و دل بوڑھا ہو جاتا ہے؛

ایڈیسن کی ایک مثال دی ہے کہ جب ایڈیسن ریلوے اسٹیشن پر اخبار بیچا کرتا تھا اُس وقت اتفاق سے اسٹیشن ماسٹر کی ایک لڑکی ریل کے سامنے گر پڑی اور ایڈیسن نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر اوس کو گھسیٹ لیا اور جان بچائی۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کو معاوضہ یہ دیا کہ ایڈیسن کو تار کا کام سکھا دیا۔ اور اُسی وقت سے ایڈیسن بجلی کی تحقیقات وغیرہ میں مصروف ہو گیا۔ سالہا سال کے بعد ایڈیسن کے پاس وہ اسٹیشن ماسٹر (اب وہ بہت سن رسیدہ ہو گیا تھا) آیا اور اُس سے امداد کی درخواست کی۔ ایڈیسن نے اس کو بجائے مالی امداد کے ایک تحقیقات میں لگا دیا۔ جس سے اسٹیشن ماسٹر مالدار ہو گیا: ایسا آدمی بوڑھا نہیں کہلا سکتا؛

ایسے ہی ایک بار ہنری فورڈ کو ایک شخص جو گھوڑوں کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ راستہ میں ملا۔ اور ہنری فورڈ سے دریافت کرنے لگا کہ اس کے شہر میں کوئی ایسا اصطبل ہے جہاں وہ نوکر ہو سکے۔ ہنری فورڈ نے جواب دیا کہ گھوڑوں کے اصطبل تو سب جگہ بند ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ہنری فورڈ اُس کو نوکر رکھا دے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ کام کرنے اور سیکھنے کی لیاقت رکھتا ہو۔ وہ شخص راضی ہو گیا۔ ہنری فورڈ کا کہنا ہے

کہ یہ شخص مدت تک اُس کے کارخانہ میں کام کرتا رہا اور بہت اونچے درجہ پر پہونچ گیا صرف اس وجہہ سے کہ وہ کام کرنے کی اور سیکھنے کی لیاقت رکھتا تھا +

ہنری فورڈ ایک بار اپنے ایک کارخانہ میں گیا اور وہاں جو کام ہوتا تھا اس کے متعلق دریافت کرنا چاہا۔ ایک شخص نے اسکو نہایت دفاحت سے جواب دئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ شخص ۸۷ برس کی عمر کا تھا" +

(سراج احمد)

صلائے عام - اس مضمون میں کئی خوبیاں ہیں۔ اول تو واقعات پر مبنی ہے جس سے سن رسیدہ لوگوں کی جان میں جان آجاتی ہے۔ دوسرے غالب کا قول غلط ہوگیا کہ

ضعف نے غالب نکما کر دیا + ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس مضمون نے یہہ بڑا کام کیا کہ بوڑھوں کو کام کا بنا دیا۔ تیسرے قوائے دماغی جو منتشر تھے کہ عقل کا انحصار ایک جگہہ پر نہیں۔ بوڑھوں کے دماغ بھی جمع ہو کر کام کے نکلے + خاصکر مجھ جیسے نکمے شخص کے کہ ع پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است + جوانوں کے دل و دماغ کی تعریف تو سب کرتے چلے آئے ہیں۔ بوڑھوں کو نکما سمجھکر چھوڑ رکھا تھا معلوم ہوا کہ یہہ بھی کام کے ہیں۔ اُن کا قصور ہے جو بوڑھوں کی قدر نہیں کرتے +

جوانی میں انسان اگر اپنے دماغ کو برباد نہ ہونے دے تو بڑھاپے میں دیرپا ہو کر زیادہ کام دے سکتا ہے۔ جس طرح احتیاط سے رکھنے سے اکثر چیزیں زیادہ

بکار آمد

بلکار آمد ہو جاتی ہیں ع پُرانے جب ہوئے چانول تو ہے انہیں میں مزہ - اچار صرف پُرانا ہونے سے زیادہ مزہ دیتا ہے۔ اور شراب کُہن کا تو کیا کہنا!

میں اپنے بڑھاپے سے ذرا بیدل سا ہو رہا تھا اِس مضمون سے ڈھارس ہو گئی کہ اخیر عمر بھی کام کی ہے: اے بڑھاپے. شاد باد و پائندہ باد!

حضرت مولانا روم رہ نے عشق کی تعریف میں جو کچھ فرمایا میں اپنے ضُعف کے حق میں عرض کرتا ہوں سہ

شاد باش اے ضعف ہستی سوزِ ما
شادیٔ ما. عیدِ ما - نوروزِ ما

وہ کہتے ہیں کہ دَوڑ کے چھو لو تو آئیں ہم + کس وقت ہاتھ پاؤں نے ہم کو دیا جواب

جانتے ہیں کہ ان سے نہ دوڑا جائے گا نہ ہمیں آنا پڑے گا - بڑھاپے میں اکثر بچے اسی طرح مجھے ہنسی کرتے ہیں: میرے دانت گر گئے ہیں میرے جلانے کے لئے لڑکیاں پان میں موٹے موٹے چھالیہ کے دانے ڈال دیتی ہیں - حالانکہ جانتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ پن کُٹّی میں پان کوٹ کر کھایا جاتا ہے؛

سہ رتبۂ شیب سے آگاہ نہیں اہلِ شباب
مُشکِ شب نکہتِ کافورِ سحر کیا جانے

صُبح پیری میں کہاں شامِ جوانی کا لُطف + رخصتِ بوئے عروسی ہے سحر سے پہلے

نشۂ عشق بڑھاپے میں کسے آتا ہے +
ٹُھمریاں بھیرویں کی مُرغِ سحر کیا جانے

غزل

افکارِ تازہ: جناب مائل دہلوی

ہمیں کو بے گناہوں میں تہِ شمشیر دیکھیں گے ✦ ہماری خاک وہ ہوگی جو دامن گیر دیکھیں گے

نگاہِ ناز کا جب وہ لگا کر تیر دیکھیں گے ✦ تو صحرائے محبت میں ہمیں نخچیر دیکھیں گے

غبار آلودہ جب تک گیسوئے تقدیر دیکھیں گے ✦ تجھے ٹوٹا ہوا اے ناخنِ تدبیر دیکھیں گے

شبِ غم میں دکھائے گی جو کچھ تقدیر دیکھیں گے ✦ سحر تک چارہ سازوں کی بھی ہم تدبیر دیکھیں گے

ادائے ناز کی چلتی ہوئی شمشیر دیکھیں گے ✦ تمہارے حُسن کو اک روز عالم گیر دیکھیں گے

خدا کے واسطے مشاطہ آئینہ نہ رکھ آگے ✦ مرا سر یاد آئے گا جو وہ شمشیر دیکھیں گے

سمجھ لینا نہ تم مردہ شہیدانِ محبت کو ✦ ہم ان آنکھوں سے اپنی نعش کی تشہیر دیکھیں گے

جو خنجر لے کے آئے ہیں تو سینہ چاک کرنے دو ✦ ہم اپنا زخم دیکھیں گے وہ اپنا تیر دیکھیں گے

سمجھتے ہیں جو دل میں سرنوشتِ غیر کو اچھا ✦ وہ کن آنکھوں سے حیراں ہوں مری تحریر دیکھیں گے

تری زلفوں کے سودے میں اگر فصلِ بہار آئی ✦ تو اپنے پاؤں میں زنجیر پر زنجیر دیکھیں گے

مشیت کی جہاں بگڑی ہوئی بنتی ہیں تقدیریں ✦ وہاں کیا رنگ لائے گی تجھے تقدیر دیکھیں گے

جو مر جائیں سلامِ شوق فصلِ گل سے کہہ دینا ✦ اگر زندہ رہے تو پھر تجھے زنجیر دیکھیں گے

نہ مرتے ہم نہ مرتے ہم پہ اس پہ جان دیتے ہیں ✦ کہ بس جاتے ہی تربت میں تری تصویر دیکھیں گے

اُدھر ہے طائرِ سدرہ اِدھر ہے مُرغِ جاں میرا ✦ کدھر جاتا ہے چھٹتے ہی تمہارا تیر دیکھیں گے

تمہارے دم سے اے عصیاں کسی کی روزِ محشر میں ✦ ہزاروں عفو کے پہلو لئے تقریر دیکھیں گے

بڑھا دیں گے ذراسی وہ درازی روزِ ہجراں کی ✦ فغان و آہِ عاشق کو جو بے تاثیر دیکھیں گے

بلا دیں گے شہیدوں میں ہی دیکر خون کے چھینٹے ✦ مجھے کیونکر قیامت میں وہ بے توقیر دیکھیں گے

شبِ فرقت میں کرلیں گے تصور اُن کی زلفوں کا ✦ بلاؤں کے اُترنے میں اگر تاخیر دیکھیں گے

مم نہو آزردہ ہم سے تو خدا کو مان نا کامی ⁂ نہ کھینچیں گے اُسے جس آہ میں تاثیر دیکھیں گے
م سمجھتا ہوں بلاتے ہیں جو مجھ کو بزمِ دشمن میں ⁂ وہ کھینچ واکر مری تقدیر کی تصویر دیکھیں گے

م یہہ کھٹکا ہے ہمارے دل کا سا نقشہ نہو مائل
کسی دن چلکے بیت اللہ کی تعمیر دیکھیں گے

صلائے عام - میں خوش ہوں کہ جناب مائل دہلوی کا کلام صرف اسی رسالہ میں شائع ہوتا ہے مجھے آپ کے کلام کی بہت قدر ہے کہ آپ کا کلام کلامِ اساتذہ کا یادگار ہے: بلکہ ان سے بڑھ کر ایک اور خوبی ہے کہ آج کل کے متروکات سے بچا ہوا ہے جو اساتذہ کے زمانہ کے بعد آج کل کے شعراء نے ترک کردیئے ⁂ دوسری خوبی مضمون کی ہے کہ زبان کے ساتھ مضمون بالکل نیا دیکھ لیجئے۔ اسی شعر کو لیجئے ؎

نہ ہو آزردہ ہم سے تو خدا کو مان نا کامی ⁂ نہ کھینچیں گے اُسے جس آہ میں تاثیر دیکھیں گے

آہِ بے تاثیر کا مضمون شعراء قدیم و جدید میں سب نے باندھا ہے۔ لیکن جو یاس و نا امیدی اور نا امیدی کے ساتھ استغنا و ضبط اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آہ ہی نہ کھینچیں گے جس سے اثر کی اُمید ہو۔ اور آہ پھر بھی کھینچیں گے کہ لازمۂ عشق و محبت ہے: مگر آہوں میں وہی آہ جو اثر نہ کرے۔ مضمون آفرینی اسے کہتے ہیں!

اسی طرح ذیل کے اشعار میں زبان و مضمون دونوں خوبیاں بے مثل ہیں :-

جو مر جائیں سلام شوق فصلِ گل سے کہہ دینا ⁂ اگر زندہ رہے تو پھر تجھے زنجیر دیکھیں گے
بڑھاویں گے ذرا سی وہ درازی روزِ ہجراں کی ⁂ فغان و آہِ عاشق کو جو بے تاثیر دیکھیں گے
جو خنجر لے کے آئے ہیں تو سینہ چاک کرنے دو ⁂ ہم اپنا زخم دیکھیں گے وہ اپنا تیر دیکھیں گے
اُدھر ہے طائرِ سدرہ اِدھر ہے مرغِ جاں میرا ⁂ کدھر جاتا ہے چھٹتے ہی تمہارا تیر دیکھیں گے

خادم

خلاصۂ خطِ فارسی

(از مولوی رجب علی خاں صاحب اسمی حکیم احسن اللہ خاں صاحب مجریہ ماہ جولائی ۱۸۵۷ء)

اس پرچہ کے صفحہ ۱۵ پر یہہ خط جو فارسی میں بجنسہٖ درج کیا گیا اس کا خلاصہ اردو میں کم و بیش خط کا مطلب سمجھنے کے لئے سرسری طور پر یہاں عرض کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ سرکار انگریزی کی طرف سے بہادر شاہ بادشاہ کے سمجھانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہوا تھا۔ حکیم صاحب بادشاہ کے مشیرِ خاص تھے اس لئے اُمید تھی کہ یہہ تحریر اثر کرے گی۔ کیونکہ دلیلیں بہت معقول لکھی گئیں ؛

مولوی رجب علی خاں صاحب نے بہ ایمائے سرکار انگریزی حکیم صاحب کو لکھا کہ اندازاً دو مہینہ سے باغی سپاہیوں نے دہلی میں آکر فتنہ و فساد بپا کر رکھا ہے اور حضرت جہاں پناہ بادشاہ کا نام بدنام کر رکھا ہے ؛

یہہ حال آفتاب کی طرح روشن ہے کہ جنگِ روس و روم میں حضور ملکۂ انگلستان خلد اللہ ملکہا و سلطنتہا کے حکم سے سلطان عبد المجید خاں بادشاہ روم کی اعانت میں کسقدر صرفِ کثیر سے افواج بحر و بر معرکہ میں بھیجی گئیں اور روس سے مقابلہ کیا گیا تاکہ سلطنت اسلامیہ کی حفاظت ہو : یہہ حفاظت اپنا نقصان گوارا کر کے ہوئے کار آئی۔ باوجود

اس کے کہ رومیوں سے اتحادِ ملت (وقرابت) تھا۔ ہندوستان میں شروع سلطنت سے اہلِ اسلام و ہنود سے کسی طرح عقائد مذہبی میں کوئی جبر و اختیار کا شائبہ بھی خیال میں نہ گزرا۔ جو جس طرح چاہے اپنے اپنے عقیدے کے موافق زندگی بسر کرے اور بسر کر رہا ہے۔ اس کا ذکر تطویل میں داخل سمجھ کر چھوڑا جاتا ہے۔

حضرت ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کا حال دیکھئے کہ ان سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ تاریخ فرشتہ سے واضح ہے کہ بادشاہ ممدوح کے عہد میں جو شاہی جہاز ہندوستان سے حجاز کو براہ دریا روانہ ہوتے تھے سرکار انگریزی کے ہاتھوں سے کیسا عمدہ سلوک ہوتا تھا۔ حالانکہ اُس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری نہ تھی۔ اب کہ تمام ہندوستان دریائے شور سے پشاور تک زیرِ نگین سرکار ابد قرار انگریزی ہے حکامِ عصر و شجاعانِ بہادر انگلشیہ سے مقابل ہونے کی مجال کسے ہے؟ اور اس وقت جو تھوڑی بہت دیر ہو رہی ہے یہہ عوام کالانعام کے سوا کسی طرح قابلِ اعتبار نہیں۔ بلکہ یہہ امتحان کا وقت ہے جس میں دوست دشمن دانا و نادان کا حال معلوم ہوتا ہے۔

جب تک کہ مفسدوں کا قدم یہاں نہیں آیا تھا ملازمانِ شاہی کی طرف سے کوئی امر خلافِ اہالیانِ سلطنتِ انگریزی وقوع میں نہیں آیا۔ اب یہہ کیا بات ہے کہ ایک بارگی بلا سبب ایسا انقلاب مزاج میں پیدا ہو گیا کہ اس فساد کے اندفاع کی طرف توجہہ مبذول نہ ہوئی۔ اگر کوئی سبب خاص ہو تو مناسب ہے کہ مفصل

عالی کے محظورات و مکنونات شاہی اصالتاً یا وکالتاً تحریراً یا تقریراً احکام عالی مقام سرکار انگریزی کے گوش گزار ہونا چاہئے: پھر یہہ موقع ہاتہ نہیں آئے گا: عقل مند کے لیئے اشارہ کافی ہے ٭ جواب کا انتظار رہے گا۔ اور جو کچھ آپ لکھیں گے صاحبانِ عالی شان کے ملاحظہ سے گزر جائے گا ٭

قلم شکستم و مضمون مختصر کردم ٭ کہ نیست طرز من ایں گفتگوئے طولانی

پھر خط کی نہ ہو اُمید داری
القط ہے قلم کی دوست داری

صلائے عام۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہہ خط بہادر شاہ بادشاہ کے مُقدمہ میں عدالت کے سامنے پیش ہوا یا نہیں؟ ورنہ اتمام حُجّت لے لئے یہہ ثبوت کافی تھا کہ سرکار انگریزی کی طرف سے بادشاہ کے سمجھانے میں کوئی دقیقہ نرمی و مروّت کا فرد گزاشت نہیں ہوا ٭

مادرِ گیتی

مادرِ گیتی جسے کہتی ہے دنیا پیرزال ۔ اتنی کہنہ ہے کہ آدم بھی ہیں اُس کے خردسال
لیکن اس عمر طوالت پر یہ حالت اسکی ہے ۔ ہر گھڑی ہر لمحہ ہر آن اک نئی چلتی ہے چال
پھر سبک رو اس قدر محسوس تک ہوتی نہیں ۔ گرد کو بھی جس کے پا سکتا نہیں پائے خیال
مستقل ہے اُس کی روش ہے منجمد اس کا خرام ۔ پاؤں اس کے لڑکھڑائیں ڈگمگائیں کیا مجال
جتنی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی ۔ ہے عروجِ ارتقا اس کے لئے شدِ رحال
آدمِ اوّل سے لے کر آدمِ آخر تک آج ۔ اہلِ شرق اربابِ اہلِ جنوب اہلِ شمال
جتنے ابنائے زماں پروردۂ آغوش ہیں ۔ حسبِ استعداد کی جاتی ہے سب کی دیکھ بھال
اس کی پابندی سے ہر آزاد نے پایا فروغ ۔ اس کی فرزندی سے ہر ناقص کو حاصل ہو کمال
اُن سپوتوں کو بتاتی ہے وہ رازِ ارتقا ۔ جو سمجھتے ہیں کہ ماضی ہے سبق آموزِ حال
ہر گزشتہ چاہتا ہے بہتریِ آئندہ کی ۔ وہ بُرا آغاز کب ہے جس کا اچھا ہو مآل
جس کے قدم کو ہر قدم در پیش عذرِ لنگ ہو ۔ منزلِ مقصود تک اُس کا پہنچنا ہے محال

سچ ہے یہ ارشاد زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اسکی سرشت

[illegible] × × × × × × × ×

صلائے عام۔ یہہ مختصر نظم ایک مختصر رسالہ سے نقل کی گئی ہے جو جناب احسن صاحب مارہروی نے "چند منظوم مشتمل بر ماضی و حال مدرستہ العلوم" کے نام سے شائع فرمایا + آپ کی شاعری میں کلام نہیں۔ نظم و نثر دونوں میں آپ کو کمال حاصل ہے + ان نظموں میں شاعری کی بہت خوبی نہ تھی مگر پھر بھی کلام نہایت پاکیزہ ہے + میں نے ابھی عرض کیا کہ آپکو نظم و نثر دونوں میں کمال ہے نظم کا نمونہ تو آپنے ملاحظہ فرمایا۔ "چند منظوم" کے دیباچہ میں شاعری کی بیقدری کی وجہہ بہت معقول لکھی

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

"کہا جاتا ہے کہ جہالت کے زمانہ میں شاعری کو فروغ ہوا کرتا ہے یا بالفاظ دیگر بیکاری اس مشغلے کو بروئے کار لایا کرتی ہے۔ اسلام سے پہلے ایام جہالت کی سخن سازیاں۔ سبع معلقات کی بلند آہنگیاں نصر بن احمد کے سامنے رودکی کی "یاد جوئے مولیاں" اور عہد محمد شاہ کی شاعرانہ رنگ رلیاں۔ اثبات دعوے کی شہادت کو کافی ہیں۔ مزید برآں سر سید اعظم کی سعی اولین میں غفلت جہل کو زیر اثر بنانے کے لئے اسپیچیں۔ اور لکچروں سے زیادہ مولانا حالی کی نظمیں جو قوت برقی سے کام کر گئیں تائیدی ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

لیکن اب کہ تعلیم عامہ نے دہم جماعت تک کے ہر کامیاب طالب علم کے چہرے سے جہالت کا بدنما داغ مٹا دیا ہے اور فکر معاش نے معمولی حرف شناس تک کو اپنے اپنے دھندوں میں لگا دیا ہے۔ شاعری کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی - غالباً یہی وجہہ ہے کہ فی زماننا قوم کا رجحان طبع شعر و سخن کی طرف محض تفریحاً رہ گیا ہے ابھی ان مناظر کے دیکھنے والے بکثرت موجود ہیں کہ جس قومی انجمن میں مولانا حالی۔ مولانا نذیر احمد۔ مولانا شبلی یا اُن کے معاصرین و متعاقبین نظمیں پڑھتے تھے تو سامعین ہمہ تن گوش بن کر سماعت کرتے اور اُن تمام مراتب تہذیب کو ملحوظ رکھتے جو قاری و سامع کے لئے علم مجلسی کے ماتحت عہد سلف سے قائم تھے۔ برخلاف اسکے اب دیکھا جاتا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے اجتماع کے موقع پر منجملہ دو مظاہروں کے نظام الاوقات میں اگرچہ نظم کے لئے بھی جگہہ رکھی جاتی ہے۔ لیکن صرف برائے نوشت۔ اور اگر برائے گفت بھی ہوئی تو پہلے سے ہدایت کر دی جاتی ہے کہ پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا جائے عموماً ایسی نظمیں تفریح و تمسخر کا پہلو لئے ہوئی ہوتی ہیں جنکے شروع ہوتے ہی قہقہوں اور زمزموں کے پردوں میں شاہد معنی اپنے تمام حسن و خوبی کے ساتھ روپوش ہو جاتا ہے + اس قحط الرجال کے زمانہ میں اجکل ڈاکٹر

[illegible]

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلاے عام کی پیشگی قیمت چھ روپے سالانہ ہے قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلاے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔

صلاے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کا اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و ناتکلفی ضرور ہو۔ یعنی لسانِ ع عروس جمیل و لباس حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلاے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلاے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائیگی۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلاے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہو فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں:-

زبان اردو میں ایک صفحہ ایکسال کیواسطے	[illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
" " تین ماہ کیواسطے	[illegible]
" " نصف صفحہ ایکسال کیواسطے	[illegible]
" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایکسال کیواسطے	[illegible]
" " " چھ ماہ کیواسطے	[illegible]
" " " تین ماہ کیواسطے	[illegible]
" ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے	[illegible]
" نصف صفحہ " "	[illegible]
" چوتھائی صفحہ " "	[illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں آجانا چاہئے۔

(منیجر صلاے عام)

صلاے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:-
دہلی۔ فراشخانہ۔ مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شایع ہوا

Printed and Published by Mir Nāsir ali Khān Bahadur (Editor) at the Nāsiri Press, Farrāsh Khāna Dehli.

SALA-I-AM, DELHI. REGD. NO. L. 1462.

صلائے عام



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best feature of the new civilization.

فہرست مضامین

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء

صریرِ قلم سے حمدِ باری تعالیٰ

اکثر اساتذہ نے قلم سے حمد باری کا کام لیا ہے۔ میں سمجھے ہوا تھا کہ میر حسن نے اس طرز میں قلم توڑ دئے ہیں ؎

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم + جھکا جس کے سجدہ میں اوّل قلم

رہ حمد میں تری عزّ و جل + تجھے سجدہ کرتا چلوں سر کے بل

کیسے کیسے پاکیزہ مضمون قلم کی زبان سے نکلوا دے + صاحب گلزار نسیم نے بھی کمال کیا ہے کہ مثنوی کے ہر عنوان میں حمد سے اخیر تک قلم سے کام نکالا ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری + ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری

متاخّرین میں مگر حضرت وِلؔ نے حمد باری میں صریرِ قلم سے خوب کام لیا ہے + یہ نظم میں خمخانۂ جاوید سے نقل کرتا ہوں کہ اس طرز میں آپکا کلام اساتذہ سے لگّا کھا گیا:۔

قلم سے ہوئے جس کے سب آشکار + جہاں کے نگارش کدہ کی بہار

اُسی سے عیاں نقش سارے ہوئے + جو چھڑکا قلم تو ستارے ہوئے

یہ سورج دیا جو خدائی کا ہے + یہ دھبا سا اک روشنائی کا ہے

جاذب کا کاغذ ہے یا آسمان + یہ مشقِ شکستہ ہے یا کہکشاں

یہ قوسِ قزح جو نمودار ہے ✤ یہ آدھا سا اک خطِ پرکار ہے
نہ کیوں اس کے کاموں میں ہو عقل دنگ ✤ ہیں اک خط کے اندر بھرے ہفت رنگ
درخشاں نہیں چرخ پر ماہتاب ✤ کھُلی سورۂ نور کی ہے کتاب
شعاعیں ہیں مسطر لگائے ہوئے ✤ طلاکار جدول بنائے ہوئے
کریں تاکہ قدرت کو اس کی رقم ✤ ہیں پتے ورق اور شاخیں قلم
نظر کیجئے سطحِ تالاب پر ✤ لکھی نظم ہے صفحۂ آب پر
جو جاری کوئی باغ میں نہر ہے ✤ تو اک شعر گویا ہر اک لہر ہے
سُنو شورِ قمری فصاحت ہے یہ ✤ قدِ سرو دیکھو بلاغت ہے یہ
جو نور اُسنے چشمِ بشر میں دیا ✤ بتِ خاک کو چرخ پیما کیا
عجب اُس کی ہر شئے بنائی ہوئی ✤ ہے تِل میں خدائی سمائی ہوئی
ترے مُنہ میں باقی ہے جبتک زباں ✤ کرا ے دل تو تحمید خلاقِ جاں

۱؎ ستاروں کے وجود کا ثبوت بہت اچھا دیا کہ قلمِ قدرت کے چھڑکنے سے ستارے پیدا ہو گئے قلم میں سیاہی زیادہ آگئی تھی ✤

۲؎ سورج کو اُسی قلم کا ایک دھبا قرار دیا۔ جسطرح اسٹیفن[۳] کی سیاہی کے اشتہار میں آپ نے دیکھا ہوگا روشنائی کا رنگ دکھانے کے لئے سیاہی کا ایک بڑا دھبہ عمداً بنا ہوتا ہے جس سے سیاہی کے رنگ کی شوخی معلوم ہو ✤ ۳؎ اسی طرح بلاٹنگ جاذب کاغذ کی تشبیہ آسمان سے کہ نیلے رنگ کا کاغذ ہے ✤ کہکشاں شکستہ خط کی مشق کا نمونہ۔ قوسِ قزح آدھا خطِ پرکار۔ شعاعیں مسطر و ا

Blue Black Ink.

صلائے عام

افسانۂ عدوؔ میں یہہ دل چھپیاں کہاں ÷ آپ اس کو سُنیے۔ سُننے کے قابل یہہ حال ہے

حضرتِ جوشش فرماتے ہیں ؎

ایک دن کا ماجرا ہے میں اُٹھا تھا سیر کو ÷ دیکھتا کیا ہوں کہ جھگڑا بر سرِ بازار ہے

برہمن کہتا ہے بُت خانہ میں ہے ذاتِ خدا ÷ شیخ کہتا ہے غلط۔ کعبہ ہی میں وہ یار ہے

اس میں جوشش بول اُٹھا سُنتے ہو شیخ و برہمن

جانے دو اپنی طرف دیکھو یہہ کیا تکرار ہے

اخبار والوں کی یہہ عادت ہے کہ دُنیا بھر کے جھگڑے لے بیٹھتے ہیں۔ اور اپنا ذکر سوائے اس کے کہ اخبار یا رسالہ کی قیمت کا رونا روئیں اور کوئی ذکر نہیں کرتے: تھوڑے دنوں سے اکثر رسالوں میں لفظ "شذرات" اُردو میں ایجاد ہوا ہے جس میں کچھ اپنا اور زیادہ مضامین مندرجۂ رسالہ کا ذکر اور مضمون نگاروں کی داد دیجاتی ہے: اُردو میں

ؔ عدو سے مراد غیر ÷

"شذرات" اساتذہ کی زبان میں مجھے نظر نہیں آیا۔ اس خیال سے میں صلائے عام کے ذکر میں ایک عنوان اسی کے نام سے بڑھائے دیتا ہوں کہ انسان جب دُنیا بھر کے قصے لکھنے بیٹھے اس پر اس کا بھی حق ہے سہ

ہمیں تو اپنی کہانی اُنہیں سُنانی ہے ✦ وہ اعتبار کریں یا نہ اعتبار کریں

کہتے ہیں کہ "اپنا کام مُہا کام"۔ حضرت منصور رح کو ایک دن کسی نے نماز پڑھتے دیکھا کہ نہایت حضورِ قلب سے نماز پڑھ رہے ہیں۔ پُوچھا کہ آپ کو تو انا الحق کا دعوٰے ہے پھر یہہ نماز کس کی پڑھی جا رہی ہے؟ فرمایا کہ "اپنا کام آپ ہی خوب ہوتا ہے"۔

اخبار و رسالہ والوں کی بڑی شکایت یہہ ہے کہ قیمت وصول نہیں ہوتی۔ یہہ شکایت یار کی جور و جفا کی طرح فضول ہے سہ

دعائے وصل جو کی چرخ سے صدا آئی ✦ یہہ التجا تو بنی ہی نہیں اثر کے لئے

لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ شکایت پر بھی رسالے والے ہمت نہیں ہارتے۔ اور جتنا جو رسالہ پاکیزہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ زیر بار ہے: اِس شکایت میں صلائے عام کا نمبر اوّل نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں یعنی اس سے مستثنےٰ نہیں سہ

عاشقی گردشِ قسمت کو کہا کرتے ہیں ✦ دن کہیں چاہنے والوں کے پھرا کرتے ہیں

جب زیر باری کا یہہ حال ہے تو صلائے عام کا جاری رکھنا کیا ضرور ہے؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ سہ

میں آؤں وعظ میں سو بار جب یہہ دل بھی لگے ✦ دو رکوں کیا واعظو رندوں کی صحبت ہی کچھ ایسی ہے

قابلِ تعزیر ہے کش ہیں جنابِ محتسب
دَور کی تقصیر کیا ہے دَور چلنے دیجئے

کمال کی قدر کوئی کرے یا نہ کرے - عوام میں کمال کی قدر اہلِ کمال کی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی ہے

مہِ نَو - ابروے پُرخم - نگہِ برگشتہ + ہم نے ٹیڑھا جسے دیکھا اُسے خنجر جانا

رسالے نکالنے اور چلانے والوں کی ہمت کو سراہنا چاہیئے کہ اس بے قدری پر نئے نئے رسالے نکال رہے ہیں اور پُرانے رسالے چلا رہے ہیں - قوم و مُلک کی سچّی خیر خواہی اسے کہنا چاہیئے ہے

مجنوں نے راہِ عشق میں چُومے مرے قدم + اُلفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

شُکر ہے دے کے دل اُنکو کوئی جھگڑا نہ ہوا
میرا تیرا نہ ہوا - اپنا پرایا نہ ہوا تو

میرے ایک کرم فرما مجھسے دریافت کرتے ہیں کہ :-

× × × × × ”عرصہ ہوا آپ نے صلائے عام میں پنشن یافتہ اصحاب کی ایک سوسائیٹی قایم کرنے کی تجویز کی تھی - وہ چلی یا نہ چلی ؟“ × × × × × × ×

اُس تجویز سے میری غرض یہہ تھی کہ ”پنشنئے“ جنہیں آپ ”پنشن یافتہ اصحاب“ سے مخاطب

فرماتے ہیں بے کار سمجھے جاتے ہیں۔ بے کاری میں اور بھی نکمے ہو جاتے ہیں: میری تجویز تھی کہ یہہ لوگ آپس میں مل لیا کریں تو تبدیل خیالات کا بہانہ حاصل ہو جائے + معمولی حالتوں میں ایک دو تجربہ کار بزرگ بھی غنیمت ہوتے ہیں۔ اس صحبت میں تو سب کے سب تجربہ کار اور منجھے لوگ ہوں گے: اور اکثر ایسے ہی لوگ جمع بھی ہوئے + مگر مجھے خیال نہ رہا کہ بقول حسن جو انہوں نے چرخ کج رفتار کی شکایت میں فرمایا کہ ؎

یہہ وہ دل کو یک جا بٹھاتا نہیں + کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

حسینوں کو آغازِ شباب میں ایک دوسرے سے جدائی کفارہ عشق و محبت سہی بوڑھے جو بوڑھوں سے جدا کئے جاتے ہیں یہہ کس مد میں سمجھا جائے؟ سوءِ اتفاق سے اس تجویز کے چند نامور بزرگ احیاناً انتقال کر گئے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف جناب مولوی نذیر احمد صاحب جیسے نامور شخص کے صاحبزادے۔ مرزا عرفان علی بیگ صاحب آی۔ ایس۔ او۔ خاں صاحب مرزا محمد علیخاں صاحب دہلوی۔ خاں بہادر پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب سی۔ آی۔ ای۔ شمس العلما مولوی محمد امین صاحب جج۔ مرزا حیرت دہلوی: یہہ لوگ بڑے نامور اور بڑے کام کے تھے + لیکن جس طرح ہر اچھی چیز کو نظر لگ جاتی ہے۔ پنشن خوار اصحاب کی تجویز کو زمانہ کی نظر کھا گئی + میرے قوٰے بھی بہت ضعیف ہو رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ضعیفی میں جس طرح سرکاری کاموں میں کہن سالگی ملازمت سے علیحدگی کی وجہہ سمجھی جاتی ہے۔ اس جم غفیر یعنی پنشن خواروں کی تجویز کے لئے تازہ دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ یہہ کام میرے بوتے کا نہیں +

دی۔ صاحب

وہی صاحب ایک اور بات پوچھتے ہیں :-

× × × × × × × ”ایک اور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں ۔ وہ یہہ ہے کہ سر جان لبک صاحب نے انگریزی کی سو چیدہ کتابوں کی فہرست شائع کی تھی ۔ اگر اُردو کی بھی کوئی ایسی فہرست تیار کی جائے تو بہت اچھا ہو ۔ مشکل یہہ ہے کہ اُردو کی عمدہ لائبریری یا کتب خانہ شاید کہیں بھی نہیں ۔ عمدہ سے عمدہ کتاب چھپتی ہے اور اُسکی اشاعت نہیں ہوتی ۔ اشتہارے اشاعت کا کام اُس بڑے پیمانہ پہ نہیں لیا جاتا جیسا کہ یورپ میں ۔ اس وجہہ سے بہت آدمی اُس کتاب کو پڑھنے سے محروم رہ جاتے ہیں ۔ اگر کہیں کسی مضمون کے لئے کتابوں کی تلاش کرنی ہو تو لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری سے مدد لینے کی ضرورت پڑے ورنہ یہاں ہندوستان میں یہہ ناممکن ہے “ × × × × × ×

(سراج احمد)

اِس کا جواب میرے اکیلے کے بس کا نہیں ۔ بہت عرصہ نہیں ہوا کہ صلائے عام کے قدرشناسوں میں سے ایک صاحب نے بالکل اسی طرح کی تجویز کی صلائے عام میں تحریک کی تھی : یہہ تحریک اب پھر کی جاتی ہے ۔ اس کے متعلق مجھے یہہ عرض کرنی ہے کہ اُردو لٹریچر میں نظم نے تو اچھی خاصی ترقی کی ہے ۔ ہماری زبان شروع سے شعروشاعری کی طرف متوجہہ رہی : کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ لٹریچر کا بڑا جزو نثر ہے ۔ نظم کی بھی تو کتابیں تو نہیں مگر دس پندرہ دیوان و تذکرے ڈھونڈھے سے مل جائیں گے مگر نثر کی تو اتنی بھی

تصانیف ابھی تک عنقا ہیں۔ چہ جائے کہ تسو کتابیں منتخب ہوں + ناول کی تعداد خاصی ہے مگر یورپ کی زبانوں میں جو ناول نکل رہے ہیں ان سے ہمارے ہاں کے ناول بہت گرے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے ترے ناولوں پر کسی زبان کی لٹریچر کو ناز کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ لٹریچر کے لئے ہر طرح کے پاکیزہ ادائے بیان کی ضرورت ہے۔ اور زبان کے ساتھ وسعت خیال بھی ضرور ہے کہ ع عروس جمیل و لباس حریر۔ کی طرح عروس کے ساتھ اچھا لباس زیبائی کا ہے

اہل تحقیق کا مسلمہ ہے کہ ہماری زبان میں اچھے خیال کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس میں اُردو کی نظم و نثر دونوں محتاج ہیں: خاصکر نثر + اب تسو کتابیں آئیں تو کہاں سے آئیں؟

یہاں آپ یہہ سوال کر بیٹھیں گے کہ اس قدر انعام یافتہ اور اُردو کی کمیٹیوں کی پسندیدہ کتابیں کس مرض کی دوا ہیں؟

اسکا جواب پڑھنے والوں کے ذمہ ہے۔ یہہ جواب درازئ شب ہجراں کی طرح طول ہوگا اور بسانِ وعدۂ یار دیر میں کیا مشکل سے ملے ہوگا۔ بقول لسان الملک حضرت ریاض

ع نہ جھوٹھ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے + قسم نہ کھا ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

ترے "جھوٹھ بولنے" سے "قسم کھانے تک" کا اعتبار نہیں۔ اور اعتبار بھی کتنا گرا ہوا کہ "کل" کے عوض "کبھی" کا بھی بھروسہ نہیں ع

جب وعدۂ وصال کی میعاد ہی نہیں
کیجیے حساب کس لئے پھر ماہ و سال کا

مضمون پریشاں

سر سید احمد خاں بہادر کو گو شعر و سخن کی طرف بہت توجہ نہ تھی مگر جی بہلانے کے لئے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ آپکا تخلص آہی تھا: شعر خاصے ہوتے تھے، نمونہ کے طور پر اپنے مطلب کے میں دو شعر اُن کے کلام سے نقل کرتا ہوں ؎

باشند بہ جمعیتِ خاطر بدمِ حشر ✦ آناں کہ سرِ زلفِ پریشانِ تو یابند

گر راز بجویند ز سر رشتۂ جانہا

موئے ز سرِ طرۂ پیچانِ تو یابند

اکثر اساتذہ نے شبِ عیش کے مضمون بڑی دھوم کے باندھے ہیں کہ رات کو یہہ تھا

وہ تھا اور صبح کو دیکھا تو کچھ نہ تھا: غالب مرزا نوشہ کا وہ قطعہ جس کا آغاز اس طرح ہے کہ:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ٭ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اور آخر کو اس مصرع پر ختم ہوتا ہے ع ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے: بے مثل ہے

لیکن صاحب عالم حضرت صابر نے اس مضمون کو جس خوبصورتی سے ادا کیا ہر ایک کے بس کا

نہیں: دیکھئے دمِ رخصت صُبح کا نقشہ کس بلا کا کھینچا ہے:-

رات بھر جاگنے سے نیند کا آنکھوں میں خمار ٭ اور کچھ کچھ اثرِ نشۂ صہبا باقی ہو

بھینی بھینی سی وہ رنگت وہ پریشاں ترکیب
لب پہ بد رنگ سا کچھ پان کا لاکھا باقی ٭

"پریشان ترکیب" خوب کہا: اس مضمون میں مجھے اسی "ترکیب" سے غرض تھی لیکن باقی

شعر بھی لاجواب ہیں۔ لگے ہاتھ وہ بھی سُن لیجئے:-

آنکھ کے ڈوروں میں کم کم سی وہ سُرخی کی نمود ٭ تھوڑا تھوڑا سا اک انداز سے سُرمہ باقی

ایک اک گام پہ بل موئے کمر میں سو سو ٭ کاٹنا شاق نزاکت سے وہ رستا باقی

اب نہ وہ شب کا مزہ اور نہ وہ صُبح کا لُطف
رہ گیا اک کفِ افسوس کا ملنا باقی

مُجھے تعجب ہے کہ ہر عیش و سرور کے لئے پریشانی و مصیبت لازمی ہے اور

آنکھوں کے سامنے ہے کہ اس مسئلہ میں سرِ مو فرق نہیں آتا: برخلاف اس کے پریشانی

یہہ شرط نہیں کہ اطمینان و دلجمعی ضرور ہو۔ پریشانی و فکر زندگی کے لئے ضروری شرطوں میں داخل ہے۔ اس سے بچنا عالم اسباب میں مشکل ہے ٭ انسان کسی حالت میں ہو پریشانی و فکر سے خالی نہیں رہ سکتا ٭

بچپن میں جو ہم ظاہرا بے فکر رہتے ہیں اس کا سبب یہہ ہے کہ ماں باپ بچہ کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ بچہ کی بے فکری ماں باپ کی پریشانی و فکر کا صدقہ ہے کہ از روے فطرت بچہ کو یہہ نعمت مفت ہاتھ لگی ٭

جوانی میں نیچر ہمیں اپنی فکر میں لگا لیتی ہے کہ نیچر کو نوع انسان کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس کے خبط میں ہم پریشان رہتے ہیں ٭ ؎

قیامت کی ہے برپا آئینہ میں عکس کا کلنے ٭ بلائیں لیتے جاتے ہیں پریشاں ہوتے جاتے ہیں

کام پھرنے سے ہے تمہیں گھر گھر ٭ شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

جوانی میں اس پریشانی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ جوان افکار و پریشانی کو جب تک جوانی رہے خیال میں نہیں لاتے۔ بس یہی تدبیر پریشانیوں سے بچنے کی ہے کہ ان کا خیال ہی نہ آئے ٭ جوانی کی تشبیہہ آندھی سے ہے کہ آندھی میں سنائی نہیں دیتا ؎

آہیں بھر لوں گا تو کچھ بات سنائی دے گی ٭ ناصحو پہلے یہہ آندھی تو اتر جانے دو

بڑھاپے میں پریشانیاں اس وجہہ سے بڑھ جاتی ہیں کہ ان کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہتی؛ جس طرح کم زور کو غصہ زیادہ آتا ہے اور پہلوان کو غصہ کم آتا ہے

اسی طرح جب انسان کسی کام کا نہیں رہتا تو افکار میں زیادہ مبتلا رہتا ہے ؎

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں ✤ لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

گر یہہ وقت بھی غنیمت ہے کہ ظاہراً گو بڑھاپے کی وجہہ سے ہم کسی کام کے نہیں رہے کہ چراغِ سحری کیطرح جو نسیم سحر سے پہلے خود بخود بجھنے کو تیار رہے۔ مگر ہمارا صبر سے یہہ وقت کاٹ دینا عبادتِ الٰہی کے برابر ہے ؎

ساقی ہمارے عبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ ✤ بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم

انسان کو سفر میں کوچ سے پہلے دیکھ لینا چاہئے کہ بے کار اسباب تو زیادہ نہیں۔ سب سے زیادہ بے کار اسباب میں ہماری آرزوئیں تھیں جو پوری نہ ہو سکیں ہم اُن کو چھوڑ چلے کہ مفت کا بوجھ ہے ✤ جب دنیا ہمیں چھوڑ دے تو ہم کیوں دنیا کے پیچھے پڑے رہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اکیلے آئے اور اکیلے جائیں گے۔ دو دن کے لئے جھگڑا لگا لینا کونسی عقلمندی ہے؟ ؎

غافل تو بھی تو رفتنی ہے ✤ کب تک غم رفتگاں کریگا؟

لیکن کچھ کیوں نہ کہئے۔ انسان سے اکیلے رہا نہیں جاتا اسے اپنی ہی صحبت ناگوار ہے: اولیاء اللہ کا ذکر نہیں مگر معمولی طور سے اکیلے بیٹھا رہنا بہت کم کسی کو پسند آتا ہے ✤ کتاب کو مونس تنہائی سمجھتے ہیں مگر کتاب بھی دیکھتے دیکھتے جی گھبرا جاتا ہے ✤

جب یہہ حال ہے تو "مضمونِ پریشان" سے کیا فائدہ ہے؟ اس کے جواب میں میں آپ سے خانہ بدوش اقوام کی ایک پاکیزہ رسم کا ذکر کرتا ہوں: وہ یہہ ہے کہ:-

خانہ بدوش جنہیں انگریزی میں جپسی کہتے ہیں یہہ دُنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں اور ایک جگہہ قیام نہیں کرتے۔ ان کی زبان اور رسوم زندگی تمام دنیا سے خاصکر تمدن و تہذیب سے جو ایک جگہہ کے رہنے والوں میں رائج ہیں عمداً بیگانہ ہیں اور پھر بھی کوئی کام انکا نہیں رُکتا۔ ان کے پاس ڈاک۔ تار۔ وائرلیس۔ خط کتابت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ پھر بھی اپنے ایک مقام سے دوسرے مقام جانے کی خبر دنیا میں جہاں ان کی برادری ہو بہت صحیح پہونچ جاتی ہے۔

آپ نے خیال نہیں کیا۔ جہاں آپ کو ان کا کیمپ نظر آوے وہاں سے ہر مقام پر جہاں جہاں یہہ جائیں گے ہندوستان سے تمام ایشیا و یورپ میں جابجا گھاس پھوس اور تنکوں کی چھوٹی ڈھیریاں دکھائی دیں گی۔ یہہ نشان اسبات کا ہے کہ ان ان مقاموں پر ان کا گزر ہوا ہے۔ اس تنکوں کے وایرلیس سے کوچ و قیام کا پتہ۔ بیاہ شادی۔ پیدائش و موت کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں اور تاریخیں مقرر ہو جاتی ہیں۔ یہہ لوگ ایسے دور دراز مقاموں کی خبر رکھتے ہیں جیسے ایرلینڈ۔ اسپین۔ اٹلی اور شاید امریکا بھی پہونچے ہوں:

صلائے عام کے **مضمونِ پریشان** گو ظاہراً جپسیوں کے تنکوں کی ڈھیریوں کی طرح نظر میں شاید نہ جچیں مگر پریشانی میں بیکار نہیں جا سکتے: بقول جناب مُفتی صدرالدین خاں آزردہ

گرے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر۔ کیوں نکل آئے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

اللہ اللہ آپ کی زلفِ پریشاں کا اثر

میں نے گر سر کی قسم کھائی پریشانی ہوئی

صلائے عام کے
کے
جواہر ریزے

(۱) دُنیا میں جب تک مشغلۂ مُحبّت ہے۔ یار کا مُسکرانا مُحبّت کی جان سمجھا جائیگا۔

(۲) یار کے طعنے غیر کی خوشامد سے اچھے لگتے ہیں۔

(۳) مُحبّت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔

(۴) آپ رونا اور یار کو رُلانا۔ اکیلے ہنسنے سے اچھا ہے۔ آپ ہی آپ ہنسنا دیوانگی ہے۔

(۵) جس کو اپنی زیست پیاری ہو۔ اُس کو مریضِ مُحبّت ہونا نصیب نہیں ہوتا۔

(۶) کسی پری وش کے خط و خال آپ آتشی شیشہ سے دیکھیے تو ساری خوبی کا خون ہو جائے گا۔

صلائے عام

رسالۂ حرم کے جون و جولائی سنہ رواں کے پرچہ میں عنوان بالا کے نام سے یہہ چہہ مختصر فقرے جو بجنسہ اوپر نقل کئے گئے "جواہر ریزے" سمجھے گئے حالانکہ سنگ ریزوں سے بھی بدتر تھے بقول جناب اصغر گونڈوی؂

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا ٭ جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

میں چاہتا ہوں کہ اِن کو ذرا چمکا دوں۔ کیونکہ سنگ ریزے بھی گو کتنے ہی بے ڈول ہوں جلا سے ذرا چمک جاتے ہیں:-

(۱) مُسکرانا تو ہر حال میں اچھا ہے۔ محبت میں اس کا کیا کہنا! ماں کو اپنے بچہ کا مسکرانا دُنیا بھر کی نعمتوں سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ عرضِ تمنا پہ یار جواب دے یا نہ دے یار کا صرف مُسکرا کر رہ جانا چاہنے والے کی جان میں جان ڈال دیتا ہے؂

ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر ٭ تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کُشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا (حضرت اصغر)

برخلاف اس کے ماتھے کی شکن سے عینِ ملاقات میں بھی آرزو کا خون ہو جاتا ہے: بقول لسان المُلک حضرت ریاض؂

دھری رہ جائے گی یوں ہی شبِ وصل ٭ نہیں لب پر شکن تیری جبیں پہ

(۲) محبت میں طعنے طعنے نہیں معلوم ہوتے بلکہ محبت کی کسوٹی بن جاتے ہیں کہ اصل سونا جس قدر کسوٹی پر رگڑیئے اپنے اچھے ہونے کا گواہ ہو جاتا ہے +

(۳) عورت کی محبت بغیر شائبۂ غرض ہے - بچے کے پالنے میں عورت جو اپنی جان لڑا دیتی ہے یہہ قیس سے لیلے کی محبت میں ممکن نہیں کہ قیس کی محبت بے غرض نہ تھی: آغاز شباب میں ایک دوسرے کو از روئے نیچر خود بخود اُنس ہوتا ہے یہہ کوئی بڑی یا نئی بات نہیں - مگر ماں کو اولاد پر جان دینے سے کیا مل سکتا ہے ؟ فرہاد کو شیریں سے محبت میں خسرو پرویز سے رشک کی جھلک تھی - زلیخا کو حضرت یوسفؑ سے جو محبت تھی اتنی بے غرض نہیں جتنی کہ ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے : حالانکہ از روئے قانون بچے پر باپ کا اختیار زیادہ ہوتا ہے + عورت جو مرد سے محبت کرتی ہے یہہ کتاب محبت کا صرف دیباچہ ہے - اُس کی غرض ماں بننے سے ہے کہ بلا غرض بچے کو پالے : بلکہ دنیوی محبتوں سے جب عاری ہو جاتی ہے تو دین سے محبت کرنے لگتی ہے کہ ہر مذہب کی عورتیں مردوں سے اپنے عقائدِ مذہبی میں زیادہ سرگرم ہوتی ہیں - یہہ خدا سے لَو لگانا ہے + ہر مذہب کی استقامت عورتوں کی مضبوطیٔ عقائد پر سمجھئے + خدا سے لو لگانی غایتِ محبت ہے +

(۴) "آپ رونا اور یار کو رُلانا" یہہ عجیب سین ہے جس کے سامنے تمام دُنیا کے قہقہے و تماشے حرفِ غلط معلوم ہوتے ہیں - دمِ رُخصت دونوں کا صدمۂ جدائی سے چشمِ نم ہونا بلا کا سماں ہے - بقول حضرت میر دردؔ ع چشم نم آئے تھے دامن تر چلے : اس کا جواب بچے کا دُنیا میں آتے ہی پہلے پہل رونا ہے کہ تمام گھر کے لئے کیسی خوشی کا

باعث ہوتا ہے ؎

(۵) جس کو اپنی زیست پیاری ہو وہ کسی پر مرنے کا خبط چھوڑ دے۔ مریضِ محبت کی تصویر یہہ ہے کہ ؎

کل آپ عیادت کو جدھر بیٹھے تھے آکر ؛ اب تک اُسی کروٹ سے یہہ بیمار پڑا ہے

(۶) یار کے معاملہ میں تحقیق و بحث بے کار ہے۔ کتنا ہی نازک و خوبصورت پھول ہو آتشی شیشہ سے دیکھیے تو اتنا بدشکل نظر آئے گا کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہے گا۔ آپ جسے تحقیق سمجھیں گے وہ آپ کی اُلجھن کا باعث نکلے گا ؎

اکیلے رونا تو بُرا نہیں۔ بلکہ رونے کے لئے تنہائی زیب دیتی ہے مگر خود بخود ہنسنا حماقت میں داخل ہے : اپنی مُصیبت میں دوسروں کو شریک کرنا بقول حضرت شیخ سعدیؒ ایک تو نقصانِ مایہ دوسرے شماتتِ ہمسایہ ہے : خوشی میں آپ جس قدر اوروں کو شریک کر سکیں زیب دیتا ہے کہ ازدیادِ مسرت کا سبب ہے۔ یہہ الہامی نص ہے کہ امّا بنعمتِ ربّکَ فحدّث ؎

صلائے عام۔ رسالہ حرم گوڈاکٹری میں مستورات کے بڑے کام کا ہے مگر لٹریچر کی ترقی کے لئے بھی بیمثل ہے۔ اور لٹریچر میں عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے ضروری ہے : یہہ دقوعی بات ہے کہ جبوقت سالہ آتا ہے سب اسکی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ جون و جولائی کا رسالہ آتے ہی ندارد ہوگیا۔ میں نے درخواست کرکے دوبارہ دفتر سے منگوائے۔ اس میں سے ایک میں نے مقفل کردیا کہ ایک تو میرے پاس رہ جائے ؎

رسالہ حرم میرے پاس صلائے عام سے تبادلہ میں آتا ہے۔ اگر یہہ صورت نہ ہوتی تو میں قیمتاً منگاتا : یہہ اشارہ ان لوگوں کی آگہی کیواسطے ہے جو قیمتاً منگا سکتے ہوں اور اب تک غافل ہوں ؎

AL Magnifying Glass.

چند بادشاہوں کا حج بیت اللہ شریف

(ازروئے تاریخ)

ہندوستان کے بادشاہوں میں سے خواہ پٹھانوں کی سلطنت والے خواہ سلاطینِ مُغلیہ والے کسی کے حج کا ذکر تاریخ میں نہیں مُجھے گُمان ہے کہ یہاں کے مُسلمان بادشاہوں میں سے کوئی حج کو نہیں گیا؛ یہانتک کہ بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر جو بادشاہوں میں نہایت مُتّقی و عابد بادشاہ تھا اور شرع کا نہایت پابند کہ مسائل میں **فتاوےٰ عالمگیری** جیسی مُستند کتاب بڑی تحقیق و صرف سے لکھوائی۔ مگر خود فریضۂ حج ادا نہ کیا ۔ بلکہ ہندوستان سے جو لاکھ روپیہ سالانہ نذرانہ خیرات کے طور پر عرب کو بھیجا جاتا تھا اُس کی نسبت شریف مکّہ نے شکایت کی کہ یہہ رقم کافی نہیں ہے اس پر عالمگیر نے حکم دیا کہ یہہ رقم ہندوستان کے غُربا و مساکین پر تقسیم کردی جائے کہ یہاں کے محتاج زیادہ مستحق ہیں ۔

مگر مجھے تاریخ سے بعض شاہان بلادِ اسلامیہ کے حج کا ذکر کرنا ہے کہ گو ہندوستان

ص ۲۱۷

کے اسلامی بادشاہوں میں سے کسی کے حج کا ذکر تاریخ میں نہیں ملا۔ مگر بلاد اسلامیہ کے سلاطین مثل بغداد و دمشق و مصر کے بادشاہوں کے سفر حج کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے ۔

خلیفہ مقتدر باللہ نے سنہ ۳۰۵ ہجری میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اور سنہ ۶۳۱ ہجری میں جب معتصم باللہ کے چچا بغداد سے بیت اللہ کو گئے تو صرف بار برداری کے واسطے ایک لاکھ بیس ہزار اُونٹ ساتھ تھے۔ اور سنہ ۹۰ ہجری میں جب سلیمان بن عبدالملک نے حج کیا تو صرف اپنے ذاتی خاصہ کے لباس و پوشاک کے لئے نُو سو ۹۰۰ اونٹ ساتھ لئے۔ اور سنہ ۱۶۰ ہجری میں خلیفہ المہتدی نے سفر حج میں تیس کرور درم خرچ کئے۔ یہانتک کہ اپنے پینے کا پانی سرد کرنے کو بغداد سے مکہ معظمہ تک برف ساتھ لی۔ حالانکہ عرب میں برا پانی بھی ملنا مشکل تھا ۔

خلیفہ ہارون رشید نے نو دفعہ مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ سفر میں ایک دفعہ ڈیڑھ کروڑ دستار (عمامے) محتاج حاجیوں کو تقسیم کئے ۔

جب عبدالملک ناصرالدین ابوالمعالی سردار مصر نے سنہ ۶۱۹ ہجری میں حج کیا تو پانسو ۵۰۰ اونٹ صرف شیرینی کی برداری کے ساتھ تھے۔ علاوہ ان کے دو سو ستر ۲۷۰ اونٹ انار و بادام اور میوہ جات کے تھے ۔

ہر مُلک کے حاجیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کیمپ ہوتے تھے اور مُحلّوں کی طرح وہ کیمپ اُس مُلک کے حاجیوں کے نام سے پکارا جاتا تھا کہ شام کا کیمپ۔ مصر کا کیمپ۔ ٹاپا کا کیمپ وغیرہ ۔

حاجیوں کے قافلے چار مہینے پہلے مکہ معظمہ میں پہونچ جاتے تھے کہ رمضان شریف کا چاند مکہ معظمہ میں دیکھنے کا بڑا ثواب ہے ۔ خلیفۂ وقت قافلوں کی حفاظت کے لئے ساتھ

سوزکرتے

سفر کرتے تھے کہ اُس زمانہ میں بدویوں کا بڑا زور تھا۔ قافلۂ مصر کے ساتھ محمد علی پاشا اور قافلۂ دمشق کے ساتھ سلیمان بادشاہ دمشق: محمد علی پاشا کے خیمہ کے دروازہ پر محتاج حاجیوں کے واسطے پانی کی مشکیں تھیں اور سلیمان بادشاہ کے خیمہ پر دو توپیں تھیں۔ دونوں کے کیمپ ایک دوسرے کے مقابل میں تھے ÷

شام کے قافلہ کو اور قافلوں سے ترجیح ہوتی تھی کہ سب سے زیادہ آرام اس قافلہ کے ساتھ ملتا تھا ÷ قسطنطنیہ سے دمشق تک منزل بمنزل راہداری کا بند و بست رہتا تھا اور ہر مقام پر سرائے اور کنواں بنا ہوا تھا۔ دمشق میں پہونچکر سواری و بار برداری کا انتظام بدویوں کے شیخوں یعنی بدویوں کے سرداروں کے ذمّہ ہوتا تھا جو شام کے قریب رہتے تھے ÷ اُس زمانہ میں قربانیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ مقتدر باللہ نے چالیس ہزار اونٹ اور پچاس ہزار گوسفند طلب کئے تھے اور اکثر متمول لوگ اونٹ کی قربانی کرتے تھے ÷

اس مضمون کا ماخذ جابجا سے جناب مسٹر رابرٹ صاحب بہادر کی کتاب فوائد الناظرین نامے ہے جو صاحب ممدوح نے انگریزی کے ۱۸۳۱ء کے سفرنامہ سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے اس کی فارسی بہت اچھی ہے لیکن کاتب نے ایسا بدخط لکھا ہے کہ اکثر مطلب کا سمجھنا مشکل ہوگیا پھر بھی اس سفرنامۂ حجِ بیت اللہ کے دلچسپ ہونے میں شک نہیں ÷ حجِ بیت اللہ کے واسطے ہر مسلمان کی دُعا ہے کہ زادَ اللّٰہ شرفاً و تعظیماً ÷

حضرتِ آذر صاحب تذکرۂ آتشکدہ نے اپنے تذکرہ کو اس شعر سے شروع کیا ہے کہ ؎

در طوفِ حرم دیدم دی مغبچہ ئے گفت ÷ کایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستی ÷ مغبچہ کے عقیدہ میں اس سے زیادہ تعریف ناممکن ہے ÷

اخلاقِ ناسخ

حضرت یہہ مضمون پیدا کیا ہوا افسانہ کے طور پر نہیں ہے واقعی حال گزارش کرتا ہوں صاحب زادہ احمد علی خاں صاحب جو امیر الدولہ نواب میر خاں والیٔ ٹونک کے فرزند ارجمند تھے اور مہاراجہ رام سنگہ والیٔ جے پور کے بڑے رتبہ کے ہم نشین۔ خلوت و جلوت کے یار راز دار تھے۔ دونوں ریاستوں کی امداد سے نہایت کر و فر اور شان و شوکت جاہ و جلال خدم و حشم کے ساتھ امیرانہ طور پر زندگی کو عیش و نشاط کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ شاعری موسیقی وغیرہ میں حدِ کمال کو پہونچے ہوئے تھے۔ میر تنویر سید امراؤ میرزا انور ظہیر الدین ظہیر، پیرن شاہ صفا دہلی کے نامآور شعرا ان کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ میر امراؤ میرزا انور سے تلمیذی کا بھی فخر رکھتے تھے۔ نیاز مند بھی حاضر باشوں میں تھا۔ عمر قریب سو برس کے پائی۔ قریب چالیس برس کے انتقال کئے ہوئے ہوئے۔ ایک روز بر سبیل تذکرہ فرمانے لگے۔ دہلی اور لکھنؤ کے ہنگامۂ غدر سے پہلے مجھکو خیال آیا کہ لکھنؤ چل کر شیخ ناسخ کے لب و دہاں سے انکا کلام سُننے یہہ ارادہ یہاں تک پختہ ہوا کہ لکھنؤ پہونچا اور شیخ صاحب کے مکان پر پہونچا تو کواڑ بند پائے۔ زنجیر کھٹکھٹانے پر خدمتگار نے کواڑ کھولے اور مجھے اجنبی شخص دیکھ کر کہا شیخ صاحب کوٹھے پر تشریف رکھتے ہیں اوپر گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک کمرہ میں سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے اور گاؤ تکیہ سے لگے ایک شخص نہایت لحیم و شحیم سیاہ رنگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سلام کیا تو سلام کے جواب کی عوض ہاتھ سے اشارہ کیا کہ آؤ بیٹھو۔ چند منٹ تک میں اس انتظار میں خاموش بیٹھا رہا کہ اب میرا حال دریافت کرتے ہیں کہ تو کون ہے۔ جب اُدھر سے سکوت پایا تو

میں نے خود ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ میں جے پورسے محض آپ کی زبان مبارک سے آپ کا کلام معجز نظام سننے کے شوق میں حاضر ہوا ہوں۔ شیخ صاحب ہنوز کچھ فرمانے نہ پائے تھے کہ ایک جوان بہت خوبصورت۔ لطیف مزاج۔ پاکیزہ لباس چوگوشیہ ٹوپی لکھنوی پہنے ہوئے آئے اور نہایت ادب کے ساتھ سلام کرکے بیٹھے۔ شیخ صاحب نے فرمایا مجھے مخاطب کرکے کہ میں نے دام شاعری جو پھیلایا تو پہلے پہل یہہ ہما پھنس گیا۔ جو صاحب تشریف لائے تھے اُن کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اِن سے کچھ سن لو میں کیا پڑھوں اور اُن سے کہا کہ تم کچھ سناؤ۔ یہہ جے پور سے آئے ہیں۔ انہوں نے ایک غزل شروع کی کہ جس کے ہر شعر پر میں داد دیتے دیتے تھک گیا اور دل میں یہہ کہہ رہا تھا کہ یہہ کون شخص ہے جب مقطع پڑھا تو معلوم ہوا کہ خواجہ وزیر ہیں۔ خواجہ صاحب کی غزل ختم ہونے پر میں نے پھر شیخ صاحب سے مکرر تمنا ظاہر کی مگر شیخ صاحب نے میری التجا قبول نہ کی اور ایک مصرعہ بھی نہ فرمایا میں ناکام چلا آیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ کے بعد پھر گیا اور شیخ صاحب کے مکان پر پہونچا تو اس خادم نے پہچان لیا۔ مکان میں گیا تو میں نے یہہ دیکھا کہ نیچے دالان میں ہر طاق میں ایک تختہ کاغذ کا اور قلم دوات رکھی ہوئی ہے۔ میں نے خادم سے پوچھا کہ یہہ کیوں رکھی ہوئی ہے تو اُس نے کہا کہ شب کو شیخ صاحب ٹہلتے جاتے ہیں اور جس طاق کے پاس شعر موزوں ہوجاتا ہے وہیں لکھ دیتے ہیں۔ یہہ سنکر میں اوپر گیا شیخ صاحب کو دیکھا کہ اسیطرح تکیہ سے پشت لگائے بیٹھے ہیں۔ میں سلام کرکے بیٹھ گیا۔ شیخ صاحب نے یہہ بھی نہ پوچھا تو کیسا ہے کب آیا مگر میں نے اپنی آرزو پھر ظاہر کی۔ اتفاق زمانہ کہ شیخ صاحب جواب دینے نہ پائے تھے کہ لکھنؤ کے ایک امیرزادہ کہ جن کی صورت سے امارت ٹپکتی تھی آگئے اور دو تھان گلبدن کے نذر گذرانے اور یہہ عرض کیا کہ میں بنارس گیا تھا وہاں کا تحفہ آپ کے لئے لایا ہوں۔ شیخ صاحب نے وہ تھان لے کر رکھ لئے تھوڑی دیر بیٹھکر وہ صاحب رخصت ہونے لگے تو شیخ صاحب نے وہ دونوں تھان اُن کو دیکر یہہ گوہرافشانی فرمائی کہ یہہ دونوں تھان میری طرف سے اپنی اماں کو دیدینا

اس کلام کو سنتے ہی وہ امیر زادہ پسینہ پسینہ ہوگئے اور چپ کھڑے کے کھڑے رہ گئے پھر ان کی طرف دیکھکر شیخ صاحب نے یہہ ارشاد کیا کہ تم نے کس دن ناسخ ایسے تیسے کو گلبدن کا پاجامہ پہنے دیکھا اور اُس کی جورو بیٹی جانتے تھے کہ نہیں ہے پھر کس لئے ایسی چیز جو بے کار ہے میرے واسطے لائے۔ جاؤ پھر ایسی حماقت نہ کرنا۔ اور میری عرض کا کچھ جواب نہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ شیخ صاحب۔ اخلاق و انسانیت تواضع و مروت سے مبّرا و معرّا ہیں۔ میں اُٹھ کر چلا آیا اور اپنے شوق پر لعنت ملامت کی ؞

صلائے عام

یہہ مضمون جناب مآئل دہلوی نے بھیجا ہے۔ اس سے دو بڑے فائدے ہوئے: ایک تو میں سمجھے ہوا تھا کہ جس کو نظم میں کمال ہوتا ہے اُس سے نثر بن نہیں پڑتی حضرت مآئل کو نظم و نثر دونوں میں ید طولے ہے ؞

دوسرے شیخ صاحب (حضرت ناسخ) کے روزمرہ کے اخلاق کا یہہ سچّا اور اچھّا نمونہ ہے۔ آپ کے اخلاقِ روزمرہ کی نقلیں میں نے اکثر سُنی تھیں کہ ناسخ میرے نانا کے باغ واقع کانپور میں زیادہ آیا کرتے تھے۔ لیکن یہہ گلبدن کے تھانوں کی نقل لاجواب ہے کہ واقعی گلبدن کے تھان ایسے شخص کے لئے تحفہ کے طور پر لانا جو ایک کھاروے کی تہمد پر گزر کر سکے خلاف عقل ہے ؞ آپ کے ہمعصر اور کمالِ شاعری میں ہم رتبہ خواجہ آتش نے ایک کملی میں بسر کردی ؞

غزل جناب مائل دہلوی

نظر ڈالی ہے کس کافر کی یا رب لف پیچاں پر ✤ کمندوں پر کمندیں پڑ رہی ہیں میرے ایماں پر
(۱) مقدر ہو اگر یہبر تو دم لوں آبِ حیواں پر ✤ قدم گھٹتا چلا جاؤں شبِ تاریکِ ہجراں پر
ہزاروں جس کے دریا ہیں کریمی کے رحیمی کے ✤ پانی کیا نہ پھریگا ذراسی فردِ عصیاں پر
(۲) ذراسی بات میں اچھا دلِ دیوانہ ہوجاتا ✤ وہ اپنا نام لکھ جاتا اگر میرے گریباں پر
کہاں تک سر پہ اپنے خاک ڈالوں دستِ وحشت سے ✤ یہی جی میں ہے دے پٹکوں بیاباں کو بیاباں پر
ہوا کرتی ہیں تقریریں ترے موجِ تبسم کی ✤ بلاکیتے ہیں مجھکو خضر اکثر آبِ حیواں پر
(۳) خدا جانے کہ کسکی بات بن جائے رہو نازاں ✤ تم اپنی سردمہری پر ہم اپنی آہِ سوزاں پر
اُدھر ہے حیلہ جو رحمت اِدھر اشکِ ندامت سے ✤ پڑے ہیں جا بجا دھبے مرے دامانِ عصیاں پر
محبت کے شرارے بھی کہیں روکے سے رکتے ہیں ✤ کہاں تک خاک ڈالوں میں خیالِ وصل و ہجراں پر
ہمارے دستِ وحشت نے اُڑا دی سب زمینوں کی ✤ کہاں سے خاک ڈالو تم عدو کے عہد و پیماں پر
مرا نامہ نہیں ایسا کہ وہ محروم پھرائے ✤ شہادت پائے گا قاصد زمیں کوئی جاناں پر
کسے مضمون ہاتھ آئیں کہ وہ مُہریں لگا بیٹھے ✤ دہن کے سرِ مخفی پر کمر کے رازِ پنہاں پر
کبھی کچھ رنگ لاتے ہیں کبھی کچھ رنگ لاتے ہیں ✤ محبت کے کرشموں نے بنا دی ہے دلِ جاں پر
جنوں کیسا زلیخا تو زبانِ شور و افغاں میں ✤ دعائیں پڑھ کے دم کرتی رہی یوسف کے زنداں پر

لئے پھرتا ہوں برسوں سے تمنائے شہادت کو ۔ یہ جی میں ہے چڑھا آؤں کسی گنج شہیداں پر

جہاں کی جس کی مٹی تھی وہاں اس کو دبا آیا ہُو ۔ مری حسرت تو چھائی ہے ہر ایک گورِ غریباں پر

سمجھکر شیخ نے دامن مصلاً چاک کر ڈالا ۔ ہو دیوانہ ایسا دختِ رز سی پاک دامن پر

یہہ سمجھانے کو شاہی پر گدائی فوق رکھتی ہے ۔ بچھا کر بوریہ بیٹھے ہیں ہم تختِ سلیماں پر

مجھے ، وہ ڈوبنے دیگا سرک جا بحرِ عصیاں تو ۔ سفینہ نوح کا جس نے چلایا موجِ طوفاں پر

جو رغبت مجھکو ہوں سے ہے واعظ کو تو ہونے دو ۔ گماں بد نہ کرنا چاہئے ہرگز مسلماں پر

صلائے ہوشیاری دے شہنشاہِ جنوں مجھکو ۔ قدم رکھ دوں اگر وحشت میں مجنوں کے بیاباں پر

یہہ تسبیح و مصلاً کیا یہہ دستار فضیلت کیا ۔ غرور اتنا نہ کر واعظ ریاکاری کے ساماں پر

کہا دل سے یہہ وحشت نے مبارک ہو قدم میرا ۔ نگہ پڑنے نہ پائی تھی تری زلفِ پریشاں پر

نہ آئی ہے نہ آئیگی کبھی ایماں کی لذت ۔ نہ آئے یا صنم جب تک زبانِ اہلِ ایماں پر

ادب نے حضرتِ حافظ کے سمجھایا مجھے مائل

ارادہ تھا کہ کر دوں حملہ اردو کا صفا ہاں پر

صلائے عام ”قدم رکھتا چلا جاوں شبِ تاریک ہجراں پر“ بہت پاکیزہ اور نیا مضمون ہے ۔

(۲) دیوانگی میں گریباں پہ یار کا نام ۔ واقعی جنوں کے لئے مجرب نسخہ ہے ۔ نسخہ نہیں تو تعویز سمجھئے ۔

(۳) دیکھئے کس کی بن پڑتی ہے ؟ یار کی سرد مہری کی یا اپنی آہ سوزاں کی ؟

یہہ سمجھانے کو شاہی پر گدائی فوق رکھتی ہے ۔ بچھا کر بوریہ بیٹھے ہیں ہم تختِ سلیماں پر (تختِ سلیماں پر بوریہ بچھا کر بیٹھنا اچھی تشبیہ ہے کہ گدائی کو بادشاہی پر ترجیح ثابت ہوگئی)

ادب نے حضرتِ حافظ کے سمجھایا مجھے مائل ۔ ارادہ تھا کہ کر دوں حملہ اردو کا صفا ہاں پر ۔

(۱) اس میں شک نہیں کہ فارسی میں بھی اس سے زیادہ پاکیزہ بیانی مشکل ہے) ۔

استفسار کا جواب

رسالہ "مبصر" کے دفتر سے یہہ استفسار اس غرض سے جاری ہوا ہے کہ ذیل کے الفاظ و جملوں کی نسبت رائے دیجائے :-

(۱) کس بلا کے رنگ میں شعر کو ڈوب دیا ہے (۲) مقطع نے بھی خوب رنگ کیا۔ (۳) کسقدر زہریلا شعر ہے۔ (۴) اس شعر نے مشاعرہ میں دھوئیں پار کر دئے۔ (۵) بھرم کی تعریف زائد کی گئی۔ (۶) آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں (۷) مشاعرہ خود رفتہ ہوا۔ (۸) اس مطلع کی منزل اور مطلعوں سے بہت دور تھی۔ (۹) واقعی جس زور بل میں آپ نے یہ مطلع کہا ہے (۱۰) آمد ہے زور ہے کہ توبہ (۱۱) قیامت کا تغزل ہے۔ کیا تیور ہیں۔

میری دانست میں ایسی تحقیق کے لئے دلی سے زیادہ لکھنؤ زیادہ موزوں ہے۔ اور لکھنؤ میں جو اہل کمال اس کے متعلق لکھ چکے ہیں قولِ فیصل کے قریب سمجھنا چاہئے : پھر بھی الامر فوق الادب کے لحاظ سے میرے ملنے والوں میں سے ایک صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ عرض ہے :-

ان گیارہ فقروں میں سوائے ایک لفظ "دھواں پار" کے اور کوئی لفظ بازاری نہیں سب الفاظ ادبی لحاظ سے بالکل درست اور ثقات کی زبانوں پر مستعمل ہیں مگر الفاظ کی تنظیم اور کلام کے مانوس و غیر مانوس ہونے میں کلام ہے۔ اس میں "ایجاد بندہ" کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے سو

مہمات

یہہ بات کوئی بُری نہیں۔ ایجاد وسعتِ زبان کے واسطے ضروری ہے۔ مگر جب تک الفاظ موقع ومحل پر استعمال نہوں ایجاد بے کار ہے ✤

مشاعرہ میں زبانی داد دیتے وقت ثقالت اور سلاست کے خیال رکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ مگر یہہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ جن الفاظ سے زبان مانوس ہوتی ہے برجستگی کے موقع پر ویسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں ✤

جناب داغ مرحوم کی ایک نقل مشہور ہے جو آپ نے دکن میں قیام کے زمانہ میں فرمائی تھی کہ :- "میں اپنے گھر کا دروازہ بند کئے گھر میں بیٹھا اپنی زبان کی حفاظت کیا کرتا ہوں" ✤

خیال فرمایئے کہ ایک قادرالکلام شاعر اپنی زبان کی چوکسی میں اس قدر احتیاط سے کام لے تو میں اور آپ کس گنتی میں ہیں ✤

زبان کے معاملے میں ایسی ایجاد ٹھیک نہیں جسمیں غیر مانوس جملے زیادہ ہوں نہ یہہ کہ شعر یا مضمون کے سمجھنے اور پڑھنے کے واسطے فرہنگ یا لُغت کی ضرورت پڑے۔ (یہہ عرض کرنا میرا اُن گیارہ فقروں کی نسبت نہیں بلکہ بات میں بات پیدا ہوجاتی ہے) اساتذہ کے طریقہ کو مضبوط پکڑے رہیئے۔ جیسے کہ گراموفون کے ریکارڈ بھرے جاتے ہیں کہ ایک دفعہ جو غزل یا گیت بھر دیا پھر ہزار دفعہ سُن لیجئے وہی آواز نکلے گی اور سوئی (پن) اسی لکیر پر جائے گی جو بھرتے وقت آواز کے صدمے سے سوئی کو لغزش ہونے کے سبب پڑگئی۔ اسی طرح آپ اساتذہ کے راستہ کو اختیار کئے ہوئے ایجادیں کیجئے۔ اگر آپ اس طرز کو چھوڑ کر ایجاد فرمائیں گے تو نہ وہ رہے نہ یہہ۔ اردو اردو نہ رہے گی ایک نئی زبان بن جائے گی ✤

۲۱/۹ق

پُرانے وقت کے شاہی فرمان۔ مراسلے اور خطوط جو فارسی میں ہوتے تھے کس قدر سلیس اور صاف فارسی ہوتی تھی۔ یہی تعریف اُردو کی ہے کہ مُغلق ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے بری ہو۔ عبارت میں بے کانگی نہ آنے پائے ان عیوب سے پاک ہو ❖

اُن گیارہ فقروں کی نسبت جو کچھ میرا خیال ہے عرض کرتا ہوں :۔

(۱) "کس بلا کے رنگ میں شعر کو ڈوب دیا ہے"۔ اِس فقرہ کے سب الفاظ اچھے اور درست ہیں مگر "شعر کو ڈوب دیا" ذرا غیر مانوس سا ہے اساتذہ کے کلام میں کہیں دیکھنے میں نہیں آیا نہ بالکل بُرا نہیں۔ (۲) "مقطع نے بھی خوب رنگ کیا۔" "کیا"۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ❖

(۳) "کس قدر زہریلا شعر ہے"۔ لفظ "زہریلا" ذرا سخت ہے اور یہہ عام و خاص میں اسوقت بولتے ہیں جب دو شخصوں کے باہیں بسبیل گفتگو کسی ایک کی زبان سے دوسرے کی نسبت کوئی ناگوار لفظ یا کلمہ یا فقرہ ایسا نکلے جس سے سُننے والے کو رنج پہونچے اور اس کے سبب سے آپس میں دونوں میں نہیں بلکہ تمام خاندان میں شکر رنجی ہو جائے تب کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے ایسا زہریلا کلمہ زبان سے نکالا ہے کہ جس کے سبب خاندان میں نفاق پڑ گیا یہ فلاں کا بِس بویا ہوا ہے ❖ گو صاحبِ داد نے اسکے دوسرے معنی لئے ہیں۔ مگر ادبی لحاظ سے "زہریلا" کہ یہہ لفظ سپیرے جو سانپ دکھاتے ہیں سانپ دکھانے میں مصنوعی چونکنے کی حرکتیں کرتے ہیں کہ اُف اوہ۔ سانپ نے پھن مارا: کیسا زہریلا ہے! ❖ (۴) "اس شعر نے مشاعرہ میں دھوئیں پار کردیئے"۔ "دھوئیں پار کردیئے" عامیانہ زبان ہے مسٹری لوگوں کی زبان سے زیادہ سُننے میں آیا ہے اس طرح کہنا تھا کہ :۔

اس شعر

اس شعر نے مشاعرہ کو دھواں دھار بنا دیا یا کر دیا۔ جناب انشا نے "دھواں دھار" باندھا ہے ؎

انشا کی گفتگو یہ دھواں دھار ہے غضب ❊ آکر بہار جسکے گلے سے لپٹ گئی ❊

دراصل یہہ جملہ "دھواں دھار" ہے۔ عوام نے بگاڑ کر دھواں پار کر لیا ❊ (۵)

"بزم کی تعریف زائد کی گئی"۔ بالکل ٹھیک ہے ❊ (۶) "آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں" آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے زیادہ سننے میں آیا ہے ❊ (۷) "مشاعرہ خود رفتہ ہوا"۔ بہت اچھا کہا۔ یہہ ایک جدت ہے۔ گویا سامعین شعر کی لذت سے وجد میں آکر از خود رفتہ ہو گئے ❊

(۸) "اس مطلع کی منزل اور مطلعوں سے بہت دور ہے"۔ اس میں کوئی لفظ بُرا اور عامیانہ نہیں مگر ذرا بیگانہ سا ہے۔ اس سے مراد رسائیِ خیال کا ثبوت ہے کہ شاعر کا خیال بہت دور پہونچا ❊

(۹) "واقعی جس زور بل میں آپ نے یہ مطلع کہا ہے"۔ یہاں "یہہ آپ ہی کا حق تھا" محذوف ہے ❊ (۱۰) "آمد ہے زور ہے کہ توبہ"۔ بہت اچھی اور پایہ کی تعریف ہے ❊ (۱۱) قیامت کا تغزل ہے۔ کیا تیور ہیں"۔ یہہ تعریف بھی نمبر ۱ کی ہم رتبہ ہے ❊ (میر احمد دہلوی)

صلائے عام۔ اس رائے سے مجھے اتفاق ہے ؎

میری تڑپ نے یار کی شوخی نے بزم میں ❊ تصویر کھینچ دی ہے سوال و جواب کی

پہلے آپ یہہ طے کر لیں کہ وسعتِ زبان و خیال منظور ہے یا جو لگے کہہ سن گئے اُسی پر قناعت کرنے کا ارادہ ہے۔ زبان میں متانت کی قطعی ضرورت ہے مگر شوخی بھی عیب نہیں کہ یار کا کم بولنا گو ادا میں داخل ہے مگر اسی زبان سے گالیاں سننے کو بھی جی چاہتا ہے ؎ خوبی ہمیں کرشمہ و نازو خرام نیست ❊ بسیار شیوہ ...

نشاطِ روح

جناب اصغر کے یہہ شعر جو رسالہ "ہمایوں" میں "نشاطِ روح" کے عنوان سے شائع ہوئے بہت پاکیزہ ہیں :-

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی ✦ کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا[۱]

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا[۲]

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہیں ✦ جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا[۳]

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

[۱] ایمان کی یہہ تعریف بلا کی ہے کہ ع کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

[۲] عشق و ہوس و عرفان تینوں کی تشریح غضب کی ہے اور کتنی مختصر کہ ہوس کو جب آگ دے دی عشق پیدا ہو گیا۔ اور جب خاک ہو گیا تو عرفان سمجھئے : یہہ سب کتنی جلدی دو مصرعوں میں دیکھ لیجئے اور سب کی جڑ ہوس ہی رہی ✦

[۳] تمام عالم کی شورشوں کا اختصار کتنا پاکیزہ کیا کہ سب کا نچوڑ انسان قرار دیا ✦

۱۶۹۸

۔۔ اس کا جواب اگر ہو سکتا ہے تو یہہ ہے کہ ؎

ایّام بہ ایں ہمہ درازی
تنگ است تو تنگ ترچہ سازی

صلائے عام۔ حضرت اصغر گونڈوی کے کلام (نشاطِ روح) پر اکثر رسالوں میں بحث رہی۔ اتفاق سے آپ کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر یہہ شعر آپ کے کلام کا نمونہ ہیں تو ان پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں: یہہ اور بات ہے کہ گونڈہ کے نام سے لکھنو یا دلی والے ناک بھوں چڑہائیں + زبان کی ضد میں مضمون کی خوبی سے آنکھ پھیر لینی ظلم ہے + شعر میں زبان کی خوبی حسن ہے مگر نری زبان کی شرط بے کار ہے جب تک کہ مضمون نہ ہو + جناب اصغر کے کلام میں زبان و مضمون دونوں کی خوبیاں ہیں۔ خاصکر مضمون کی زیادہ +

ایک بہت اچھی نثر کے لکھنے والے ذی کمال کی تعریف کے ساتھ ایک بڑے سخن شناس کی رائے صلائے عام کی نسبت یہہ ہے کہ :- × × × × × × × × × × ×
آپ کے سامنے × × × نثر کے متعلق کچھ لکھنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے (سہ انکے آگے فروغ پانا و سورج کو چراغ ہے دکھانا) یا دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کرنا ہے: نثر لکھنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے۔ جو لطف آپ کی نثر پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس کا اظہار احاطہ تحریر و تقریر سے باہر ہے + × × × ×

شاہ بہار کا

شاہنامہ کا ایک مختصر تاریخی واقعہ

(خدائے سخن فردوسی کی نظم کے چند دل کش مناظر)

(از جناب آثر صفی پوری)

شاہ کیکاؤس کے زمانہ میں اُس کے چند سردارانِ فوج شکار کھیلنے گئے۔ ایک گنجان جنگل میں انہیں ایک حسین مہ جبیں ترکی شہزادی نظر آئی۔ آپس میں جھگڑا ہوا ایک کہتا تھا میں لوں گا دوسرا یہی سمجھیں تھا کہ میں اس کا مستحق ہوں اس لئے یہ قصہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ کی نظر جب اُس شہزادی پر پڑی دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ پہلوانوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ایک ہی غزالِ رعنا اسیر کر کے لائے ہو یہ شہزادی تمہارے لایق نہیں ہے۔ شہزادی کو حرم سرا میں بھیج دیا اور اُن سب کو نقد و جواہر سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔ اُس شہزادی کے بطن سے ایک فرزند ارجمند حسین و جمیل پیدا ہوا جس کا نام سیاوش رکھا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ شہزادی مر گئی۔ اِس درمیان میں بادشاہ کو بغرض تسخیر ہاماوراں فوج لے جانا پڑی جب وہاں پہونچا تو شاہ ہاماوراں نے اُس کو اور اس کے سردارانِ فوج کو مکر و فریب سے ایک مقام پر قید کر دیا۔ بہر حال رستم کی کوششوں سے کامیاب ہوا پھر شاہِ ہاماوراں کی دختر جس کا نام سودابہ تھا اپنے ساتھ بیاہ لایا۔

جب سیاوش کی تعلیم کا زمانہ آیا تو اُسے شاہ کیکاؤس نے اپنے زبردست سپہ سالار رستم دستاں کے سپرد کیا وہ اپنے وطن سیستان لے گیا تھوڑے ہی عرصہ میں فنونِ حرب و ضرب میں طاق کر دیا۔ جب سیاوش حاضر دربار ہوا تو کیکاؤس نے ایک بہت بڑا جشن کیا۔ شاہزادہ حُسن و خوبی و سپہ گری و خرد و ہوشمندی میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا اور بادشاہ اُس پر ہر وقت اپنی

جان نثار کیا کرتا تھا۔ اُس لڑکے نے عقلمندوں اور بہادروں کی صحبت پائی تھی اس لئے اسکو فطرتاً مستورات سے نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ شاہی دربار میں رہا کرتا تھا۔

کیکاوس اپنی خوبصورت ملکہ سوداؔبہ کو بہت چاہتا تھا اور حد سے زیادہ اُس کا مطیع و فرمانبردار تھا سوداؔبہ بھی حُسن و جمال میں اپنی آپ نظیر تھی۔

پہلا منظر

سوداؔبہ کا سیاوش پر عاشق ہونا

یکے روز کاوس کے بالیسر و نشستہ کہ سوداؔبہ آمد زور

چو سوداؔبہ روئے سیاوش بدید ؔپراندیشہ گشت و دلش بر دمید

چناں شد کہ گفتی طرا نیخ است ہوا پیش آتش نہادہ یخ است

ایک صبح جب کہ سیاوش کیکاوس کے پاس بیٹھا ہوا تھا سوداؔبہ یکایک دروازہ پر آگئی جب اس کی نظر شہزادے پر پڑی تو جلوۂ حسن سے ایسی بیخود و بیحس ہو گئی گویا ایک ریشمی پردہ کی تصویر تھی۔ نفس میں ہیجان اور دل میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ آتشِ عشق سے اس طرح دل پگھل رہا تھا جس طرح آگ کے آگے برف۔ اُسکا دل وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتا تھا مگر کسی نہ کسی طرح سے دل ہاتھوں سے دبائے ہوئے ہٹ گئی۔

دوسرے دن سیاوش کے پاس سوداؔبہ نے خفیہ طریقہ سے کہلا بھیجا کہ تم شاہی شبستان میں کیوں نہیں آتے۔ سیاوش نے اس کے جواب میں یہ کہا۔ میں مردِ شبستان نہیں ہوں جو وہاں آؤں۔ شب کو جب سوداؔبہ بادشاہ کے پاس گئی تو اُس نے کہا ؎

بدو گفت کاے شہریارِ سپاہ ٭ کہ چون تو ندید ست خورشید و ماہ

نہ اندر زمیں کس چو فرزند تو ٭ جہاں شاد بادا بہ پیوند تو

فرستش بسوئے شبستان خویش ٭ بر خواہران و نغستان خویش

اے بادشاہ تیرا ایسا شہنشاہ چشمِ خورشید و ماہ نے بھی نہ دیکھا ہوگا اور نہ مثل تیرے فرزند کے خدا دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ ایک روز اُس کو شبستان میں بھیج دیجئے تاکہ ہم اور اُس کی بہنیں اس کو دیکھ لیں۔ آرزوئے دید دونوں کو بے چین کر رہی ہے اور ہم سب اُس کے انتظار میں چشم براہ ہیں۔

کیکاوس۔ تمہارا کہنا بجا ہے واقعی تم اُس کی ماں ضرور ہو تم کو اُس سے محبت ہوگی۔

بادشاہ۔ سیاوش کو بلا کر یہ گفتگو کرتا ہے

کیکاوس۔ محبت کا خون رگوں میں [illegible]

جا سکتا. جب غیر محبت کرتے ہیں تو وہ لوگ جن میں تمہارا خون ملا ہے کیونکر تم سے محبت نہ کریں گے جب وہ تم کو دیکھتے ہوں گے تو خدا جانے اُن کے دلوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ کچھ دیر کے لئے چلے جاؤ وہاں تمہاری ماں سودابہ اور بہنیں ہیں وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گی اور جو کچھ رسم پرستش ہوگی بجالائیں گی۔

سیاوش نہایت دور اندیش تھا اس کو گمان ہوا کہ شاید بادشاہ اُس کا امتحان لے رہا ہے دیر تک غور کرتا رہا اس کے بعد اُس نے یوں عرض کیا۔

سیاوش۔ دست بستہ ہوکر۔ جب سے آفتاب عالمتاب نے اس خاک ریزہ کو روشن کیا ہے آپ کا ایسا فرمانبردار و عقل و دانش میں یکتا آج تک پیدا نہیں ہوا آپ نے مجھے تخت و تاج بخشا ہے۔ بادشاہوں کے جلسے۔ عقلمندوں کی صحبت یا میدان جنگ میں جانے کا حکم دیا ہوتا۔ شاہی حرم سرا میں جاکر ناقص العقل عورتوں سے مجھے کیا سبق حاصل ہو سکتا ہے۔

کیکاؤس۔ مسکرا کر۔ تم اپنے دل میں کسی طرح کا اندیشہ نہ کرو حرم سرا جانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ چشم بد دور تم بہت عقلمند ہو۔

سیاوش۔ علی الصباح حاضر خدمت ہوں گا اور جو حکم ہوگا بسر و چشم بجالاؤں گا۔

دوسرا منظر

سودابہ کا اپنے کو آراستہ کرنا

ہیربد ایک عابد زاہد شاہی حرم کا کلید بردار بتخانوں کا محافظ تھا بحکم شاہ حاضر کیا گیا۔

کیکاؤس۔ کل صبح تم سیاوش کے پاس جانا دیکھو وہ کیا حکم دیتا ہے مگر وہاں جانے کے قبل سودابہ کے پاس جاکر کہدینا کہ جب شہزادہ حرم سرا میں داخل ہو۔

بہ سودابہ فرمائے تا پیش او بہ نثار آورد گوہر مشک بو

پرستندگاں نیز با خواہراں بہ زبرجد فشانند با زعفراں

صبح کو سیاوش خود ہی حاضر ہوا بادشاہ نے چند باتیں کیں اور اُس عابد کو سمجھا بجھا کر اُس کے ہمراہ کردیا جب وہ دونوں دروازۂ حرم سرا پر پہونچے۔

چو برداشت پردہ ز در ہیربد سیاوش ہمی بود ترساں ز بد

جس وقت حرم سرا کا پردہ ہٹایا گیا تو شہزادہ لرزاں و ترساں داخل ہوا۔

شبستاں ہمہ پیش باز آمدند ٭ بدیدار او بزم ساز آمدند

سب اُس کے استقبال کو آگے بڑھے گویا ایک بزم آراستہ اُسے دیکھنے آئی تھی

ہمہ خانہ بُد از گراں تا گراں ٭ پُر از مشک و دینار و پُر زعفراں

محل کا صحن مشک و زعفران و دینار سے بھر گیا تھا

درم زیر پایش ہمی ریختند ٭ چُو بازر دگو ہر برآمیختند

اس کے قدموں پر اس قدر زر و گوہر نثار کئے گئے

زمیں بود در زیر دیبائے چیں ٭ پُر از دُر خوش آب روے زمیں

کہ زمیں فرش دیبائے چیں بن گئی جو دُرِ خوش آب سے چمک رہی تھی

مے و بوئے و آواز رامش گراں ٭ ہمہ بر سراں افسراز گوہراں

شبستاں بہشتے بُد آراستہ ٭ پُر از خوبرویاں دپُر خواستہ

شراب اور بوئے خوش اور حسین گانے والیوں جن کے سروں پر تاج جواہر نگار رکھے ہوئے تھے محلِ شاہی بہشتِ بریں بن گیا تھا

سیاوش چو اندر شبستاں رسید ٭ یکے تخت زرّیں رخشندہ دید

برو برز پیروزہ کردہ نگار ٭ بدیبا بیاراستہ شاہوار

سیاوش جب شبستاں میں پہونچا تو اُس کو ایک تخت زریں [illegible] آب و تاب نظر آیا جو جواہرات سے مرصع [illegible] سے آراستہ تھا

[illegible] ٭ بسان بہشتے پر از رنگ و بو

نشستہ بر تاباں سہیل یمن ٭ سر جعد زلفش شکن در شکن

یکے تاج بر سر نہادہ بلند ٭ فرو ہشتہ تا پائے مشکیں کمند

پرستار نعلین زرّیں بدست ٭ بپاے ایستادہ سر افگندہ پست

سودابہ ایک بلند تاج سر پر رکھے بہشتی حور کی طرح تخت زریں پر رونق افروز تھی اور اس کا چہرہ مثل سہیل یمن کے تاباں اور زلف شکن در شکن اُس کے زانوؤں پر پڑی ہوئی تھی ایک کنیز نعلین زریں ہاتھ میں لئے اور سر جھکائے مؤدب کھڑی تھی۔

جب سیاوش قریب پہونچا تو سودابہ تخت سے اُتری اور خراماں خراماں پاس جاکر شہزادے کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور دیر تک اُس کے رخسار اور آنکھوں کا بوسہ لیتی رہی۔

سودابہ۔ اُس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جسنے تیرا ایسا فرزند بادشاہ کو عطا کیا۔ دنیا میں سوائے بادشاہ کے تیرا کوئی مثل و نظیر نہیں۔

سیاوش نے اُس کی محبت کا اندازہ کر لیا اور جلد وہاں سے اُٹھ کر اپنی بہنوں کے پاس چلا گیا۔ زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا۔ بہنوں نے اُس کو دعائیں دیں اور کرسی زرنگار پر بٹھایا کچھ دیر باتیں کرکے رخصت کے لئے سودابہ کے

پاس پھر آیا اور بعد حصولِ اجازت محل سے برآمد ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا ؎

شبستان ہمہ پر شد از گفتگو * کہ اینست سر تاج و فرہنگ جو
تو گفتی بمردم نماند ہمی * روانش خرد پرفشاند ہمی

شبستان میں ہر سمت یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ یہ ہے قابلِ تاج و تخت شاہی۔ یہ انسان نہیں ہے بلکہ ایک مجسمہ عقل و خوبی ہے۔

تیسرا منظر

گفتگو

کیکاوس۔ کہو کیا دیکھا ؎

سیاوش بپیشِ پدر شد بگفت * کہ دیدیم پردہ سرائی نہفت
ہمہ نیکوی در جہاں بہرِ تست * ز یزداں بہانہ نبایدت جست
ز جم و فریدون و ہوشنگ شاہ * فزونی بشمشیر و گنج و سپاہ

سیاوش۔ آپ کا حرم سرا دیکھا حقیقت حال یہ ہے کہ تمام جہان کی خوبیاں آپ ہی کے واسطے ہیں۔ کیکاوس اس گفتگو سے بے حد مسرور ہوتا ہے اور سودابہ کے پاس جاتا ہے۔

کے کاؤس ؎

نہفتہ بگو اے سیاوش بگو * ز بالا و دیدار و گفتار او
پسند تو آمد خردمند ہست * از آواز بگذر ز دیدن بہست

تمنے سیاوش کو دیکھا قد و قامت رفتار و گفتار میں کیسا پایا ؎

بدو گفت سودابہ ہمتای شاہ * نبیند ندیدہ است گاہ و سپاہ

سودابہ۔ ماشاءاللہ آپ کا فرزند ہر بات میں بے مثل ہے سوائے شاہ کے اور کوئی اس کا ہمتا نہیں۔

کیکاوس۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے مجھے ڈر ہے کہیں نظرِ بد نہ لگ جائے۔

سودابہ۔ اگر شہزادہ میرا کہنا مانے تو میں اپنی خاص لڑکی کے ساتھ اس کا عقد کر دوں۔ علاوہ اس کے کے پشین و کے آرش کی بھی لڑکیاں موجود ہیں۔

کیکاوس۔ یہ تمنے میرے دل کی بات کہی۔ اچھا میں بلا کر ابھی دریافت کرتا ہوں۔

سیاوش آتا ہے

کیکاوس۔ اے سیاوش ایک آرزو میرے دل میں ہے امید ہے کہ خدا اس کو پوری کرے گا اور وہ یہ ہے ؎

کہ ماند ز تو نام تو یادگار * ز پشت تو آید یکے شہریار
چناں کز تو من گشتہ ام تازہ رو * تو دل بر کشائی بدیدار او

کہ مثل تیرے تیرا یادگار بھی پیدا ہو جاتا۔ میں نے

ستارہ شناسوں سے سُنا ہے کہ تیری پشت سے ایک بادشاہ ہوگا جس سے دُنیا میں تیرا نام روشن ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ جو لڑکیاں شبستان میں موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لو۔

سیاوش۔ آپ کے حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔ مگر جس کو آپ پسند کریں وہ مجھے منظور ہے۔

کیکاوس۔ نہیں نہیں تمہیں خود انتخاب کرنا چاہئے۔

سیاوش۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ باتیں سودابہ سُنے گی تو کبھی منظور نہ کرے گی کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ میری اولاد کے ساتھ عقد ہو۔ مجھے نہ اس سے اور نہ اُس کی شبستاں سے غرض ہے۔

کیکاوس تبسم آمیز لہجہ میں۔ سودابہ کی نسبت کوئی خیال بد نکرو وہ تم کو بہت چاہتی ہے۔

سیاوش ظاہرا خوش ہوکر بادشاہ کے پاس سے اُٹھکر چلا جاتا ہے۔

چوتھا منظر

تزئین سودابہ باردیگر

برین داستانہا شب دگر گذشت ✽ سپہر از بر خاک تیرہ گشت
نشت از بر تخت سوداپشاد ✽ ز یاقوت سرخ افسری بر نہاد
بہ دختراں را بر خویش خواند ✽ بیاراست بر تخت زریں نشاند
بہشتش بتان نو آمین بپاے ✽ تو گفتی بہشت است کاخ و سراے

سودابہ یاقوت سُرخ کا تاج سر پر رکھے ہوئے تخت مرصع پر بیٹھی اور تمام لڑکیوں کو آراستہ و پیراستہ کرکے ہر ایک کو کرسی زرنگار پر بٹھایا۔ اُن سب کے سامنے کنیزان نو آئین بہ ہزار حسن و خوبی و ناز و ادا استادہ تھیں۔ وہ مکان ان خوبرویوں کے حُسن و جمال سے بہشتِ بریں بن گیا تھا۔

سودابہ۔ ایک کنیز کی طرف دیکھکر۔ ہیربد کو اپنے ساتھ لاؤ۔

ہیربد۔ کیا حکم ہے۔

سودابہ۔ جاؤ اور شہزادہ سیاوش سے کہو کہ تھوڑی دیر کے لئے محل میں چلے آئیں۔

مصرع۔ نمائی مرا سرو بالائے خویش

ہیربد سیاوش کے پاس جاتا ہے اور سودابہ کا پیغام پہونچاتا ہے۔ سیاوش ہمراہ ہیربد داخلِ شبستان ہوتا ہے ؎

خراماں بیامد سیاوش برش ✽ بدیداں نشست و سرو افسرش

سودابہ نے جب شہزادے کو آتے دیکھا تخت

سے اُتر پڑی ؎

فرود آمد از تخت و شد پیش اُو ٭ بہ گوہر بیاراستہ رُو و مُو

سیاوش تختِ زریں پر بیٹھ گیا اور سودابہ ہاتھ باندھے ہوئے سامنے بیٹھی ؎

بتاں را بہ شاہ و نوائیں نمود ٭ کہ بودند چوں گوہرِ نا بسود

بدو گفت بنگر بریں تخت گاہ ٭ پرستندہ چندیں بہ زرّیں کلاہ

ہمہ تار سیدہ بتانِ طراز ٭ کہ بسرشت شاں ایزد از شرم و ناز

کسے کت خوش آید سراپائے اُو ٭ نگہ کن بہ دیدار و بالائے اُو

سودابہ ۔ اے سیاوش ان زرنگار کرسیوں پر نظر کرو یہ سب تمہاری فرمانبردار ہیں ان کے قد و قامت شکل و صورت دیکھو اور پسند کرو۔

سیاوش نے ایک نظر اُن کو دیکھ لیا۔ مگر ان حسینوں کی نظریں سیاوش کے چہرہ سے ایک لمحہ بھی نہیں ہٹتی تھیں۔ آپس میں یہ اشارے تھے کہ کیا حسن ہے چہرہ پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ کچھ دیر بعد بہ اشارۂ سودابہ وہ سب اپنی قسمتوں پر نظر کرتی ہوئی ہٹ گئیں جب یہ مجمع ہٹ گیا تو سودابہ سیاوش سے یوں مخاطب ہوئی ؎

نگوئی مرا تا مرادِ تو چیست ٭ کہ بر چہر تو فرّ چہر پریست

سودابہ ۔ اے دل کا راز نہ ظاہر کرنے والے اس وقت تو تیرے چہرے پر پریوں کا جمال برس رہا ہے دیکھنے والے کیونکر نہ تجھ پر فریفتہ ہو جائیں۔ سچ کہو ان حسینوں میں سے کس کو تم نے پسند کیا ہے

سیاوش ۔ خاموش۔

چونکہ وہ سودابہ اور اُس کے خاندان سے بخوبی واقف تھا اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ؎

کہ من بر دلِ پاک شیون کنم ٭ بہ آید کہ از دشمناں زن کنم۔

کہ دل پر جبر کر لینا اچھا ہے مگر دشمنوں کے خاندان سے کوئی عورت انتخاب کر لینا مناسب نہیں۔

سودابہ ۔ میری طرف دیکھو تم سے کہتی ہوں۔ کیوں نہیں بولتے۔

سیاوش پھر خاموش ؎

بہ پاسخ سیاوش نکشاد لب ٭ پری چہرہ برداشت از رخ قصب

بدو گفت خورشید با ماہ نو ٭ گر اید ون کہ بیند بہ گاہ تو

نہ باشد شگفت از شود ماہ خوار ٭ تو خورشید داری خود اندر کنار

جب سودابہ نے دیکھا کہ سیاوش کچھ نہیں بولتا تو اپنے چہرہ سے نقاب ہٹا دی اور کہا کہ دیکھ کسی نے آفتاب و ماہتاب کو ایک جگہ جلوہ گر دیکھا ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ تجھسے ماہتاب شرمندہ ہو جائے۔ اس لئے کہ اس وقت تیری گود میں خورشید جلوہ گر ہے اگر تم مجھسے عہد و پیمان کرو تو تمہیں ایک دختر اپنی۔ خدمت کے

سے لئے دیدوں جو تمام عمر تمہاری فرماں برداری کرتی رہے۔ وہ پیمان یہہ ہے کہ جب بادشاہ اس جہان کو خالی کرے تو تم میرے لئے اُس کی یادگار بنجاؤ۔ میرے آرام کا خیال رکھو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھو۔ میں دل و جان سے تمہاری خدمت گزاری کے لئے ہر وقت موجود ہوں۔ تمام عمر تمسے سرتابی نہ کروں گی ؎

سرش تنگ بگرفت ویک بوسہ داد ❊ ہمانا کہ از شرم ناورد یاد
رخانِ سیاوش چو خوں شد زشرم ❊ بیاراست مژگاں تو خوناب گرم
چنیں گفت با دل کہ از کارِ دیو ❊ مرا دور دارا د کیواں خدیو
نہ من با پدر بے وفائی کنم ❊ نہ با اہرمن آشنائی کنم

سودابہ نے کچھ شرم نہ کی اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ایک بوسہ لے لیا۔ سیاوش کا چہرہ مارے غیرت کے سرخ ہوگیا۔ دل میں کہا کہ خداوندا مجکو اس کارِ شیطانی سے محفوظ رکھ کیونکہ میں باپ کے ساتھ ہرگز بے وفائی نہ کروں گا۔ اور نہ شیطان سے دوستی اگر اس کو کچھ برا بھلا کہتا ہوں تو یہہ غصہ میں آکر بادشاہ سے شکایت کردے گی اور جو یہ کہے گی بادشاہ اس کو مان لے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ آشتی کے ساتھ گفتگو کروں اور اس سے اپنی جان بچا لوں۔

سیاوش۔ دنیا میں سوائے بادشاہ کے کون آپ کا جواب ہوسکتا ہے۔ واقعی آپ بدر کامل ہیں۔ نے آپکی لڑکی کو پسند کرلیا ہے اور جب تک وہ جوان نہ ہوجائے گی عہد کرتا ہوں کہ کسی عورت پر نظر نہ ڈالوں گا ؎

و دیگر کہ پرسیدی از چہر من ❊ بیامیخت با جان تو مہر من
مرا آفرینندہ از فرِّ خویش ❊ چنیں آفریدای نگاریں ز پیش
تو ایں راز مکشاد با کس مگو ❊ مرا جز نہفتن ہماں نیست رو
سرِ بانوانے و ہم مہتری ❊ من ایدوں گمانم کہ تو مادری
بگفت ایں و بیروں شد اندر زماں ❊ ز سودابہ رفتہ دل و ہوش و جاں

دوسرے یہ کہ میری محبت آپ کی جان میں پیوست ہوگئی ہے۔ کیا کہوں خدا نے مجھے ایسا ہی پیدا کیا ہے۔ یہہ جو کچھ ہوا وہ ہوا اس راز کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ آپ تمام شہزادیوں کی افسر ہیں اور میرے گمان میں آپ میری ماں ہیں۔

یہ کہکر سیاوش باہر چلا گیا اور اپنے ساتھ سودابہ کے ہوش و حواس بھی لے گیا۔

پانچواں منظر

مژدہ تہنیت

بادشاہ محل میں آتا ہے اور سودابہ مژدہ

سُناتی ہے۔

سودایہ۔ آخر میں نے پسند ہی کرالیا۔ جس وقت وہ داخلِ حرم سرا ہوا تو میں نے تابانِ سیہ چشم کو اس صحن میں جولاں کرا دیا اُس وقت عجیب عالم تھا گویا کہ آسمان سے ستارے جھڑ رہے تھے۔ آخر اُس نے سوائے میری لڑکی کے اور کسی کو پسند نہ کیا۔ بادشاہ یہ سُنکر بہت خوش ہوا چنانچہ اس تقریب کے لئے تمام دنیا کے ساماں مہیا کئے گئے۔

چھٹا منظر

سودایہ کی ناپاک محبت کا اظہار

چھٹے روز سودایہ آراستہ و پیراستہ ہوکر تخت پر جلوہ گر ہوئی اور سیاوش کو بُلا بھیجا۔ جب وہ آیا تو دیر تک گفتگو کرتی رہی اور اُس کے خوش کرنے کے لئے یہہ کہا۔ میں نے خزانے کے خزانے اِس تقریب کے لئے معمور کر دئے ہیں شاید کسی بادشاہ نے یہ سامان مہیا کیا ہو۔ لڑکی بھی تیرے سپرد کرتی ہوں اور یہہ سب سامان بھی تیری نذر ہے ؎

بہانہ چہ داری کہ از مہرِ من ✤ بپیچی ز بالا و از چہرِ من

کہ تا دیدمت تیرہ ہا بودہ ام ✤ خروشان و جوشان و آزردہ ام

ہمی روزِ روشن نہ بینم ز درد ✤ برآنم کہ خورشید شد لاجورد

کنوں ہفت سالست تا مہرِ من ✤ ہمی خوں چکاند از چہرِ من

یکے شادکن در نہانی مرا ✤ ببخشائے روزِ جوانی مرا

دگر تو نیائی بہ فرمانِ من ✤ بپیچی ز رائے و ز پیمانِ من

کنم بر تو بر بادشاہی تباہ ✤ شود تیرہ بر چشم تو ہور و ماہ

سودایہ نے کہا اے سیاوش اب بھی تجھکو مجھسے نفرت ہے تجھے کیا معلوم کہ کتنا عرصہ ہوا میں تیرے عشق میں مبتلا ہوں اور خون کے آنسو رو رہی ہوں۔ جب سے دیکھا ہے رونے پیٹنے میں بسر ہوتی ہے۔ تیرے ہجر میں روزِ روشن مجھے سیاہ نظر آتا ہے۔ میرا تو گمان یہ ہے کہ آفتاب جہاںتاب لاجورد ہو گیا۔ للتہ ایکبار خوش کر دے اور اپنی جوانی کا ایک دن مجھے دے ڈال۔

اگر تو میری اِس آرزو کو پوری نہ کرے گا اور نافرمانی کریگا تو تجھ پر تیری بادشاہی تباہ کر دوں گی اور پھر تیری آنکھیں آفتاب و ماہتاب کو دیکھ نہ سکیں گی۔

(سیّد احمد حسن اثر صفی پوری)

”تیرھویں صدی“

”زمانہ“

”پہلے تہذیب الاخلاق نکلا تو آگرہ اخبار نے تیرھویں صدی کا مقبولِ عام ماہوار رسالہ شایع کیا جس نے خود نیچرل پارٹی والوں کے دلوں میں ایسی چٹکیاں لیں جس کا مزا آج تک اُن کے دلوں کو آرہا ہے ؂

گورنمنٹ اور سرشتۂ تعلیم بھی اس کی لٹریچر پر قدر افزا نگاہ کرتا رہا۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ ہز اکسلنسی سر آسمانجاہ بہادر مرحوم ہزار روپیہ سال سے اعانت فرماتے تھے ؂

عالیجناب نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم اُس کے بڑے قدرداں تھے۔ نواب علی مُراد خاں صاحب بہادر مرحوم والئی خیرپور سندھ۔ جناب حاجی امداد علی خاں صاحب بہادر سب جج وغیرہ وغیرہ اس کے خاص معاون رہے جب وہ صدی ختم ہوئی تو ہمنے اُس پرچہ کا نام زمانہ رکھا کہ قیامت تک کو کافی ہو۔

جب تہذیب الاخلاق بند ہوا تو زمانہ بھی ٹھہر گیا اب پھر وہ نکلا تو زمانہ بھی اس کے ساتھ ہولیا“

یہہ عبارت رسالہ "زمانہ" سے نقل کی گئی ہے جسے عرصہ ہوا کہ مطبع آگرہ اخبار سے حضرت خواجہ محمد یوسف صاحب مرحوم کے اہتمام سے نکلتا تھا۔ دونوں رسالے "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" آپ ہی کے اہتمام سے آگرہ سے عرصہ تک نکلتے رہے +

شروع میں مَیں تفریحاً آگرہ اخبار میں مضمون لکھا کرتا تھا۔ اخبار میں معمولی وغیر معمولی جزوں کے ساتھ ایسے مضامین کی جو یادگار زمانہ سمجھے جاسکیں احتیاط سے رکھنے کی امید بہت نہیں ہوسکتی: اتفاق سے اُندنوں میں انگریزی کا اُنیسویں صدی[1] نامے رسالہ زیادہ دیکھتا تھا۔ اس کے مضامینِ محققانہ و عالمانہ کی بہت شہرت تھی + اُنیسویں صدی کے ختم ہونے پر اُن لوگوں نے رسالہ کے نام کے ساتھ لفظ "بعد" بڑھا دیا۔ یعنی اُنیسویں صدی اور بعد صدی مذکورہ + یہہ ذرا طول سا ہے۔ میرے ذہن میں آیا کہ دُنیا میں صرف زمانہ ہی ایسا ہے جو ختم ہونے والا نہیں ایسا نام تجویز کرنا چاہئے جو پھر ختم نہ ہو +

وہ زمانہ میری جوانی و ملازمی کا تھا۔ جوانی میں دل و دماغ کی شکایت نہ تھی لیکن ملازمت کے اذکار سے زیادہ لکھنے پڑھنے کی فرصت نہ ملی پھر مجھے معلوم نہیں کہ زمانہ پر کیا گزری؟

میں نے صاحبِ آگرہ اخبار کو لکھا ہے کہ "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" کے پرچے تلاش کرکے مجھے بھیجدیں تاکہ وہ مضامین ایک جگہہ جمع کرکے کتابی شکل میں چھاپ دے جائیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اُس زمانہ کے پرچے ملنے ذرا مشکل ہیں: اس لئے صلائے عام میں یہہ التماس شایع کرنے کی ضرورت ہوئی کہ جو صاحب "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" کے پُرانے پرچے عاریتاً یا قیمتاً مجھے بھیج سکیں [illegible]

[illegible]

[1] Nineteenth Century. یہہ رسالہ اب بھی نکلتا ہے مگر نام اب Nineteenth Century and After ہے +

دو خطوں کا اقتباس

× × × × × × × × × × × × × ×

"آج کل میں صلائے عام کے پُرانے پرچوں کو دُہرا رہا ہوں۔ عجیب لُطف آتا ہے ✤ آپ نے اِرادہ کیا تھا کہ چیدہ چیدہ مضامین کو کتاب کی صورت میں علیحدہ چھاپ دیا جائے"[1]

× × × × × × × × × × × ×

× × × × "آپ تو اِس مٹی ہوئی اُردو کی جان ہیں۔ آپ نے اپنے زورِ قلم سے بہت سے اس کے دِل دادہ پیدا کر دئے ہیں" × × × × × × ×

ایک اور صاحب جن کو زباں دانی اور معلوماتِ علمی میں کمال ہے لکھتے ہیں کہ:-

× × × × × "سوائے صلائے عام کی اُردو کے (فلاں بُزرگ جو نظم و نثر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں) دوسرے کی اُردو پسند نہیں کرتے ✤ آج کل صلائے عام کے پرچے اُن کی زیرِ نظر ہیں۔ اور مضمونِ پریشاں[2] کے بیحد مُعترف ہیں اور روزانہ تعریف کیا کرتے ہیں ✤

× × × × × × × × × × × × × × × ×

---

[1] اس کا ارادہ قطعی ہو رہا ہے۔ اپنی ضعیفی کی وجہ سے مضامین کے انتخاب کرنے کی مجھے ہمت نہیں ہوتی کوئی صاحب یہہ کام اپنے ذمہ لیں ✤ مُجھے اپنے مضمونوں میں کم

پلٹاؤ ان

اچھا کون سا ہے اور چھوڑ دینے کے لائق کون سا ہے امتیاز کرنا ذرا مشکل ہے + مضمون پریشاں کے سوا مجھے اور سب مضمون پسند ہیں خاصکر اور مضمون نگاروں کے +

مجھے اتنا ہی مشکل ہے جو کچھ اسوقت صلائے عام میں لکھ رہا ہوں - پچھلے پرچوں کے مضامین کا انتخاب آپ اپنے ذمہ لیں سے

آسودگانِ خاک نہ چونک اُٹھیں پھر کہیں + آہستہ ذکر چاہئے اُس بت کی چال کا

پرانے پرچوں سے آپ اپنی پسند کے مضمون چھانٹ دیں - پھر میں دیکھ لونگا کہ وہ باقاعدہ کتاب کی شکل میں شایع ہونے کے لایق ہیں یا نہیں؟ یعنی اُس وقت جلدی میں جو غلطیاں رہ گئی ہوں گی اُن کو درست کردوں گا سے

آنے سے تیرے تا نہ ہو ہمسایہ کو خبر + کرتے ہیں نالہ ہم تری آوازِ پا کے ساتھ

اس انتخاب کا آدھا ثواب آپ کو ہوگا + باقی ثواب پڑھنے والوں کو پہونچ جائے گا: اکثر اصحاب جو اِسکا تقاضہ کر رہے ہیں احسان مند ہوں گے - خاصکر میں سب سے زیادہ کہ آپ نے اِس دردِسر سے مجھے بچا لیا سے

جو جو عذابِ دستِ جنوں ہم نے جھیلے ہیں + ان سب کا رُوحِ قیس کو یارب ثواب ہو

لہ مضمونِ پریشاں بھی مضمونوں میں کوئی مضمون ہے - بے کاری میں محض دل و دماغ کا مشغلہ ہے کہ خالی کون بیٹھا رہے سے

برسوں رہا ہے صدمہ کشِ اشک و آہ دل + یہہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہوا

کہتے ہیں خیر ہو یارب مرے سودائی کی کل
خواب میں گیسوئے شب گوں کو پریشاں دیکھا

رُباعیاتِ عمر خیامؒ

کے اُردو ترجمہ کے متعلق جناب نیجور نے اپنے رسالہ چوکیدار نامے میں ایک اچھا مضمون لکھا ہے مضمون محققانہ ہے: خاصکر صاحبانِ فرنگ کی نگاہ کے لحاظ سے معلومات کا بیش ذخیرہ ہے +

یہہ امرِ واقعی ہے کہ ازروئے شاعری حضرت کے کلام کو ایران و ہندوستان میں اس مرتبہ کی شہرت حاصل نہیں ہوئی جتنی انگلستان میں ہوئی اور ہو رہی ہے حضرت کا طرز اپی کیوریٹن فلاسفی کا نچوڑ ہے: جس ملک و قوم میں جس قدر اقبال و دولت کی ترقّی ہوگی اُسی قدر یہہ فلاسفی منظورِ نظر رہے گی۔ جس طرح بادی النظر میں عورت کی خوبیوں میں خط و خال کی خوبیوں پر پہلے نظر پڑیگی گھر گرستی کا خیال پیچھے آئے گا + آپ کے کلام میں بقول حضرت عراقیؒ ع ورائے شاعری چیزے دگر ہست + یہہ "دیگر چیز" فتزجرالڈ صاحب کے حصہ میں آگئی کہ آپ نے اپنی زبان میں رباعیات کو ایسی جلا دے دی کہ عمر خیام کا یہہ مختصر کلام انگریزی میں کلیسکس کے مرتبہ کو پہونچ گیا۔ یہانتک کہ ترجمہ سے اصل کی نمود بڑھ گئی۔ گویا حاشیہ سے متن کی قدر زیادہ ہوگئی +

سُنا ہے کہ عمر خیّام کی فلاسفی کے قدر شناسوں نے ایران کو حضرت عمر خیامؒ کی قبر کی عظمت و شان کی سفارش میں لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ یہاں شاعری میں ایسے ایک دو شاعر نہیں بلکہ اس سرزمین میں شعراء باکمال ہزار دو ہزار سے زیادہ نکلیں گے + کہتے ہیں کہ ایرانیوں میں ہر تیسرا شخص شاعر نکلتا ہے +

اِس میں شک نہیں کہ رباعیاتِ عمر خیّام کے انگریزی ترجموں میں فتزجرالڈ صاحب کا ترجمہ لاجواب سمجھا جاتا ہے: جو انگریزی و فرنچ و جرمن وغیرہ یورپ کی زبانوں میں رباعیات کی شہرت کا باعث ہوگیا + برخلاف اس کے جناب نیجور نے اُردو کے ترجمہ میں ازروئے تنقید غلطیاں نکالی ہیں اور ارشاد فرمایا ہے کہ یہہ گفتگو رسالہ صلائے عام میں بالتفصیل لکھی جائے گی: مجھے جناب نیجور کے مضامین کا انتظار ہو رہا ہے +

ف Epecurian. ک Classics

مہتمم کی طرف سے
اطلاع

صلائے عام کی پیشگی قیمت چھ روپے سالانہ ہے

قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے؛ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے ۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ۔ اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصولِ ڈاک آنا چاہئے ۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کیونکہ وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہی اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو۔ یعنی لسانِ ع عروسِ جمیل لباسِ حریر۔ کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے ۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے ۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائیگی ۔

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی ہوں یا ناگری میں ۔

زبانِ اُردو میں ایک صفحہ ایک سال کے واسطے	[illegible]
" " چھ ماہ کے واسطے	[illegible]
" " تین ماہ کے واسطے	[illegible]
" نصف صفحہ ایک سال کے واسطے	[illegible]
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم "	[illegible]
" " چھ ماہ "	[illegible]
" " تین ماہ "	[illegible]
" ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے	[illegible]
" نصف صفحہ " "	[illegible]
" چوتھائی صفحہ " "	[illegible]

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اُردو سے دُگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں آجانا چاہیے ۔

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ :-
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خان بہادر۔

حسب الارشاد میر ناصر علی خان بہادر۔ مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد علی چھپا اور شائع ہوا ۔
Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasiri Press, Farrashkhana, Delhi.

SALA-I-AM, DELHI. REGD. NO. L. 1462.

صلائے عام

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

Mustansir Press, Farash-khana, Delhi.

فہرستِ مضامین

بابت ماہ جولائی ۱۹۳۰ء

صلائے عیش

غیر ولسانے کی جو بات وہ ٹھہری صلائے عیش ، میں نے پڑھا جو شعر وہ فریاد ہو گیا ،

اس عنوان کی وجہ یہہ ہے کہ دلی کے **ساقی** نامے رسالہ میں " جام نوازیں " کے نام سے **صلائے عام** کے کسی مضمون کا یہہ جزو عیش کے متعلق شایع ہوا : مجھے یاد نہیں کہ یہہ مضمون کب کا ہے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ **صلائے عام** کے طرز کا بہت اچھا نہیں تو معمولی نمونہ ضرور ہے :-

× × × × × × × × ×

آپ یہہ نہ سمجھ لیں کہ عیش کرنا کچھ آسان بات ہے ۔ ہر مشکل فن کی طرح عیش کے لئے بھی مشق کی ضرورت ہے : ایک دفعہ کو عیش مصیبت سے بدتر سمجھئے جس عیش کے نباہنے کا آپ کو مقدور نہ ہو ۔ وہ عیش نہیں خودکشی سے بدتر ہے ۔ رات کی بادہ خواری اگر صبوحی نہ ہو تو وبال جان ہو جاتی ہے ۔ ؎

کفارۂ شراب ہی پیتا ہوں نقد ہوش ٭ سرگرم ہوں تلافیٔ اعمالِ زشت میں

عیش کی تلاش میں انسان کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ۔ یہہ ایک دفعہ نہیں روز کی خودکشی ہے اور اس لئے بری ہے کہ ع مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا ٭

عیش کسی طرح کا ہو بے خبر جوانی کی نیند کی طرح وقت کا قائل نہیں کہ جہاں پڑے

آنکھ لگ گئی۔ یہہ خبر نہیں کب کھلے گی؟ ناچنے گانے کی رات مبتلایان عیش کو کبھی لمبی نہیں معلوم ہوتی اور شب وصل چاہنے والوں کی نگاہ میں مختصر رہتی ہے۔ گو قطب شمالی کی طرح برسوں آفتاب دکھائی نہ دے: عیش کی گھڑیاں کنواریوں کے خیال کی طرح جن کی شادیاں ہونے والی ہیں اس طرح کٹ جاتی ہیں کہ معلوم بھی نہیں ہوتا کب آئیں کب گئیں ؛

عیش میں ہر خیال اُسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے جو ہمارے دل میں ہو۔ اس کے سامنے گردش دوراں کی نہیں چلتی: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی زمین و آسمان جو کسی کی نہیں سُنتے ہمارے ساتھ چل رہے ہیں ؎

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے ؛ جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے

لیکن عیش کسی طرح کا ہو۔ داغ کا ہو یا دل کا ملک کا ہو یا مال کا بے خراب کئے نہیں مانتا۔ جب تک آپ کے بس میں ہے۔ ہے۔ جب آپ اس کے بس میں آگئے تو دردِ سر سے سر اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے ؛

("صلائے عام" دہلی)

میں چاہتا ہوں کہ اس طرز کے مضمون صلائے عام سے زیادہ لکھے جائیں کہ زیادہ عُمر ہو جانے کیوجہ سے میں خود تو لکھنے پڑھنے کے کام کا نہیں رہا مگر اسطرح کے چند اقتباس کبھی کبھی دیکھنے میں آ جائیں تو بُرا نہیں۔ بقول حضرت نوح ؎

ساقی بزم مجھے دیکھ کے آنکھیں نہ چُرا ؛ اُنہیں پیمانوں سے دے دے انہیں پیمانوں میں

اور بقول جناب عزیز ناطقی۔ ختم ہی سمجھو زندگی کے دن ؛
کچھ ورق اور ہیں فسانے کے

"ساقی"

اس نام کا رسالہ کئی مہینے سے دلی سے نکل رہا ہے۔ اخباری رسوخ کے موافق مجھے صلائے عام میں اس کا ذکر کرنا پہلے چاہیئے تھا: مگر میرا قاعدہ ہے کہ دو چار پرچے نکلنے کے بعد لکھنے کی مجھے ہمت ہوتی ہے: سبب یہ کہ اکثر رسالے عمر طبیعی کو نہیں پہونچتے۔ اخبار نویسی میں کسی پہونچے ہوئے فقیر کی دعا ہے کہ اردو کے رسالوں کو بڑی عمر نصیب نہیں ہوتی ٭

رسالہ کا نام ساقی شاعرانہ ہے کہ اہل سخن میں ساقی سے مفر نہیں۔ خاصکر حضرت حافظ رح کی سنت ہے کہ شراب کے مضمون ان سے بہتر لکھنا مشکل ہے اور شراب کے لئے ساقی کی ضرورت ہے + جس طرح تصوف میں حافظ کی شراب سے بادۂ عرفان مقصود ہے اسی طرح شاعرانہ اصطلاح میں ساقی سے غرض مدد ایزدی سمجھئے +

قدیم یونان کی لٹریچر میں اپالو کے نام سے آغاز سخن کا دستور تھا اور اپالو تمام دیوتاؤں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ فارسی والوں نے جن کو یونان کی تہذیب سے واسطہ رہا حمد الہی میں ساقی کو پکارنا پسند کیا۔ حمد کی طرح یہ آغاز کلام ہو گیا +

اس میں شک نہیں کہ جس طرح یونانی لٹریچر میں شعر و شاعری کی دیبیاں مشہور تھیں جن کو پکار کر کلام کی تمہید ہوتی تھی اسی طرح ایشیا میں ہر کلام کا آغاز خدا کے نام سے رائج ہے

شعراء نے تو اپنا کلام اکثر ساقی ہی سے شروع کیا: یہہ بُرا نہیں کیا کہ آغاز کلام عیش سے شروع ہو تو زیادہ مناسب ہے ✤ اس تمہید سے میری غرض یہہ ہے کہ ہر کلام کا آغاز اسبابِ عیش و مسرت سے شروع ہو تو زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے اور دل لگا کر سُننے کو جی چاہتا ہے ✤ ؎

ساقی قدحِ شراب دیدے ✤ مہتاب میں آفتاب دیدے

ساقی کی رعایت سے فارسی میں لاجواب ساقی نامے لکھے گئے۔ ظہوری کا ساقی نامہ شاعری کی جان ہے کہ بڑے حجم کی ایک علیحدہ کتاب ہو گئی اور کمال ہے کہ شروع سے یعنی حمد سے اخیر تک اسی رعایت میں ساری کتاب ختم کر دی۔ بسم اللہ اس شعر سے ہے ؎

ثنا ہا ہمہ ایزدِ پاک را ✤ ثریا دہِ طارمِ تاک را

شراب کی ضد میں۔ جو حرام ہے "ایزدِ پاک" خوب کہا۔ اور ثریا کی تشبیہہ جو انگور کے خوشہ سے مشابہ ہے بے مثل ہے: اسی طرح ساری کتاب میں کمالِ شاعری دکھا دیا ہے ✤

ایک دفعہ مجھے فارسی کے ساقی ناموں کے جمع کرنے کا خیال ہوا تو سو سوا سو سی زیادہ ہاتھ لگے ✤ اُردو میں بھی اکثر کلام ساقی سے شروع کیا جاتا ہے۔ اصغر علی خان نسیم نے الف لیلہ نظم میں لکھی تو ہر رات ساقی و شراب کے مضمون سے شروع کی اور ہر رات میں اس رعایت سے علیحدہ علیحدہ مضمون باندھا ✤ حضرت اسمٰعیل منیر نے معراج المضامین نامے مثنوی میں حضرتِ خاتونِ جنّت رضی اللہ عنہا کی مدحِ پاک میں بے مثل ساقی نامہ لکھا ؎ گلابی ہے مرے تقوے کا جامہ ✤ ردائے دُخترِ رز ہے عمامہ

اتفاق سے رسالہ ساقی کے نکالنے والوں میں جوان خیال اور جوان طبیعت اہل قلم نظر آتے ہیں۔ یہہ مناسبت خداداد ہے * برخلاف اس کے راقم الحروف نہایت ضعیف العمر ہے۔ اس نقص کی وجہہ سے ریویو نگاری کا حق ادا کرنے میں جس طرح کہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے یا جس طرح ادا کرنا چاہئے ادا نہیں کر سکتا * لیکن سب سے اچھا طریقہ ریویو کا میرے ذہن میں یہہ ہے کہ ہر پرچہ کی خوبیاں علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کے عوض ماہ جون کے ساقی کا ایک مضمون بجنسہ صلائے عام میں نقل کئے دیتا ہوں کہ اسی پر اور مضامین کا مرتبہ قیاس کر لیا جائے *

اس مضمون کے نقل کرنے کی بڑی وجہہ یہہ ہے کہ دلی کی معلومات اور قلعہ معلّٰی کی زبان بلکہ روزمرہ کی زندگی کا اچھا مُرقّع ہے *

صاحب مضمون کی مورخانہ معلومات کا میں بہت مدّاح ہوں کہ آپ کا مضمون غدر سے پہلے کی تاریخ کا بڑا دلچسپ حصہ ہے۔ گو مُختصر ہی *

لال قلعہ کی ایک جھلک

(از حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جانشین خواجہ میر درد)

(۱)

اکبر ثانی کا انتقال رات کے ۱۰ بجے ہوا۔ خبردار دم بدم کی خبر ولی عہد کو دے رہے تھے اور ولیعہد تاج اور لباس اور جواہر کا زیور خوان میں لئے بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ میں کب یہ سنوں کہ گھی کا کُپّہ لُنڈھ گیا اور تخت بادشاہی پر بیٹھ جاؤں چنانچہ ایک خبردار نے خبر دی کہ حضور مبارک ہو مسافر گیا بس فوراً میرزا ابن ولیعہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں جو نجومی اور جوتشیوں نے کہا وقت اچھا نہیں ہے سورج نکلنے جلوس فرمائیے گا اندھیرے میں تخت پر بیٹھنا نحس ہے ولیعہد نے کہا میرے لئے نحس ہے یا رعایا کے لئے۔ نجومی کہنا تو چاہتے تھے کہ دونوں کے لئے بُرا ہے مگر ولیعہد کے ڈر سے کہہ دیا کہ حضور رعیت کے لئے اچھا نہیں ہے۔ ولیعہد نے کہا خیر دیکھا جائے گا آفتاب نہ نکلے گا تو کیا روشنی نہ ہوگی۔ اور مشعل اور مہتاب اور شمع و چراغ کی ایسی جگ مگ جگ مگ ہوئی کہ دن نے مات کھائی۔ ولیعہد تخت پر بیٹھے۔ ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔ ان کے تخت پر بیٹھتے ہی کال پڑا سارا ہندوستان تراہ تراہ پکارنے لگا آدمیوں نے بھوک کے مارے اپنے بچے بھون کر کھا لئے آگرہ کی طرف سے گیہوں ناؤں میں بھرا ہوا کئی ہزار من آرہا تھا جب ناویں لال قلعہ کے پاس کنارہ پر لگیں اس سے پہلے کہ اناج کی بوریاں کھاری باؤلی میں پہونچائی جاویں کنگلوں اور بھوکوں نے لُوٹ

لیبں اور اناج کا دانہ دانہ لے گئے۔ دلّی کی عورتوں میں اس کی بھی یادداشت بن گئی تھی۔ ایک سے دوسری کہتی تھی کہ بُوا جب ناویں لُٹی تھیں تو میں بارہ برس کی تھی۔ ناویں لُٹی تھیں تو یہہ بات یوں ہوئی تھی۔ بہادر شاہ کی بے وقت کی تخت نشینی کے متعلق ایک نظم پڑھی تھیں جو بہت بڑی تھی مگر میں نے اُسے یاد نہیں کیا نہ یاد کرنے کی ضرورت تھی نہ اس کا کوئی موقع تھا دو چار مصرعے حافظہ میں جم گئے تھے وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ؎

تخت پہ بیٹھنا اِن کا نہ سزاوار ہوا۔ مہنگا اکبار ہوا ۔ مصرعہ۔ شاہ اکبر کا دماغ اور تھا اِن کا ہے کچھ اور۔ کی سلاطین کی غور پہ کاٹتے لوگوں کے ... کر کے اندھیرا افسوس ۔

اور سچ یہہ ہے کہ اِن کی بے وقت کی تخت نشینی اپنا رنگ لائی۔ شاہجہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی سلطنت اُجڑ گئی لال قلعہ کا ڈھانچ رہ گیا نام نمود کا پانی ملتان بہہ گیا۔

(۲)

پانچ پانچ چھہ چھہ برس کی دو لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھ جاتیں ایک دوسری کی ہاتھ کی اُنگلیاں اُنگلیوں میں ڈال لیتیں اور آہستہ آہستہ ہلتی جاتیں اور کہتی جاتیں ماما کوئی ایسا سخی کوئی ویسا سخی کوئی چڑیا کا بچہ چھپا دینا۔ کوئی ایسا سخی کوئی ویسا سخی کوئی چڑیا کا بچہ چھپا دینا۔ جب اِس کھیل کو دیر ہو جاتی تو لڑکا لڑکی کوئی بیگم اُٹھتیں اور لڑکیوں کی اُنگلیوں سے اُنگلیاں نکال دیتیں۔ وہ دونوں لڑکیاں اپنے گمان میں چڑیاں تھیں اور لڑنے کے لئے گویا گتھ گئی تھیں تیسرے شخص نے آ کر بیچ بچاؤ کروا دیا۔

(۳)

برسات کے موسم میں جب بیر بہوٹیاں نکل پڑتیں تو بادشاہ زادیوں کو ان کا لال مخملی پن بہت پسند آتا۔ ایک ایک بیر بہوٹی ایک ایک اشرفی کو مول لی جاتی اور بچوں کو بانٹی جاتیں۔ ایک بادشاہ زادی جس کی عمر پانچ برس کی ہوتی بیر بہوٹی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتی وہ ہاتھ کے ہلنے جُلنے سے اپنے پنجے سمیٹ لیتی اور گول مول ہو کر مُردہ بنجاتی تو بادشاہ زادی کہتی بیر بہوٹی پنجہ کھول تیرا ماموں آیا بیر بہوٹی پنجہ کھول تیرا ماموں آیا۔ آخر ہتیلی کی حرکت تھم جاتی تو بیر بہوٹی پھر اپنے پنجے کھولتی اور چلنے لگتی اس پر وہ

وثی

خوشی منائی جاتی کہ الله الله شام کے وقت سونے کی ڈبیہ میں بیر بہوٹی بند کی داروغہ کو سپرد ہوتی اگر کہیں رات کو بیر بہوٹی مر کر رہ گئی تو صبح اُٹھ کر چھوٹی بیگم روتے روتے اپنی بسو بچا لیتیں بڑی بیگم اپنی بچّی کو چمکارتیں اور فرمائیں: قربان کی تھی اپنی لاڈو پر سے موئی دو کوڑی کی بیر بہوٹی۔ اری ساز گار دُروانہ ذرا ڈیوڑھی پر جانا دس اشرفیاں روتہ کو دے آنا اور سمجھا آنا کہ بیوی بنّو کے لیے سوتی سوتی نرم نرم دس بیر بہوٹیاں لا دے۔ روتہ اشرفیاں لیکر جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹے میں پلٹ کر آتا اور ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا اور چیخ کر کہتا حضور بیر بہوٹیاں آگئی ہیں مگر آج منڈی میں بیر بہوٹیوں کا بھاؤ دوگُن تھا دس اشرفیاں قرض کر آیا ہوں۔ بڑی بیگم فرماتیں روتہ بڑا نمک حلال ہے اس نے اشرفیوں کا مُنہ نہ کیا اور ہمارا حکم بجالایا دس اشرفیاں اسے اور دو تاکہ بیر بہوٹی والے کا قرض چکا آئے اور انعام کے گیارہ روپے الگ اسے دیئے جائیں ÷

(۴)

لال قلعہ کی ایک بیگم طوطے کے بچّے کو سبق پڑھا رہی تھیں۔ حق اللہ پاک ذات اللہ صحیح تو خدا خدا کا رسول تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول۔ جُگ جُگ جیا کرو۔ دُودھ بتاشے پیا کرو نام نبی کا لیا کرو۔ مٹھا نقیر حلی کمہ کو اُٹھ نقیر حلی کمہ کو ۔ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ نَهراً يرَحِيقٍ ولبن ÷ لِعَلِي ولزهرا لحُسين وحَسَن۔ پڑھو میاں مٹھو پڑھو۔ بیوی کا مٹھو بیگم کا مٹھو اگر اس سبق کو سُن کر طوطے نے ٹیں ٹیں کی تو خیر نہیں بیگم نے خفا ہو کر فرمایا پڑھو تو پڑھو نہیں پنجرہ خالی کرو ÷

(۵)

فرنگیوں نے جب کلکتہ سے شاہجہاں آباد کو ریل لانی چاہی تو بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ٹھہرنے اور اُس میں اُترنے چڑھنے کے لئے شہر میں سٹیشن بنانے کے لئے اجازت ہو اگرچہ فرنگی سارے مُلک اور سارے شاہجہاں آباد پر قابض ہو چکے تھے مگر نام کے بادشاہ کا ادب کرتے تھے اور اسی سبب سے اور اسی لئے مُنہ چھوانے کے لئے یہ بات کہی تھی۔ جہاں پناہ نے اس کے جواب میں فرمایا۔ اماں میں ریل گاڑی کا چرچا بہت دن سے سُن رہا ہوں توبہ توبہ وہ شہر میں چلے گی

تو اُس کی گڑگڑاہٹ سے پیٹ والیوں کے پیٹ گر جایا کریں گے آدمی پس پس جائیں گے۔ اس کے دھوئیں سے آنکھیں بیمار ہوں گی۔ تمہیں اگر ریل گاڑی لانی ہے تو اُس کا اسٹیشن کشمیری دروازہ سے چھ سات میل پرے بنانا اور فرنگیوں نے بادشاہ سلامت کے اس حکم کو مان لیا اسٹیشن کے لئے شہر سے بہت پرے جگہ بھی تجویز ہو گئی تھی مگر خدا کو اور منظور تھا۔

(۶)

لال قلعہ کی ساری بیگموں کا اعتقاد تھا کہ ٹیٹری جو پرند ہے اور اکثر تالابوں کے کنارہ رہتا ہے اس کے حلق میں چھید ہے جب یہ پانی پیتا ہے تو باہر نکل جاتا ہے اور یہہ غریب چڑیا پیاسی رہ جاتی ہے اور ساری عمر یہہ کہے جاتی ہے ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں۔ ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں۔ ایک بوند بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی ہے اور یہہ پیاسی ہی مرجاتی ہے +

دوسرے کویل جو کو کو پکارتی ہے یہہ آموں پر عاشق ہے جب سے آموں کے درختوں پر مور آتا ہے اور کیریاں لگتی ہیں یہہ آم کھانے کی آرزو میں چیخ چیخ کر گیت گاتی ہے مگر جس وقت آم تیار ہونے کے قریب آتا ہے تو اس کی باچھیں پک جاتی ہیں یہہ آم کھانے سے محروم رہتی ہے اور اسی حسرت میں اس کی عمر کٹ جاتی ہے ÷

(۷)

ایک دن جہاں پناہ خاصہ نوش فرما رہے تھے اور چلمن کے پیچھے میں اور میری ساس حاضر تھیں ملکہ زینت محل نے کہا حضور یہہ جو گرگ باراں دیدہ کہلاتا ہے تو کیا بھیڑیئے کے بارہ آنکھیں ہوتی ہیں اس بات کو سنکر بادشاہ سلامت بہت ہنسے اور فرمایا نہیں نہیں یہہ بات غلط ہے بلکہ بڑوں سے ایسا سُنا ہے کہ جب برسات بہت برستی ہے اور جل تھل بھر جاتے ہیں جنگل اور میدانوں میں پانی ہی پانی ہوتا ہے تو گیدڑ۔ لومڑیاں۔ بھیڑیئے اپنے اپنے بھٹوں میں اور اپنے اپنے گھروں میں چھپ رہتے ہیں۔ ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ ایک کھو میں دس پندرہ بھیڑیئے گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور مینہہ اور پانی کی مار سے باہر نکل نہیں سکتے۔ بھوک کے مارے بولاتے ہیں اُن میں

سراج

سے جوں نڈھال ہو جاتا ہے اور ناتوانی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اور بھیڑیئے اسے تکہ بوٹی کرکے کھا لیتے ہیں اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں اسی طرح ہر روز ایک آدھ بھیڑیا ادھ موا ہوتا رہتا ہے اور اور بھیڑیئے اُسے کھاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن میں سے بچ بچا کر ایک بھیڑیا رہ جاتا ہے اور اس عرصہ میں مینہ بھی کھل جاتا ہے جھڑ موقوف ہو جاتا ہے تو یہ بھیڑیا کمونکلتا ہے مگر بلا کا چوکنا اور پرلے سرے کا چالاک ہو جاتا ہے اپنے سایہ سے بھڑکتا ہے پتہ سے بھڑکتا ہے جب کوئی آدمی ایسی ہی ہوشیاری کی لیتا ہے تو کہتے ہیں وہ تو گرگ باراں دیدہ ہے۔ اسیطرح جب بھیڑیا اور اُسکی مادہ اور پانچ بچے اُن کے ساتھ جنگل میں پھرتے ہیں اور شکار ڈھونڈتے ہیں تو ستا مار دھن کہلاتے ہیں یہ سب کے سب داؤ کرتے ہیں اور جا بجا چھپ جاتے ہیں اور ہرن بیچارے کو پکڑ لیتے ہیں اور مل مل کر چا جاتے ہیں۔ کوئی آدمی بے بلائے اپنے جورو بچوں کو لیکر کسی کے ہاں مہمان آجاتا ہے تو طعن سے کہا جاتا ہے لو بوا ستا مار دھن آ پہونچے ؛

(۸)

جہاں پناہ کے چڑیا خانہ میں ایک بُلبل ہزار داستاں پلی ہوئی تھی سونیکے تار کے پنجرہ میں رہتی تھی اُستاد میرن جو چڑیا خانہ اور کبوتر خانہ کے داروغہ تھے اُسکی رکھیا کرتے تھے اُسکے پنجرہ پر کئی کئی لستنیاں مندھی رہتی تھیں جب بہار کا موسم آجاتا تو بلبل کو چہکنے کا شوق ہوتا اُستاد میرن اسکا پنجرہ لیکر بیگم کے باغ میں آتے کھٹے کے درخت کی ٹہنی میں پنجرہ لٹکا دیتے شہر میں ایک دن پہلے سے دھوم مچ جاتی تھی کہ کل مغرب کے وقت اُستاد میرن بادشاہی بلبل کا پنجرہ لیکر بیگم کے باغ میں آئیں گے شوقین لوگ اپنے اپنے اگن۔ چنڈول۔ طوطی۔ مینا۔ دیئڑ۔ شام دیئڑ وغیرہ بولنے والے جانوروں کے پنجرے لیکر بیگم کے باغ میں لیکر پہنچتے گھانس کے تختوں پر جو مخمل کو مات کرتی تھی پھسکڑہ مار کر بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے پرندوں کے پنجرے اپنے اپنے آگے رکھ لیتے۔ بادشاہی بُلبل ہزار بولیاں بولتی جنہیں سُنکر سُننے والے سُبحان اللہ کہتے بُلبل کے دم کو سنکر کوئی پرندہ کسی شوقین کا چہکنے لگتا تو اُس کا مالک پنجرہ کو تھپک دیتا جس سے یہ مراد تھی کہ بُلبل ہزار داستاں کی بولی کان لگا کر سُن اور چُپ رہ تاکہ تجھے بھی یہ ہانک آجائے۔ اور فی الواقع بُلبل کی بولیاں سُن سُن کر شاہجہاں آباد کے شوقین لوگوں کے اگن۔ چنڈول خوب بولنے لگتے تھے اور شوقین لوگ فخریہ کہتے تھے کہ جناب ہمارے اگن چنڈول نے بادشاہی ہزار داستاں کی مار کھائی ہے کبھی کبھی بلبل کا پنجرہ رات کے وقت محل میں بھی آجاتا تھا اور جہاں پناہ کے چھپر کھٹ کے پاس لٹکا دیا جاتا تھا جب تک حضور کا جی چاہتا اسکا چہکنا سُنتے تھے جب جی چاہتا پنجرہ باہر بھجوا دیا جاتا ؛

(از رسالہ ساقی۔ جون ۱۹۳۰ء)

مضمون پریشاں

گھنٹے گھڑیوں کی ایجاد سے پہلے ہندوستان میں شیشۂ ساعت کا رواج تھا۔ شیشۂ ساعت کی ترکیب یہہ تھی کہ دو چھوٹی چھوٹی شیشیوں کے منہہ جوڑکر اُوپر کی شیشی میں سُرخ باریک ریت بھردیجاتی اور نیچے کی شیشی خالی رہتی۔ ریت اِس انداز سے بھری جاتی کہ گھنٹے یا آدھ گھنٹے میں اوپر سے نیچے آجائے۔ پھر نیچے والی شیشی کو اُلٹ کر رکھ دیتے: اسی طرح وقت کا اندازہ ہو جاتا ❖

شیشۂ ساعت کے ذکر سے میری غرض یہہ ہے کہ جس طرح اُوپر والی شیشی کے آخری ذرّے بمقابلہ شروع کے ذرّوں کے تیزی سے جلد جلد گرتے نظر آتے ہیں یہی حال بجنسہ بُڑھاپے میں میری عُمر کے باقی ماہ سال کا ہے کہ جلدی جلدی گزرتے جا رہے ہیں۔ یہانتک کہ اوپر کی شیشی میں ریت کا ایک دانہ بھی باقی نہیں رہتا کہ یہہ خاتمہ کا نشان ہے ❖ شروع میں تو ریت کے ذرّے سب سٹے ہوتے ہیں جنکی جدائی گرنے میں بہت محسوس نہیں ہوتی جب تھوڑے دانے باقی رہ جاتے ہیں ایک ایک دانہ جُدا جُدا گرتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہجوم علایق میں ہمیں اپنی زندگی سے علیحدگی کا خیال

کم ہوتا ہے۔ جب زندگی تھوڑی رہ جاتی ہے تب ذہن میں آتا ہے کہ ع جاتی ہے بہار آئی ہوئی ✤

انسان کی زندگی کے خاتمہ میں بڑا رنج اس بات کا رہ جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تنہائی غضب کی ہو جاتی ہے۔ موت سے بڑا خوف تنہائی کا ہے کہ تنہائی بلا کی ہوتی ہے ✤ اپنے پرائے سب چھوٹ جاتے ہیں۔ بُرے بھلے ارمانوں سے قطعِ تعلق ہو جاتا ہے: نہ اپنا سوجھتا ہے نہ پرایا۔ ایک عالمِ ہُو ہوتا ہے ✤

اس پر مجھے خیال ہوا کہ سچ پوچھئے تو تنہائی عیب میں داخل نہیں۔ جس طرح پریشانی کی تعریف میں ہے کہ ع پریشانی اگر عیب است زلفِ یار ہم دارد۔ خدائے واحد کی اعلیٰ صفات میں وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ قبر میں ہماری تنہائی مُصیبت کے عوض ہُنر میں سمجھنی چاہئے کہ جو چیز صفاتِ ایزدی سے ملتی جُلتی ہو وہ عیب میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتی ✤

غایتِ تنہائی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ہے کہ اُس کا شریک ممکن ہی نہیں۔ شریک سے مراد ہم رُتبہ: فرشتے محض خدمت گزار ہیں اور خدمت گار ہم صحبتوں میں گنے نہیں جاتے انبیاء علیہم السلام اور اولیا اللہ اور اور تمام نیک و صالح بزرگانِ دین صرف اس کے بندے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ شریک ہونے کا دعوے کر سکیں ✤ علمِ کلام میں بڑی بحث اسی بات کی ہے کہ قادرِ مُطلق کی قدرت میں اپنا شریک پیدا کرنا ناممکن ہے۔ آپ دیکھیں کہ یہ کس درجہ کی احدیت ہوئی! خدا کی بنائی ہوئی مخلوق فرشتے ہوں یا اعلیٰ علّیین کے رہنے والے اُس کے شریک نہیں سمجھے جا سکتے کہ مخلوق کو خالق کی ہم سری سے کیا واسطہ؟

خدا تعالےٰ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تنہائی پر رحم آیا اور حضرت حوّا کو پیدا کر دیا کہ تنہائی مٹے۔ لیکن اپنے لئے ازل سے ابد تک بلکہ جب جس کا خیال جہاں تک جا سکے اور اس کے بعد بھی تنہائی پسند کی ✣

یہاں آپ کہیں گے کہ اتنے ہمہ اوست وہمہ از اوست کے ماننے والے جن کو عشق آلٰہی کا دعوے ہے اور وصل ووصال پر مر رہے ہیں اُن کے ہوتے خدائے برتر واعلےٰ کیسے اکیلا سمجھا جائے جس کے چاہنے والے بے گنتی ہیں۔ اس کے جواب میں ہاتف کی آواز آرہی ہے کہ وہاں تو وہ صحبت چاہئے جو پروانہ کو شمع سے ہے۔ وہاں مارے باندھے کا تعلق پسند نہیں ✣

میں نے موت سے بڑی مصیبت تنہائی کو سمجھ رکھا تھا کہ سارے علایق چھوٹ جاتے ہیں۔ لیکن یہہ علایق سے چھوٹنا مصیبت ہرگز نہیں۔ بلکہ ایک طرح کا اچھا خاصہ ہنر ہے کہ جو بات میاں کو پسند ہو عیب نہیں ✣

غرض زندگی ہو یا موت۔ کوئی حالت بُری نہیں ؛ زندگی کو جو دارِ محن سمجھتے ہیں دیکھ لیں کہ جہاں فراقِ جاناں میں ایک دفعہ رونا ہے وہاں وصلِ یار میں قیامت تک خوشی ہے۔ بقول فیضی ؎

چوں نسخہ جُزو کُل نوشتند ✣ یک درد بہ صد دوا سرشتند
گر برگ بود وگر بلا رک ✣ گیرند بلاکشاں تبارک

کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو بچے ذرا دیر کے لئے مُنہہ بسور لیتے ہیں پھر بدستور کھیلنے اور ہنسنے لگتے ہیں ؏

دنیا سے جُدائی کچھ ایسی جاں گُسل مُصیبت نہیں جب کہ یقین ہو کہ پھر زندگی نصیب ہوگی۔ جس طرح فراقِ جاناں میں پھر یار سے ملنے کی آس ہو۔ لیکن وہاں تو فردا اور پس فردا پھر بھی خیریت: اس پر بقول جناب حسن بریلوی ؎

دُھرے الم ہیں صبح شبِ وصل اے حسن ✦ کس کو یقین ہے کہ وہ اپنے ہی گھر گئے

یہ دُھرا قلق نہیں تو کیا ہے کہ مرنا تو واقعی و قوعی اور مرنے کے بعد واللہ اعلم بالصواب: صبح شبِ وصل یار کا جانا کیا کم رنج کا سبب ہے۔ اس پر یہ شُبہ کہ جانے کہاں گئے؟ خُدا جانے دشمن کے گھر تو نہیں گئے؟ اور شُبہ مُقتضائے مُحبت ہے ✦

رہا قیامت کا حساب کتاب۔ معتزلہ کے عقاید میں رُویتِ الٰہی میں شُبہ ہے کہ اللہ میاں کا دیدار نصیب ہونا مشکل ہے۔ گو عقیدہ میں ناممکن نہ ہو ✦ دُنیا میں تو آپ ہمیشہ غائب رہے۔ حضرت موسٰے کو بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ حضرت کو بقول شخصے ایک سُنہری لکیر سی جو شاید "ابرو بادومہ و خورشید" (بلکہ پہاڑ پر بجلی کی کرن) سے ہوا ارنی کا خیال ہوا اور لن ترانی سُننی پڑی۔ گو رگِ گردن سے قریب تر سُنتے رہے ✦

لیکن قیامت کے دن تو حضور کا دیدار ضرور ہے کہ ملزم کے لئے گو کتنے ہی سنگین جُرم میں ماخوذ ہو جج کا سامنے ہونا مناسب ہے۔ اگر عدالت کے دن آپ سامنے نہ ہوے تو پھر ہمارا کون ہے؟ ہم بھی تو کسی سے پوچھیں ؎ نیا ونہ کینو کی نی ٹھکرائی ✦ بن کینے لکھو دین بُرائی ✦

معمولی اُردو میں اس طرز کے ادائے بیاں کی بہت گنجائش نہیں۔ فاصکر نثر میں

جب پابندیئے عقاید کی شرط ہو۔ مگر یورپ (ولایت) کی نامور زبانوں میں اس وضع پہ اظہارِ خیال فصاحت میں داخل ہے ⁂ اور زبان کی وسعت کی خاطر سے ہر طرز پہ لکھنا کار آمد ہے ⁂

یہ مضمون محض خیالی ہے کسی طرح کے عقاید سے اسکا تعلق مطلق نہیں۔ اس سے غرض صرف اپنی زبان میں جدّت طرازی کا ایک نمونہ دکھانا ہے جو انگریزی زبان کے اچھے اچھے لٹریری دماغوں کو سوجھتا رہتا ہے ⁂ اللہ بس باقی ہوس!

رہے نہ رہے

(از جناب سید انور حسین صاحب آرزو جانشین جناب جلال مرحوم)

خبر نہیں کہ یہ دیوانہ پن رہے نہ رہے ⁂ گھٹے نہ شانِ جنوں پیرہن رہے نہ رہے
نہیں رفاقتِ شعلہ میں خس کی خیر نہ ہو ⁂ فغاں ضرور ہے۔ کام و دہن رہے نہ رہے
وہ مدعائے دلی ہے یہ ہے فریبِ نظر ⁂ رہے بہار الٰہی۔ چمن رہے نہ رہے
پھر آئے گی کہ یہ اک چلتی پھرتی چھاؤں بہار ⁂ چمن کی خیر ہو۔ رنگِ چمن رہے نہ رہے
حصول کچھ نہیں دو دن کی پردہ پوشی سے ⁂ یہ خاکِ گور سلامت کفن رہے نہ رہے
گداز دل پہ ہے موقوف سوز دل کی بقا ⁂ غرض حفاظتِ جاں سے ہے تن رہے نہ رہے
رسن سے باندھے ہیں سودائی زلفِ یار نے ہاتھ ⁂ اس احتیاط پہ بھی پیرہن رہے نہ رہے

نفسِ حیات کا ضامن سہی مگر کب تک ٭ درازدستیِ قیدِ رسن رہے نہ رہے
چہل پہل سے اُمیدوں کی ہوئے لطف انسوں ٭ بھری پُری یُوں ہیں یہ انجمن رہے نہ رہے
بدل رہا ہے زمانہ تو آرزو کیا ٹھیک
وطن میں بھی یہ سوادِ وطن رہے نہ رہے

صلائے عام - یہہ غزل رسالہ مُبتصر لکھنو میں لُطفِ سخن کے عنوان سے چھپی ہے۔ زمین مُشکل تھی مگر جناب **آرزو** نے نہایت دل کش کر دی کہ اجتماعِ ضدّین ہوگیا اور نہایت پاکیزہ اور نہایت نازک ٭

بہار کے دونوں مضمون کس خوبی سے ادا کیئے ؎

وہ مدّعائے دلی ہے - یہ ہے فریبِ نظر ٭ رہے بہار الٰہی - چمن رہے نہ رہے
پھر آئیگی کہ ہے اک چلتی پھرتی چھاؤں بہار
چمن کی خیر ہو - رنگِ چمن رہے نہ رہے

یہہ غضب کا مضمون ہے کہ ؎

حصول کچھ نہیں دودِن کی پردہ پوشی سے ٭ یہہ خاکِ گو سلامت کفن رہے نہ رہے

اس سے بہتر کوئی مضمون کیا ہوگا؟

نفسِ حیات کا ضامن سہی مگر کب تک؟ ٭ درازدستیِ قیدِ رسن رہے نہ رہے

("درازدستیِ قیدِ رسن" کیا کہنا!)

ایک شمع کے دو پروانے

(از جناب سید الشعرا سید حسن۔ سید ظہیری ناظم بزمِ ادب بھوپال)

اے سکینہ اللہ کی امان (اللہ رکھے) تم اب آئیں اگر اب بھی نہ آتیں تو کوئی تمہارا کیا کرلیتا۔ دوپہر ڈھلی سہ پہر گزری۔ تم نہ آنی تھیں نہ آئیں۔ تم نے تو صبح سے شام ہی کردی۔ یہ تو کہو آخر کس خطا پر مجھے یہہ سزا دی۔ بس یہہ سمجھ لو کہ اک دم ہی نہیں نکلا اور سب کچھ ہوگیا ٭ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو یہہ مصیبت بھی نہ بھرتی ٭ کیا یہی محبت کا پھل ہے جو مل رہا ہے ٭

اگر میں تم سے محبت کم کردوں یا نہ ملوں اور یہہ ٹھان لوں کہ اب نہ ملوں گی تو مجھے یقین ہے کہ تم ہرگز اس کی پروانہ کروگی بلکہ غنیمت سمجھو گی اور کبھی میرے گھر کا رُخ نہ کروگی۔ تمہاری نگاہیں یہہ کہہ رہی ہیں کہ تم اس بات کی راہ دیکھ رہی ہو ٭

میں دیکھتی ہوں کہ تمہارا جی مجھ سے ملکر خوش نہیں ہوتا۔ جب تک یہاں رہتی ہو اُداس رہتی ہو۔ میں کچھ کہتی ہوں تم کچھ کہتی ہو۔ بھلا یہ باتیں نباہ کی ہیں؟

مگر کیا کیجئے دل پھنس گیا ہے اور تم نے یہہ سمجھ رکھا ہے کہ اس نامراد کو میرے بغیر کل نہ پڑے گی اگر میں نہ جاؤں گی تو خود دوڑی ہوئی آئے گی ٭

آخر یہہ کب تک۔ میں انسان ہوں۔ میرا بھی دل ہے۔ میں بھی کچھ سمجھتی ہوں۔ ننّی بچّی نہیں ہوں۔

دیکھو سکینہ زمانہ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ گھڑی بھر میں کیا سے کیا ہوجاتا ہے تمہارے سامنے کی بات ہے کہ ابھی ابر تھا اور ابھی دھوپ نکل آئی۔ یہی حال انسان کی طبیت (طبیعت) کا ہے کہ بدلی سو بدلی منائے نہ منوں گی۔ تم ہزار بلاؤ گی تو ہرگز نہ آؤں گی ٭

پیاری سکینہ مجھے اتنا نہ ستاؤ کہ چیخ اُٹھوں اور اتنا نہ جلاؤ کہ بیمار پڑ جاؤں۔ آخر تم میری سہیلی ہو ساتھ کی کھیلی ہو۔ تمہیں اسکا تو خیال چاہئے۔ کہ نہیں؟

یہہ میں جانتی ہوں کہ تم اپنے بس میں نہیں ہو میری طرح تم بھی کسی سے محبت کرنے لگی ہو۔ فرق اتنا ہے کہ تم مجھ سے چھپاتی ہو اور میں نہیں چھپاتی۔ مرے لئے یہہ دوہری مصیبت ہے میں تمہیں اس سے نہیں روکتی کہ کسی کو نہ چاہو نہیں ضرور چاہو۔ مگر مجھے تو نہ بھولو۔

جیسا میں تمہیں یاد رکھتی ہوں ویسا تم بھی مجھے یاد رکھو۔ کیا میں تمہاری دشمن ہوں بیرن ہوں۔ جو تم اپنے دل کا بھید مجھ سے نہیں کہتی ہو۔ کیا میں کسی سے کہدوں گی۔ تمہیں خدانخواستہ رسوا کردوں گی۔ تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارا بھید دل میں رکھوں گی ٭ تمہیں اعتبار نہ ہو تو جیسی چاہو مجھ سے قسم لے لو۔ میں تو یہہ چاہتی ہوں کہ تم سُکھ سے رہو۔ میں چاہے دُکھ میں رہوں۔ مرے لایق اگر کوئی کام ہو تو میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ اپنا جان و مال فدا کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اس میں دریغ کروں تو کہنا رابعہ کوئی ایسی ویسی تھی۔ بس یہہ مرا کہنا ہے ٭ لیکن تم مُنہ کھول کر مجھ سے کہو تو سہی۔ مُنہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی ہو۔ منہ سے بولو نہ سر سے کھیلو۔ کچھ کہتی ہو نہ سُنتی ہو۔ آخر اس کا علاج میں کیا کروں ٭

سکینہ چُپ ہے طرح طرح کے خیال دل میں آرہے ہیں سکتہ کی کیفیت طاری ہے مجال کیا کہ پلک تو جھپک جائے۔ نظر زمین پر کیا گئی کہ وہیں کی ہو رہی۔ رابعہ جواب کی منتظر ہے ٭ جواب کیسا۔ سکینہ یہاں اب ہے ہی نہیں ٭

آدھ گھنٹہ گذر گیا رابعہ نے جب دیکھا کہ یہہ تو بولتی ہی نہیں گلے میں بانہیں ڈالدیں اور کوچ پر اپنے پاس بٹھالیا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سکینہ دفعتاً چیخ مار کر رو پڑی اور ہچکیوں کا تار بندھ گیا۔ اتنی بھی سُدھ نہ رہی کہ دوپٹہ ہی سے آنسو پونچھ لیتی۔

ہائے یہ وقت بھی عجیب وقت تھا کہ دل کی باتیں زبان پر نہ آئیں اور آنکھوں سے آنسو بنکر ٹپک گئیں ٭

یہہ آدہ گھنٹہ جو ضبط کی حالت میں گزرا قیامت سے کم نہ تھا۔ سکینہ کا دل مچھلی کی طرح تڑپتا تھا جگر کا یہہ حال تھا کہ آہوں کو آغوش میں دبائے تھا اور ہمسایہ کی مصیبت پہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ تن کی آن میں سکینہ کے چہرہ پر زردی چھا گئی۔ گویا پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔ سینہ جو صاف آئینہ تھا اب داغوں کا گلدستہ بن گیا ☙

رنگ رخ داغ جگر ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
مجھ سے چھپتے ہیں وہ اتنا کہ چھپا بھی نہ سکوں (ظہیر دہلوی)

رابعہ اس حالت کو نہ معلوم کر سکی اس لئے کہ وہ جوشِ شکوہ سے لبریز تھی اور دیر سے بھری بیٹھی تھی اور اس فکر میں تھی کہ موقع پائے تو گلے شکوے کرے۔ دل کی کوفت دور ہو۔ سکینہ کچھ ہنسے بولے دل مسرور ہو ✚

اُسے کیا خبر تھی کہ سکینہ کے آتے ہی یہہ آسمانِ ستم ٹوٹ پڑے گا کہ اُلٹے لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ بارہا گلے شکوے ہوئے تھے مگر کبھی یہ نوبت نہ پہونچی تھی نہ سکینہ کی ایسی حالت ہوئی تھی جو آج ہوئی۔ وقت ہی تو ہے۔ اگر سکینہ کی یہہ حالت ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ✚

رابعہ اور سکینہ کی مثال اس وقت اُن پروانوں کی سی ہے جو ہوائے شوق میں ساتھ ساتھ اُڑتے ہیں مگر ایک کی تڑپ دوسرا نہیں جانتا ✚

رابعہ کے جذبات الاماں اِس وقت اِس غضب کے ہیں کہ اُسے کچھ نہیں سوجھتا۔ کہنے کو تو کہہ دیا کہ سکینہ اگر اپنے دل کا بھید کہہ دے گی تو کوئی تدبیر ایسی نکل آئے گی کہ وہ اپنی مراد کو پہونچ جائے۔ لیکن رابعہ کے دل کی حالت خدا جانے یا رابعہ۔

بھلا کون سخی کا لال ایسا ہوگا جو اپنے مطلوب کا ہاتھ رقیب کے ہاتھ میں دیدے گا ✚ یہہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور اس لئے ہیں کہ سکینہ اپنے دل کا بھید بتا دے ✚ محبت میں بھی بغیر داؤ گھات کام نہیں چلتا۔ محبت بھی ایک قسم کا شکار ہے کہ فریقین ایک دوسرے سے

نظریں بچا بچا کر کھیلا کرتے ہیں +

آج کی رات اس طرح گزری کہ دونوں کی پلک سے پلک نہ لگی +

رابعہ تو اس خیال میں نہ سوئی کہ اللہ کیا کروں سکینہ کے دل کا بھید کیونکر پاؤں +

سکینہ اس عالم میں تھی کہ کہیں رابعہ پر میرا حال نہ کھل جائے۔ اگر ایسا ہوا تو غضب آجائے گا۔ وہ کب گوارا کرے گی کہ اس کے منگیتر کو میں چھین لوں۔ خدا کرے اُسے نہ معلوم ہو۔ مگر یہہ ممکن نہیں کہ اُسے نہ معلوم ہو۔ وہ تو کل ہی سے میرے گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ اگر میں نے نہ کہا تو کیا اُسے پتہ نہ چلے گا۔ کیا یہہ بات چھپی رہے گی۔ آخر کب تک چھپی رہے گی + مامائیں نمک حرام میں کچھ لے دے کر کہہ دیں گی۔ کیا کروں اللہ کیا نہ کروں۔ سوز ئی اس کے لئے کانٹوں کا بستر بن گئی تھی گھڑی اُٹھتی تھی گھڑی بیٹھتی تھی۔ اور یہہ خیال کا بھوت سر پر سوار تھا +

رابعہ کو بھلا کل کہاں تھی دن نکلتے ہی ماماؤں کو بلا بھیجا اور کچھ لالچ دیکر سارا حال پوچھ لیا۔ اس کے بعد اب رابعہ سکینہ کی دوست نہ تھی اب سکینہ اس کی سوکن تھی اور یہہ اُس کی دشمن۔ کہاں کی سکینہ اور کیسی سکینہ۔ دلی جذبات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب بجائے اس کے وہ سکینہ کی ہمدرد بن کر اس کی مدد کرتی اور حسب وعدہ سکینہ کو اپنی مراد کو پہونچاتی۔ اس فکر میں پڑ گئی کہ صفحہ دنیا سے اُسے مٹا کر چھوڑے + سکینہ بیچاری جب بستر سے اُٹھی تو یہہ خطرہ ساتھ لے کے اُٹھی۔ آج دن کے دس بج گئے اور رابعہ کے ہاں سے کوئی نہیں آیا۔ جب تو اس کا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ شاید رابعہ کو اس کی خبر ہو گئی۔ اسی سوچ میں بیٹھی تھی کہ رابعہ کی ماما ایک خط لیکر آئی۔ سکینہ نے کھول کر پڑھا اور جو خیال ابھی ابھی اس کے دل میں آیا تھا وہ ہی اُس خط میں تحریر تھا۔ سکینہ خط پڑھتے ہی دھم سے گری اور بے ہوش ہو گئی + یہہ بے ہوشی نہ تھی بلکہ موت کی نیند تھی۔ حکیم طبیب ڈاکٹر جب تک آئیں آئیں سکینہ میں کچھ نہ تھا +

گھر میں کہرام مچ گیا۔ اپنے پرائے سب اکھٹے ہو گئے اور اس جوانہ مرگ پر کون تھا کہ

جسنے ماتم نہ کیا۔ ہائے سکینہ کی موت بھی کس قدر حسرت ناک موت تھی کہ جو سنتا تھا سر پیٹ لیتا تھا ہمسایوں کا یہہ حال تھا کہ ایک چیخ آسمان پر تھی تو ایک چیخ زمین پر۔ رابعہ کو جب اس کی خبر ملی تو یقین نہ آیا جب رونے پیٹنے کی صدائیں متواتر کان میں آئیں تب یقین ہوا کہ واقعہ سچا ہے۔ بجائے اس کے کہ رابعہ کو غم ہوتا یہہ فکر پیدا ہو گئی کہ کہیں میرا خط نہ پکڑا جائے اور میں سکینہ کی قاتل نہ قرار پاؤں فوراً ڈولی منگوائی اور سوار ہو کر سکینہ کے گھر جا اتری وہاں پہونچتے ہی کچھ ایسی گھبرائی کہ خط خیال دل سے جاتا رہا +

یہاں تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا تھا۔ ماتم دار صفیں باندھے بیٹھے تھے اور سکینہ سکینہ پکار پکار کر نوحہ کر رہے تھے کوئی سینہ کوٹ رہا تھا کوئی سر پیٹ رہا تھا۔ رابعہ کا دل بھر آیا اور اس منظر کو دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ اب اُس کی نسبت کوئی یہہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سکینہ اس کی سوکن تھی۔ ڈاڑھیں مار مار کر روتی تھی پچھاڑیں کھا کھا کر گرتی تھی۔ اسی جوشِ غم میں اُس نے اپنی اُن انگلیوں کو پتھر سے کچل ڈالا جن سے خط لکھا تھا۔ چونکہ جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ باہر سے آواز آئی کہ ہٹ جاؤ۔ پردہ ہوا لوگ آئے اور جنازہ اُٹھا کر لے چلے۔ ہائے اُس وقت عجیب عالم تھا کہ رابعہ کی انگلیوں سے خون جاری تھا سر لہو لہان تھا پیشانی پر ورم آگیا تھا جا بجا جسم میں نیل پڑ گئے تھے آواز بیٹھ گئی تھی چلنے میں پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ آنکھیں اس قدر پھول گئی تھیں کہ نرگس کا پھول معلوم ہوتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ دوپٹہ کی دھجیاں اُڑ چکی تھیں۔ دامن و گریبان میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ سر کے بال پریشان تھے۔ قریب تھا کہ گریۂ خونی آنکھوں سے جاری ہو جائے کہ بے ہوشی نے آکر روک دیا۔ سکینہ کے گھر والے سکینہ کو بھول گئے مہمان کی اس حالت کو دیکھ دیکھ کر روتے تھے اور زانو پر سر رکھے بیٹھے تھے اور پنکھا جھل رہے تھے۔ کوئی برف منہ میں دیتا تھا۔ کوئی گلاب چھڑکتا تھا۔ کوئی دم کرتا تھا۔ کوئی دعائیں مانگتا تھا۔ غرض کہ اس گھر میں رابعہ سے بڑھ کر سکینہ کا کوئی ماتم دار نہ تھا۔ دو گھنٹہ کے بعد جب رابعہ کو ہوش آیا تو یہہ حالت تھی کہ خاموش تصویر کی طرح جہاں کھڑی ہے کھڑی ہے

باقی پھر

نظریں بچا بچا کر کھیلا کرتے ہیں +

آج کی رات اس طرح گزری کہ دونوں کی پلک سے پلک نہ لگی +

رابعہ تو اس خیال میں نہ سوئی کہ اللہ کیا کروں سکینہ کے دل کا بھید کیونکر پاؤں +

سکینہ اس عالم میں تھی کہ کہیں رابعہ پر میرا حال نہ کھل جائے۔ اگر ایسا ہوا تو غضب آجائے گا۔ وہ کب گوارا کرے گی کہ اس کے منگیتر کو میں چھین لوں۔ خدا کرے اُسے نہ معلوم ہو۔ مگر یہہ ممکن نہیں کہ اُسے نہ معلوم ہو۔ وہ تو کل ہی سے میرے گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ اگر میں نے نہ کہا تو کیا اُسے پتہ نہ چلے گا۔ کیا یہہ بات چھپی رہے گی۔ آخر کب تک چھپی رہے گی + مامائیں نمک حرام میں کچھ لے دے کر کہہ دیں گی۔ کیا کروں اللہ کیا نہ کروں۔ سوزنی اس کے لئے کانٹوں کا بستر بن گئی تھی گھڑی اُٹھتی تھی گھڑی بیٹھتی تھی۔ اور یہہ خیال کا بھوت سر پر سوار تھا +

رابعہ کو بھلا کل کہاں تھی دن نکلتے ہی ماماؤں کو بُلا بھیجا اور کچھ لالچ دیکر سارا حال پوچھ لیا۔ اس کے بعد اب رابعہ سکینہ کی دوست نہ تھی اب سکینہ اس کی سوکن تھی اور یہہ اُس کی دشمن۔ کہاں کی سکینہ اور کیسی سکینہ۔ دلی جذبات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب بجائے اس کے وہ سکینہ کی ہمدرد بن کر اس کی مدد کرتی اور حسب وعدہ سکینہ کو اپنی مراد کو پہونچاتی۔ اس فکر میں پڑ گئی کہ صفحہ دُنیا سے اُسے مٹا کر چھوڑے + سکینہ بیچاری جب بستر سے اُٹھی تو یہہ خطرہ ساتھ لے کے اُٹھی۔ آج دن کے دس بج گئے اور رابعہ کے ہاں سے کوئی نہیں آیا۔ جب تو اس کا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ شاید رابعہ کو اس کی خبر ہو گئی۔ اسی سوچ میں بیٹھی تھی کہ رابعہ کی ماما ایک خط لیکر آئی۔ سکینہ نے کھول کر پڑھا اور جو خیال ابھی ابھی اس کے دل میں آیا تھا وہی اُس خط میں تحریر تھا۔ سکینہ خط پڑھتے ہی دھم سے گری اور بے ہوش ہو گئی + یہہ بے ہوشی نہ تھی بلکہ موت کی نیند تھی۔ حکیم طبیب ڈاکٹر جب تک آئیں آئیں سکینہ میں کچھ نہ تھا +

گھر میں کہرام مچ گیا۔ اپنے پرائے سب اکٹھے ہو گئے اور اس جوانہ مرگ پر کون تھا کہ

جسنے ماتم نہ کیا۔ ہائے سکینہ کی موت بھی کس قدر حسرت ناک موت تھی کہ جو سنتا تھا سر پیٹ لیتا تھا ہمسائیوں کا یہہ حال تھا کہ ایک چیخ آسمان پر تھی تو ایک چیخ زمیں پر۔ رابعہ کو جب اس کی خبر ملی تو یقین نہ آیا جب رونے پیٹنے کی صدائیں متواتر کان میں آئیں تب یقین ہوا کہ واقعہ سچا ہے۔ بجائے اس کے کہ رابعہ کو غم ہوتا یہہ فکر پیدا ہو گئی کہ کہیں میرا خط نہ پکڑا جائے اور میں سکینہ کی قاتل نہ قرار پاؤں فوراً ڈولی منگوائی اور سوار ہو کر سکینہ کے گھر جا اُتری وہاں پہونچتے ہی کچھ ایسی گھبرائی کہ خط خیال دل سے جاتا رہا +

یہاں تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا تھا۔ ماتم دار صفیں باندھے بیٹھے تھے اور سکینہ سکینہ پکار پکار کر نوحہ کر رہے تھے کوئی سینہ کوٹ رہا تھا کوئی سر پیٹ رہا تھا۔ رابعہ کا دل بھر آیا اور اس منظر کو دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ اب اُس کی نسبت کوئی یہہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سکینہ اس کی سوکن تھی۔ ڈاڑھیں مار مار کر روتی تھی پچھاڑیں کھا کھا کر گرتی تھی۔ اسی جوشِ غم میں اُس نے اپنی اُن انگلیوں کو پتھر سے کچل ڈالا جن سے خط لکھا تھا۔ چونکہ جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ باہر سے آواز آئی کہ ہٹ جاؤ۔ پردہ ہوا لوگ آئے اور جنازہ اُٹھا کر لے چلے۔ ہائے اُس وقت عجیب عالم تھا کہ رابعہ کی انگلیوں سے خون جاری تھا سر لہو لہان تھا پیشانی پر ورم آگیا تھا جا بجا جسم میں نیل پڑ گئے تھے آواز بیٹھ گئی تھی چلنے میں پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ آنکھیں اس قدر پھول گئی تھیں کہ نرگس کا پھول معلوم ہوتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ دوپٹے کی دھجیاں اُڑ چکی تھیں۔ دامن و گریبان میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ سر کے بال پریشان تھے۔ قریب تھا کہ گریۂ خونی آنکھوں سے جاری ہو جائے کہ بے ہوشی نے آکر روک دیا۔ سکینہ کے گھر والے سکینہ کو بھول گئے مہمان کی اس حالت کو دیکھ دیکھ کر روتے تھے اور زانو پہ سر رکھے بیٹھے تھے اور پنکھا جھل رہے تھے۔ کوئی برف منہ میں دیتا تھا۔ کوئی گلاب چھڑکتا تھا۔ کوئی دم کرتا تھا۔ کوئی دعائیں مانگتا تھا۔ غرض کہ اس گھر میں رابعہ سے بڑھ کر سکینہ کا کوئی ماتم دار نہ تھا۔ دو گھنٹہ کے بعد جب رابعہ کو ہوش آیا تو یہہ حالت تھی کہ خاموش تصویر کی طرح جہاں کھڑی ہے کھڑی ہے

جہاں تھی

یہاں بیٹھی ہے بیٹھی ہے - تیسرے دن جب گھر آئی تو مہینہ بھر ڈاکٹری علاج کے بعد اس قابل ہوئی کہ چل پھر سکے - اب اس کا یہہ معمول تھا کہ صبح سے شام تک قرآن پڑھنا اور سکینہ کی روح کو ثواب پہونچانا - پہننا اوڑھنا سب چھوڑ دیا - کھانا بھی لیا دیا کھاتی تھی - پانی کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی پیا اور کبھی نہ پیا - پان کا تو ذکر ہی کیا - چھالیہ تک مُنہ میں نہ ڈالتی تھی + سکینہ سکینہ ہائے سکینہ یہہ اس کا تکیہ کلام تھا - جس ماما نے سکینہ سے دِل چھڑایا تھا آخر وقت تک اُس کی صورت نہ دیکھی حکم دیدیا تھا کہ دنیا آئے مگر وہ مُردار صورت نہ دکھائے - گھر والوں نے ہرچند کوشش کیں کہ سکینہ کا غم رابعہ کے دل سے دور ہو مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دِن بہ دن اُس کی حالت ابتر ہی ہوتی گئی - آخر یہہ قرار پایا کہ رابعہ کی شادی کردی جائے ممکن ہے کہ شادی کے بعد اس کی طبیعت سنبھل جائے - چنانچہ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں - گھر باہر ہرم یہی قصّے تھے اور یہی چرچے لیکن رابعہ کو اس سے کچھ دلچسپی نہ تھی بلکہ اُسے سخت ناگوار تھا اور اسی وجہہ سے اُس نے یہہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جب سکینہ دنیا سے بے ارمان گئی تو مجھے بھی بے ارمان جانا چاہئے - جب تو اُس گناہ کی تلافی ہوگی جو میری جلد بازی کے سبب مجھ سے سرزد ہوا ہے - ایک ماما کے کہنے پر اتنی مشتعل ہوئی کہ فوراً قلم دوات منگواکر سکینہ کو خط لکھہ دیا اور یہہ نہ سوچا کہ نازک دل سکینہ اسے پڑھکر کب زندہ رہ سکتی ہے - کل کی بات ہے کہ سکینہ جب یہاں آئی تھی تو اُس کی کیا حالت تھی کہ آدھ گھنٹہ تک سکتے کے عالم میں رہی اور جب میں نے بٹھایا تو بیٹھی - کاش میں جلدی نہ کرتی تو میری سکینہ مجھ سے جُدا نہ ہوتی - میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیری مدد کروں گی - کوئی تدبیر نکالوں گی ہائے ہائے وہ وعدہ بھی میں نے فراموش کردیا - او بدگمانی تیرا بُرا ہو تو نے رات بھر مجھے سونے نہ دیا - اور اپنے مطلب کی باتیں سوچتی رہی - او خودغرضی تو دنیا سے اُڑ جائیو تو نے میرے ہاتھ سے سکینہ کو کھو دیا - خدا جانے اُس رات سکینہ پر کیا گزری - گھر والوں کا تو یہہ بیان ہے کہ وہ بھی نہیں سوئی +

س۔ عجلت۔

اس عجلت پر جو خط لکھنے میں رابعہ نے کی تھی رہ رہ کر جب اس کا ضمیر ملامت کرتا تھا تو آنکھیں خون کے آنسو بہاتی تھیں اور اس کا بدن کانپنے لگتا تھا نگاہیں جھک جاتی تھیں ہر بُن مُو سے ندامت کا پسینہ بہنے لگتا تھا۔ گھر والے یہہ سمجھتے تھے کہ بخار اُترنے کا پسینہ ہے۔

عین اُس روز کہ برات رخصت ہونے والی تھی۔ اور انتظامات رخصتی ہو رہے تھے۔ پچھلی رات موت کا ہلکارہ یہہ خبر لے کر آیا کہ اَے براتیو دُلہن اب دُولہا گھر نہ جائے گی۔ بلکہ معہ اس جلوس کے شہر خاموشاں کی ہوا کھائے گی اور تمہارے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ تمہاری خوشی اب غم سے تبدیل ہونے والی ہے۔ یہہ رات وصل کی رات نہیں بلکہ ہجر کی رات ہے۔ وہ وقت قریب ہے کہ تم رابعہ کو سپرد خاک کرو اور ناکام و نامراد کف افسوس ملتے ہوئے اپنے اپنے گھر پھرو ؎

رات کے تین بجے رابعہ اُٹھی ماں کو بلایا خطا قصور معاف کرایا سہاگ کا جوڑہ اس نے نہیں پہنا تھا اپنی اَناں کو حوالہ کیا سورہ یٰسین پڑھی۔ کلمہ پڑھا سب کو گواہ کیا ایک ہچکی آئی دوسری آئی تیسری ہچکی پر اللہ اللہ کہتی ہوئی یہہ جنت کی چڑیا جنت کو سدھار گئی۔ ہائے وائے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خوشی کے باجے بند ہوئے شادی کا گھر غم کا گھر بن گیا نالہ و بکا کی کثرت گھر سے زیادہ باہر تھی مہمانوں کا ہجوم تھا۔ جس وقت یہہ خبر باہر پہونچی تو قیامت برپا ہو گئی۔ خصوصاً نوشاہ کہ اپنی آنکھوں سے پژمردہ اور خاک پہ بکھرے دو غنچے دیکھ چکا تھا ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا تھا اور اپنے جینے پر ہزار ہزار لفریں کرتا تھا۔ اور دیوار سے سر دے دے مارتا تھا۔ مگر یہہ سب بے کار تھا۔ یہہ آگ اُسی کی لگائی ہوئی تھی۔ محض اس لئے کہ رابعہ کے باپ جلد شادی کر دیں۔ رابعہ جو سکینہ کی محبت میں گرفتار ہے رشک و رقابت کی آگ میں کود پڑے اور سکینہ کو چھوڑ دے۔ اور سکینہ سے یہہ کہا کہ مجھے تم پسند ہو اور اُسے یقین دلایا کہ رابعہ بھی یہی چاہتی ہے کہ اُس کی شادی میرے ساتھ نہ ہو بلکہ تمہارے ساتھ ہو۔ بھولی بھالی لڑکیوں کا مردوں کے فریب میں آجانا کون سی بڑی بات ہے۔ ایک خاندان کے لوگ

اکثر یہہ حرکت کر بیٹھتے ہیں عورتوں کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے ۔ نوشاہ کی پشیمانی کی کوئی حد نہ تھی ۔ مگر اب پشیمانی عبث تھی ۔ اس ناکامی نے اسکا دماغ خراب کر دیا جو کچھ پڑھا لکھا تھا سب بھول گیا ۔ صرف ایک بات یاد رہ گئی "کسے کردکہ نیافت" اکثر عالم وحشت میں یہہ جب سکینہ اور رابعہ کی قبروں پر پہونچ جاتا تھا تو یہہ صدائیں سنتا تھا ؎

ستم دیکھتے ہیں مرے بعد دشمن
برا چاہنا بھی برا ہے کسی کا ✤
(ظہیر دہلوی)

غزل

(از جناب سید الشعرا سید حسن صاحب سید ظہیری ناظم بزم ادب بھوپال)

دل اُس کا کبھی مجھ سے مکدر نہ ہوا تھا ✤ پھر بھی وہ ستم ہے کہ کسی پر نہ ہوا تھا ✤ جیسی کہ دلِ خوں شدہ پر آئی تباہی اس طرح تو برباد کوئی گھر نہ ہوا تھا ✤ کیوں کھینچ لیا ناوکِ دل دوز جگر کرہ یہہ غنچہ ابھی کھل کے گلِ تر نہ ہوا تھا اللہ رے مرے اشکِ مسلسل کی روانی ✤ اس جوش سے غلطاں کبھی گوہر نہ ہوا تھا ✤ ہر فیض سے مطلب یہی جو ہر قسمت دریا تھا وہ ہر قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا ✤ فرہاد نے اک شاخ محبت میں لگا دی ✤ رسوا کوئی یوں تیشہ سے مر کر نہ ہوا تھا وہ جتنے پشیماں ہیں ستم کر کے عدو پہ ہو ✤ اتنا تو اثر اُس کے بھی دل پر نہ ہوا تھا ✤ نکلا ہے ترے سامنے کب چاند گہن سے کب گھٹ کے وہ ماحسن کے برابر نہ ہوا تھا ✤ میساں کی خطا کیا جو نہ ہو ہمت عالی ✤ گوہر وہی قطرہ تھا جو گوہر نہ ہوا تھا پامال کیا جنبشِ رفتار نے اُس کو ✤ جو فتنہ ترے قد کے برابر نہ ہوا تھا ✤ اسواسطے کہنے سے رقیبوں کے ستایا کہنے سے کبھی میں ترے باہر نہ ہوا تھا ✤ محدود خنا تک تھا نہ تنے کا بہانا ✤ آئینہ کبھی سد سکندر نہ ہوا تھا ناراض ہوے تھے مگر اتنے نہ ہوئے تھے ✤ ایسا تو کلیجہ کبھی پتھر نہ ہوا تھا

ہو ظلم نئی بات تو دُہرایئے سید
تمیز نہ ہوا تھا کہ عدو پہ نہ ہوا تھا

سودا کی

مرزا رفیع سودا کی غزل گوئی

(از جناب مرزا محمد بشیر)

چمنِ اُردو کی دوسری بہار عجیب قیامت کی بہار تھی۔ دستِ قدرت نے دامنِ بہار میں وہ پھول چُن چُن کے جمع کئے تھے کہ جن کی رعنائیوں پر ایک عالم مرحبا کہتا تھا۔ اُن دل فریب پھولوں میں ایک پھول جس کا نام اب ہم لیتے ہیں مرزا محمد رفیع سودا تھے۔ بقول میر حسن "اوستاد اوستادان کامل و قادر سرآمد زمان"۔ میر تقی میر سلمہ جن کے طغیانِ ناز نے ایک ستم ڈھایا ہے۔ ان کو پورا شاعر مانتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر + کیا کیا کہا کرے ہیں زبانِ قلم سے ہم

میر و مرزا رفیع و خواجہ میر + کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

ناسخ کا قول ہے ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب + ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

خواجہ آتش بھی ان کے کلام پر سر دُھنتے ہیں ؎

پہروں ہی مصرعۂ سودا ہے رُلاتا آتش + تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا

زمانہ جانتا ہے کہ مرزا رفیع مختلف اصنافِ سخن کے تاج دار ہیں۔ لیکن ہم کو آج جس صنفِ سخن سے سروکار ہے وہ غزل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرزائے مذکور کا غزل میں وہی مرتبہ ہے جو قصیدہ میں ہے۔ ایک حق شناس کا قول ہے "بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل حرفیست مہمل بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل"[1]۔

لیکن صد افسوس زمانہ نے ان کی غزل کو اس نظر سے نہ دیکھا جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ خود رونا رو گئے ہیں ؎

[1] از گلشنِ بیخار

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب + اُن کی خدمت میں لئے میں یہہ غزل جاؤنگا

مشہور ہے کہ سودا کی غزلوں میں سوز نہیں۔ وہ "واہ" ہیں "آہ" نہیں۔ یوں کہنے کو دُنیا جو چاہے کہے لیکن ان کے کلام پر اگر ایک نظرِ انصاف ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں سوز بھی ہے درد بھی ہے۔ آہ بھی ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

سودا کو شمع بزم جو کہتے تو تھا بجا + ہے اشک آہ سوختن اس کی سرشت میں

مُصنّف کاشف الحقایق نے بالکل درست لکھا ہے۔" ان کا کلام درد۔ سوز و گداز خستگی سے خالی نہیں ہے۔ اور یہہ وہ صنعتیں ہیں جو غزل سرائی کی جان ہیں۔"

ہم اس مضمون میں میر و مرزا کے کلام کا مقابلہ نہیں پیش کریں گے۔ بلکہ مرزا کے کلام سے بحث کریں گے۔

حُسن و عشق اُردو شاعری کے دوسرے دَور کی امتیازی شان یہہ تھی کہ حُسن و عشق کے واقعات نہایت سادگی سے بیان ہوتے حُسن کی دلفریبیاں عشق کی کرشمہ سازیاں میٹھے میٹھے الفاظ میں ادا کرتے۔ سودا کی غزل دیکھئے تو ہر جگہہ آتشِ عشق کے شعلے حُسن کی گرم بازاریاں عاشقوں کی حُسن پرستیاں محبوبوں کی بے نیازیاں نمایاں ہیں۔ مرزا کے کلام پر یہہ تہمت ہے کہ ان کے بیان سادگی ہیں۔ ہمنے مانا کہ وہ میر کی سی بات نہیں لیکن ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا تو بقول محمد حسین آزاد۔" سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ"۔ یہہ ان کی "اپنی ترنگ" ان کو میر اور خواجہ میر سب سے جُدا کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نہ پڑھیو یہہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے + وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

حُسن و عشق کی باتیں اپنے طرز میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ عشق کا مرتبہ ان کی نظر میں نہایت بلند ہے ؎

کمال بندگیٔ عشق ہے خداوندی + کہ ایک زن نے مہِ مصر سا غلام لیا

مرزا جس حُسن پہ شیدا ہیں اس کو کوئی بازارِ مصر میں بھی نہیں خرید سکتا ہے

دکھلایئے لیجاکے تجھے مصر کا بازار + لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

اور یہی وہ حُسن ہے جو زاہد پارسا کی پارسائی توڑ سکتا ہے

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو + خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

چشمِ یار کا عالم ہر شاعر دکھلاتا ہے لیکن سودا کے یہاں کے بیان کچھ اور طرز سے ہیں

جادو بھرے ہیں چشم میں مت آئینہ کو دیکھ + دھڑکے ہے دل مرا کہ نہ پلٹے نظر کہیں

پھر تیرِ نظر کا یہہ عالم ہے

ممکن نہ تیر خوردہ تڑپ کر سنبھل سکے + مارا تری نگہ کا جگہہ سے نہ ہل سکے

سودا صرف معشوق کے خط و خال اور عاشق کی آہ و بکا ہی نہیں دکھلاتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جذباتِ انسانی کی ترجمانی بھی کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہہ دکھلاتے ہیں کہ وہ انسان جو محبت سے ناآشنا ہیں کیا جانیں کہ آتشِ عشق کیا بلا ہوتی ہے

کس سے بیان کیجیئے حالِ دلِ تباہ کا + سمجھے اسے وہی جو ہو زخمی تری نگاہ کا

مرزا مظہر جان جاناں کا مشہور شعر ہے

آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو + مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

میر صاحب فرماتے ہیں

کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارہ ہے + یہی دل جو لیکے گریں گے ہم تو لگے گی آگ مزار میں

سودا آپ اپنی ترنگ میں کہتے ہیں

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا + کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

پھر فرماتے ہیں کہ

کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی + یک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہے

ابن حسن محبت کرنے والے کو قتل کا سزاوار ٹھیراتے ہیں۔ کہتے ہیں

جو کوئی پوچھے کیا کس جرم پر سودا قتل + کہہ کسی کو گر کوئی چاہے یہ کم تقصیر ہے
سودا کو جرم عشق پہ کرتے ہیں آج قتل + پہچانتا ہے تو یہ گنہگار کون ہے
بجرم نیم نگہ تھا نہ قتل سودا فرض + اجل کے واسطے یہ اس کے اک بہانا تھا

معشوق کی پشیمانی کسی عاشق کو گوارہ نہیں ہو سکتی۔ مرزا نے نہایت خوبی سے یہ مطلب ذیل کے دو شعروں میں ادا کیا ہے وہ یہ ہیں۔ ہاں میر کا یہ قول کہ "ہر مصرع برجستہ اش راسر وازاد بندہ" ان شعروں پر صادق آتا ہے ؎

جو گزری ہم پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا + بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر + مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

تصوف

حق تو یہ ہے کہ یہ چیز خواجہ میر کی ہے لیکن سودا جہاں اس کو اپنی ترنگ میں چھیڑتے ہیں دل لے لیتے ہیں۔ محبوب حقیقی کے جلوے ان کو ہر شئے میں نظر آتے ہیں ؎

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا + موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا

حسن مطلق کے پرستار۔ ہمہ اوست کے دم بھرنے والے کو حرم و دیر سے کیا غرض ؎

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب + تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

وہ آتش میں سنگ رہا ہے۔ سر میں سرمدی عشق ہے۔ نالہ منصور لب پر ہے دار رس نظر میں ہے ؎

آتش ہے تری گرمیٔ بازار محبت + سر بیچتے پھرتے ہیں خریدار محبت

سلوک کے متعدد مقامات ہیں مثلاً فکر۔ حیرت۔ فنا وغیرہ۔ شیخ کو صلاح دیتے ہیں کہ سالک کو فنائی تعلیم سے پیشتر اس کا دل دُنیا سے متنفر کرے ؎

خانہ پرورِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم + اتنی رخصت دے کہ ہولیں گُل سے ٹک آزاد ہم

خُمریات سودا اسی میخانہ کے رندِ شرابی ہیں جہاں میرؔ اور خواجہ میرؔ خُم کے خُم چڑھا جاتے ہیں۔ لیکن وہ شراب کیسی ہوتی ہے۔ اس کا جواب مرزا بیدلؔ سے سُنئے ؎

بخیالِ چشم کہ می زند قدحِ جنوں دلِ تنگ ما + کہ ہزار میکدہ می دَوَد بکابِ گردشِ رنگ ما

مرزا کی نظر میں درِ مغاں کی بڑی عزت ہے ؎

اسرارِ خرابات سے واقف جو ہو زاہد + کعبہ سے نہ کم سمجھے درِ پیرِ مغاں کو

پھر رندانہ محفل میں جہاں جمع ہوں ع شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود۔

مرزا جو کچھ کہتے ہیں مستی سے خالی نہیں بقول شیفتہ "ذوق کلامش ہم اثر شراب است"۔ فرماتے ہیں ؎

گردش سے اس نگاہ کی اے محتسب خبر + دُنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

چمن میں صبا کی بدشرابیاں ہیں اور اُسی سے خطاب ہوتا ہے۔ اس تخاطب نے لطف پیدا کیا ہے ؎ کس کی ہیں یہ چمن میں صبا بدشرابیاں + ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں۔

اس "رندِ خراب حال" کو قبائے بادشاہی اور تاجِ خسروی کی حاجت نہیں ؎

طلب میں سلطنت جم کی صبح و شام کرتا ہوں + درِ میخانہ پہ جا کر سوالِ جام کرتا ہوں

اور آرزو ہے تو یہ ؎

بہارِ باغ ہو مینا ہو جامِ صہبا ہو + ہوائے ابر ہو ساقی ہو اور دُنیا ہو

ساقی گئی بہار رہی دل میں آرزو + تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں نہیں

بہار چند دن کی ہوتی ہے ساقی کو دیر نہ کرنا چاہئے۔ یہاں جو ندرت بیان سوداؔ نے اختیار کیا ہے وہ معنی میں اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ مصنف "گلشن ہند" لکھتے ہیں " سچ تو یہ ہے کہ مرزا نے

مذکور سرحلقہ سخنوراں اور سرامد معنی گستراں تھے"۔ شعر۔

ساقی ہے اک تبسّمِ گُل فرصتِ بہار ✦ ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

غم واندوہ اس میں شک نہیں کہ "ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا"۔ لیکن جس وقت غم واندوہ کی دُھواں دھار گھٹائیں اوٹھتیں اور ان کے دل پر جھوم جھوم کے برستیں وہ اُس وقت سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے شعر کہتے اور یہی شعر بقول "شبلی" ہمارے دل نیز پر شعر ہوتے ہیں۔ افسردگی کا عالم ہے کہتے ہیں سه

نے بلبلِ چمن نہ گُلِ نو دمیدہ ہوں ✦ میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

بادِ بہاری کی اٹھکھیلیاں بُری لگتی ہیں سه

چھیڑ مت بادِ بہاری کہیں جوں نکہتِ گل ✦ پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

پھر نسیم سے اُلجھ پڑتے ہیں سه

کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحنِ چمن سے ✦ دو برگ لئے گُل کے نسیمِ سحر آوے

نسیم بھی ہے چمن میں اور اب صبا بھی ہے ✦ ہماری خاک سے پوچھو تو کچھ رہا بھی ہے

نسیم کے جھونکے ان کے چمن کو سرسبز نہیں کر سکتے سه

اپنے چمن کو فائدہ کیا تجھ سے اے نسیم ✦ یہہ جا ہے وہ کہ یاں دم عیسیٰ سموم ہے

موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے ✦ دل خاک ہوگیا ہے کسی بے قرار کا

عجیب پریشانی میں گرفتار ہیں۔ کبھی صیاد سے التجا کرتے ہیں کبھی "شکستہ بالی" کا شکریہ ادا کرتے ہیں سه

صیاد اب تو کیجیے قفس سے ہمیں رہا ✦ ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس چلے

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے ✦ کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

اس قدر غم زدہ ہوتے ہیں کہ اشک باری ہونے لگتی ہے سه

اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا ✦ تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا

دیندار

بے ثباتیِ دنیا

دنیا کے عروج و زوال کی تصویر پیش کرتے ہیں ے

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبحِ چمن تیرا ✤ اُدھر گُل لے گئے گلچیں گئی روتی اِدھر شبنم

زمانہ کا بگڑ لیا کیا ہے ے

اِک وقت اِک زمانہ جہاں میں لُٹائے گُل ✤ سر کو ہمارے خاک نہ دی وسے چہ جائے گُل

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ✤ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

حسرت سے کہتے ہیں ے

سوداؔ جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا ✤ جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے

بے ثباتیِ دنیا کا نقشہ نہایت موثر پیرایہ میں کھینچتے ہیں ے

اے گُل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم ✤ پائے نہ بوئے وفا کی ترے پیرہن میں ہم

دنیا سے اِس قدر برگشتہ ہیں ے

خندۂ گُل بے نمک فریادِ بُلبُل بے اثر ✤ اس چمن سے کہہ تو جا کر کیا کریں گے یاد ہم

دنیا میں ہاں دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں ے

دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پُر آب ✤ دیکھ سوداؔ گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

ہم دنیا پہ کیوں جان دیتے ہیں اس کا سبب بیان کرتے ہیں ے

اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں ✤ اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو۔

اُن لوگوں پر افسوس کرتے ہیں جو زندگی سے لو لگائے ہیں ے

کسی کے مرگ پر سوداؔ نہ کیجے چشم تر ہرگز ✤ بہت سا روئے اُن پر جو اِس جینے پہ مرتے ہیں

دُنیا کو وہ اِک قفس سمجھتے ہیں لیکن آہ و بُکا اُن کا شیوہ نہیں ے

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے ✤ اے ہمصفیر فائدہ ناحق کے شور کا

رہا کرنے کو لیں ہم منتِ صیادِ ظالم ✤ بس اتنا ہی نہ مر رہیں گا زیرِ دام کیا ہوگا

دُنیا سے رہائی پانا کچھ بڑی بات نہیں۔ ناسخؔ ے ۔

ترکِ دنیا میں سوچ کیا ناسخ ✤ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

میر انیس فرماتے ہیں ع دنیا کو چھوڑ کون بڑی کائنات ہے ۔ سودا نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں ؎

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ ✤ دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

تخیل

تخیل بقول مولینا حالی مرحوم "ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دل کش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسیقدر الگ ہوتا ہے"۔ مرزا کی بلند پروازی کی دھوم زمانہ میں ہے ان کا مشہور شعر ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ✤ تڑپے ہے مُرغ قبلہ نما آشیانہ میں

رنگِ گُل بے طرح دہکے ہے سُن اے ابرِ بہار ✤ آشیاں میرا چھڑک لگتی ہے اب گلشن کو آگ

یہاں جو باتیں شاعر کے ذہن میں پیشتر سے موجود ہیں وہ یہہ ہیں :-

(۱) بہار میں گلاب کے پھولوں کا کھلنا ۔(۲) اس کو معلوم ہے کہ رنگِ گُل کو آتش سے تشبیہ دیتے ہیں (۳) وہ جانتا ہے کہ اگر کسی چیز کو پانی سے تر کر دیا جاے تو اس پر آگ کے شعلے اثر نہیں کر سکتے ۔ ان مشاہدات و تجرباتِ کو شاعر کی تخیل نے اس طرح سے ترتیب دیا کہ ہمارے سامنے جوشِ بہار میں آتشِ گُل کی تصویر کھینچ گئی ۔

محاکات

بقول مولانا شبلی مرحوم "شاعری دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل"۔ محاکات کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز یا حالت کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے ۔ مصور جب کسی حالت کو تصویر میں دکھاتا ہے تو رنگوں سے کام لیتا ہے ۔ لیکن شاعر بقول لارڈ میکالے اسی کام کو لفظوں سے انجام دیتا ہے ۔ سودا کے یہاں محاکات کی بہت سی مثالیں ہیں لیکن صرف یہاں ایک مثال پیش کی جاتی ہے ؎

کیونکہ چمن

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ + ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تشبیہ و استعارہ

آزادؔ لکھتے ہیں کہ "تشبیہ اور استعارے ان کے یہاں ہیں مگر اسقدر جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ"۔ لیکن جہاں تشبیہ سے کام لیتے ہیں وہاں ستم ڈھاتے ہیں۔ ساون کے بادلوں سے آنکھوں کو تشبیہ دی ہے ظاہر ہے کہ ساون کے بادل پانی سے بھرے ہوتے ہیں اور جب برس پڑے جنگل کے جنگل ہرے کر دیئے ؎

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے + یہ نین وہ ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

استعارے خال خال استعمال کرتے ہیں مثلاً موجِ نسیم ع "موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے۔ تبسمِ گل ع ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصتِ بہار۔

معنوی خوبیاں

سوداؔ نہایت لطافت اور متانت سے بات کہتے ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں "در عرصۂ لطافت و قدرت و متانت سخن بازوئے فطرت او چوں تیر راست انداز است" مثلاً ؎

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہ پیام + کچھ تو اے خانہ خراب اس دل کے بہلانے کی طرح

کہتے تھے اس لئے کہ نہ ہو آشنائے گل + اے عندلیب دیکھی نہ آخر وفائے گل

کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے + ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے

ان کے سیکڑوں شعر اصلیت سادگی اور جوش سے بھرے ہیں۔ ان میں "آہ" ہے اور قیامت کی آہ ہے ؎

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے + پھر پھر گل آ چکے یہ صنم تم بھلے گئے۔

خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جوش لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے اور یہ مشاعر ہے بقول جان اسٹوارٹ مل "خیالات و الفاظ جن میں جوش خود بخود سما جائے" ؎

ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک + کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روز ہجر کو + پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

ان کے شعروں میں تڑپ ہوتی ہے ؎

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے + ٹپکا تری آنکھوں سے کبھی لخت جگر بھی

سودا کی یہ خصوصیت ہے کہ مضمون نہایت صاف اور شستہ پیرایہ میں ادا کرتے ہیں جس سے لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ شیفتہ کہتے ہیں "حلاوت کلامش چاشنی نوش لب شکریں شاہدان شیریں شمائل میدارد" ؎

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں + دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

ظالم میں کہہ رہا تھا کہ اس خوں سے در گزر + سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

جن نے پوچھا کہ دل خوش ہے کہیں دنیا میں + رو دیا اس نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں۔

لفظی خوبیاں

مصنف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں "مرزا زبردست الفاظ کے مایہ دار ہیں جن کی مدد سے وہ مبتذل اور بیش پا مضامین کو بھی رنگینی الفاظ سے مرصع بنا دیتے ہیں" مضمون کیسا ہی پست ہو وہ ایسے الفاظ اس کے لئے انتخاب کرتے ہیں جو اس کو بلند کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مٹ گئے وہ شور دل کے ہائے جب گئی بہار + ورنہ کیا کیا ہم بھی کرتے اس دل ویراں میں دھوم

الفاظ کی سادگی قابل تحسین ہوتی ہے ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر + اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

دوسری جگہہ فرماتے ہیں ؎

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات + آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

تعقید لفظی اور ابہام سے گریزاں رہتے جو بات کہتے صاف صاف کہتے ؎

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ + کیا جانیئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

جس شان کا مضمون ہوتا... اسی شان کے الفاظ استعمال کرتے۔ مثلاً مرزا ے

نازک مزاج سوتے ہوں اور شور قیامت ان کے سر پہ بپا ہو۔ یہ کب گوارا ہو سکتا تھا۔ دیکھیا مضمون اور الفاظ دونوں میں کیسا برابر کا زور ہے ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت ✤ خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اپنی نازک مزاجی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر ✤ لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

اور بعض وقت الفاظ میں ظرافت کا لگاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

میں دشمن جاں ڈھونڈھ کر اپنا جو نکالا ✤ سو حضرت دل سلمہ اللہ تعالےٰ

الفاظ میں موسیقیت ہوتی ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے ؎

نہ لطف نہ مروت نہ محبت نہ وفا ✤ سادگی دیکھ کہ اس پہ بھی لگا جاتا ہوں

محاورات

سودا کے یہاں نزاکت مضمون اور ندرت الفاظ کے ساتھ محاورات کی برجستگی قابل دید ہے۔ انہوں نے جہاں جو محاورہ رکھ دیا وہ نگینہ کی طرح جڑ ہوا ہے۔ مثلاً محاورہ ہے "کوئی دن کا مہمان" کوئی شخص بہت بیمار ہو تو کہتے ہیں کہ "فلاں شخص کوئی دن کا مہمان ہے" یا کوئی پھل یا ترکاری آخری فصل کا ہو تو اسکو بھی "کوئی دن کا مہمان" کہتے ہیں یا کوئی موسم اخیر ہوتا ہے تو اس کو بھی "کوئی دن کا مہمان" کہہ دیتے ہیں اور بھی کئی موقعہ پہ بولا جاتا ہے ؎

فصل گل جاتی ہے سودا دیکھ لے نرگس کو تک ✤ باغ میں مہماں کوئی دن ہے یہ بہار چمن

محاورہ ہے "دستور ہونا" مثلاً "ان کا تو یہ دستور ہو گیا" ؎

رونا اب اپنی چشم کا دستور ہو گیا ✤ دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

بہت سے فارسی محاورات انہوں نے استعمال کئے اور مستعمل ہو گئے ہندی محاورات بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً "سدھ ہونا"[1] ؎

کس قدر آب کے ہوا مست ہے دیوانہ کی ✤ کسی لڑکے کو نہیں سدھ کسی دیوانہ کی

قوت انتقال ذہنی

اس قوت کی کرشمہ سازیاں ان کے کلام میں بہت نظر آتی

[1] "سدھ" بمعنی اچھا۔ عمدہ۔ کثرت استعمال سے "سدھ" بولا جانے لگا۔ میرحسن نے بھی اپنی مثنوی میں باندھا ہے ع نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ گل کی لی۔ سدھ کو [illegible]

ہیں۔ سودا ایک چھوٹے سے چھوٹے لفظ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ شعر کا سارا مفہوم اس سے دماغ میں آجاتا ہے ؎

جو گل چاہیے کیجے مجھے دکھ دینے کا ✤ وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

یہاں لفظ "وہ" سے ظلم جور بے وفائی کج ادائی۔ غرض جتنے ستم معشوق کر سکتا ہے ہماری سمجھ میں آتے ہیں ؎

حاضر ہے تیرے سامنے سودا گر اس کو قتل ✤ مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا

"یک نگاہ" سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ مجرم ہوں ایک نگاہ بھر کے دیکھنے کا یا مری رہائی اور میرا قتل تیری ایک نگاہ پر منحصر ہے۔ چاہے رہا کر دے چاہے قتل۔ یہاں خوبی یہ ہے کہ جو مراد بھی ہم "یک نگاہ" سے لیں یہ دو لفظ سارے شعر کا مفہوم ہم پر عیاں کر دیتے ہیں۔ سودا کے مشہور شعر میں "چلائیں" میں (ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلائیں) یہی قوت کام کر رہی ہے۔

حُسن ادا

میر صاحب نے بہت درست فرمایا ہے "ہر شعرش طرف لطف رُستہ رُستہ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ"۔ معمولی سے معمولی مضمون کو انہوں نے لیا اور اس شگفتہ اور سلیس طرز سے ادا کیا کہ اس میں چار چاند لگ گئے۔ شیفتہ نے خوب کہا ہے ؎

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ ✤ معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

مثلاً سودا کہتے ہیں۔ پائمال مضمون ہے لیکن دیکھنا شعر حُسن ادا کا مُرقّع ہے ؎

غنچہ سے مسکرا کے اسے زار کر چلے ✤ نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے۔

دوست کی بے وفائی کا رونا ہر ایک شاعر رویا ہے لیکن سودا اچھے اور ہی انداز سے یہ مضمون ادا کرتے ہیں۔ سودا کے متعلق "آب حیات" میں آیا ہے کہ "کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی"۔ اس کی مثال یہ ہے شعر ؎

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا ✤ لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

ایک اور شعر ہے ؎

نوٹ:۔ سلہ خود فرماتے ہیں سلہ میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو ✤ اللہ رے اللہ رے کیا زور بیاں ہے (ایڈیٹر)

فانی دو

خاک پر بھی تیرے دیوانہ کی یہ تدبیر ہے + ہر بگولہ طوق ہر موجِ ہوا زنجیر ہے ؎

بڑے سے بڑے مضمون کو چند الفاظ میں ادا کرتے ہیں اور خوبیٔ بیان ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ؎

فکرِ معاش عشقِ بتاں۔ یادِ رفتگاں + اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

سودا کے بیان میں ایک جدت ہوتی ہے جو شعر میں روح ڈال دیتی ہے ؎

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ + کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

بیکس کوئی مرے تو جلے اسپہ دل مرا + گویا یہ ہے چراغ غریبوں کی گور کا

ایک معمولی سی بات اس ادا سے کہتے ہیں کہ شعر حسنِ ادا کی تصویر بن جاتا ہے ؎

آہ و فغاں کی آج جو آتی نہیں صدا + شاید ترا جہان سے بیمار اُٹھ گیا

اس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو + قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو

موت نے عہد میں تیرے ہی تقدیر سے یہ پیغام کیا + ناز و تغافل دیکھا اسکو مجھکو کیوں بدنام کیا

مرزا کی ہمہ گیر طبیعت جس طرح کسی ایک صنفِ سخن کی ہو کے نہ رہ سکی اسیطرح غزل میں کسی ایک صفت کے تابع نہ رہے۔ ان کی غزل میں کہیں سادگی ہے تو قیامت کی اور کہیں شکوہِ الفاظ اور بلندیٔ مضامین۔ دیکھئے تو ایک عجیب شان ٹپک رہی ہے۔ مثلاً ؎ وہی جہاں میں رموزِ سکندری جانے + بھبھوت یہ جو ملبوسِ قیصری جانے۔ غرض مرزا کو واہ۔ سمجھ لینا اور دوسروں کے کہنے سے مرعوب ہو کر ان کی غزلوں سے ان خوبیوں کو خارج سمجھنا جو غزل سرائی کی جان ہیں سراسر ستم ہے۔ وہ واہ۔ بھی تھے اور آہ۔ بھی۔ سچ پوچھئے تو مرزا ایک بہتے دریا تھے جو کبھی تو آہستہ آہستہ نہایت سکوت اور خاموشی سے بہتا اور کبھی زوروں پر آجاتا تو اس کی موجیں اور اس کی طغیانی الامان والحفیظ۔ سودا ایک بے مثل غزل گو شاعر تھے بقول میر "سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است" ان کی غزلوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ہمارے غزل گو شعرا میں فرداً فرداً پائی جاتی ہیں۔ یہاں چند خوبیاں پیش کی گئیں +

ع سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ؏

(مرزا محمد بشیر)

تاریخی سوال کا جواب

قلعہ چتوڑ کی سنگینی جس طرح ضرب المثل ہے کہ ع گڈھ تو چتوڑ گڈھ اور سب گڈھیاں ہیں اسی طرح یہاں کے راجے بھی اپنی شرافت شجاعت کے سبب شہرۂ آفاق ہیں۔ راجپوتوں کو جو اس پر فخر ہے وہ بجا ہے۔ درحقیقت یہاں کے راجے ایسے ہی تھے کہ اُن کی آن بان میں کبھی فرق نہ آیا ہر عہد میں اُن کی نوک جھونک کا انداز وہی رہا جو قدیم سے تھا۔ اور کبھی انہوں نے بیجا جبر و تشدد قبول نہ کیا۔

اکثر لوگ مغل بادشاہوں پر الزام رکھتے ہیں کہ اُنہوں نے اِن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا یہہ محض اِفترا ہے۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ ہی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ان کی وعزت کی جو ان کے شایانِ شان تھی۔ خودسری کرنے پر بھی اُنہوں نے طرح دی اور کمال درگزر سے پیش آتے اور جب اُن کے سامنے اظہارِ اطاعت کیا گیا تو اُنہوں نے پہلے سے زیادہ نوازش فرمائی اور ہر طرح کا خیال رکھا آج بھی اگر مقابلہ کیا جائے تو مغلوں کے سوا کسی بادشاہ کے دور میں اس کی نظیر کم نکلے گی ؁

اَب رہا یہہ امر کہ شجاعت کا دعوےٰ جیسا اُنہیں تھا ویسا مغلوں کو بھی تھا اور یہہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو نہیں سمجھتا اس لئے دونوں کا یہ دعوےٰ اپنے اپنے خیال کے مطابق درست تھا۔ اور یہہ امر مسلمہ ہے کہ دونوں نے میدانِ کارزار میں ایک دوسرے کی شجاعت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہی کہ بہادر بہادر کی عزت کرتا تھا اور جب وہ خودسری کرتے تھے تو مغل بادشاہ اُنہیں معاف کر دیا کرتے تھے ؁

ہم اِس مضمون کو خلجیوں کے عہد سے شروع کرتے ہیں اور اُن تمام واقعات کو یکجا کیے دیتے ہیں جو فرداً فرداً ہر بادشاہ کے زمانہ میں پیش آئے ہیں اس سے یہہ فائدہ ہو گا کہ گہلوٹ خاندان کے مجموعی حالات بھی روشنی میں آجائیں گے اور فاتحینِ قلعہ کے کارنامے بھی ناظرین کے ملاحظہ سے

گزر جائیں گے۔ اور اس سوال کا بھی حل ہو جائے گا جو صلائے عام کے اپریل نمبر میں جناب آغا دہلوی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

اوّل اس مہم پر سلطان علاء الدین نے اُلغ خان ملک نصرت کو مامور کیا تھا۔ لیکن اُن سے قلعہ رنتھنبور Ranthanbore ہی سر نہ ہو سکا اور ایک طویل محاصرے کے بعد جب وہ وہاں سے ناکام پھرے تو خود سلطان نے مالوہ کا رُخ کیا۔

سب سے پہلے اس نے رنتھنبور اس کے بعد قلعہ چتوڑ چند حملوں میں فتح کر لیا اور یہاں کا راجہ بھی گرفتار ہو گیا تو سلطان نے بہ الزام سرکشی راجہ کو معزول کیا اور اس کا ملک راجہ مالدیو کو دے دیا۔ لیکن اگلی پشت میں گہلوٹ[1] خاندان پھر اُبھرا اور اپنے ملک پر قابض ہو گیا ۱۹ء۱۳ھ میں جو راجہ اس خاندان کا گدی پر بیٹھا اس کا نام کم بھکا Kambhka تھا اور اس کا عہد ایک کامیاب عہد تھا۔ سنگرام سنگھ جو تاریخ میں راجہ سانگا Sanga کے نام سے مشہور ہے وہ راجہ کمبھکا کی تیسری پشت میں تھا وہ بابر کا ہم عصر تھا۔ اگر اس کے حسب و نسب پر اور گہری نظر ڈالی جائے گی تو غالباً یہ ایرانی نکلے گا۔ تاریخ راجستان کا مشہور مصنف کرنل ٹاڈ Col Tod اس کا بڑا مداح ہے اور اس طرح گل فشاں ہے کہ اس سورما کے جسم پر شرافت و شجاعت کی انتہا ٹھہریں تھیں گو مختلف حربوں کے اس کے بدن پر اتنی نشان تھے۔ اس میں شک نہیں کہ راجہ سانگا ایسا ہی دلیر تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن بڑھاپے میں بھی جوانوں کا دم خم اس میں موجود تھا اور ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہتا تھا۔ اور یہ وہی راجہ سانگا تھا کہ بابر کو اس نے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اچانک ۹۳۳ھ ۱۵۲۶ء میں ایک بڑی سی فوج لیکر آگرہ کے قریب آ دبایا۔ بابر اس وقت سخت پریشان تھا ناموافق آب و ہوا نے اس کی فوج کو بے دل کر رکھا تھا اور آگرہ کی گرمی نے آسے اور بھی جھلس ڈالا تھا۔ اکثر لوگ وطن جانے پر اڑے ہوئے تھے اور بابر کے منائے نہ منتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بابر کی پریشانی بجا تھی۔ اور گو دشمن سخت تھا لیکن اُس کے مقابلہ سے مُنہ پھیر کر جانا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ الغرض بحکمت عملی بابر نے فوج

[1] تاریخ ہند حصہ دوم باب ۴ صفحہ ۱۲۸ تا ۱۰۰۔ مولفہ سید ہاشمی مطبوعہ جامعہ عثمانیہ۔ [2] تاریخ ہند باب ۶ صفحہ ۱۶۰۔
[3] تاریخ ہند حصہ دوم باب ۶ صفحہ ۱۵۸ تا ۱۹۰۔ مولفہ سید ہاشمی صاحب۔ مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔

کو راضی کیا اور غیرت دلائی کہ مغلوں کا نام ڈبوئے دیتے ہو۔ پھر تو فوج میں ہل چل مچ گئی اور اتنا جوش بڑھا کہ مغلوں نے قسم کھائی کہ یا تو ماریں گے یا مر جائیں گے مگر دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں گے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کُن جنگ سیکری کے میدان میں ٹھنی اور ایسی ٹھنی کہ راجپوتوں نے بہادری دکھانے میں کمی نہ کی مگر بابر نے بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور اپنی قلیل فوج سے دشمن پر ایسا ٹوٹ کے گرا کہ چھکے چھڑا دئے۔ راجپوتوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اتنے مقتول میدان میں چھوڑے کہ اُن کی کھوپڑیوں سے ایک کلہ منار بطور سُنت چنگیزیہ مغلوں نے بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس شکست کے بعد چند مہینے بھی راجہ سانگا نہ جیا اور راہی مُلکِ عدم ہوا۔ یہہ خبر بابر کو اُس وقت پہونچی کہ وہ اپنے مشیروں سے ایک خاص مشورہ کر رہا تھا۔ اس خبر نے بابر کو بے فکر کر دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس بہادر دشمن کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد قنوج سے واپسی میں جب بابر نے آگرے اور گوالیار کی طرف مراجعت کی تو یہاں اُکی محنت و جانفشانی کا اُسے یہ صلہ ملا کہ راجہ سانگا کے وارث[1] نے اطاعت قبول کی اور اس کا مزید ثبوت یہ دیا کہ اس نے قلعہ رنتھنبور کی کُنجیاں بھی بابر کے حوالے کر دیں۔ اور اب بابر کو قلعہ چتوڑ کے سر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

بابر کے بعد ہمایوں کا زمانہ بہت پُر آشوب گزرا اور خاندانِ سُور نے وہ انقلاب برپا کیا کہ ہمایوں کو مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

لیکن اس کے اقبال مند بیٹے اکبر نے اس مثل کو پورا کر دکھایا کہ ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ تخت نشینی اور عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اکبر نے ۹۷۵ھ (۱۵۶۸ء) میں جب چتوڑ[2] پر چڑھائی کی تو اس وقت راجا سانگا کا بیٹا اُودے سنگھ اودے پور میواڑ کا راجہ تھا جو اکبری اقبال کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اور پہاڑوں میں جا چھپا۔ قلعہ جے مل کو سونپ گیا جو اُس کا ایک قریبی رشتہ دار تھا۔ جے مل کی ماتحتی میں آٹھ ہزار منچلے راجپوت تھے۔ وہ یہہ خود بھی منچلا اور ہوشیار سردار تھا۔ اس نے قلعہ کی محافظت کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ بادشاہی فوج قلعہ کا محاصرہ کئے پڑی تھی تسخیرِ قلعہ کی تدبیریں کی جاری

[1] تاریخ ہند حصہ دوم باب ۶۔ صفحہ ۱۶۱ ۔ [2] تاریخ ہند حصہ دوم باب نہم۔ صفحہ ۱۸۶

تھیں اور اکبر بھی وہیں کہیں دیوار سے لگا بیٹھا تھا کہ ناگاہ ایک رات قلعہ کی فصیل پر اکبر کو جے مل نظر آیا جو مشعل کی روشنی میں قلعہ کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا۔ اکبر نے وقت کو غنیمت سمجھا اور تاک کر ایسا نشانہ لگایا کہ گولی ٹھیک جے مل کی پیشانی پر لگی اور جے مل اُنہیں قدموں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس حادثہ نے راجپوتوں کے دل توڑ دئے اور ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ مغل فوج کو اب روکنے والا کون تھا بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہو گئی اور راجپوتوں کو گھیر گھیر کر قتل کر ڈالا۔ غالباً قدرت نے یہ اُس ظلم کا بدلہ دیا کہ جے مل کے مرنے کے بعد ان ظالموں نے بلا وجہ اپنی عورتوں اور بچوں کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا۔

اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ عہد جہاں گیر میں شہزادہ خُرّم کے ہاتھ سے قلعہ چتوڑ کی مہم سر ہو اور رانا کا بڑا بیٹا کرن اس ذریعہ سے دربار شاہی میں داخل ہو کر خلعت و اکرام شاہی سے سرفراز کیا جائے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ رانائے اُودے پور سے ابھی جنگ کا سلسلہ جاری ہے اور برابر معرکہ آرائیاں ہو رہی ہیں پہلے شہزادہ پرویز پھر مہابت خاں اس مُہم پر بھیجے جا چکے ہیں لیکن سوائے اس کے اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے کہ مہابت خاں سے رانا شکست کھا کے میدانِ جنگ سے ہٹ گیا ہے اور حسبِ معمول پہاڑوں میں جا چھپا ہے۔ جب جہاں گیر نے یہ دیکھا کہ لڑائی بھی ہوئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا تو شہزادہ خرم کو بیس ہزار فوج دیکر چتوڑ پر دباوے کا حکم دیا[1]

شہزادہ خرم کو اس مہم سے اس لئے دلچسپی تھی کہ شہزادہ پرویز اور مہابت خاں جیسے امرا دیپر سے شہزادہ کا خیال تھا کہ اگر مجھے کامیابی ہو گئی تو علاوہ اس کے کہ امراء دربار میں میرا پایہ بلند نظر آئے گا آئندہ بادشاہت کے بھی قابل سمجھا جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شہزادہ نے اودے پور میں چھاؤنی ڈالدی اور اپنے حسن تدبیر سے رانا کو زچ کر کے چھوڑا۔

پہاڑوں کے کل راستوں کی ناکہ بندی ایسی کر دی کہ رانا کو رسد ہی نہ پہونچ سکی اور چند دستے فوج کے اس غرض سے چھوڑ دئے کہ وہ رانا کی جمعیت جہاں پائیں نقصان پہونچائیں۔ یہ سلسلہ دنوں جاری رہا۔ راجپوتوں نے بھی ہمت نہ ہاری لیکن تابکے جب سامان رسد ہی نہ پہونچ

[1] تاریخ ہند حصہ دوم باب ۱۱ صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۸ مطبوعہ جامع عثمانیہ حیدرآباد دکن

سکا اور قلت واقع ہوئی تو رانا گھبرا گیا اور سوائے قبولِ اطاعت کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اور صلح و آشتی کے پیغام سلام شروع ہو گئے۔

اس درمیان میں کرشن دیو رانا کا بھائی تھا جس کی خوش تدبیری سے یہہ صلح رانا کے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی کہ اس کا وہ علاقہ جو اکبر کے ملک مفتوحہ میں داخل کر لیا گیا تھا واپس کر دیا گیا۔ اور روز بروز اس کے اعزاز و اکرام میں ترقی ہی ہوتی گئی۔

جب صلح کا مرحلہ طے ہو گیا تو رانا خود اظہارِ اطاعت کے لئے شہزادہ کے دربار میں حاضر ہوا اور نذر پیش کی شہزادہ بغل گیر ہو کر ملا اور رانا کو اپنے برابر بٹھایا۔ اس برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ رانا دل میں پھولا نہ سماتا تھا اور اب شہزادہ کو وہ اپنا سچا محسن و مربی سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے کرن کو جو اس کے بعد دربارِ جہانگیر سے باپ کا جانشین قرار پایا بہ اتفاق شہزادہ خرم کے ساتھ کر دیا اور جب کرن دربارِ شاہی میں حاضر ہوا تو وہاں اس کی بڑی عزت و توقیر ہوئی۔ خلعت فاخرہ پایا اور منصب پنجہزاری بھی عطا فرمایا گیا اور اسی روز سے اس کا شمار سلطنت کے جنگی عہدیداروں میں ہونے لگا۔

خافی خاں نے اپنی تاریخ میں جس رانا کا ذکر کیا ہے وہ یہی رانا ہے اور بعد کو جو بیٹا رانا کا گدی نشین ہوا وہ یہی بیٹا ہے جسکا نام کرن ہے اور یہ وہی کرن ہے جس نے دربارِ جہانگیر میں شہزادہ خرم کی وساطت سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کی تھی اور منصب پنجہزاری پایا تھا اور یہہ اسی راجہ سانگا کے خاندان کا رانا ہے۔ جس کا کرنل ٹاڈ مداح ہے اور جس کے حالات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

دکن کی لڑائیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں اور ضرورت تھی کہ وہاں خرم جیسا سپہ سالار بھیجا جائے۔ چنانچہ آئندہ سال شہزادہ کو شاہ کا خطاب عطا ہوا اور باپ نے بیٹے کے اپنے ہاتھ سے تلوار زیب کمر کی اور دکن کی طرف روانہ کیا اور کچھ روز بعد خود بھی مالوے کی طرف کوچ کیا اس غرض سے کہ میدانِ جنگ سے قریب رہے۔ جب اودے پور کی منزل میں آیا تو رانائے اودے پور بھی تصدیق

سلے کارنامہ جہانگیری جلد صفحہ ۲۰۱۰۔ ملہ ترک جہانگیری۔ سلے الفنسٹن صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۹۔ دیکھو میواڑ کی لڑائی ۔

اطاعت و استقبال کے لئے جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور نذر گزرانی جہان گیر رانا کے اس مخلصانہ اظہار بندگی و اطاعت سے بہت خوش ہوا اور خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا اور بڑی مہربانی سے پیش آیا۔

شاہجہاں کا عہد سلطنت ہر اعتبار سے جیسا اچھا گزرا تاریخ اُس کی ایک زندہ شہادت ہے۔ اور یہ شاہجہاں کے تدبّر و حُسنِ اخلاق کی ایک ایسی روشن دلیل ہے کہ جس کی مثال کسی مُغل بادشاہ کے دور میں نہیں ملتی۔

عالم گیر جو سب سے زیادہ قوی اور منتظم بادشاہ گزرا ہے اس کا عہد سلطنت بھی شورشِ راجپوتانہ سے نہ بچ سکا۔

سنہ ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں جب رانا رقمِ خراج ادا کرنے میں لیت و لعل کر رہا تھا اور جودھپور کے نافرمان راجپوتوں کی حمایت پر تُلا ہوا تھا۔ عالم گیر کو اس پر فوج کشی کرنی پڑی تھی۔ اور یہ ایسا سخت حملہ تھا کہ رانا کسی طرح اس کی تاب نہ لا سکتا پہاڑ جو اس کا ملجا و مامن تھے اب وہاں بھی اُسے پناہ ملنی دشوار تھی اس لئے کہ شہزادہ محمد معظم نے دکن سے اور محمد امین صوبہ دار نے احمد آباد سے بڑھ کر اودیپور کو گھیر لیا تھا اور خود عالم گیر اِدھر چھاؤنی ڈالے ہوئے پڑا تھا۔ اس سنگین کارروائی کا نتیجہ آخر یہی تھا کہ رانا سرِ تسلیم خم کرے۔ معاملہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب تک کوئی بڑی طاقت بیچ میں پڑے عالم گیر سے صفائی مشکل تھی کیونکہ شہزادہ محمد اکبر جو اوّل اوّل اس مُہم پر روانہ کیا گیا تھا رانا نے اُسے ورغلا کر عالم گیر سے توڑ لیا تھا اور اس کے بادشاہ بنائے جانے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں۔ نوجوان شہزادہ اس طمع میں پھنسکر باپ سے باغی ہو گیا تھا۔

بارے عالم گیر کی حکمتِ عملی سے یہ فتنہ فرو ہوا اور شہزادہ ایسا بھاگا کہ پھر باپ کو صورت نہ دکھائی اور ایران جا کر وہیں مر گیا۔

رانا نے مجبور ہو کر شہزادہ محمد اعظم کی خوشامد کی اور اُسے اپنا شفیع بنا کر عالم گیر سے قصور کی معافی چاہی اور خراج کے مطالبہ میں دو پرگنے حوالے کئے۔

عالم گیر کی فیاضی و درگزر اس موقع پر قابلِ ملاحظہ ہے کہ اتنی سنگین خطا پر بھی اُسنے

تاریخ ہند۔ باب ۱۳۔ صفحہ ۴۴۱ تا ۴۴۴ (جامع عثمانیہ سیریز)۔

معافی

معافی دیدی کہ اس کا ایک لختِ جگر شہزادہ محمد اکبر ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اور معافی کے ساتھ منصب پنجہزاری بھی عطا فرمایا اور دربار کے معزز اُمرا میں بھی رانا کو داخل کر لیا۔ اور جب رانا مرا تو اس کے بیٹے جے سنگھ کو باپ کا جانشین بنایا خلعتِ فاخرہ و خطاب خاص سے ممتاز فرمایا۔ اور رانا مرحوم کے بھائیوں کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ راجہ بھیم سنگھ۔ اندر سنگھ بہادر سنگھ۔ ان تینوں کو منصب سہ ہزاری سے پنجہزاری منصب تک ترقی دی اور یہ تینوں جاں نثار دکن کی لڑائیوں میں آخر وقت تک بادشاہ کے ساتھ رہے۔

مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا جو لیین پول نے اورنگ زیب کے حالات میں اُس موقع پر لکھا ہے جب دارا کو شکست ہوئی اور وہ آگرے سے دہلی چلا گیا۔

عالمگیر اِس فکر میں تھا کہ شاہجہاں کا ارادہ معلوم کرے نیز اندرونی حالات کا پتہ چلائے کہ اس کی نسبت اس وقت شاہجہاں کا کیا خیال ہے۔ حالانکہ اُس کی فراست و مآل اندیشی اسے پہلے ہی بتا چکی تھی مگر پھر بھی اس نے شہزادہ محمد اکبر کو اسی غرض سے باپ کے پاس بھیجا اور اونچ نیچ سب سمجھا دی۔ اور وہاں یہ خبر تھی کہ عالمگیر خود عفو قصور کے لئے آتا ہے۔ لیکن بجائے اُس کے جب شہزادہ محمد اکبر پہونچا تو جو جو منصوبے مدعیوں نے باندھے تھے وہ سب ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد کئی روز شہزادہ داداکے پاس رہا۔ اور اکثر شاہجہاں نے اسے یہ ترغیب دی جو کمال جوشِ محبت پر مبنی تھی کہ میں بیٹوں میں سے کسی کو تاج و تخت نہیں دیتا یہ آپس میں لڑتے ہیں بلکہ تمہیں بادشاہ بنائے دیتا ہوں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ قلعہ کے اندر جو بادشاہ کے راز دار تھے سب اس سے آگاہ تھے اور اس ترغیب میں شریک تھے۔ شہزادہ یوں تو بادشاہ کا دل خوش کرنے کے لئے سب کی ہوں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ لیکن دل سے ہرگز اس بات پر راضی نہ تھا کہ باپ کے خلاف کوئی بات کرے۔ آخر وہاں سے بلطائف الحیل یہ نکلا اور عالمگیر کے پاس آکر ساری کتھا کہہ سنائی خصوصاً حُسن آرا کے خیالات کہ وہ تو بہت ہی بُرے تھے۔

مگر اتفاق وقت کہ وہی شہزادہ جس نے باپ کے خلاف اُس دادا کا کہا نہ کیا جو شہنشاہ

ہندوستان تھا۔ آج ایسا ہو جائے کہ رانا اور درگا داس کے کہنے پر باپ سے فرنٹ ہو کر علم بغاوت بلند کر دے اور اتنا نہ سوچے کہ اب عالمگیر وہ عالمگیر نہیں ہے جو اُس وقت تھا کہ جب اُس نے اِسے شاہجہاں کے پاس بھیجا تھا۔

میں نے جہاں تک اس بات پر غور کیا اور انسان کی فطرت پر نظر ڈالی تو یہہ نتیجہ نکلا کہ انسان کا مزاج ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ اور یہہ مثل بھی سچ ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ بڑے بڑے عقلمند۔ لوگوں کے کہنے سُننے میں لگ کر بعض وقت وہ کچھ کر بیٹھتے ہیں جو شہزادہ محمد اکبر نے کیا۔

تاریخ بھی عبرتوں کا البم ہے۔ جس صفحہ کو اُلٹیئے سلطنت کا تختہ اُلٹا ہوا نظر آئے گا۔ جس سُرخی پر نظر ڈالیئے خون کا دریا بہتا دکھائی دے گا۔ خوشی کے کارنامے۔ غم و رنج کے افسانے سطر سطر سُنائے گی۔ عبرت کی آنکھ کہیں روئے گی اور کہیں مُسکرائے گی غرض کہ دُنیا عجیب جگہ ہے کہ ہزار بار بنی اور ہزار بار بگڑی مگر پھر بھی اس کی دل داریاں اور دل چسپیاں اب تک وہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی ؎

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی + ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

(خادم۔ سید حسن۔ سید ظہیری از بھوپال)

صلائے عام۔ صاحبِ مضمون نے یہہ تاریخی جواب بہت مفصل لکھا ہے۔ معمولی رسالوں کے پڑھنے والے گو مورخانہ مضامین سے دلچسپی کم رکھتے ہیں مگر صلائے عام کی قدر ایسے ہی مضامین سے ہے جن میں معلومات زیادہ ہوں۔ دوسرے اِس مضمون میں رُوکھا پن مُطلق نہیں آنے پایا۔ تاریخی مضامین اگر اِس طرز پہ لکھے جائیں تو ممکن نہیں کہ دلچسپی سے خالی نکلیں۔ یہہ جواب اُس تاریخی سوال کا ہے جو صلائے عام میں پہلے شایع ہوا تھا +

الاستفسار

کیا اہلِ دہلی میں سے کوئی صاحب لفظِ خواجہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟ تعجب ہے کہ اس بائیس خواجہ کی چوکھٹ سے بھی محروم جواب رہوں۔ کشمیر اور دہلی ماوئے اور ملجائے خواجگان مانا گیا ہے۔ بڑے بڑے ذی علم خواجہ ان دونوں مقاموں پر گزرے اور بحمد اللہ اب بھی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ اب تک کسی صاحب نے لفظ خواجہ کی تحقیق نہیں فرمائی۔ خصوصاً حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب سے یہ سوال دریافت طلب ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا بھی خواجہ تھے یا آپ ہی والد کی طرف سے خواجہ ہیں۔ شیخ سید مغل پٹھان جو ہندوستان کی مسلم قومیں ہیں انہیں میں سے خواجہ بھی ہیں یا خواجہ کوئی اور ذات ہے۔ اگر لقب یا خطاب ہے تو ہر نیک اور بزرگ شخص کو خواجہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اور اس مذکر کا مؤنث کیا ہے۔ مرد خواجہ ہے تو عورت کو کس لفظ سے تخاطب کیا جائے گا۔ امید کہ علاوہ ناظرین صلائے عام دیگر محققانِ کلام خصوصاً ذریات خواجگانِ انام بھی توجہ فرمائیں اور جناب خان بہادر دامت فیوضہم ضرور اس طرف ایک کرم کی نگہ فرمائیں۔

(سپاس گزار التفات، احقر احمد علی خاں آغا دہلوی)

صلائے عام۔ جب تک اور اصحاب اس لفظ کی تحقیق میں لکھیں۔ معمولی طرزِ کلام میں خواجہ بمعنی آقا۔ غلام کی ضد میں سمجھنا چاہیئے +

× × × × × × میں تو ہر وقت یہی دُعا مانگتا ہوں کہ آپ کے قوئے درست رہیں اور آپ عمرِ خضر پائیں۔ اس لئے کہ ہماری آرزوؤں کی دنیا آپ کے دم سے آباد ہے

ابی گایہ

ں کا یہ مطلب ہے کہ آپ ہیں تو ہم بھی ہیں ورنہ ہماری طبیعت کو اُبھارنے والا اور ہم سے کام لینے والا دوسرا ایسا کون ہوگا جس کے حکم کو ہم واجب التعمیل سمجھیں گے اور جس کا بزرگانہ اثر ہمیں مجبور کرے گا کہ ضرور بالضرور کچھ نہ کچھ ہم لکھتے رہیں اور پیش کرتے رہیں" × × × × × × × ×

(سید حسن ستیہ ظہیری)

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی پیشگی قیمت چھ روپے سالانہ ہے قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شائع نہ ہو سکیں ان کے واپس کرنیکا ذمہ نہیں۔ اگر واپس منگانیکی ضرورت ہو تو محصول ڈاک آنا چاہئے

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکیالی ضرور ہو یعنی بسان عروس جمیل لباس حریر کی شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا ایک سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی +

شرح اُجرت اشتہارات

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی ہوں یا ناگری:-

زبانِ اُردو میں ایک صفحہ ایک سال کے واسطے [illegible]
" " چھ ماہ کے واسطے [illegible]
" " تین ماہ کے واسطے [illegible]
" نصف صفحہ ایک سال کے واسطے [illegible]
" چوتھائی صفحہ یا اس سے کم ایک سال کیواسطے [illegible]
" " چھ ماہ کیواسطے [illegible]
" " تین ماہ کیواسطے [illegible]
" ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے [illegible]
" نصف " " " [illegible]
" چوتھائی " " " [illegible]

ناگری میں ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اُجرت۔ انگریزی میں ہو تو اردو سے دوگنی اُجرت ہے۔ اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی چاہئے۔ اشتہار کا مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں آجانا چاہیے +

(منیجر صلائے عام)

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:-

دلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر، مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا +
[Prin]ted and Published by Mir Nasir ali Khan Bahādur (Editor) at the Nāsri Press, Farrāsh Khāna, Delhi.